اشاعت خاص

فکر اسلامی

مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نمبر

جولائی ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء

مدیر

محمد اسعد قاسمی

مرکز دعوت وارشاد

دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی، الہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمارہ: ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳ — جولائی ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۱ء

سہ ماہی "فکرِ اسلامی" بستی

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نمبر

زیر سرپرستی

حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم

مدیر

محمد اسعد قاسمی

مجلس ادارت

مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں
مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی
مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی
مولانا ظہیر انوار قاسمی
مولانا شاہد احمد قاسمی
مولانا محمد اسجد رشید قاسمی

ناشر

مرکزِ دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی الہند

زرِ تعاون سالانہ 100/ روپئے — خصوصی شمارہ 150/ روپئے

تزئین وکتابت - امتیاز احمد قاسمی

معاون تصحیح وطباعت - مولانا انصار اللہ قاسمی

فہرست عناوین

پیغامات :

۱۔ پیغام ـــــ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ۶

۲۔ پیغام ـــــ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم ۸

فکر و نظر :

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں ـــــ مدیر ۱۰

(۱) حیات و شخصیت :

۱۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ماہ و سال کے آئینے میں ـــــ مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی ۱۸

۲۔ حضرت مولاناؒ کے اخلاق و عادات ـــــ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی ۲۹

۳۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ـــــ مولانا سید سلمان الحسینی ندوی ۴۷

۴۔ حضرت مولاناؒ۔ ایک نادر شخصیت ـــــ مولانا بدر الحسن قاسمی ۸۷

۵۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ـــــ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی ۹۷

۶۔ عالم ربانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ـــــ مولانا نور عالم خلیل الامینی ۱۰۷

۷۔ حضرت مولانا علی میاںؒ۔ شخصیت کے چند گوشے ـــــ مولانا مفتی جمیل احمد نذیری ۱۲۶

۸۔ حضرت مولاناؒ۔ ایک موہوب شخصیت ـــــ مولانا اسعد قاسم سنبھلی ۱۳۶

۹۔ حضرت مولاناؒ۔ ایک نادرۂ روزگار شخصیت ـــــ مولانا اختر امام عادل قاسمی ۱۴۲

(۲) امتیازات و خصوصیات :

۱۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ نقوش و تاثرات اور خصوصیات ـــ مولانا عتیق احمد قاسمی ۱۵۸

۲۔ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ۔ فکر و نظر کے چند امتیازات ـــ مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں ۱۹۶

۳۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کے رہنما دعوتی اصول ـــ علامہ یوسف القرضاوی / ترجمہ محمد سلمان خان ندوی ۲۰۷

۴۔ حضرت مولانا علی میاںؒ۔ چند امتیازات و خصوصیات ـــ مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی ۲۲۰

۵۔ دعوت کے میدان میں حضرت مولاناؒ کی سرگرمیاں 〃 ۲۳۴

۶۔ حضرت مولانا کے مدرسۂ فکر کے امتیازات ـــ مولانا عطر لیف شہباز ندوی ۲۵۶

۷۔ ایک مایۂ ناز ادیب و داعی ـــ ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت / ترجمہ مولوی عبدالجلیل ندوی ۲۶۵

(۳) علمی و دینی کمالات :

۱۔ حضرت مولاناؒ اور علم تفسیر ـــ پروفیسر بدرالدین الحافظ ۲۷۳

۲۔ حضرت مولاناؒ کی قرآن فہمی کے دو نمونے ـــ مولانا محمد باقر حسین صاحب ۲۸۶

۳۔ حضرت مولاناؒ اور علم حدیث ـــ مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ۲۹۴

۴۔ حضرت مولانا علی میاںؒ اور فقہ اسلامی ـــ مولانا عتیق احمد قاسمی ۳۲۴

۵۔ حضرت مولاناؒ عربی کے صاحب طرز ادیب ـــ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ۳۴۲

۶۔ تاریخ دعوت و عزیمت۔ ایک عظیم شاہکار ـــ مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی ۳۵۷

۷۔ منصب نبوت۔ ایک اجمالی تبصرہ ـــ مولانا عبدالقیوم قاسمی ۳۶۵

۸۔ حضرت مولاناؒ کی تصانیف پر ایک نظر ـــ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ۳۷۲

(۴) اشخاص، ادارے اور تحریکات :

۱۔ حضرت مولاناؒ دیار عرب میں ـــ مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی ۳۸۲

۲۔ حضرت مولاناؒ اور تبلیغی جماعت ـــ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی ۴۰۵

۳۔ حضرت مولاناؒ اور دینی تعلیمی کونسل ـــ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ۴۲۱

۴۔ حضرت مولاناؒ اور مسلم پرسنل لا بورڈ ـــ مولانا رضوان احمد ندوی ۴۸۲

۵۔ حضرت مولاناؒ اور اخوان المسلمین ـــ مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری ۴۹۲

۶۰۔ پیام انسانیت کے علمبردار ——— مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں ۴۹۹

۷۔ حضرت مولاناؒ کا دورۂ ایران ——— مولانا محمد علاؤ الدین ندوی ۵۰۵

۸۔ بزرگ و معاصر شخصیات حضرت مولاناؒ کی نظر میں ——— مولانا عبد العلی فاروقی ۵۱۴

۹۔ حضرت مولاناؒ اور دار العلوم دیوبند ——— مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی ۵۲۲

۱۰۔ " دار العلوم ندوۃ العلماء ——— " ۵۳۴

۱۱۔ " دار العلوم الاسلامیہ ——— مولانا ظہیر انوار قاسمی ۵۴۴

۱۲۔ " مسلم مجلس مشاورت ——— مولانا فیروز اختر ندوی ۵۵۰

۱۳۔ حضرت مولاناؒ مشاہیر کی نظر میں ——— مولوی محمد احمد قاسمی ۵۵۵

۱۴۔ حضرت مولاناؒ کا شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے تعلق ——— مولوی محمد عفان قاسمی ۵۶۶

۱۵۔ اقبال کا مردِ مومن ——— مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی ۵۷۵

(۵) تأثرات و ملاحظات :

۱۔ صبر و ضبط کی تلقین ——— محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب مدظلہٗ ۵۸۵

۲۔ علی میاں ——— مولانا عبد الماجد دریابادیؒ ۵۸۹

۳۔ حضرت مولاناؒ اور کچھ ذاتی تأثرات ——— مولانا محمد ولی رحمانی ۵۹۱

۴۔ اسلامی قدروں کے اعلیٰ ترجمان ——— سید شہاب الدین ۶۰۳

۵۔ ایک مرد درویش کی رحلت ——— ڈاکٹر محمد یوسف نگرامی ۶۰۸

۶۔ عالم اسلام کی محبوب و محترم شخصیت ——— پروفیسر خورشید احمد ۶۱۳

۷۔ حضرت مولانا علی میاںؒ ——— سید حامد ۶۲۲

(۶) مجلات و جرائد کے چند اہم مضامین :

۱۔ آہ! حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ ——— مولانا محمد تقی عثمانی ۶۳۵

۲۔ حضرت مولاناؒ۔ چند تأثرات و ملاحظات ——— مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ۶۴۵

۳۔ ہندوستان کی آفاقی شخصیت ——— مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی ۶۴۹

۴۔ داعی الی اللہ کی وفات ——— مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۶۵۵

۵۔ آہ! مینارۂ علم وتقویٰ ——— مولانا مجیب اللہ ندوی ۶۶۴

۶۔ عالم اسلام کی عظیم شخصیت ——— مولانا اسیر ادروی ۶۷۵

۷۔ میر کارواں ——— مولانا محمد اسعد قاسمی ۶۷۹

(۷) منظوم خراجِ عقیدت :———

۱۔ دُعا ——— محترمہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ ۶۸۳

۲۔ چراغِ رہگذر ——— شفیق جونپوریؒ ۶۸۴

۳۔ بیادِ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ——— مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں ۶۸۵

۴۔ خراجِ عقیدت ——— محمد عبدالقدیر ایڈوکیٹ ۶۸۷

در دست نہ تیر است نہ در دست کمان است
ایں سادگیٔ اوست کہ بسمل دو جہان است
در مدرسہ از جنبشِ لعلِ تو حکایت
در میکدہ از مستیٔ چشمِ تو نشان است

پیغامات

پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Mohammad Rabey Nadwi

Nadwatul Ulama, P.O. Box 93 Lucknow 226007 (INDIA)
Ph. : (0522) (Off.) 382681, (Res.) 323864/229174
Fax : 330020 E-mail airp@lw1 vsnl.net in

محمد الرابع الحسنی الندوی

ندوۃ العلماء، ص.ب. ۹۳، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷ (الہند)
الہاتف : (مکتب) ۳۸۲۶۸۱، فاکس : ۳۳۰۰۲۰
" : (منزل) ۳۲۳۸۶۴/۲۲۹۱۷۴

Date .....

تحریر امی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد دار العلم مضلع بستی کے ترجمان "فکر اسلامی" کے ذمہ داران نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور خصوصیات پر خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے یہ فیصلہ دار العلم بستی کے ذمہ داروں کے اس متین خاطر کی دلیل ہے جو ان کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اور اب ان کی وفات کے بعد ان کی یاد کے تقاضہ پر اپنے اس متین خاطر کو اس خاص نمبر کے ذریعہ ظاہر کر رہے ہیں۔ دار العلم کے مہتمم اعلیٰ مولانا ماہر حسین صاحب اور رسالہ فکر اسلامی کے مدیر مولانا محمد اشعد فاروقی صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی زندگی میں برابر رابطہ رکھا اور قدر دانی کا اظہار کیا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ملت کے مسائل کی جو فکر تھی اور اسکو خطرات سے بچانے اور اسکو بلند مقام کی طرف لے جانے کی جو لگن تھی اسکو ملت کے سب اہل درد افراد محسوس کرتے تھے اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کرتے تھے اور اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی محنتوں اور فکر مندیوں کے اثرات بھی ظاہر ہوئے اور ملت کئی خطرات سے محفوظ رہی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملت کی فکر میں جو جدوجہد کرتے تھے، تنہا وہی ان کی خصوصیت نہ تھی بلکہ اسکے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کے فروغ، صحیح فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت، راہ حق کی نشاندہی اور دعوت کے اصلی کام کی طرف توجہ اور تربیت باطنی کی فکر ان کی دیگر خصوصیات تھی جس کو سب دانشوروں نے محسوس کیا اور ان کی وفات کے بعد ان کی ان خصوصیات کی نشاندہی کرکے ملت کے خوردوں کو ان کی نقل کی طرف متوجہ کیا اور کر رہے ہیں اس سلسلہ میں متعدد اسلامی اداروں نے اپنے خاص نمبر نکالے اور اب دار العلم بستی کا ترجمان فکر اسلامی اپنا خاص نمبر نکال رہا ہے میں اسکو خوشی اور مبارکباد اور امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ صحیح اسلامی فکر کی خدمت کا حق ادا کرنے کی ایک اچھی قدم بنا اللہ تعالیٰ کو یہ بنائے اور قبول فرمائے آمین

خاکسار محمد رابع حسنی ندوی
۲۰/۶/۲۱۴۲ھ

• رئیس دار العلوم ندوۃ العلماء ورئیس المجمع الإسلامی العلمی۔ ونائب الرئیس لرابطة الأدب الإسلامی العالمیة

م ۶۳ / ۱۶۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :-

دارالعلوم ضلع بستی کے ترجمان "فکر اسلامی" کے ذمہ داران نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور خصوصیات پر خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ فیصلہ دارالعلوم بستی کے ذمہ داروں کے اس تعلقِ خاطر کی دلیل ہے جو ان کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، اور اب انکی وفات کے بعد انکی یاد کے تقاضہ پر اپنے اس تعلق خاطر کو اس خاص نمبر کے ذریعہ ظاہر کر رہے ہیں — دارالعلوم کے مہتمم اعلیٰ مولانا باقر حسین صاحب اور رسالہ "فکر اسلامی" کے مدیر مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے انکی زندگی میں برابر ربط رکھا اور قدر دانی کا اظہار کیا مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ملت کے مسائل کی جو فکر تھی اور اسکو خطرات سے بچانے اور اسکو بلند مقام کی طرف لیجانے کی جو لگن تھی اسکو ملت کے سب اہلِ درد افراد محسوس کرتے تھے اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ اس سلسلہ میں بٹانے کی فکر کرتے تھے اور الحمد للہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی محنتوں اور فکر مندیوں کے اثرات بھی ظاہر ہوئے اور ملت کئی خطرات سے محفوظ رہی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملت کی فکر میں جو جد وجہد کرتے تھے تنہا وہی انکی خصوصیت نہ تھی، بلکہ اسکے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کے فروغ، صحیح فکرِ اسلامی کی ترویج واشاعت، راہِ حق کی نشاندہی اور دعوت کے اعلیٰ کام کی طرف توجہ اور تربیتِ باطن کی فکر انکی دیگر خصوصیات بھی تھیں جن کو سب دانشوروں نے محسوس کیا اور انکی وفات کے بعد انکی ان خصوصیات کی نشاندہی کے ساتھ ملت کے فرزندوں کو انکی نقل کی طرف متوجہ کیا اور کر رہے ہیں، اسی سلسلہ میں متعدد اسلامی رسالوں نے اپنے خصوصی نمبر نکالے اور اب دارالعلوم بستی کا ترجمان "فکر اسلامی" اپنا خصوصی نمبر نکال رہا ہے، میں اسکو خوش آمدید کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اسکے ذریعہ صحیح اسلامی فکر کی خدمت کا حق ادا کرنے کی راہ میں ایک اچھا قدم ہوگا، اللہ تعالیٰ مفید بنائے اور قبول فرمائے آمین

خاکسار محمد رابع حسنی ندوی

۲۰ / ۶ / ۱۴۲۱ھ

پیغام

حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب — دامت برکاتہم

PHONE 8289 & 2458 — Gram: DARUL ULOOM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بستی یوپی الہند

دار العلوم الاسلامیة

DARUL ULOOM-AL-ISLAMIA

BASTI - 272001 U. P. INDIA

Ref. No..... Dated... ۸ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ دار العلوم الاسلامیہ بستی کے موقر ترجمان سہ ماہی "فکر اسلامی" کے کارکنان مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے گرانقدر افکار و خیالات اور دینی و علمی خدمات کو زندہ اور ان کے حسن عمل کے نمونوں کو ملت کے سامنے رکھنے کیلئے "مفکر اسلام نمبر" شائع کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا کا مجھ ناچیز، دار العلوم الاسلامیہ (بستی) مدرسہ امدادیہ (مرادآباد) اور ان کے کارکنوں سے جو گہرا تعلق تھا اسے دیکھتے ہوئے بھی اس نمبر کی اشاعت ہماری محسن شناسی کا تقاضا تھی۔

میں اس ضخیم و عظیم نمبر کی اشاعت پر رسالہ "فکر اسلامی" کی مجلس ادارت کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ نمبر اپنے دینی و علمی اور فکری مقاصد میں ہر طرح کامیاب اور عوام و خواص کیلئے چشم کشا اور بصیرت افزا ثابت ہو۔

والسلام

محمد باقر حسین عفی عنہ

(حضرت مولانا) محمد باقر حسین (صاحب مدظلہ العالی)

صدر دار العلوم الاسلامیہ بستی و مہتمم مدرسہ امدادیہ مرادآباد

۸ رجب المرجب ۱۴۲۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے مؤقر ترجمان سہ ماہی "فکر اسلامی" کے کارکنان مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے گرانقدر افکار و خیالات اور دینی و علمی خدمات کو زندہ اور ان کے حسنِ عمل کے نمونوں کو ملت کے سامنے رکھنے کیلئے "مفکر اسلام نمبر" شائع کر رہے ہیں۔

حضرت مولاناؒ کا مجھ ناچیز، دارالعلوم الاسلامیہ (بستی) مدرسہ امدادیہ (مرادآباد) اور ان کے کارکنوں سے جو گہرا تعلق تھا اسے دیکھتے ہوئے بھی اس نمبر کی اشاعت ہماری محسن شناسی کا تقاضا تھی۔

میں اس ضخیم و عظیم نمبر کی اشاعت پر رسالہ "فکر اسلامی" کی مجلس ادارت کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ نمبر اپنے دینی و علمی اور فکری مقاصد میں ہر طرح کامیاب اور عوام و خواص کیلئے چشم کشا اور بصیرت افزا ثابت ہو۔

والسلام

محمد باقر حسین غفرلہٗ

(حضرت مولانا) محمد باقر حسین (صاحب مدظلہٗ العالی)
صدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی و مہتمم مدرسہ عربیہ امدادیہ
مرادآباد

فکر و نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

از :- مدیر

ملتِ اسلامیہ اور امتِ محمدیہ کے لئے عصرِ حاضر میں ایسے حالات وحوادث پیش آرہے ہیں جو اس کیلئے ہمت شکن اور روح فرسا کہے جاسکتے ہیں اور جنھیں دیکھتے ہوئے قربِ قیامت کا احساس ویقین بڑھتا جاتا ہے، خارجی طور پر اکثر بڑی طاقتیں عالمِ اسلام کو اپنے استبداد واستعمار کے نرغے میں گھیرے ہوئے اور سیاسی واقتصادی شکنجے میں کسے ہوئے ہیں اور مذہبی وتہذیبی طور پر ان پر تعصب وناروا داری، دہشت پسندی ودہشت گردی جہالت وپسماندگی کے الزامات قائم کئے ہوئے ہیں، کسی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف (TERRORISM) کے چارج لگائے جارہے ہیں اور کسی جانب سے عالمِ اسلام میں "حقوقِ انسانی" (HUMAN RIGHTS) اور "حقوقِ نسواں" کی پامالی کا الزام لگایا جاتا ہے، غرض عالمِ اسلام کے خلاف نفرت وتعصب کی ایسی فضا قائم کی جارہی ہے جس کے پردے میں عالمِ اسلام پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاسکیں اور اس کا استحصال کیا جاسکے اور اسے محکوم ومجبور بنایا جاسکے، ایسے ہنگامی اور بحرانی حالات میں بھی عالمِ اسلام ان الزامات کا معقول جواب دینے اور بھرپور دفاع کرنے کے بجائے خانہ جنگیوں، باہمی مخالفتوں

اور عداوتوں اور برادر کشی، بلکہ خود شکنی و خودکشی میں مبتلا ہے۔ فیا مصیبتاہ وداویلاہ!

ان خارجی حالات کے ساتھ عالم اسلام قحط الرجال میں بھی مبتلا ہے اور اس کے ہر شعبۂ زندگی میں لائق و فائق، اہل و باصلاحیت افراد کی کمی پیدا ہوتی جارہی ہے اور حالت یہ ہے کہ کسی شعبۂ زندگی کا کوئی فرد اٹھ جاتا ہے تو پھر اسکی جگہ پُر ہوتی نظر نہیں آتی اور ایک بھیانک اور افسوسناک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

تقدیر الٰہی کے آگے کیا چارہ ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں گذشتہ چند مہینوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے عالم اسلام اور ہندوستان ایسے مشاہیر و اکابر علماء و مشائخ سے خالی ہوگیا جن کا نعم البدل تو کیا، کمتر بدل ملنا بھی مشکل نظر آتا ہے، چنانچہ عالم عرب میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ، شیخ عبدالعزیز بن بازؒ، شیخ مصطفیٰ الزرقاءؒ، استاذ محمد ناصر الدین الالبانیؒ شیخ علی طنطاویؒ، شیخ محمد الغزالیؒ، السید سابقؒ، شیخ محمد المجذوبؒ، شیخ عطیہ محمد سالمؒ، شیخ مناع قطانؒ کے ساتھ ہندوستان اور عالم اسلام کی آبرو، داعی الی اللہ، عالم ربانی و شیخ حقانی، فاضل اجل و یگانۂ عصر، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی ہندوستان اور عالم اسلام کے مسلمانوں کو سوگوار چھوڑ کر رحمتِ حق سے وابستہ ہوگئے۔

حضرت مولانا کی رحلت ایسے حالات میں ہوئی جن کی وجہ سے اس کی المناکی ایسے کی شکل اختیار کرگئی، عین اسوقت جبکہ حضرت مولاناؒ کی موجودگی کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ مسلمانانِ ہند پر دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے الزامات لگ رہے تھے، مدارس و مساجد پر بندش لگانے کیلئے "مذہبی مقامات بل" پاس کرنیکی سازش ہورہی تھی، مسلم پرسنل لاء کو نشانہ بنایا جارہا تھا اور ان کے گرد سازشوں اور انکوائریوں کا دائرہ تنگ کیا جارہا تھا، کہ ان سب آفتوں کے مقابل سینہ سپر ہونے والی اور ملتِ اسلامیۂ ہند کیلئے ڈھال بننے والی شخصیت ہی کو اٹھالیا گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت مولاناؒ کی وفات سے ملت اپنے کو یتیم و بے سہارا محسوس کر رہی ہے اور اسکی سرگرمیاں رک سی گئی ہیں، اور دور دور تک ایک مہیب خلاء اور سناٹا نظر آتا ہے ؎

رفتی واز رفتنت یک عالمے تاریک شد
تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

حضرت مولاناؒ ان اکابر علماء و مشائخ میں تھے جن سے اقوام و ممالک کی قسمتیں اور تقدیریں وابستہ ہوتی ہیں اور انکی شخصیت قوموں کی ذہنی و فکری، علمی و ثقافتی سیاسی و اجتماعی زندگی میں روحِ رواں اور سرچشمۂ قوت بنی ہوتی ہے اور ان کی ذات سے ملک و قوم کا وقار و اعتبار وابستہ ہوتا ہے اور انکی جامع الجہات شخصیت اجتماعی زندگی کا محور و مدار بن جاتی ہے، حضرت مولاناؒ کی جامعِ کمالات ہستی ایک ہشت پہل نگینہ ہے جس کا ہر پہلو دلکش اور تابناک ہے، وہ عالمِ ربانی بھی ہیں اور شیخ روحانی بھی، وہ صاحبِ دل اور روشن ضمیر عارف بھی ہیں اور صاحب فہم و بصیرت سیاسی قائد و رہنما بھی، وہ ایک نامور اور صاحبِ طرز ادیب و اہل قلم بھی ہیں اور پرجوش خطیب و داعیِ اسلام بھی، وہ ایک کامیاب استاذ و معلّم بھی ہیں اور ایک شفیق و ہمدرد شیخ و مربی بھی، قدرت نے اس جامع کمالات ہستی کے نشو و نما کیلئے ایسے سازگار حالات بھی پیدا کر دئے جنکی بدولت فضائل و کمالات کی شیرازہ بندی ہوتی گئی، چنانچہ غربؒ اساتذہ کے علاوہ علماء و مشائخ دیوبند سے بھی علمی و روحانی استفادہ کیا، جن میں حضرت مولانا تھانویؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اس جامع تعلیم و تربیت کے نتیجے میں انکی ذات میں علم و عرفان کا وہ مثالی اجتماع ہو گیا جس کی دوسری نظیر ملنا مشکل ہے، اس علمی و ثقافتی جامعیت کے سبب وہ ملکی

اور بین الاقوامی سطح کے علمی و دینی اداروں اور تحریکوں کے معزز رکن بنائے گئے، اور متعدد اداروں کی سربراہی بھی کی جن میں مجمع اللغۃ العربیہ (مصر و شام) دارالعلوم دیوبند، دارالمصنفین (اعظم گڑھ) رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) تحریک پیام انسانیت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لاء بورڈ مسلم مجلس مشاورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء بہت نمایاں ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

بہت سے فضائل و کمالات کے باوجود حضرت مولانا بنیادی طور پر اردو اور عربی کے ایک بلند پایہ صاحب طرز اہل قلم اور اپنے زمانہ کے عظیم مصنف و محقق تھے، جن کی عہد ساز تحریروں نے اسلامی لٹریچر کا ایک مستقل دبستان قائم کر دیا ہے وہ عصر حاضر کے ان چند عظیم اسلامی اہل قلم میں ہیں جن کی تحریروں نے مغربی ادب و ثقافت کے پیدا کردہ چیلنجوں اور فتنوں کا سدباب کیا ہے، اور مثبت طور پر اسلامی تعلیمات اور اسلامی ثقافت کی مؤثر اور طاقتور ترجمانی کی ہے، اسلامی دعوت کو عصر حاضر کے ذہن و فکر کی سطح سے روشناس کرایا ہے، اور اس کے امکانات کو روشن کیا ہے، اور دنیا کے سامنے اسلام کے تعمیری و تہذیبی، اخلاقی و انسانی کردار کی پرزور وکالت کی ہے اور تن تنہا ایک اکادمی اور مکتب فکر کا کارنامہ انجام دیا ہے، ان کے گوہر بار قلم سے بعض ایسی بلند پایہ کتابیں نکلی ہیں جنکی اسلامی لٹریچر اور علوم و فنون میں نظیر ملنا دشوار ہے اور جن کو بقائے دوام حاصل ہونے کی توقع ہے، ایسی کتابوں میں "سیرت سید احمد شہیدؒ"۔ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"۔ "تاریخ دعوت و عزیمت"۔ "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" "ارکان اربعہ"۔ "نبی رحمتؐ" وغیرہ بہت ممتاز ہیں، ان کے علاوہ آپ نے مدارس اسلامیہ کے لئے مفید و مؤثر اور معیاری نصاب تعلیم کے تحت بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں اپنا مؤثر کردار ادا کر رہی ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

حضرت مولاناؒ کے ان فضائل وکمالات کی جان ان کا اخلاص وللّٰہیت، تقویٰ وطہارت، خوفِ خدا وفکر آخرت، دینی غیرت وحمیت، ایمانی فہم وفراست، امانت ودیانت، احساسِ ذمہ داری، اور دین وملت سے وفاداری، دنیا سے استغنا وبے نیازی اور بے غرضی تھی حضرت مولاناؒ اپنے حسبِ حال کبھی کبھی اقبال کے یہ اشعار پڑھتے تو سامعین بھی متأثر ہوتے تھے اور اسکی تصدیق کرتے تھے ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں ؛ غلام طغرل وسنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن ؛ کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

جسکی وجہ سے نزد خدا وخلق انھیں وہ عزت ومقبولیت حاصل ہوئی جو انکے معاصر علماء میں کسی کو بھی حاصل نہ تھی اور انکی اخلاقی ومعنوی خوبیوں کے سبب انھیں عوام وخواص، ملک وبیرونِ ملک میں وہ وقار واعتبار حاصل ہوا کہ وہ ملت اسلامیہ کی متفق علیہ شخصیت بن گئے اور غیر مسلموں اور سرکاری حلقوں میں بھی انکا احترام ملحوظ رہتا تھا، اس مقبولیت ومرجعیت سے انھوں نے ذاتی فائدہ اٹھانے کے بجائے ملک وملت ہی کو فائدہ پہونچایا، انکی دلنواز شخصیت میں ریشم کی نرمی تھی، مگر دین وملت کیلئے کسی فتنے اور اندیشے کے وقت ان میں فولاد سے زیادہ سختی بھی ظاہر ہوتی تھی

؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ؛ رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

چنانچہ مسلم پرسنل لاء کی حفاظت وبقا کیلئے انھوں نے اپنے آہنی عزم وارادہ سے پورا کام لیا، پیام انسانیت کے فورم سے انھوں نے فسادات وبدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کی، اور پورے ملک میں اس کے اچھے اثرات پڑے، وندے ماترم کے زبردستی نفاذ کے خلاف انھوں نے جو نعرۂ حق بلند کیا وہ حکومت کے ایوانوں تک گونج اٹھا، حضرت مولاناؒ کی گوناگوں فضائل وکمالات سے آراستہ شخصیت کیلئے یہ نمبر رسمی اور روایتی نمبر نہیں، بلکہ ان کے نمایاں محاسن وکمالات کا مرقع ہے، جن میں ہم سب کیلئے عبرت وبصیرت اور پند وموعظت کا سامان ہے کہ آج کے مشکل ترین اور نازک حالات میں ہند وبیرونِ ہند

میں دعوت و فکر اسلامی، غلبۂ دین و اظہارِ حق اور اسلام و ملت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے حضرت مولانا کے طرزِ فکر و عمل سے وجدان و فیضان حاصل کر کے انھیں ایک روشن مستقبل سے ہمکنار کریں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (قٓ)

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

دارالعلوم الاسلامیہ (بستی) کے قیام میں حضرت مولانا کا ایماء اور انکی سرپرستی شامل رہی ہے اور اس کے ہر مرحلے پر اسے ان کا تعاون اور انکی دعائیں حاصل ہوتی رہی ہیں، دارالعلوم کے بانی و صدر والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم اور ان کے افرادِ خاندان سے حضرت مولاناؒ عزیزوں کا سا معاملہ اور بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔

دارالعلوم الاسلامیہ جب کبھی کسی آزمائش میں مبتلا ہوا تو حضرت مولانا اس کیلئے دعاگو ہوئے اور سرکاری و غیر سرکاری حلقوں تک اسکی تائید و سفارش فرمائی جو دارالعلوم اور اس کے کارکنان کیلئے تقویت و تسلی کا باعث ہوئی، دارالعلوم میں حضرت مولانا کی بار بار تشریف آوری ہوئی اور اس کے جلسوں کو اپنی آمد سے انہوں نے عزت بخشی اور اس کی ہر طرح سرپرستی فرمائی۔

حضرت مولانا دارالعلوم اور اس کے کارگزاروں کے محسن و مربی تھے، اسلئے مرتبہ شناسی کے ساتھ احسان شناسی کا بھی یہ تقاضا تھا کہ انکی عزیز یاد میں "فکر اسلامی" کا ایک شایانِ شان نمبر شائع کیا جائے، الحمدللہ کہ محسن شناسی کی توفیق کے نتیجے میں ہم یہ نمبر شائع کرنے کے لائق ہو سکے۔

ہم یہاں اپنے فاضل اہل علم و اہل قلم مقالہ نگاروں کے تعاون کے لئے بھی تہہ دل سے انکے شکر گزار ہیں۔

حضرت مولاناؒ کی شفقتوں اور عنایتوں کے پیش نظر ہم ان کی زندگی میں زبانِ حال
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

سے یہ کہتے رہے اور اب زبانِ قلم سے یہ عرض کرتے ہیں کہ خداوندِ کریم ان کے احسانات کا انھیں اجرِ جزیل عطا کرے ؎

أفادتكم النعماء منّي ثلاثة

يدي ولساني والضمير المحجّبا

سب سے بڑا سرمایہ

"انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے، وہ محبت کا سرمایہ ہے، وہ ایک آنسو ہے، جو انسان کی آنکھ سے کسی بیوہ کے سر کو ننگا، کسی غریب کے حوصلے کو ٹھنڈا، کسی مریض کی کراہ کو سن کر ٹپک پڑتا ہے ....

انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر محبت کا مادہ ہے اس کو حرکت دینے والی کوئی چیز مل جائے تو حرکت میں آجاتا ہے۔ پھر نہ مذہب کو دیکھتا ہے نہ ملت کو، نہ فرقے کو نہ علاقے کو۔ نہ وطن کو دیکھتا ہے، نہ ملک کو دیکھتا ہے۔ انسان انسان کا دل دیکھتا ہے، اس کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور وہ کھنچنے پر مجبور ہے اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے۔"

——— حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رح

(۱)

حیات و شخصیت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ماہ و سال کے آئینہ میں

جعفر مسعود حسنی ندوی

۵/دسمبر ۱۹۱۳ء ولادت ——— ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء

۵/دسمبر ۱۹۱۳ء ولادت

۱۹۲۳ء والد صاحب کی وفات ہوئی۔

☆ اردو، فارسی اور عربی تعلیم کا آغاز۔

۱۹۲۴ء ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے ساتھ کانپور کا سفر۔

۱۹۲۶ء ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا ظفر علی خاں، اور حکیم اجمل خاں سے ملاقات۔

۱۹۲۷ء لکھنؤ یونیورسٹی میں فاضل ادب میں داخلہ۔

۱۹۲۸ء شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۲۹ء فاضل ادب کے امتحان میں فرسٹ ڈیویژن فرسٹ آئے۔

☆ لاہور کا سفر کیا اور علامہ اقبالؔ اور حفیظؔ جالندھری سے تعارف حاصل ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا حیدر حسن خاںؔ صاحب سے حدیث شریف کی تعلیم کا آغاز کیا۔

☆ انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۳۰ء والدہ صاحبہ کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں چند روز میڈیکل کالج میں قیام رہا۔

☆ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد ہوئی۔

☆ مولانا داؤد غزنوی کے رسالہ "ہندستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم" کا عربی ترجمہ کر کے تصنیفی زندگی میں قدم رکھا۔

☆ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے ساتھ، اعظم گڑھ، مئو، اور مبارکپور کا سفر کیا۔

۱۹۳۱ء لاہور کا سفر۔

☆ مولانا احمد علی لاہوری کے درسِ قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کی۔

☆ مولانا احمد علی لاہوری کے شیخ خلیفہ غلام محمد بھاولپوری سے بیعت ہوئے۔

۱۹۳۲ء دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا حسین احمد مدنی کی خدمت میں حاضری دی اور درس حدیث میں شریک ہوئے۔

☆ "الضیا" نامی رسالہ کا اجراء ہوا، اور یہیں سے آپ کی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۳۳ء مفتی امین الحسینی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۳۴ء دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر وادب کے استاذ کی حیثیت سے ۴۰ روپیہ ماہوار پر تقرر ہوا۔

☆ شادی ہوئی۔

☆ تھانہ بھون میں حاضری اور مولانا اشرف علی تھانوی سے پہلی ملاقات۔

۱۹۳۵ء بمبئی میں ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دے کر اپنے دعوتی مشن کا آغاز کیا۔

۱۹۳۶ء علیگڑھ مسلم ایجوکیشن کی جبلی میں شرکت کی۔

☆ ٹونک کا سفر کیا اور نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی۔

۱۹۳۷ء علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات ہوئی۔

۱۹۳۸ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے B.A. کلاس کیلئے دینیات کی کتاب تیار کی۔

۱۹۳۹ء مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے پہلی ملاقات ہوئی۔

☆ سیرت سید احمد شہید طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

☆ ہندوستان کے دینی مراکز کا دورہ کیا۔

☆ مولانا عبدالقادر رائے پوری سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا۔

☆ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی خدمت میں پہلی حاضری۔

۱۹۴۰ء "الندوہ" نامی رسالہ سہ بارہ جاری ہوا، اور مولانا عبدالسلام قدوائی کیساتھ اس کی ادارت کی ذمہداری سنبھالی۔

☆ مختارات کی تالیف کا کام مکمل ہوا۔

☆ مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے دوسری ملاقات اور تبلیغی کام کا آغاز۔

۱۹۴۱ء مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی آپ کی دعوت پر ندوہ تشریف لائے۔

☆ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔

۱۹۴۲ء جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا۔

☆ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ علی گڑھ کا سفر کیا۔

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں "مذہب وتمدن" کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب کی موجودگی میں مقالہ پڑھا۔

☆ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ایما پر ندوۃ العلماء سے تنخواہ لینا بند کردی۔

۱۹۴۳ء جماعت اسلامی سے کنارہ کشی اختیار کی۔

☆ مرکز تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت درس قرآن کے حلقوں کا سلسلہ شروع کیا۔

☆ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اصرار پر دوبارہ تنخواہ لینا شروع کیا۔

۱۹۴۴ء پشاور میں سیرت کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۴۵ء دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ملازمت سے تعلق ختم کرلیا۔

۱۹۴۶ء لاہور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی لاہوری سے خلافت ملی۔

★ مولانا عبدالقادرؒ رائے پوری سے اصلاحی تعلق قائم ہوا۔

★ بھاگلپور میں فوجی ٹرک پر فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا اور سروے کر کے شہداء کی رپورٹ تیار کی۔

۱۹۴۷ء والدہ صاحبہ، ہمشیرہ صاحبہ اور بھانجے سید محمد ثانی حسنی کے ساتھ پہلا حج کیا۔

★ شاہ سعود کو خط لکھا جو بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔

★ جواہر لال نہرو کی دعوت پر منعقد ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی دیگر شرکاء میں سروجنی نائیڈو، محمد علی جناح۔

۱۹۴۸ء "تعمیر" نامی رسالہ کا اجرا ہوا اور اس کی ادارت سنبھالی۔

★ رکن مجلس انتظامی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔

★ مولانا عبدالقادر رائے پوری نے آپ کو خلافت عطا فرمائی۔

۱۹۴۹ء علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر نائب معتمد تعلیم بنائے گئے۔

★ ہندو اور مسلمانوں کے مخلوط اجتماعات سے خطاب کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۵۰ء دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے۔

★ دعوتی مقصد سے حج کا دوسرا سفر کیا، رفقاء مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا طاہر حسینی مولانا محمد رابع حسنی۔

★ خانہ کعبہ کے کلید بردار شیبی کی دعوت پر کعبہ کے اندر داخل ہونے کا پہلی بار شرف حاصل ہوا۔

★ سید قطب شہید سے مکہ مکرمہ میں پہلی ملاقات ہوئی۔

★ اپنے شیخ مولانا عبدالقادر رائے پوری کو لے کر دوبارہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۵۱ء مصر کا سفر کیا۔

★ قاہرہ یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔

★ شیخ حسن البنا کے والد عبدالرحمن سے ملاقات کی۔

★ سید قطب شہید کے مکان پر آپ کی موجودگی میں آپ کی مشہور کتاب "ماذا خسر العالم" پر علمی مذاکرہ ہوا۔

★ اخوانی رہنما شیخ محمد الغزالی کے ساتھ مصر کے قصبات اور دیہات کا دورہ کیا۔

★ اُردن گئے۔

★ بیت المقدس میں رمضان کا آخری عشرہ گذرا، اور عید کی نماز ادا کی۔

★ شریف حسین کی قیام گاہ پر ان کی عیادت کی۔

★ اُردن کے حکمراں شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملاقات کی اور بیت المقدس کی بازیابی کے سلسلہ میں گفتگو کی۔

★ شام گئے۔

★ دمشق یونیورسٹی میں "مسئلہ فلسطین کے بارے

میں علم و تاریخ کی شہادت" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔
۱۹۵۲ء ہندوستان میں فرقہ وارانہ صورتحال کو بگڑتے دیکھ کر ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔
۱۹۵۳ء لکھنؤ میں تبلیغی مرکز قائم کیا۔
۱۹۵۴ء دارالعلوم دیوبند میں طلبہ سے پہلی بار خطاب کیا۔
★ لاہور تشریف لے گئے اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کی صحبت میں رمضان گذارا۔
★ فتح پور جاکر شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں پہلی حاضری دی۔
۱۹۵۵ء آپ کی شاہکار تصنیف "تاریخ دعوت وعزیمت مطبوعہ شکل میں سامنے آئی۔
۱۹۵۶ء دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے شام تشریف لے گئے اور آٹھ لکچرس دیئے۔
★ شامی ریڈیو اسٹیشن سے دو تقریریں نشر ہوئیں۔
★ دمشق میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ صدارت سابق وزیر اعظم انڈونیشیا نے کی اور نائب صدر آپ منتخب ہوئے۔
★ شام کے صدر شکری القوتلی اور پارلیمنٹ کے اسپیکر ناظم القدسی سے ملاقات کی۔
★ دمشق کی علمی اکیڈمی کے ممبر منتخب ہوئے۔
★ شامی پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کی۔
★ سابق وزیر اعظم سے ملاقات ہوئی۔
★ سوڈان اور لبنان کا سفر کیا اور دعوتی و اصلاحی اور دینی تحریکوں کے قائدین سے ملاقات کی۔
★ ترکی کا سفر کیا، کمال اتاترک کی اسلام مخالف پالیسیوں کا مشاہدہ کیا، اور ہندوستان واپس آکر اس کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔
★ عراق کا سفر کیا۔ اور دعوتی و اصلاحی تحریکی رہنماؤں سے ملاقات کی، اور عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔ ۱۹۵۷ء موتیابند کی شکایت اور لکھنے سے معذوری۔
۱۹۵۸ء مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ایما پر "قادیانیت" نامی کتاب لکھی۔ ۱۹۵۹ء دمشق سے نکلنے والے عربی رسالہ "المسلمون" کا اداریہ لکھنے کی فرمائش کی گئی چنانچہ کئی ماہ تک مسلسل اس کے اداریے آپ ہی کے قلم سے نکلے۔
★ لکھنؤ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی۔
۱۹۶۰ء دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں بنیادی حصہ لیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔
★ نقرس Gout کی تکلیف رہنے لگی۔ ★ ندوہ کے تعارف کیلئے برما کا سفر کیا۔
۱۹۶۱ء ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کی وفات ہوئی۔
★ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔
۱۹۶۲ء علیگڑھ میں موتیابند کا آپریشن ہوا۔
★ سعودی عرب کا سفر۔

★ مدینہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے مشاورتی بورڈ کے بنیادی رکن نامزد ہوئے۔

★ شاہ سعود اور لیبیا کے فرمانروا ادریس سنوسی سے ملاقات کی۔

★ رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس میں حصہ لیا اور اس کے رکن نامزد ہوئے۔

★ مدینہ یونیورسٹی میں منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین کے عنوان سے کئی لیکچرس دیئے۔

★ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے رکن نامزد ہوئے۔

★ حج کے مبارک موقع پر حرم شریف میں مصلی شافعی کے اوپر بنذنہ سے حجاج کرام کو خطاب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

★ شاہ فیصل سے دوسری ملاقات ہوئی۔

★ یورپ کا سفر ہوا۔

★ اڈمبرا یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی کے یونین ہال، اور لندن یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں تقریریں ہوئیں۔

★ B.B.C سے دو عربی تقریریں نشر کی گئیں۔

★ سوڈانی رہنما حسن ترابی (جو اس وقت طالب علم تھے) سے ملاقات۔

★ اسپین کا سفر کیا۔

۱۹۶۴ء یورپ کا دوسرا سفر ہوا۔

★ جرمنی میں برلن یونیورسٹی آف انجینئرنگ میں جرمن قوم سے خطاب کیا جرمن زبان میں آپ کی تقریر کا ترجمہ کیا گیا۔

★ جمشید پور اور راور کیلا کے فسادات کے بعد جے پرکاش نرائن سے دہلی میں اور ونوبا بھاوے سے ناگپور جاکر ملاقات کی، اور ان سے اس موقعہ پر سامنے آنے کی اپیل کی۔

★ بمبئی میں بائیں آنکھ کا آپریشن ہوا جو ناکام رہا۔

★ مسلم مجلس مشاورت کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔

★ شاہ فیصل سے تیسری ملاقات ہوئی اور اسلامی ملکوں کے حالات پر گفتگو ہوئی۔

۱۹۶۵ء مسلم مجلس مشاورت کی مہم کے دوران آپریشن زدہ آنکھ پر ہمرج کا اور پھر اسی آنکھ میں سنیل بانی کا سخت حملہ ہوا۔

۱۹۶۶ء مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے خلاف آواز اٹھانے پر حکومت ہند نے آپ کا پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیا۔

★ امام حسن البنا شہید کی خود نوشت سوانح پر سعید رمضان بوطی (حسن البنا شہید کے داماد) کی خواہش پر مقدمہ لکھا۔

۱۹۶۷ء حجاز کا سفر کیا اور طائف میں کار کا حادثہ ایسا سخت پیش آیا جس میں آپکا بچنا کسی معجزہ سے کم نہ تھا۔

۱۹۶۸ء سعودی وزیر تعلیم کی دعوت پر ریاض یونیورسٹی میں تعلیم کے موضوع پر لکچر دیا۔

☆ والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔

☆ کویت میں عرب ممالک کے وزرائے تعلیم کی میٹنگ کیلئے ایک مقالہ تحریر فرمایا۔

۱۹۶۹ء تبلیغی مرکز سے منتقل ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام رہنے لگا۔

☆ یورپ کا تیسرا سفر کیا۔

☆ برمنگھم یونیورسٹی اور لیڈس یونیورسٹی میں خطاب کیا۔

☆ صحت کی خرابی کے باعث دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفیٰ دینا چاہا جو منظور نہ ہوا۔

۱۹۷۰ء تکیہ (آبائی گاؤں) میں سیلاب آنے کی وجہ سے شہر میں عارضی قیام فرمایا۔

۱۹۷۱ء سیتاپور میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا۔

۱۹۷۲ء ترمیمی ایکٹ کے خلاف دہلی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کنونشن کا افتتاح کیا۔

۱۹۷۳ء رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان ایران، لبنان، شام اور عراق کا دورہ کیا۔

☆ طہران میں آیۃ اللہ العظمیٰ مرزا محمد خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ جلسہ میں ایرانی دانشوروں سے خطاب کیا۔

☆ لبنان کے وزیر اعظم تقی الدین الصلح سابق وزیر اعظم صائب سلام، وزراء اور ممبران پارلیمنٹ سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔

☆ اردن کے بادشاہ شاہ حسین سے ملاقات ہوئی۔

☆ سعودی عرب کے فوجی سینٹر کا معائنہ کیا اور فوجیوں سے خطاب کیا۔

۱۹۷۴ء تحریک پیام انسانیت کا آغاز کیا۔

☆ شارجہ کے حاکم سلطان محمد القاسمی کی دعوت پر عرب امارات کا دورہ کیا۔

۱۹۷۵ء دارالعلوم کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد کیا۔

۱۹۷۶ء ہمشیرہ محترمہ لمۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا انتقال ہوا۔

☆ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد دہلی میں وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور نس بندی کے سلسلہ میں پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ اسلامی موقف کی وکالت کی

☆ راشٹرپتی بھون دہلی میں مورٹیانیا کے صدر مختار ولد داد صاحب سے ملاقات ہوئی۔

☆ Isalamic universities federate کے جلسہ میں شرکت کے لئے مراکش کا سفر کیا۔

☆ مراکش کے بادشاہ شاہ حسن سے ملاقات کی۔

☆ شاہ خالد سے ملاقات۔

۱۹۷۷ء مسز اندرا گاندھی آپ سے ملنے کے لئے آپ کے گاؤں تکیہ آئیں۔

☆ سابق وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر اور حالیہ وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری باجپئی آپ سے ملنے کیلئے ندوہ آئے۔

☆ امریکہ کی مشہور مسلم تنظیم M.S.A. کے

سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امریکہ کا سفر کیا۔

★ امریکہ کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں کو لمبیا یونیورسٹی (نیویارک) ہارورڈ یونیورسٹی (کیمبرج) ڈٹرائٹ یونیورسٹی (آن آربر) کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس انجلس) اور اوٹا یونیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) میں لکچر دیئے۔

★ فلاڈیلفیا (امریکہ) میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا اور آنکھ کی معذوری جاتی رہی۔

★ عظیم باکسر محمد علی کلے نے آپ سے ملاقات کی۔

۱۹۷۸ء پاکستان تشریف لے گئے "ایشائی کانفرنس میں شرکت کی کانفرنس کی صدارت جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان نے کی، اور نائب صدر حضرت مولانا منتخب ہوئے۔

★ ایوان صدر میں جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان سے ملاقات۔

★ اسلامی نظریاتی کونسل نے آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔

★ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید کی دعوت پر پاکستانی دانشوروں کو خطاب کیا۔

★ سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس انوار الحق نے آپ سے ملاقات کی۔

★ کراچی یونیورسٹی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) زرعی یونیورسٹی (فیصل آباد) پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں تقاریر ہوئیں۔

★ جسٹس مشتاق چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ (جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا فیصلہ دیا تھا) کی دعوت پر بار ایسوسی ایشن میں وکلاء جج صاحبان سے خطاب کیا۔

★ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی۔

★ مشہور امریکن نومسلمہ مریم جمیلہ سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۷۹ء عرب ممالک کے وزرائے اوقاف کی میٹنگ میں رابطہ عالم اسلامی کی نمائندگی کی۔

★ سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے قطر گئے۔

★ قطر کے ولیعہد و وزیر دفاع سے ملاقات ہوئی۔

۱۹۸۰ء شارجہ کے حکمراں سلطان بن محمد القاسمی آپ سے ملنے کیلئے لکھنؤ تشریف لائے۔

★ عراق کے صدر صدام حسین کے خصوصی ایلچی کی ندوہ آمد، اور آپ کو صدر صدام حسین کی طرف سے عراق کا دورہ کرنے اور ان کی زیر صدارت منعقد ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت۔

★ اُردن کی علمی اکیڈمی کے رکن منتخب ہوئے۔

★ فیصل ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم آپ نے افغان پناہ گزینوں، جماعت تحفیظ القرآن اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کیلئے مختص فرمادی۔

★ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر وہ تاریخی تقریر فرمائی جس کی گونج آج بھی اسی طرح

سنائی دے رہی ہے۔

۱۹۸۱ء کشمیر یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔

۱۹۸۲ء مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۸۳ء اردن کے ولی عہد امیر حسن سے ملاقات ہوئی۔

☆ دبئی کا سفر۔

☆ امارات یونیورسٹی کے گرلس کالج اور العین یونیورسٹی میں محاضرہ دیا۔

☆ کویت کا سفر۔

☆ کویت یونیورسٹی کے سائنس کالج اور جمعیت الاصلاح میں تقریر کی۔

☆ لندن کا سفر اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کا افتتاح اور اس کی صدارت۔

۱۹۸۴ء سعودی عرب کا سفر اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے۔

☆ ایرانی رہنما آیۃ اللہ خمینی سے ملاقات ہوئی۔

☆ بنگلہ دیش کا سفر۔

☆ اسلامک فاؤنڈیشن اور ڈھاکہ کی مرکزی مسجد بیت المکرم میں خطاب کیا اور بنگالی ادیبوں اور صحافیوں کے سامنے تقریر کی۔

☆ اردن اور یمن کا سفر کیا۔

☆ صنعاء یونیورسٹی اور یرموک یونیورسٹی میں تقریر کی۔

☆ یمن کے صدر علی عبداللہ صالح سے ملاقات ہوئی۔

☆ یمن کے وزیر اعظم عبدالعزیز عبدالغنی سے ملاقات۔

☆ یمن کے ایئر فورس اور نیک ڈیویژن سے خطاب کیا۔

☆ پاکستان کا سفر۔

☆ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کراچی آکر آپ سے ملاقات کی اور آپ نے ان کو مسجد اقصیٰ کا مرمری ڈھانچہ پیش کیا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت ایک صاحب ایمان صدر کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

☆ سیرت النبی کی ساتویں جلد پر آپ کے مقدمہ پر حکومت پاکستان نے ایک لاکھ روپے کا انعام دیا، انعام کی یہ رقم آپ نے نصف دارالمصنفین اعظم گڑھ اور نصف علامہ سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ کو دے دی۔

۱۹۸۵ء آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کو قانونی شکل حاصل ہوئی

برک ویلز اور لکسم برگ کا سفر۔

☆ لکسم برگ میں واقع ادارہ تحقیقات اسلام کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت اور اس کی صدارت کی۔

۱۹۸۶ء ترکی اور پاکستان کا سفر ہوا۔

☆ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات ہوئی۔

★ سعودی عرب کا سفر اور جدہ میں آپ کے اعزاز میں کئے گئے جلسہ میں شرکت۔

★ الجزائر کا سفر اور ملتقی الفکر الاسلامی میں شرکت۔

★ دہلی، ناگپور، اور پونہ میں ڈاکٹر کا انعقاد اور ہندو دانشوروں کے سامنے آپ کی تقاریر ہوئیں۔

★ آپ کی حکیمانہ اور مخلصانہ قیادت میں مخلصانہ قیادت میں مسلم خواتین مطلقہ بل پالیامنٹ میں پاس ہوا۔

۱۹۸۷ء ملیشیا کا سفر کیا۔

★ قومی یونیورسٹی، ٹیکنالوجی یونیورسٹی، ملیشین یونیورسٹی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں خطاب کیا۔

★ لندن کا سفر اور سینٹ کراس کالج میں عبدالعزیز المطوع لیکچرز سیریز کا افتتاح کیا۔

★ سعودی عرب کا سفر اور رابطہ عالم اسلامی کی سلور جبلی میں شرکت۔

۱۹۸۸ء عرب امارات کا سفر۔

★ شارجہ کے حاکم شیخ سلطان محمد القاسمی سے ملاقات، ابو ظبی، دبئی اور شارجہ میں محاضرات ہوئے۔

۱۹۸۹ء انگلستان اور ترکی کا سفر۔

★ سابق وزیر اعظم ترکی نجم الدین اربکان سے ملاقات۔

۱۹۹۰ء سعودی عرب کا سفر۔

☆ ولی عہد سلطنت امیر عبداللہ بن عبدالعزیز ریاض کے گورنر امیر سلمان بن عبدالعزیز سعودی عرب کے وزیر دفاع امیر سلطان سے ملاقاتیں ہوئیں۔

★ بابری مسجد ورام جنم بھومی کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے سابق گورنر بہار یونس سلیم صاحب اور سابق گورنر آندھرا پردیش شری کرشن کانت (جو اس وقت ہندوستان کے نائب صدر ہیں) کے ساتھ کانچی پورم کے دو شنکر اچاریہ۔ شری یرم اچاریہ دوسرے شری وجیندر اچاریہ سے مدراس جاکر ان کے منھ میں گفتگو کی۔

★ وزیر اعظم ہند شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے ملاقات۔

۱۹۹۱ء عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو آپ نے عوامی جذبات کی پرواہ کئے بغیر اس قبضہ کو غیر اخلاقی، غیر شرعی اور غیر عقلی قرار دیتے ہوئے کھل کر اس کی مذمت فرمائی۔

★ سعودی عرب کا سفر۔ اور رابطۂ عالم اسلامی کے خصوصی اجلاس میں شرکت۔

☆ افغانستان کے سابق وزیر اعظم عبدرب الرسول سیاف سے ملاقات ہوئی۔

☆ شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر معروف الدوالیبی سے ملاقات ہوئی۔

☆ ترکی کے سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان سے ملاقات ہوئی۔

☆ بابری مسجد کے مسئلہ پر ہندو مذہبی پیشواؤں

سے گفتگو اور وزیر اعظم سے ملاقات پیام انسانیت کا جلسہ اور ممتاز ہندو دانشوروں کی شرکت۔

☆ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد بن عبدالعزیز کو خط لکھ کر سعودی معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے پر زور دیا۔

☆ اردو اکیڈمی یوپی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کا اعلان کیا گیا۔ ایوارڈ کی رقم آپ نے مولانا پر تحقیقی کام کرنے والوں کیلئے مختص فرمادی۔

۱۹۹۲ء حکومت ہند کا ایک اعزاز پدم بھوشن قبول کرنے سے معذرت کی۔

☆ انگلستان کا سفر۔

☆ اسلامک فاؤنڈیشن مارک فیلڈ (لیسسٹر شائر) اسلامک سینٹر ریجنٹ پارک لندن میں خطاب کیا۔

☆ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کے جلسہ انتظامی میں شرکت۔

☆ سنٹر اور ازبکستان کی حکومت کے مابین امام بخاری کی یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں ایک معاہدہ کیا۔

۱۹۹۳ آکسفورڈ میں اسلام کے تاریخی و ثقافتی اٹلس کے منصوبہ کو آخری شکل دی۔

☆ شکاگو (امریکہ) میں دنیا کے تمام مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شرکت کی۔

☆ ازبکستان، تاشقند اور بخارا کا سفر کیا۔

☆ امام بخاری کے نام سے موسوم ایک علمی مرکز کا افتتاح کیا۔

۱۹۹۴ء سرسید ہاؤس (علی گڑھ) میں یونیورسٹی کے اساتذہ سے خطاب کیا۔

☆ لندن کا سفر کیا۔

☆ آکسفورڈ میں واقع بروکس یونیورسٹی میں تقریر کی۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء پر سی۔ بی۔ آئی نے چھاپہ ڈالا۔

☆ زخمی طلبہ کے لئے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے کا اعلان اور آپ کا انکار۔

۱۹۹۵ء آپ کی سرپرستی میں تحفظ مدارس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔

☆ قطر کا سفر۔

☆ دوحہ یونیورسٹی میں تقریر۔ عرب خواتین کے پروگرام میں شرکت اور ان سے خطاب۔

۱۹۹۶ء سابق وزیر اعظم دیوگوڑا کی آپ سے ملاقات کے لئے ندوۃ آمد اور بی۔ جے۔ پی کا اس پر اعتراض۔

☆ ترکی میں آپ کے اعزاز میں ایک سیمینار کا انعقاد اور اس میں آپ کی شرکت۔

☆ کلید کعبہ پیش کی گئی اور در کعبہ کھولنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۹۹۷ء رابطۂ ادب اسلامی کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر۔

☆ صدر پاکستان فاروق احمد لغاری کی کانفرنس

میں شرکت اور آپ سے ملاقات۔

★ قادیانیت کے موضوع پر ندوہ میں ایک عالمی سمینار۔

★ نئی تعلیمی پالیسی کے خلاف آپ کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ۔

۱۹۹۸ء دبئی حکومت کی طرف سے عالم اسلام کی ممتاز شخصیت کا ایوارڈ ملا، ایوارڈ کی رقم (ایک کروڑ بیس لاکھ) دینی مدارس اور تعلیمی مراکز میں تقسیم کردی گئی۔

★ وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے اپنے لاہور کے بس سفر میں آپ سے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے اس سفر سے معذرت کی۔

★ سرکاری اسکولوں میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا لازمی قرار دیئے جانے پر آپ کا سخت رد عمل۔

★ رائے بریلی میں آپکے مہمان خانہ پر رات میں پولیس کا چھاپہ اور خانہ تلاشی۔ جس پر پورے ملک مین زبردست احتجاج کیا گیا۔ اور عرب دنیا نے سخت رد عمل ظاہر کیا۔

★ آپ کے سخت رویے کو دیکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ سرسوتی وندنا کے احکامات منسوخ کردیئے گئے بلکہ وزیر تعلیم کو بھی برطرف کردیا گیا۔

★ بنگلور میں میڈیا سینٹر کا افتتاح کیا۔

★ اردن کا سفر۔

★ امیر حسن سے ملاقات۔

★ شاہی محل میں آپ کے اعزاز میں دعوت اور وزرا اور حکومت کے اعلیٰ ذمہ داری سے آپ کا خطاب۔

۱۹۹۹ء علالت

★ سعودی سفیر کی عیادت کے لئے ندوہ آمد۔

★ وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ عیادت کیلئے ندوہ آئے۔

★ ندوۃ العلماء میں ملکی سطح پر منعقد ہونیوالے تبلیغی اجتماع سے خطاب۔

★ سلطان بروناٹی الحاج حسن البلقیہ کے نام سے بروناٹی حکومت نے ایوارڈ دیا۔

★ ۳۰ر دسمبر ہندوستانی جہاز کے اغواکاروں سے مسافروں کی رہائی کی اپیل کی۔

★ ۳۱ر دسمبر مطابق ۲۲ر رمضان جمعہ کی نماز سے پہلے داعئ اجل کو لبیک کہا۔

★★★

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق و عادات

اسوۂ نبوی کے آئینہ میں

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی ـــــ صدر شعبۂ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پوری انسانیت میں کمالِ اخلاق کے حقیقی تاجدار جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے ہیں، جنھیں خود خالق نے "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" کی سندِ امتیاز عطا فرمائی اور قیامت تک باقی رہنے والی کتاب قرآن کریم میں اس کا اعلان فرما کر تمام انسانوں کو نہ صرف ان کے اس کمال سے باخبر کیا، بلکہ ان کی اتباع کر کے باکمال بننے کا ہر ایک کو راستہ بھی دکھا دیا، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" چنانچہ جن خوش نصیبوں نے جتنا اتباع کیا اتنا ہی اس وصف میں حصہ دار بن کے کمال نسبی حاصل کیا، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو جتنا متبع سنّت ہے اتنا ہی وہ با اخلاق و باکمال ہے، اس معیار سے بھی جب ہم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو جانچتے ہیں تو انھیں فائق الاقران پاتے ہیں۔

سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں کا ایک بہت ہی جامع اور قدیم آئینہ ہمارے سامنے مشہور محدث (اور صحاح ستہ میں سے ایک صحیح کے مصنف) امام ابو عیسیٰ ترمذی (ت ۲۷۹ھ) کا تیار کردہ "شمائل" کے نام سے صدیوں سے موجود و متداول ہے، زیادہ تر اسی کے کچھ اقتباس پیش کر کے

اسی آئینہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق و عادات کو دیکھنے کی ایک کوشش آئندہ سطروں میں کی جارہی ہے، کتاب مذکور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار اوصاف حسنہ میں سے ایک راوی نے چند یہ اوصاف بھی بتلائے ہیں :-

"أجود الناس صدرًا واصدق الناس لهجةً والينهم عريكةً وأكرمهم عشيرةً من رآه بديهةً هابه ومن خالطه معرفةً احبّه"۔

اس کا ترجمہ شیخ وقت، محدث العصر و برکۃ الزمان شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ نے (خصائل نبویؐ) میں یوں کیا ہے :-

"آپؐ سب سے زیادہ سخی دل والے تھے، سب سے زیادہ سچی زبان والے، سب سے زیادہ نرم طبیعت والے تھے اور سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے ..... آپ کو جو شخص یکایک دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا ..... البتہ جو شخص پہچان کر میل جول کرتا تھا وہ آپ کے اخلاق کریمہ و اوصاف جمیلہ کا گھائل ہو کر آپ کو محبوب بنا لیتا تھا"۔

جب ہم نبیؐ کے اس آئینہ میں امتی (حضرت مولانا) کا چہرہ دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اتباع کامل نے امتی کو نبی کا پرتو بنا دیا تھا، حضرت مولانا کی سخاوت تو ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکی ہے، اپنے پرائے سب اس کے قائل ہیں، کون واقف نہیں جانتا کہ حالیہ چند برسوں میں جب ان پر مادی دولت کی بارش ہوئی (مختلف ایوارڈوں کی شکل میں) تو انہوں نے اسے لٹا کر ہی دم لیا وہ خواہ فیصل ایوارڈ کی صورت میں ملنے والی لاکھوں کی رقم ہو یا ابوظبی سے ملنے والا ایک کروڑ روپئے سے زیادہ کا انعام یا برونائی سے حاصل ہونے والے بیس لاکھ روپیہ سے زیادہ سب سے دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہو گئے، جس طرح ان کے اور ہر مسلمان کے حقیقی مقتدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو جاتے تھے، (حوالوں اور تفصیل کیلئے دیکھئے راقم کا مقالہ، حضرت مولاناؒ پر شائع شدہ "نئی دنیا" خصوصی شمارہ اور "تعمیر حیات" شمارہ ۲۵ جنوری ۸۲ء) اور جس طرح ہادیٔ برحق کی یہ صفت (جود و سخا) ماہِ مبارک میں نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی (اجود من الریح المرسلۃ

تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی ۔ بخاری) اسی طرح ان کے اس پیرو کا بھی کم و بیش یہی حال ہوتا کہ اسکے دستر خوان پر روزانہ سینکڑوں، بلکہ اخیر دور میں تو بعض دن ایک ایک ہزار اور شاید اس سے بھی زیادہ لوگ ــــ روزہ افطار کرتے، سیر ہو کر کھاتے اور سحری تناول کرتے، یہ تو موجودین کیساتھ برتاؤ تھا اور جو حاضر نہ ہو سکتے ان میں نہ جانے کتنے (جن کی تعداد بھی سینکڑوں سے کم نہ ہوگی) نقد کی شکل میں حصہ پاتے، راقم نے ایک مرتبہ خود حضرت مولانا کے پاس ایک رمضان میں منی آرڈر فارموں کی ایک بڑی تعداد پُر رکھی دیکھی، ظاہر ہے کہ ان کے ذریعہ غائبین کو حصے پہنچائے جارہے تھے، ایسا ہی حال کم و بیش دوسرے وصف (سچائی) میں بھی تھا، اور تیسرے وصف (نرم طبیعت) میں تو ان کا ــــ اس عصر میں ــــ شاید ہی کوئی ہم پلہ ہو، ان کی طبیعت کی نرمی کا یہ حال، سارے واقف جانتے ہیں کہ ان کے یہاں سفارش کرانے والوں کا بالخصوص عرب ممالک سے متعلق امور میں تانتا لگا رہتا تھا اور وہ کسی کو بھی مایوس نہ کرتے، حتی کہ ایسے افراد بھی جنھیں حضرت مولانا ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے پسند نہ کرتے وہ بھی ناکام نہیں لوٹتے، بلکہ بار بار کے تلخ تجربوں کے باوجود در پر کسی آنے والے کو نامراد واپس نہ کرتے۔

چوتھے وصف (سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے) میں ان کا امتیاز سب کو معلوم ہے (اگرچہ یہ اختیاری وصف نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انھیں یہ وصف بھی عطا کیا تھا) کہ وہ براہ راست سلالۂ نبوی میں سے تھے، اور ان کے آباد و اجداد نے اس شرف (نسب) کی پوری حفاظت کی تھی، ان سے ملنے پر اچانک مرعوبیت طاری ہو جانا ہر نئے آنے والے کا تجربہ ہے، لیکن میل جول رکھنے اور کثرت سے آمد و رفت میں ہی نہیں، ایک نشست میں وہ تعلق انکی محبت میں تبدیل ہو جاتا۔

اسی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اور اوصافِ حسنہ دوسرے راوی کے حوالہ سے یہ بتائے گئے ہیں:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخزن لسانہٗ إلا فیما یعنیہ ویؤلفھم ولا ینفرھم

ویکرم کریم کل قوم .... ویحذر الناس ویحترس منهم من غیر ان یطوی علی أحد بشره ولا خلقه، ویتفقد اصحابه ویسأل الناس عما فی الناس ویحسن الحسن ویقویه ویقبح القبح ویوهیه، معتدل الأمر غیر مختلف ..... ومن سأله حاجة لم یرده إلا بها او بمیسور من القول، قد وسع الناس بسطه وخلقه فصار أبا لهم ..... مجلسه مجلس علم وحلم وحیاء وصبر وأمانة لا ترفع فیه الاصوات ولا تؤبن فیه الحرم ولا تنثی فلتاته" الخ -

(ایک آدھ لفظ کے تغیر کے ساتھ) اسکا ترجمہ بھی حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے قلم سے ہی پیش کیا جارہا ہے :-

" ضروری امور (ضروری باتوں) کے علاوہ اپنی زبان کو محفوظ رکھتے، فضول تذکروں میں وقت ضائع نہیں فرماتے تھے، آنے والوں کی تالیف قلوب فرماتے، انکو مانوس فرماتے، متوحش نہیں بناتے تھے، (یعنی تنبیہ وغیرہ میں ایسا طرز اختیار نہ فرماتے جس سے ان کو حاضری میں وحشت ہونے لگے یا ایسے امور ارشاد نہ فرماتے تھے جن کی وجہ سے دین سے نفرت ہونے لگے) ہر قوم کے کریم اور معزز کا (خاص) اعزاز واکرام فرماتے، لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے (یا مضر امور سے بچنے کی تاکید فرماتے) ..... اور خود اپنی بھی، لوگوں کے تکلیف پہونچانے یا نقصان پہونچانے سے حفاظت فرماتے لیکن باوجود خود احتیاط رکھنے اور احتیاط کی تاکید کے کسی سے اپنی خندہ پیشانی اور خوش خلقی کو نہیں ہٹاتے تھے (یعنی ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے) دوستوں کی خبر گیری فرماتے، لوگوں کے حالات، آپسی معاملات کی تحقیق فرماکر ان کی اصلاح فرماتے، اچھی بات کی تحسین فرماکر اس کی تقویت فرماتے اور بری بات کی برائی بتاکر اس کو زائل فرماتے اور روک دیتے ..... ہر امر میں اعتدال اور میانہ روی اختیار فرماتے، جو آپ سے کوئی چیز مانگتا آپ اس کو مرحمت فرمادیتے،

(اگر نہ ہوتی) تو نرمی سے جواب دیتے، آپ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی تمام لوگوں کیلئے عام تھی، آپ تمام لوگوں کے حق میں باپ کی طرح شفیق تھے ..... آپ کی مجلس علم وحیاء اور صبر وامانت کی مجلس ہوتی تھی، نہ اس میں شور وشغب ہوتا تھا نہ کسی کی عزت وآبرو اتاری جاتی تھی، اس مجلس میں اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تھی تو اس کو شہرت نہیں دی جاتی تھی۔

جن لوگوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو برابر دیکھا اور برتا ہے، نیز ان کی مجلسوں اور صحبتوں سے طویل مدت تک فیض اٹھایا ہے (جنھیں براہ راست اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ مذکورہ کا علم نہیں) بعید نہیں! وہ ان سطروں کو پڑھ کر انہیں ـــ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ـــ اس امتی ہی کی صفات سمجھ بیٹھیں، کیونکہ آقا کے طرز وانداز کی اتباع ونقل میں ان کے اس شیدائی وفدائی نے اپنے آپ کو ایسا ڈھال لیا تھا کہ گویا وہ "نقل مطابق اصل" کا مصداق بن گیا تھا، اس اجمال کی تفصیل کرنے کی ـــ واقفین کیلئے ـــ تو کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ جنھوں نے آں مخدوم کو قریب سے نہیں دیکھا ہے اور نہ برتا ہے ان کیلئے کچھ وضاحت بے محل نہ ہوگی۔

حضرت مولانا کی مجلسوں کا خاص امتیاز بھی یہی تھا کہ لایعنی اور فضول باتیں نہ فرماتے، کسی کی غیبت اور عیب جوئی نہ کرتے، بلکہ اگر کوئی مولانا کے مزاج سے ناواقف، دوسروں کی مجلسوں کا عادی، کبھی کسی کی برائی ـــ خواہ مولانا کے کسی شدید مخالف کی برائی ـــ کا ذکر چھیڑنا چاہتا، ـــ مولانا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ـــ تو موصوف اول وہلہ میں ہی اس کی بات کاٹنے کیلئے موضوع سخن اس طرح بدل دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا، آنے والوں ـــ جن میں ہر طبقہ ہر خیال، ہر مذہب اور ہر فکر کے لوگ ہوتے اور بکثرت آتے رہتے ان سب ـــ کی دلداری اور تالیف قلوب اس طور پر کرتے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی، زبان وقلم اس کے بیان سے عاجز ہی لگتے ہیں۔

ہر قوم کے کریم (معزز و ممتاز) افراد کی توقیر کا یہ انداز تھا کہ ــ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر ــ شیعہ، بوہرہ، بریلوی اور اہل حدیث وغیرہ ہی نہیں، غیر مسلموں کے ممتاز افراد سے بھی اس طرح کا برتاؤ کرتے کہ وہ سب ان کے اخلاق کریمانہ کے اسیر بن کر اور پھر ملنے کی تمنا لیکر جاتے۔ بایں ہمہ موصوف کسی بھی غلط فکر سے متاثر ہونا تو کجا، ہر کج فکر کو سیدھی راہ دکھانے کی فکر کرتے، مگر اس انداز سے کہ اس پر گراں گذرنے کے بجائے اسمیں ممنونیت کا جذبہ پیدا کر دیتے، دوستوں، عزیزوں اور اہل تعلق کی خبر گیری کا تو یہ حال تھا کہ اگر ذرا پتہ چل جائے کہ فلاں..... عزیز یا فلاں..... صاحب تعلق کو کسی قسم کی پریشانی ہے خواہ وہ تعلق کسی نوعیت کا ہو ــ اسمیں ادارۂ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والوں کا خاص مقام و لحاظ تھا ــ تو وہ اسکی پریشانی دور کرنے کیلئے اپنی توجہات اور امکانات بروئے کار لانے سے دریغ نہ کرتے، پھر پریشانی دور ہونے تک برابر فکر مند رہتے۔

اگر اہل تعلق کے درمیان کبھی کوئی بدمزگی ہو جاتی تو اسے دور کرنے کی پوری سعی کرتے اور اور جب تک دور نہ ہو جاتی چین نہیں آتا، ہر اچھے کام اور قول پر تشجیع اور حوصلہ افزائی کرتے اور اس میں پوری فراخدلی کا مظاہرہ فرماتے، بالخصوص اچھی تحریر (اچھی کتاب یا مقالہ) پر بہت دل کھول کر داد دیتے، اور برابر اس کا ــ تعریفی انداز میں تذکرہ فرماتے رہتے، بلکہ بسا اوقات انعام بھی دیتے، بری بات کی نشاندہی اور اس پر نکیر اس طرح فرماتے کہ سننے والے میں ممنونیت کا احساس اور امتثالِ امر کا جذبہ بیدار ہو جاتا، کڑوی سے کڑوی بات بھی ایسے شیریں انداز میں کہتے کہ کڑواہٹ دب کر رہ جاتی اور شیرینی کے چٹخارے ہر ذوقِ سلیم لینے لگتا، ہر معاملہ میں اعتدال و توازن مولاناؒ کا وہ وصفِ امتیازی تھا جس کے قائل ــ موافق و مخالف ــ سب ہیں، سائل کے سوال کو رد کرنا تو گویا جانتے ہی نہ تھے، خندہ پیشانی اور ہر آئندہ و روندہ کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے میں ان کی عادت تو شہرۂ آفاق ہے ہی، جس نے ایک مرتبہ بھی ملاقات کی وہ ان کے اس وصف کے گن گاتا رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات کا تو اس جگہ تذکرہ کرنا نہ مقصود ہے نہ آسان (بلکہ کسی

انسان کیلئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ کا احاطہ ممکن نہیں) بس یہاں چند اور ایسی صفات کا تذکرہ کرکے بات ختم کی جاتی ہے، جن سے حضرت مولانا کے کچھ اور اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبل بوجھہ وحدیثہ علیٰ اشر القوم یتألفھم بذالک ..... لم یکن فحاشا ولا متفحشا ولا صخابا فی الأسواق ولا یجزی بالسیئۃ السیئۃ ولکن یعفو ویصفح ..... دائم البشر، سھل الخلق، لین الجانب لیس بفظ ولا غلیظ ..... کان لا یذم احدا ولا یعیبہ ولا یطلب عورتہ"

ترجمہ (حضرت شیخ الحدیثؒ کا کیا ہوا)

قوم کے بدترین شخص کی طرف بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تالیف قلب کے لحاظ سے اپنی خصوصی توجہ مبذول کرتے اور گفتگو بھی خاص توجہ سے فرماتے تھے (جسکی وجہ سے اسکو اپنی خصوصیت ــــ کہ اللہ کے رسولؐ اس پر خاص توجہ فرما رہے ہیں ــــ کا خیال ہوتا) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو طبعاً فحش گو تھے نہ تکلف فحش بات فرماتے تھے اور نہ بازاروں میں چلّا کر (خلاف وقار) باتیں کرتے، بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے تھے، بلکہ معاف فرما دیتے تھے اور اس کا ذکر و تذکرہ بھی نہ فرماتے تھے، آپ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے، یعنی چہرۂ انور پر بشاشت اور تبسم کا اثر نمایاں رہتا تھا، آپ نرم مزاج تھے، یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپؐ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تو آپ سہولت سے موافق ہو جاتے تھے، نہ آپ سخت گو تھے اور نہ سخت دل تھے..... نہ عیب گیر تھے کہ دوسروں کے عیوب پکڑیں، نہ کسی کی مذمت فرماتے تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے نہ کسی کے عیب تلاش فرماتے تھے"۔

جن لوگوں کا حضرتؒ سے ربط و تعلق اور ملنا جلنا رہا ہے وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہونگے کہ حضرت مولانا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام اوصافِ حسنہ اور صفاتِ حمیدہ کو ایسا

اپنا لیا تھا کہ وہ اسوۂ نبویؐ کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَارْفَعْ دَرَجَاتِہٖ وَاَدْخِلْہُ فَسِیْحَ جِنَانِہٖ

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا کہ "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" لکھ دو۔ پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کیلئے اپنی آئندہ نسل کیلئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی، وہ کس گروہ و ملت کی پیرو ہوگی، کس کی پرستش کرے گی، کن عقائد کو مانے گی یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی، یا سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خداؤں اور دیوتاؤں کی، یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دستِ قدرت کو کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

امام العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

مولانا سید سلمان حسینی ندوی

ان کی شخصیت کے اہم عناصر ان کی کتابوں اور اداروں

اُن کا تعارف خود ان کے آئینہ میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر خود ان کی حیات میں جتنا لکھا گیا، ان کی خود نوشت سوانح حیات کے علاوہ ملک و بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں (ایم اے) اور ان پر (پی ایچ ڈی) کے مقالات لکھے گئے، ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کے ارکان کی طرف سے ان کے اعزاز واکرام میں ان کے ادبی کارناموں پر ایک مستقل سیمینار منعقد کیا گیا، مشاہیر اہل قلم نے ان کی بعض کتابوں کے مقدمات اور مستقل مضامین یا ان کے کسی اہم خطاب کی تمہید میں بہت کچھ لکھا اور کہا، اور وفات کے بعد تو الحمد للہ مضامین مجلات وجرائد، خاص نمبرات، سیمناروں اور جلسوں کا ایک سیلاب ہے، جو رواں دواں ہے، اور جس نے ہندوستان کے تمام اہم مراکز کا تقریباً احاطہ کر لیا ہے۔

حضرت شیخ الہند کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت:- مولاناؒ کی یہ مقبولیت، محبوبیت، شہرت، عظمت اور عام قلوب میں عقیدت ایک نادر مثال ہے، جس کی نظیر ہندوستان میں اس صدی میں اگر ہے تو شاید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی ذات گرامی ہے، جن کو برصغیر کے تمام حلقوں نے قبول کیا تھا، اور یہ ان کی بے مثال قربانیوں کا ثمرہ تھا، اور ایسی ہی عمومی مقبولیت و عقیدت حضرت مولاناؒ کے حصہ میں آئی جو ان کے خلوص، وسعت قلب اور حکمت و بصیرت کا ثمرہ ہے۔

اپنے دور میں عالم اسلام کی منفرد شخصیت:- مولاناؒ کو عالم عربی میں جو مقام کئی دہائیوں سے حاصل تھا، وہ موجودہ دور کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بانیوں میں ایک مخلص ترین، صاحب علم وادب اور صاحب بصیرت داعی الی اللہ کا تھا، جن میں سرفہرست شیخ حسن البناؒ کو تسلیم کیا جاتا ہے، پھر مولانا

مودودیؒ کو، ان کے بعد عالم اسلام میں حضرت مولاناؒ کی شخصیت کلیۃً منفرد شخصیت تھی، جنکی سطح کی کوئی بھی دوسری شخصیت اس دور میں باقی نہیں رہ گئی تھی، اس کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مراکش سے کویت و امارات تک، جہاں بھی کسی کانفرنس، کنونشن، اجتماع یا میٹنگ میں حضرت مولانا کی شرکت ہوتی تو ان کو سب سے زیادہ بزرگ، قابل احترام اور سرپرست شخصیت کی حیثیت دی جاتی تھی۔ برصغیر ہند و پاک میں ایک مفکر، مؤرخ، ادیب اور داعی کی حیثیت سے وہ اپنی جوانی کے ایام ہی سے پہچانے جاتے تھے، اور خانقاہوں سے لیکر مدارس اور ملی تنظیموں اور جماعتوں میں ان کا ایک وقار تھا، لیکن حضرت مولانا زکریا صاحبؒ، مولانا قاری طیب صاحبؒ اور پھر حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے اٹھنے کے بعد مولاناؒ کی شخصیت محفل کے ایک تنہا چراغ کی تھی، مولاناؒ کے درجہ مقام اور مرجعیت میں ان حضرات کے بعد پورے برصغیر میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں رہا تھا۔

امام العرب والعجم:- اس لئے یہ کہنا بالکل برحق ہے کہ اپنے آخری دور میں وہ واقعتاً (امام العرب والعجم) تھے، اگرچہ یہ لقب ان کیلئے استعمال نہیں کیا گیا، لیکن بجا طور پر وہ اس کے مستحق تھے، ظاہر ہے کہ ائمہ حرمین اور ان سب کے بزرگ رئیس شؤن الحرمین (صدر امور حرمین) جس کا اکرام ایک شاگرد اور محب اور متوسل کی حیثیت سے کرتا ہو، اور مرکز اسلام میں جس کو سب سے زیادہ وقار و اعتبار حاصل ہو، وہ اگر امام المسلمین نہیں تو اور کون ہے؟!

مولانا کی رفعت اور عظمت کے اسباب:- حضرت مولاناؒ کو یہ مقام اور رتبۂ بلند کیسے حاصل ہوا؟ اخلاص، علم، فضل، کمال، دینی بصیرت، عربی زبان و ادب پر نہایت اعلیٰ اور استاذانہ قدرت، داعیانہ جذبہ، سوز دروں، ایمانی جذبۂ حرارت، حمیت و غیرت، زہد و اتقاء، استغناء و ترفع، تواضع و مروت، نجابت و شرافت، رقت و رافت، حلم و دور اندیشی، وضع داری و خاکساری اور اس طرح کے نہ جانے کتنے اوصاف ہیں، جو حضرت مولاناؒ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے، اور ان کو ہی اس کا سبب گردانا جاتا ہے، ظاہر کی بنیاد پر حکم لگانے والے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں، لیکن اصل حقیقت تو عالم

الغیب والشہادۃ ہی جانتا ہے، کہ اس کو کیا ادا پسند آجاتی ہے، جس کے بعد کن فیکونی تدابیر اور انتظامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے او ظاہر بینوں کو عالم تحیر میں ڈالتا چلا جاتا ہے۔

تشکیل شخصیت کے بنیادی عناصر کی تلاش:- بہر حال مجھے ان سطور میں اس کی کوشش کرنی ہے کہ پتا لگاؤں وہ بنیادی عناصر کیا ہیں، جنہوں نے مولانا کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور کن عوامل کی یہ کار فرمائی ہے کہ ایک ایسی شخصیت وجود میں آسکی۔

ایک بڑے اور گھنے درخت کی سیکڑوں شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کو دیکھ کر اندازہ لگانے والے جو بھی اندازہ لگائیں، اور اس کے مظاہر کی جن الفاظ و تعبیرات میں تعریف کریں، بہر حال اس کی جڑوں سے واقفیت رکھنے والوں کے حقیقی تجزیہ تک ان کا پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں اس کے خاندان، ماحول، اساتذہ، علوم و فنون اور مشغولیات کا بہت دخل ہوتا ہے، لیکن کسی دو لیا غذا میں شامل، مختلف اجزاء اور ان کی مقدار کا تعین کسی لیبارٹری میں ہو سکتا ہے، لیکن کسی شخصیت پر پڑنے والے اثرات کا ایسا تجزیہ بہت دشوار گزار امر ہے۔

مجاہدین و مصلحین کا خاندان :- حضرت مولاناؒ جس خاندان میں پیدا ہوئے، اسے ذات رسالت پناہ ﷺ کی نسبت خاندانی ہی بس تھی، تنہا اسی نسبت کے اثرات بھی اکثر و بیشتر شرافت و نجابت اور کریمانہ اخلاق کے سبب ہوتے ہیں، لیکن جس خاندان سے مولاناؒ کا نسبی تعلق ہے، وہ محمد ذوالنفس الزکیہ ؒ کے توسط سے نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسنؓ سے ملتا ہے، ان کی بارہویں پشت میں شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد المدنی جو سیدنا عبدالقادر جیلانی کے بھانجہ تھے، اور ۶۰۷ھ میں ہندوستان جہاد کے ارادہ سے آئے تھے، وہ پہلے غزنی آئے پھر دہلی اور دہلی سے قنوج، پھر مانک پور اور کڑا آئے جہاں جہادی کاروائیوں کے نتیجہ میں فتوحات حاصل کیں۔ ان کی پندرہویں پشت میں حضرت شاہ علم اللہؒ (۱۰۳۳-۱۰۹۶ء) خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں، جنہوں نے تکیہ

کی بستی آباد کی اور کعبہ مقدسہ کے نقشہ کے مطابق مسجد تعمیر فرمائی، اور اس کی بنیادوں میں آب زمزم ڈالا، اور جن کا اتباع سنت اپنے دور میں بے مثال تھا، اور جنکی چوتھی پشت میں حضرت سید احمد شہیدؒ ہیں، جن کی تحریک اصلاح وجہاد کے اثر سے برصغیر میں ایمان کی باد بہاری چلی اور اسلام کی سربلندی اور دشمنان اسلام کے قبضہ سے آزادی کا ایسا طاقتور جذبہ فروزاں ہوا، جس کی مثال ملکوں اور صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

وقت کے اصحاب ارشاد سے استفادہ:- حضرت شاہ علم اللہؒ اور ان کے اخلاف میں اتباع سنت، دینی حمیت، شجاعت وسخاوت، زہد واتقاء اور اصلاح وارشاد کے عمل کا تسلسل قائم رہا، اور یہ روایت قائم رہی کہ اپنے دور کے مشاہیر علماء ربانیین ومجددین ومصلحین سے استفادہ ہوتا رہے، بیعت وسلوک تعلیم وتربیت اور دعوت وارشاد کے ذریعہ ان کے فیوض کو عام کیا جاتا رہا، حضرت شاہ علم اللہؒ حضرت مجدد صاحبؒ کے سلسلہ سے وابستہ ہوئے، ان کے پوتے مولانا سید محمد صابر حضرت مجدد صاحب کے پوتے شیخ محمد صدیق سے منسلک رہے، اور حضرت شاہ محمد واضحؒ، حضرت شاہ ابو سعیدؒ حضرت سید محمد معینؒ اور سید محمد نعمانؒ (عم حضرت سید احمد شہیدؒ) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں تھے، اور مولانا سید قطب الہدیٰؒ اور مولانا سید محمد اسحاق (برادر حضرت سید احمد شہیدؒ) اور خود حضرت سید صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر سے مستفیض ہوئے۔

مولاناؒ کا خاندان، علم وفضل میں ممتاز رہا، اور اس میں ادب، تاریخ وسوانح نگاری کا پہلو غالب رہا، تصوف وسلوک سے اس کا رابطہ بھی صدیوں پر محیط ہے، اور غالباً حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے خاندانی ربط نے اس رنگ کو اور گہرا کیا، لیکن اس خاندان میں تصوف کبھی بھی سجادگی اور خانقاہی روایات وآداب کا پابند اور تعطل وجمود کا قائل نہیں رہا، بلکہ اصلاح وارشاد اور دعوت وجہاد ہمیشہ اس کا شیوہ رہا، غالباً اس میں محمد ذوالنفس الزکیہؒ کی جہادی کوششوں اور خون شہادت کا اثر کارفرما ہے۔

مولانا پر والدین کا اثر:- مولاناؒ کی جس گھر میں پیدائش ہوئی، اس پر علم وادب، تدین وتقوی، دینی

تعلیمی، تربیتی اور تحریکی کوششوں کا سایہ تھا، والد ماجد پایہ کے ادیب و مؤرخ اور محدثانہ رسوخ علمی رکھنے والے خاموش مصنف وانشاء پرداز تھے، وہ ندوۃ العلماء کی تعلیمی واصلاحی تحریک کے ناظم اور اس کے دارالعلوم کے ذمہ دار اعلیٰ تھے، وہ اپنے خاندانی روایات کے امین تھے اویس زمانہ حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تصوف وسلوک کا ربط رکھتے تھے، طبابت کا پیشہ معاشی ضرورت کے لئے اختیار کر رکھا تھا، تصوف وسلوک سے ربط، علمی رسوخ، انتظامی صلاحیت اور پیشۂ طبابت اور خاموش اصلاحی کوشش وہ نمایاں اوصاف تھے جو مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ میں اپنے والد سے منتقل ہوئے، اور مولانا میں ان کا ذوق تصنیف، زبان وادب پر قدرت اور سوانح نگاری کی میراث منتقل ہوئی، ساتھ ساتھ تصوف وسلوک کا تعلق بھی۔ دوسری طرف والدہ ماجدہ ایک نہایت متقیہ، عابدہ، زاہدہ، اور اوراد واذکار، تلاوت ونوافل کی بہت پابند، اور دعا ومناجات کا خاص ذوق رکھنے والی خاتون تھیں، ان کو دیکھ کر یہ خیال آتا کہ یہ اپنے دور کی رابعہ بصریہؒ ہیں، نرمی، مروت، دوسرے کا پاس ولحاظ، کسی کو ادنیٰ تکلیف دینے سے گریز، بے انتہا شرم وحیا، اور انقطاع وتبتل الی اللہ وہ اوصاف تھے جن میں مولانا کی والدہ خیر النساءؒ بہتر صاحبہ اپنے دور میں فرد فرید تھیں، اور ان سب اوصاف پر مستزاد، ادبی ذوق اور شعر وشاعری جو اسی للّٰہیت اور انابت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، مولانا میں بے انتہا مروت، نرمی، شرم وحیا اور کیفیت ابتہال اپنی والدہ محترمہؒ ہی کا عکس تھا، جو طبیعت میں گھلا ہوا اور مزاج میں رچا بسا تھا۔ مولانا کی شخصیت کی بنیادی تشکیل میں اور ان کے مزاج وطبعی خصائص میں والدین بالخصوص والدہ ماجدہ کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں تھے، مولانا شکل وشباہت میں بھی اپنے والد کے مقابلہ والدہ سے زیادہ مشابہ تھے، جسمانی خصوصیات کے ساتھ، نفسیاتی اور طبعی خصوصیات میں جو عمر کے ساتھ اور زیادہ نمایاں اور روشن ہوتی چلی گئیں مولانا اپنی والدہ کے موروثی خصائص کے زیادہ حامل تھے۔

خاندان کے مجموعی اوصاف:- مولاناؒ نے اپنے خاندان کی خوبیوں اور کمزوریوں کا ایک مختصر جائزہ "کاروان زندگی" کے شروع میں کیا ہے، اپنے ابتدائی دور کی بعض ناہمواریوں کا تذکرہ کرتے

ہوئے ان کا کہنا ہے کہ خاندان کی تاریخ کے مطالعہ اور اپنے دور میں اس کے مشاہدہ کے بعد چند باتیں قدر مشترک کے طور پر نظر آئیں۔

۱- خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت غلو و مبالغہ کی حد تک کی ہے، جس سے بہت سے موروثی خصائص کی حفاظت ہوئی، تو بعض ذہنی و جسمانی صلاحیتوں میں کمزوری بھی آئی۔

۲- خاندان ہمیشہ خالص عقیدہ توحید پر قائم، مشرکانہ اثرات سے محفوظ، بدعات سے مجتنب اور تشیع کے اثرات سے دور رہا، توحید و اتباع سنت کی دعوت اس کا عام طور پر شعار اور خصوصیت رہی۔

۳- خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اکثر عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ہے، یہ وصف اس خاندان نے تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک نمایاں طریقہ پر قائم رکھا، اور کچھ تعجب نہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذہنی نشو و نما اور سیرت کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ رہا ہو۔

۴- خاندان میں اکثر اور بالعموم اس صفت کی کمی نظر آتی ہے جس کو چالاکی، سیاسی ذہانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں ایک طرح کی سادہ دلی یا بھولا پن پایا جاتا ہے، اور عام حالات میں ان میں ظالم بننے سے زیادہ مظلوم بننے، کسی کو نقصان پہنچا کر نفع حاصل کرنے سے زیادہ کھونے اور نقصان اٹھا لینے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵- خاندان کے تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ شریعت و طریقت سے ہر دور میں مربوط رہا اور اس میں ایک طرف علمائے ربانی پیدا ہوتے رہے تو دوسری طرف مشائخ روحانی۔

۶- اس خاندان میں کبھی دولت و ثروت کی فراوانی نہیں رہی، زیادہ تر مجاہدہ اور عسرت کا دور گزرا اور زیادہ سے زیادہ بقدر کفاف خاندان کے لوگوں کو حاصل ہوا، (کاروان زندگی ج ۱ ص ۲۰-۲۹)

مولانا کی شخصیت سازی میں ماموں کا اثر:- مولاناؒ کی شخصیت کی تشکیل، ان کی ابتدائی تربیت اور مزاج سازی میں ان کے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ مرحوم کو بھی بڑا دخل ہے، مولانا کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے بنیادی پتھر رکھنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، وہ عجیب دلآویز اور جامع شخصیت کے مالک تھے، اسلامی زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کے فرزند ارجمند، حافظ قرآن، دل کش

انداز میں پڑھنے والے، صرف ونحو بڑی پختہ، خط نہایت پاکیزہ، معاملات کے نہایت صاف، کاہلی و سستی سے کوسو دور، جفاکش وپابند اوقات چال سے بھی مستعدی وعزم کا اظہار ہوتا، تہذیب وشائستگی ان پر ختم تھی، چھوٹے اعزہ یا دوستوں کے لڑکے جوان کی اولاد کے برابر تھے، آجاتے اور وہ لیٹے ہوتے تو فوراً پاؤں سمیٹ لیتے اور بیٹھ جاتے، نوکروں اور مزدوروں کو بھی کبھی کسی درشت لفظ سے یاد نہ کرتے، بالکل بے آزار انسان تھے، اور شاید ایذا رسانی اور دل شکنی کی صلاحیت فطری طور پر ان میں نہ تھی۔

(کاروانِ زندگی جلد ا ص: ۴۳-۴۵)

جو حضرت مولاناؒ کے قریب رہے ہیں اور خاص طور پر آخری دور میں، ان کو خاندان کے بزرگوں کے ان احوال کے پڑھنے کے بعد صاف محسوس ہوتا ہوگا کہ یہ تو خود مولاناؒ کی سیرت کے درخشاں پہلو ہیں۔ گویا "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کے مصداق۔ مولاناؒ اپنی افتاد طبع اور فطری صلاحیتوں کا تذکرہ، کر رہے ہیں، مولاناؒ کی دینی تربیت میں ماموں حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ کا جو نقش تھا، اس کا ہی یہ اثر تھا کہ مولاناؒ نے اپنی پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہید کو انھیں کے نام منصوب کیا تھا، جن کی کتاب کی اشاعت سے چند مہینے پہلے بتاریخ ۳۱ر مئی ۱۹۳۸ء وفات ہوگئی تھی۔

خاندان کی شاخ ٹونک کے امتیازی اوصاف:- مولاناؒ کے خاندان کی وہ شاخ جو ٹونک میں رہی، جو حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ریاست ٹونک کی دعوت پر ٹونک منتقل ہوگئی تھی ۱۹۲۰ء میں یہ شاخ ٹونک سے پھر تکیہ رائے بریلی منتقل ہوگئی، یہ اس شاخ سے چند صفات میں نمایاں اور ممتاز تھی جو دائرہ شاہ علم اللہؒ میں پہلے سے آباد تھی، اس شاخ میں اگرچہ صحت عقائد، پابندی فرائض اور بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن ٹونک کی شاخ اسلامی اخوت ومساوات، صلہ رحمی، تواضع، انکساری وسادگی، ملازمین اور ماتحتوں سے مساویانہ برتاؤ اور اکرام میں نمایہ طور پر فائق تھی، یہ حضرت سید صاحب کی صحبت اور تربیت کا فیض اور مجاہدین ومہاجرین کے اخلاق کا اثر تھا۔

(کاروانِ زندگی ج ا ص ۴۸-۴۹)

افراد خاندان کا شوق کتب بینی :- مولاناؒ کے والد ماجد اور اجداد علم و ادب سے نہ صرف وابستہ رہے، بلکہ ان میں اکثر مصنف، انشاء پرداز، مؤرخ، تذکرہ نویس اور سوانح نگار تھے، ان کے اثر سے گھر کا ماحول خالص علمی ماحول تھا، گھر پر کتابی ذوق سایہ فگن تھا، کتب بینی کا ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے، جو پیسے مل جاتے اس کا بہترین مصرف کتاب کی خریداری تھی، اور چونکہ یہ گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیروکار تھا اس لئے غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو، گھر میں جگہ نہیں پاتی تھیں، البتہ سیرت، بزرگوں کی حکایات اور بے ضرر دلچسپ کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ مولاناؒ لکھتے ہیں کہ آج تک دل پر نقش ہے۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی
جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی
اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی

اس سیدھی سادی نظم نے اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب سیرت ابن ہشام میں یہ عزیز و لذیذ حکایت پڑھی تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آگیا۔ (کاروانِ زندگی ج ۱ ص: ۵۸-۵۹)

بچپن میں داعیانہ جذبہ :- اسی ذوق اور اس کے نتیجہ میں بچپن ہی میں داعیانہ جذبہ نے ۸-۹ سال کی عمر میں گھر پر سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق پیدا کیا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا، بہن نے سر پر پگڑی باندھی، اور سیرت کی کوئی کتاب پڑھ کر سنانا شروع کی، گھر میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں خوب پڑھی جاتی تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
مسدس تو حالی گویا ورد زباں تھی۔

والد صاحب کے مواعظ کی نقل:- "والد صاحب" جہاں ایک طرف ناظم ندوۃ العلماء تھے، وہیں دوسری طرف اپنے محلہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے، اور جمعہ کی نماز کے بعد ان کا وعظ مسجد میں ہوتا تھا، عیدین کے موقع پر وہ انسوہ فتحپور جاتے، جہاں ان کا ننہیال تھا، اور عید کی نماز پڑھاتے اور تقریر کرتے، والد صاحب کے احباب ان سے عقیدت و محبت میں مجھ سے وعظ کی فرمائش کرتے۔ عمر ۶-۷ سال کی تھی، وعظ کی فرمائش میں آیت کریمہ "یا ایھا الذین آمنو اقوا نفسکم و اھلیکم نارا" (اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ سے) پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا" مولاناؒ فرماتے ہیں کہ "اب جب کبھی اس آیت کو دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے پڑھتا ہوں تو بے اختیار وہ زمانہ یاد آجاتا ہے۔"

(کاروانِ زندگی ج ۱ ص:۶۵)

ابتدائی اساتذہ اور نصاب:- مولاناؒ کی تسمیہ خوانی رائے بریلی میں ہوئی، پھر لکھنؤ میں محلہ کی مسجد کے امام و موذن حافظ محمد سعید صاحبؒ کے مکتب میں پڑھنا شروع کیا، ان کے پاس قرآن پاک ناظرۃً ختم کیا اور اس موقع پر والد صاحبؒ نے ضیافت کا بھی انتظام کیا۔ پھر اپنے عم محترم مولوی سید عزیز الرحمٰن ندویؒ جو دفتر ندوۃ العلماء واقع گولہ گنج میں کام کرتے تھے کے پاس تعلیم کیلئے جانا شروع کیا۔ وہاں مولانا غلام محمد شملوی کا جو بڑے وجیہ، خوش تقریر، سرگرم اور مخلص سفیر ندوہ تھے قیام بھی رہتا تھا وہ شملہ کے پھلوں سے خاطر فرماتے تھے۔

اردو بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد جس کا نصاب مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتاب تھیں جن میں "سفینہ اردو" گویا بیاض اور وظیفہ کی کتاب تھی، اس کی بہت سی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ انجمن حمایت اسلام کی فارسی کی پہلی، دوسری کتاب سے فارسی تعلیم کا آغاز ہوا، اس کیلئے ایک کہنہ مشق استاد مولوی

محمود علی صاحب کا انتخاب ہوا، والد صاحب کی تصنیف کردہ کتابیں "تعلیم الاسلام" اور "نور الایمان" پڑھیں، مولوی صاحب سے محنتی اور کاغذ پر لکھنے کی مشق کی۔

والدہ کی تربیت:- "والد صاحب" کی وفات کے بعد رائے بریلی میں عبوری قیام رہا، وہاں عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب سے جو اچھے فارسی داں تھے بوستاں پڑھی، لوہانی پور کے ماسٹر محمد زماں خاں صاحب سے حساب اور اردو عبارت نویسی سیکھی، والدہ محترمہ قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں یاد کراتیں تھیں، اور تربیت کی انھیں خاص کر فکر رہتی تھی، نماز کا بہت اہتمام کراتیں، اور زیادتی یا غرور کسی ادنیٰ ملازم یا اس کے بچہ کے ساتھ بھی انھیں کسی حال میں گوارہ نہیں تھا، ایسی غلطی ہوتی تو معافی مانگنے پر مجبور کرتیں، مشتبہ مال سے حفاظت کا اللہ نے انتظام فرمایا اور بدعات و رسوم کے کھانے سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔"

(کاروانِ زندگی ج:۱، ص:۸۰-۸۱)

پھر جب لکھنؤ میں قیام کا اطمنان حاصل ہوا، تو بوستان پڑھنے کا سلسلہ یہاں اپنے چچا سید عبد الرحمٰن صاحب سے جاری ہو گیا۔

اس زمانہ میں مولانا جب کچھ لکھنے کے قابل ہو گئے تو والدہ محترمہ نے تاکید فرمائی کہ جب کچھ لکھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ یہ دعا لکھو" اللھم آتنی بفضلك أفضل ماتؤتی عبادك الصالحین "یہ عادت عرصہ تک رہی، مولانا لکھتے ہیں کہ اب بھی دعا کرتے وقت اکثر یہ دعا یاد آجاتی ہے۔

دولت و امارت سے عدم تاثر کا سبب:- والد صاحبؒ کی وفات کے بعد جب تک لکھنؤ میں اپنے مکان کا انتظام نہ ہو سکا تھا، نواب نور الحسن مرحوم کی کوٹھی پر قیام رہا جو نواب سید صدیق حسن قنوجیؒ کے صاحبزادہ تھے، اور مولانا کے والد سے ان کے بہت گہرے، گھریلو مراسم تھے، مولانا فرماتے ہیں کہ اس کوٹھی میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار چھٹ گئے اور دولت و امارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اسلئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا تھا۔

برادر اکبر کی ابتدائی تربیت:- اس دوران برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کو ان کی تربیت کے سلسلہ میں ایک تو اس کی فکر رہتی تھی کہ نماز میں غفلت نہ ہونے پائے، دوسرے یہ کہ کوٹھی کے ملازموں کے پاس زیادہ اٹھنا بیٹھنا نہ ہو، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ نہ پڑھوں، وہ خود کتابوں کا انتخاب کر کے دیتے تھے، پہلی کتاب جو انہوں نے پڑھنے کے لئے دی وہ "سیرت خیر البشر" پھر "رحمۃ للعالمین" مطالعہ میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب کی ترتیب نصابی کتب:- ڈاکٹر صاحبؒ نے فارسی تعلیم میں اپنی پسندیدہ کتاب "اصول فارسی" (مصنفہ مولانا فاروق چریاکوٹی) کی تعلیم کے بعد فارسی ختم کرادی، لیکن بقول مولاناؒ "فارسی کی اس قدر تعلیم سے اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ 'مکتوبات امام ربانی' اور 'ازالۃ الخفاء' وغیرہ کا آسانی سے مطالعہ کر سکوں"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی، اور دوسری طرف عربی زبان کی تعلیم کے لئے شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمنی بھوپالی کے سپرد کر دیا کہ وہ اپنے نہج پر عربی زبان کی تعلیم دیں، عربی کی تعلیم کا آغاز اس طرح ہوا کہ شیخ خلیل عرب صاحبؒ نے فعل، فعلاً، فعلوا کی گردان لکھ کر دی کہ اسے یاد کر لو، اس کے چند دن کے بعد انہوں نے اپنی محبوب کتاب "المطالعۃ العربیۃ" (مصر کی وزارت تعلیم کی طرف سے تیار کردہ و منظور شدہ) شروع کرادی، وہ مدرس تھے اور طلباء صرف دو تھے، ایک مولاناؒ دوسرے شیخ کے صاحبزادہ حسینؒ، اس طرح شیخ کی توجہ کا دونوں طالب علموں کو پچاس فیصدی حصہ رسدی مل رہا تھا۔

شیخ خلیل عرب کا پسندیدہ عربی نصاب:- شیخ خلیل کے پسندیدہ نصاب میں مندرجہ ذیل کتابیں تھیں۔ الطریقۃ المبتکرۃ ۱.٤ ، مدارج القراءۃ ۱.۳ ، کلیلۃ و دمنۃ اور مجموعۃ من النظم والنثر۔

چند ہی دن کی تعلیم کے بعد شیخ نے عربی بولنا لازم کر دیا، اردو بولنے پر جرمانہ عائد کیا جانے لگا، صرف و نحو میں زیادہ زور مشق، صحیح پڑھنے اور وجوہ اعراب سمجھنے اور بتانے پر تھا، انشاء کی مشق بھی تھی،

سبق پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ طلباء پورا سبق تیار کر کے لائیں اور ان کو سنا دیں۔

نحو کے مسائل کے لئے انہوں نے ابوالحسن الضریر کی کتاب "الضریری" پڑھائی، جس میں تقریباً نحو کے سب مسائل آگئے ہیں، "میزان ومنشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج" مولانا کے چچا مولوی سید عزیز الرحمن صاحبؒ نے پڑھائیں، "مجموعة من النظم والنثر" میں حصہ نثر کو بھی زبانی یاد کرنا اور سنانا پڑتا تھا۔

شیخ خلیل عرب کا طریقۂ تدریس:- ان ابتدائی کتابوں کے بعد مولانا کے عربی نصاب میں "نہج البلاغة، مقامات حریری، دلائل الاعجاز" اور "عشر قصائد" زیر درس رہیں۔ شیخ خلیل عربؒ کا طریقۂ تدریس کتنا فطری، مؤثر اور کامیاب تھا، خود مولانا کے قلم سے اس کو سنئے:

"اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کر دینے اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے اور مصنف کا ہم زبان وہم مذاق بنا دینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی، جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں وہبی ہے۔

عربی زبان وادب کا ذوق سلیم وذوق صحیح، پھر اس کے منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان (جو صدیوں سے عربی کے مذاق سلیم سے ناآشنا اور صحیح طریقۂ تعلیم سے محروم ہے) بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی وعربی حلقوں میں بھی شاذ ونادر ہی شاید پائی جائے۔"

(کاروان زندگی ج ۱ ص: ۸۸-۹۱)

اردو زبان میں مطالعہ کی ابتدائی کتابیں:- جہاں تک اردو زبان وادب کا تعلق ہے، مولانا نے ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانہ میں اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ علامہ شبلیؒ کی "الفاروق" کئی بار پڑھی، محمد حسین آزاد کی "آب حیات" بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اسکے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر نقش ہو گیا۔

زبان وادب کا ذوق ماموں زاد بھائی کا اثر:- اردو زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے میں مولانا

کے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰنؒ کا بڑا حصہ ہے، وہ خاص طور پر مؤمن، غالب، ذوق، آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ذوق رکھتے تھے، بچوں سے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے تھے چنانچہ اساتذہ فن کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار سمجھنے کی عادت پڑی۔

اسی طرح شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق کا بھی حصہ ہے، وہ لکھنؤ کی زبان کی عاشق محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، ان مجالس کا اثر مولاناؒ کی طبیعت موزوں پر یہ پڑا کہ مشاعرے سننے کا بھی شوق پیدا ہوا اور کچھ موزوں کرنے کی بھی کوشش کی لیکن برادر اکبر ڈاکٹر صاحب نے اس شغل سے سختی سے روک دیا۔

محمد حسین آزاد کی نثر کی تقلید:- مولوی محمد حسین کی کتاب "آب حیات" اور "نیرنگ خیال" کا عمر کے اس ابتدائی دور میں اتنا اثر پڑا کہ ان کے اسلوب کی نقل کرنا شروع کر دی اور صفحات کے صفحات ان کی تقلید میں سیاہ کر ڈالے۔

الہلال کے گہرے نقوش:- مولانا شبلیؒ، مولانا حالیؒ، مولوی نذیر احمدؒ، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی چند کتابیں پڑھیں۔ الہلال کے فائل ذوق و شوق سے پڑھے اور ان کے زور قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا۔

مضمون نویسی میں والد کا رنگ:- اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد صاحب کی یاد ایام کا رہا اور اس طرز پر پہلا مضمون اندلس پر لکھا۔

رحمۃ للعالمین نے ایک کرنٹ دوڑا دیا:- اسی زمانہ میں "رحمۃ للعالمین" مصنفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا اشتہار پڑھا، طبیعت میں شدید انجذاب پیدا ہوا کتاب منگائی، پیسے نہ ہونے پر باصرار رو رو کر والدہ صاحبہؒ سے مطالبہ کیا، جنھوں قرض لے کر اس مطالبہ کو پورا کیا پھر اس کتاب کو بہت ہی شوق و ذوق اور عقیدت و محویت کے ساتھ پڑھا، کم کتابوں نے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا

ہوگا جتنا اس کتاب نے، دل و دماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔

۱۲ سال کی عمر میں بے تکلف عربی گفتگو:- ۱۲-۱۳ سال کی عمر ہوگی جب عربی بولنے کی اتنی مشق ہوگئی تھی کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور بتاریخ ۵، ۶، ۷ رنومبر ۱۹۲۶ء میں مولانا برادر اکبر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گئے تھے، اور معزز مہمانوں میں اسکی شہرت تھی کہ ایک لڑکا ۱۲-۱۳ سال کا بے تکلف عربی بولتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا اور امتحاناً چند سوالات کئے۔

کھیلوں کا شوق:- ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک کا یہی زمانہ ہے جب مولاناؒ کو ہاکی کھیلنے کا شوق بلکہ ان کے ہی الفاظ میں لت لگ گئی تھی، اور مکان سے قریب کے ایک کلب میں کھیلنے کے لئے جانا شروع کر دیا، ہاکی فٹ بال کے میچ اور ٹورنامنٹ دیکھنے کا شوق بھی ہوا بلکہ ایک سودا پیدا ہوا، لیکن جلد ہی اس کا احساس ہوگیا کہ اس میں جس طبقہ کے لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑ رہا ہے وہ ایک آزمائش ہے، اور تعلیمی انہماک اور ذہنی یکسوئی کے لئے مضر اس آزمائشی مرحلہ کے بارے میں مولانا کا احساس یہ ہے۔ ؎

نشستم بانکویان فرنگی اذاں
بے سوزتر روزے ندیدم

مولانا عبید اللہ سندھی کے طرز تفسیر سے تعارف:- اسی زمانہ میں برادر اکبر کے کہنے پر ان کے دوست خواجہ عبدالحی فاروقی استاد التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ جب کہ لکھنؤ آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہی قیام تھا، مولاناؒ کو آخری پارہ کی کچھ سورتیں پڑھائیں۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ میرا مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ کے طرز تفسیر اور فکر سے پہلا تعارف تھا، جس کی وجہ سے میں نے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں (جس کا شرف مجھے تین چار سال کے بعد حاصل ہونے والا تھا) اجنبیت محسوس نہیں کی۔

مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کا سحر:- خواجہ صاحب کی صحبت و مجلس بڑی معلومات افزا اور مفید تھی، اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کے شہرہ آفاق اخبار "زمیندار" اور بالخصوص ان کے سنڈے ایڈیشن سے دلچسپی پیدا ہوئی، ہفتہ بھر اس کا انتظار رہتا تھا، اور مولانا کی نظم جو صفحۂ اول پر ہوتی تھی مزے لے لے کر پڑھتا تھا، اور ان کی قادر الکلامی، خوش نوائی اور جوش کلامی سے مسحور ہوتا تھا، بھائی آفتاب صاحب (جو حکیم عبدالقوی کے نام سے معروف تھے اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے بھتیجے تھے) اور مولانا محمد علی جوہرؒ کے مداح اور فدائی تھے اور میں مولانا ظفر علی خاںؒ کا حامی و وکیل، دونوں میں خوب بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔

صرف و نحو کی تعلیم میں مولانا طلحہ کا اثر:- "اسی زمانہ میں عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب سے بھی پڑھنے کی نوبت آئی، وہ صرف و نحو کے امام تھے، صحیح عبارت پڑھنے اور صرف و نحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا داخل ہے، صرف و نحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے ذہنی تربیت ہوئی، تاریخی شعور پیدا ہوا اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا۔" (کاروان زندگی ج:۱، ص:۱۰۰-۱۰۲)

صرف تعلیمی انہماک:- تعلیمی انہماک کا یہ ابتدائی دور خاص دینی اور روحانی تربیت اور کسی تحریکی عمل سے خالی تھا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

> "یہ وہ زمانہ تھا کہ کسی قسم کا دینی ذوق اور کسی بزرگ کی صحبت حاصل نہ تھی، نہ زبان و ادب یا کھیل کے سوا کسی چیز سے ذوق یا دلچسپی تھی، نہ شہر میں کوئی دینی دعوت یا تحریک تھی جس سے کچھ اصلاح و تربیت اور دینی مشغولیت ہوتی۔"

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ:- ۱۹۲۷ء میں شفیق استاد خلیل عرب صاحب کے اصرار پر جبکہ میری عمر تقریباً ۱۴ سال کی تھی ڈاکٹر صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی کے درجہ فاضل ادب میں میرا داخلہ کرادیا، شیخ خلیل عرب صاحب وہاں ایم، اے۔ بی، اے۔ کے کلاسز کو عربی پڑھاتے تھے۔ امتحان داخلہ کے موقع پر

"رسائل أبی بکر الخوارزمی" کی عبارت پڑھوائی گئی، اور میں نے بڑی آسانی سے اس کی عبارت پڑھ دی، زیر درس کتابوں کا سبق یونیورسٹی کے علاوہ شیخ خلیل عربؒ کے مستقر پر بھی جاری رہتا تھا۔

فاضل ادب اور فاضل حدیث کی سندیں:- "یونیورسٹی میں عربی شعبہ کا نصاب شیخ خلیل عربؒ کے مشورہ سے رکھا گیا تھا میرے لئے دو چیزیں مشکل تھیں۔ ایک فن عروض جس کی کتاب 'محیط الدائرۃ" داخل درس تھی، دوسرے دقیق نحوی مسائل، حماسہ کے پرچے میں بعض ایسے نحوی سوالات کے باعث جو میری دسترس سے باہر تھے میں فیل ہو گیا، باقی مضامین میں فرسٹ نمبرات تھے۔

"اگلے سال ۱۹۲۹ء میں اس کی تلافی ہو گئی، اور میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا"۔

(کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۰۲-۱۰۴)

اس کورس کی تکمیل کے بعد مولانا نے "فاضل حدیث" کے شعبہ میں داخلہ لیا اور بغیر مطالعہ و محنت کے اس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

سفر لاہور، علامہ اقبال اور مشاہیر ادباء سے تعارف:- جون ۱۹۲۹ء میں مولانا کا لاہور کا سفر ہوا، اس وقت عمر ۱۵-۱۶ سال کی تھی، اس سفر میں علامہ اقبالؒ سے ملاقات ہوئی، حفیظ جالندھری نے نظمیں سنانے کی فرمائش کی اور انہوں نے بعض نظمیں سنائیں، مشاہیر علم وادب میں حافظ محمود شیرانی علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر شاداں بلگرامی، خواجہ دل محمد، پروفیسر عبدالباسط، خواجہ سلیم عبدالرحمٰن چغتائی، میر سید ممتاز علی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں، عم محترم مولانا طلحہ صاحب اس طرح تعارف کراتے تھے کہ یہ مصنف "گل رعنا" کے فرزند ہیں اور یہ بچہ بے تکلف عربی لکھتا اور بولتا ہے، علامہ اقبالؒ کے یہاں تعارف میں یہ بھی بتایا گیا کہ انہوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے عم محترم کے ذریعہ ہی تعارف و تعلق ہوا۔

پروفیسر محمد شفیع کا مشورہ ایک سنگ میل:- مولانا کا لاہور کا یہ سفر تعلیم کا رخ متعین کرنے

کے سلسلہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے؛ مولانا کے عم محترم مولانا طلحہ صاحبؒ نے اورینٹل کالج لاہور کے استاذ عربی اور پرنسپل مسٹر محمد شفیع صاحب سے ملایا، اور مشورہ لیا کہ ان کی تعلیم کے بارے میں آپ کیا رائے دیتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا، میری رائے ہے کہ یہ عربی کو اپنا موضوع بنائیں اور اسی میں ترقی کریں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ اور دروس فقہ و حدیث:- مولاناؒ لاہور سے جب واپس آئے تو انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا، پہلے فقہ کا درس مولانا شبلی صاحبؒ جیراجپوری اعظمی سے لیا، پھر شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے حلقہ درس میں باقاعدہ داخل ہوئے۔

شیخ الحدیث سے مولانا نے صحیحین، سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا اور کچھ منطق کے اسباق بھی مولانا حیدر حسن خاںؒ نے اپنے شوق سے پڑھائے۔

شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں کا طرز تدریس:- شیخ الحدیث کا طرز تدریس خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل، درس میں طالب علموں سے مراجعت و تحقیق، تلاش و جستجو کا پورا کام لیا جاتا تھا کتابوں میں سے حوالے نکالنے، کتب رجال اور جرح و تعدیل میں مواد تلاش کرنے اور مسئلہ لکھنے میں بھی شریک رکھا جاتا تھا، جس سے طلبہ کی نظر وسیع اور تجربہ عملی ہوتا تھا، مولانا حیدر حسن خاں پر رقت و خشیت بہت غالب اور آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول تھا، جس میں گریہ غالب ہوتا۔

ظاہر ہے کہ ایسے اساتذہ کے درس میں فنی تحقیق کے ساتھ، نور علم اور تزکیہ باطن کا بہت وافر سامان ہوتا تھا۔

والدہ کی نصیحت کا سوانحی ذوق پیدا کرنے میں بنیادی حصہ:- والدہ کی نصیحت کے نتیجہ میں خاندانی کتب خانہ کی حفاظت اور دیکھ بھال کا کچھ مشغلہ شروع ہوا تو تاریخ ہند، تراجم علماء تذکروں

اور سوانح کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بہت نفع ہوا۔

اسپتال کے ماحول کا ایک گہرا اصلاحی اثر:- تعلیم کے اس تسلسل کے دوران روحانی تربیت اور اصلاح باطن کے بھی بعض مواقع آتے رہے لیکن ۱۹۳۰ء میں مولانا کے بھانجہ سید محمود حسنؒ متوفی ۱۹۴۲ء کے گردہ کی تکلیف کے نتیجہ میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں آپریشن ہوا، جبکہ ان کی عمر ۹ سال کی تھی، اور وہ مولاناؒ سے بہت مانوس تھے اسپتال کے ماحول اور زندگی کی بے ثباتی کے مناظر نے مولانا پر بہت گہرا نفسیاتی اثر ڈالا، اسپتال کے اس قیام نے جو ایک طرح کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا، طبیعت میں اپنی اصلاح و ترقی اور تعلق باللہ کا ایک ہلکا سا شعور پیدا کیا، اور اس واقعہ نے جو بظاہر بہت بڑا نہیں تھا، زندگی کے لئے ایک موڑ کا کام کیا۔

علامہ تقی الدین ہلالی سے ادب و تفسیر میں استفادہ:- اسی زمانہ کی بات ہے کہ شیخ خلیل عربؒ کے مشورہ سے علامہ تقی الدین ہلالیؒ مراکشی کو جو ملک عبد العزیز والی حجاز سے کسی بات سے اختلاف کی وجہ سے ہندوستان آگئے تھے اور بنارس میں اپنے دوست مولانا عبد المجید حریری کے پاس مقیم تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء تدریس کے لئے بلایا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں ان کا باقاعدہ تقرر ہوا، مولاناؒ نے ان سے ان کی مجالس کے ذریعہ بہت استفادہ کیا لیکن باقاعدہ طریقہ پر ان سے "دیوان نابغہ" پڑھا، ان کے افادات نوٹ کئے، "شرح شذور الذہب" کی جماعت میں شرکت کی، ان کی تصنیف کردہ ناتمام تفسیر ان سے پڑھی۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص: ۱۱۶-۱۱۷)

اسی زمانہ میں ہلالی صاحبؒ اور سید صاحبؒ کی سرپرستی میں دار العلوم سے عربی رسالہ "الضیاء" کا اجرا عمل میں آیا، جس میں مولانا اور مولاناؒ کے دوست اور رسالہ کے ایڈیٹر مولانا مسعود عالم ندویؒ نے لکھنا شروع کیا۔

عربی میں سوانح نگاری کا فنی ذوق پیدا کرنے کیلئے برادر اکبر کی رہنمائی:- یہ ذکر کیا ہی جا چکا ہے کہ مولاناؒ کی تعلیم کا نظام ڈاکٹر صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں چل رہا تھا اسی زمانہ کی بات ہے

کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے مولانا کو مولوی محی الدین قصوری کا ایک مضمون "ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ" جو رسالہ توحید، امرتسر میں شائع ہوا تھا، عربی ترجمہ کے لئے دیا، اور یہ مشورہ دیا کہ پہلے عرب تاریخ وسیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں اور خاص خاص مطالب اور طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت پڑتی ہے نوٹ کرلوں، اس مقصد کے لئے مولانا نے ابن الاثیر کی "الکامل" کا مطالعہ کیا، اور خاص خاص الفاظ اور محاورے نوٹ کئے، اس کے بعد ترجمہ میں بڑی آسانی ہوگئی۔

اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے اخبار "ام القری" کا ایک شمارہ دیا جس میں حجاج کے لئے انجکشن اور ٹیکہ لگوانے کے سلسلہ میں ہدایات تھیں، تاکہ ان کا ترجمہ کر کے شائع کر دیا جائے، یہ خاص خاص اصطلاحات سے واقفیت کی تعلیم وتربیت تھی۔

مولانا کی انگریزی تعلیم کے اساتذہ:- مولاناؒ کی انگریزی تعلیم کا آغاز خلیل الدین صاحب ہنسویؒ جو محلہ میں رہتے تھے سے ہوا، رائے بریلی میں اپنے بڑے ماموں سید احمد سعید صاحب سے انگریزی پڑھی، پھر دارالعلوم میں ماسٹر محمد سمیع صاحب سے انگریزی پڑھی، پھر ۱۹۲۹ء میں محمد الفاروقی (ایم، اے، ایل، ایل، بی) جو لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے استاد تھے) کے پاس انگریزی پڑھنے کے لئے جانے لگے۔

انگریزی کا شوق اور والدہ کی نصیحت:- فاضل ادب پاس کر لینے کے بعد میٹرک پاس کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ وہ زمانہ تھا؛ جب بقول مولانا "مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا، اور اس کا بخار چڑھا میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لیں، ریاضی محلہ کے ایک استاد سے پڑھنی شروع کی، اور اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں ڈکشنری سے حل کر کے مطالعہ کرنے لگا، ابھی؛ امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہؒ کو اس انہماک کا علم ہوا، اور انہوں نے بڑے مؤثر اور دردمندانہ لہجہ میں خطوط لکھ کر مجھے؛ اس رخ سے باز رہنے کی تاکید کی۔

مولاناؒ کی تعلیمی زندگی میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات اور انگریزی سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کے بعد کس رخ پر جاتی عالم الغیب ہی اس کو جانتا ہے، لیکن بہرحال پھر وہ وہ ابوالحسن علی ندویؒ نہ ہوتے جنکا ہم ان سطور میں تذکرہ کر رہے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ تربیت کا کتنا گہرا ربط ہے، اور تربیت و تزکیہ کے بغیر تعلیم کا دھارا کدھر بہہ سکتا ہے، مشاہیر علمائے ہی نہیں عام اہل علم کی زندگی میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، ماں کی تربیت اور ذہن سازی کا ایک نمونہ اس موقعہ پر ذکر کر دینا ضروری ہے تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ بھائی صاحب اور والدہ صاحبہ انہیں کیا بنانا چاہتے تھے، اور الحمد للہ انہیں اس میں کس درجہ کامیابی حاصل ہوئی، والدہ صاحبہ خط میں لکھتی ہیں۔

میری سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی:- "علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو، اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو، جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ (اس سے مراد مولانا ابو محمد ابراہیم صاحب آروی مشہور اہل حدیث عالم ہیں جو مولانا کے نانا سید شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کے مرید اور ربانی حقانی عالم تھے) اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ (حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ) اور مولوی محمد امین صاحب (حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے خلیفہ) جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔

انگریزی مرتبے والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں۔

علی! اگر میری سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں۔ آمین ثم آمین یارب العالمین"۔

والدہ صاحبہ کے نصائح، اور ان کی دعاؤں کا یہ اثر ہوا کہ مولاناؒ کی طبیعت انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گئی، لیکن اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت نے اتنی استعداد پیدا کر دی کہ اسلامیات کے موضوع پر انگریزی کتابوں سے نہ صرف استفادہ کیا، بلکہ یورپ کے سفروں میں اس استعداد نے بڑا کام کیا۔ (کاروان زندگی ج ا ص: ۱۲۰-۱۲۳)

مولانا لاہوریؒ کے "درس حجۃ اللہ" میں:- مولانا ۱۹۳۰ء میں لاہور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے درس میں استفادہ کے لئے حاضر ہوئے، لیکن وہ وقت ان کے منظم درس کا نہیں تھا، جو شعبان سے ذیقعدہ تک چلتے تھے، لیکن مولانا نے ازراہ شفقت سورۂ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھایا۔

دوبارہ ۱۹۳۱ء میں "حجة الله البالغة" کے درس میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے، اور باقاعدہ شرکت کر کے امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

مولانا مدنیؒ کے درس حدیث میں:- جولائی ۱۹۳۲ء میں برادر اکبر کی خواہش اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایماء پر ان سے استفادہ کے لئے تعلیمی سال کے درمیان میں ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں مولانا دیوبند حاضر ہوئے، اور حضرت مدنیؒ کے درس بخاری اور درس ترمذی میں باقاعدہ شریک ہوئے، مولانا نے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کا رسالہ "تقریر دل پذیر" اور مولوی سید طفیل احمد منگلوری کی کتاب "حکومت خود اختیاری" پڑھنے کے لئے دی، قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کو سمجھنے کے لئے مولانا نے وقت مانگا، مولانا نے جمعہ کا وقت دیا، اس سلسلہ میں استفادہ بھی ہوا اور مولانا مدنیؒ کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا، درس حدیث کا حال یہ تھا کہ تعلیم کے اوقات کے علاوہ بعد عصر اور بعد عشاء بھی دیر رات تک جاری رہتا تھا۔

مولانا اعزاز علی دیوبندی سے استفادہ:- اس زمانہ میں مولانا کی ایماء پر مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے ملا علی قاریؒ شرح "نقایہ" بھی پڑھی، اور مولانا کو اس درس سے بہت فائدہ ہوا۔

علامہ انور شاہؒ کی مجالس میں:- حضرت علامہ انوار شاہ کشمیریؒ کی مجالس میں بعد عصر شرکت

کا موقع ملا، جب کہ وہ ڈابھیل سے تشریف لائے ہوئے تھے۔

کتابوں کے اختتام کے بعد امتحان سے پہلے مولانا دیوبند سے واپس تشریف لے آئے تھے۔

مولانا لاہوریؒ کے درس تفسیر میں:- دسمبر ۱۹۳۲ء میں مولانا مدرسہ قاسم العلوم لاہور کے باقاعدہ طالب علم بن گئے، مدرسہ کے شعبہ تفسیر میں مدارس کے فارغ طلبہ کو پورا قرآن مجید مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے طرز پر پڑھادیا جاتا تھا۔

یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا، ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا، اور جس کی باری آتی تھی، اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کئے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی ماخذ بتانا پڑتا تھا، ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا، مولانا کو ۹۸ نمبر ملے۔ (کاروان زندگی ج ا ص: ۱۲۸۔ ۱۳۳)

برادر اکبر کی رہنمائی میں عربی اخبارات سے استفادہ:- مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلیؒ کے نام ۱۹۲۶ء سے جب کہ وہ حج سے آئے تھے مکہ مکرمہ کا اخبار "ام القری" آتا تھا، دوسری طرف انھوں نے مولوی سید سعید اشرف صاحب سے جو اردو اخبار "ہمدم" میں عربی سے اردو ترجمہ کا کام کرتے تھے، یہ طے کرلیا کہ وہ اخبارات سے کام لینے کے بعد انہیں پہونچادیا کریں جو اخبارات ڈاکٹر صاحب کے پاس اس طرح آتے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

فتی العرب (دمشق) الجامعة الاسلامية (فلسطين)

ان کی عربی بڑی اچھی اور طاقتور ہوتی تھی۔ "الجامعة الاسلامية" کے افتتاحیے بڑے طاقتور فصیح وبلیغ اور آتشیں قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

مولاناؒ عربی ادب کی آخری کتابیں پڑھ چکے تھے، لیکن اخبارات پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی، ڈاکٹر صاحب ان کی رہنمائی کرتے، اور جدید تعبیرات اور اصطلاحات کی تشریح کرتے، اس سے انشاء وتحریر میں بڑی مدد ملی۔ دارالعلوم کی "جمعیۃ الاصلاح" میں اس وقت "المنار، الہلال، المقطف"

مجلّہ "الزهراء" "المجمع العلمی" اور "العرفان" وغیرہ عربی رسائل آتے تھے، ہلالی صاحب نے محب الدین الخطیب کا رسالہ "الفتح" بھی جاری کرادیا، اور اس رسالہ سے جس میں اس وقت بلند پایہ اسلامی الفکر اہل قلم امیر شکیب ارسلان وغیرہ کے مضامین ہوتے تھے، اور جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع رسالہ تھا، مولانا کا کہنا کہ ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہونچا۔ (کاراوانِ زندگی ج ا ص: ۱۲۵-۱۲۶)

مولانا کے تدریسی مضامین اور ان کا مولانا کی ثقافت پر اثر:- اس موقعہ پر مولانا کی ثقافت اور ٹھوس علمی بنیادوں کے سلسلہ میں اس کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے دوران تدریس کیا پڑھا، پڑھایا، قرآن مجید کے ابتدائی دس پارے، ترمذی شریف کا نصف ثانی، خضری بک کی تاریخ "العلوم الاسلامیة" کا پہلا حصہ، حماسہ کا "باب الادب والنسیبُ والمراثی" القراءة الرشیدة، "حکایات الاطفال"، تفسیر کے درس کیلئے "کشاف"، "معالم التنزیل، مدارك" تقریباً لفظاً لفظاً پڑھی، جدید تفاسیر میں "المنار" اور مولاناؒ آزاد کی "ترجمان القرآن" سے پورا استفادہ کیا، طلبہ کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی "روح المعانی" سے سب سے زیادہ مدد ملی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے لئے مولاناؒ عبدالماجد دریا آبادی سے مراسلت اور ملاقات کے ذریعہ استفادہ ہوتا رہا، ایک درجہ میں منطق بھی پڑھائی۔ جدید و قدیم منطقی اصطلاحات واصول کے مثالیں روزمرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے دیتے تھے، ڈپٹی نذیر احمد کی "مبادی الحکمۃ" سے مدد اور رہنمائی لی، تاریخ الادب العربی کا درس دیا، یہ پسندیدہ اور مانوس موضوع تھا، بخاری کے ابتدائی ابواب "کتاب الایمان اور کتاب العلم" کئی سال پڑھائے ایک سال مکمل بخاری پڑھانے کا آغاز ہوا، لیکن سفروں کی کثرت اور نظر کی کمزوری کی وجہ سے سلسلہ قائم نہیں رہ سکا۔

۱۹۴۰ء تک داعیانہ اور اقدامی عنصر کی کمی:- مولاناؒ کی تعلیم اور تعلیمی دائرہ کی تربیت کی اس مرحلہ پر آکر تکمیل ہوجاتی ہے، دعوتی اور تحریکی جذبہ و عمل اور روحانی تربیت اور تزکیہ کے مراحل سے ابھی گزرنا نہیں ہوا تھا، مولاناؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت تک ہمارا مطالعہ اور رجحان ایسے ادبی دائرہ میں محدود تھا جس میں اسلامی خیالات کی جھلک اور دینی حمیت کی آمیزش تھی، لیکن قلم واسلوب کا رخ ابھی دعوت کی طرف نہیں ہوا تھا، نہ مطالعہ میں وسعت اور خیالات میں عمیق پیدا ہوا تھا "الضیاء" رسالہ نے قلم میں روانی اور فکر میں جولانی ضرور پیدا کی، لیکن اس وقت بھی تحریر میں داعیانہ اور اقدامی عنصر پورے طور پر شامل نہیں ہوا تھا، یہ ۱۹۴۰ء کے بعد کی بات ہے مولاناؒ کی ثقافت کی تشکیل جن بنیادی کتابوں اور جن اساتذہ و مدرسین کے ذریعہ ہوئی میں نے اس کی کوشش کی ہے کے اس کا مولاناؒ ہی کے بیانات کی روشنی میں بڑی حد تک استقصاء ہو جائے، تاکہ جس تعلیم و تربیت اور ثقافت کے اثرات ہم ایک متوازن فکر اور جامعت کی شکل میں دیکھتے ہیں اس کے اصل اسباب اور عناصر معلوم ہوں، ظاہر ہے کہ کوئی مجموعہ بغیر اجزائے ترکیبی کے تیار نہیں ہوتا، ہم مجموعہ پر اجمالی اور تبصرہ اور تاثر تو ظاہر کرتے ہیں، اسکی افادیت اور تاثیر کی تعریف اور قدر بھی کرتے ہیں لیکن اس کی تقلید واتباع اور سابق نمونوں کو دہرانے کا کوئی واضح خاصہ نہیں بناتے ہم جس طرح کے اثرات چاہتے ہیں ضروری ہے کہ اس کی مناسبت سے ہم اس طرح کے موثرات بھی فراہم کریں، جن اہل علم کے علم سے ہم متاثر ہیں اور انکی جامعیت کے معترف انکے نصاب درس اس کی ترکیب اور اس سے استفادہ کے طریقوں پر غور بھی کریں قبل اس کے ہم مولاناؒ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بڑھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ کی علمی و دینی ثقافت کی تشکیل میں جس نصاب اور مطالعہ کی جن کتابوں نے اہم رول ادا کیا بلکہ ثقافت کی بنیادی ڈھانچہ تیار کیا اس کا ایک نقشہ ذیل میں دیدیں (**تسمیہ خوانی**) تکیہ کلاں رائے بریلی کے کسی بزرگ کے ذریعہ (**ناظرہ**) ناظرہ قرآن شریف، لکھنؤ میں حافظ محمد سعید صاحب امام مسجد محمد علی لین، گوئن روڈ کے ذریعہ (**اردو**) اردو کی ابتدائی کتابیں، مولوی اسماعیل میرٹھی کی، سفینۂ اردو مولوی اسماعیل میرٹھی کی (**فارسی**) فارسی کی پہلی، دوسری کتاب شائع کردہ: انجمن حمایت اسلام مدرس: مولوی محمود علی صاحب (**دنیات**) تعلیم الاسلام اور نور الایمان۔ مصنف والد صاحب۔ مولانا عبدالحئی صاحب۔

یہ نصاب ۹ سال کی عمر تک تھا۔ والد صاحب کی وفات ۱۹۲۳ء کے بعد:-

(**فارسی**) بوستاں، عم محترم سید محمد اسماعیل صاحب رائے بریلی (**اردو حساب**) ماسٹر محمد زماں خاں صاحب، رائے بریلی (**حفظ سور**) طوال مفصل یاد کرائی گئیں بذریعہ والدہ ماجدہ۔ (**مطالعہ**) سیرت خیر البشر، سیرت رحمتہ للعالمین۔

پھر لکھنؤ میں تعلیم اس نہج پر رہی:-(**فارسی**) اصول فارسی، مصنفہ مولانا فاروق چریاکوٹی (**انگریزی**) انگلش ریڈر برادر اکبر ڈاکٹر صاحب نے خود پڑھائی (**انگریزی**) انگلش ریڈر خلیل الدین صاحب ہنسوی، سید سعید احمد صاحب (مولانا کے ماموں) (**عربی**) مشق گردان: شیخ خلیل عرب صاحب (المطالعة العربية. الطريقة المبتكرة. مدارج القراءة. كليلة و دمنة. مجموعة من النظم و النثر)۔ عربی بولنے کی مشق۔ (**قواعد**) الضریری مولفہ ابوالحسن الضریری، میزان منشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج، شیخ خلیل عربؒ سے۔

اس کے بعد نصاب اس طرح رہا:-(**عربی زبان**) نہج البلاغۃ، مقامات حریری، دلائل الاعجاز، عشر قصائد: شیخ خلیل عرب (**عربی قواعد**) عم محترم مولانا طلحہ صاحب (**مطالعہ اردو**) الفاروق، آب حیات، نیرنگ خیال، مومن، غالب، ذوق، آتش اور امیر مینائی کے اشعار۔ ماموں زاد بھائی، سید حبیب الرحمٰن صاحب سے۔ مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم، رتن ناتھ سرشار کی کتابیں پڑھیں۔ الہلال کے فائل دیکھے؛ یادایام؛ مولفہ والد محترم پڑھی، زمیندار؛ اخبار کے سنڈے ایڈیشن سے دلچسپی لی۔ (**تفسیر**) آخری پارہ کی کچھ سورتوں کی تفسیر۔ خواجہ عبدالحی فاروقی سے ۱۹۲۷ء میں (**عربی زبان**) فاضل ادب، لکھنؤ یونیورسٹی کا نصاب۔ (**حدیث**) فاضل حدیث، لکھنؤ یونیورسٹی کا نصاب ۱۹۲۹ء (**انگریزی**) محمد الفاروقی صاحب سے۔ (**ریاضی**) محلہ کے استاذ سے۔ (**فقہ**) ۱۹۳۰ء مولانا شبلی جیراجپوری اعظمی سے حدیث صحیحین وسنن ترمذی مولانا حیدر حسن خاں (**تفسیر**) سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ۔ مولانا حیدر حسن خاں (**منطق**) مولانا حیدر حسن خاں (**عربی ادب**) دیوان نابغہ، قواعد، شرح شذور الذہب

علامہ تقی الدین ہلالیؒ سے۔ اواخر ۱۹۳۰ء میں (**تفسیر**) سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ۱۹۳۱ء میں، حکمت شریعت حجۃ اللہ البالغۃ مولانا احمد علی لاہوری سے ۱۹۳۲ء میں (**حدیث**) بخاری وترمذی کے ابواب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے۔ (**مطالعہ**) "تقریر دل پذیر" مولانا قاسم نانوتوی، "حکومت خود اختیاری" مولوی سید طفیل احمد منگلوری سے۔ (**تفسیر**) حل مشکل آیات مولانا مدنی سے۔ (**فقہ**) شرح نقایہ: مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے۔ اواخر ۱۹۳۲ء میں۔ (**تفسیر**) مکمل قرآن مولانا احمد علی لاہوریؒ سے۔

دوران تدریس جن کتابوں کو پڑھایا:- (**عربی زبان**) القراءۃ الرشیدہ، حکایت الاطفال، حماسۃ کا باب الادب، حماسہ کا باب النسیب والمراثی (**تفسیر**) ابتدائی دس پارے۔ مطالعہ تفسیر کشاف، معالم التنزیل، مدارک، تفسیر المنار، ترجمان القرآن، روح المعانی، تفسیر ماجدی کے مختلف حصے۔ (**حدیث**) ترمذی شریف، بخاری کے ابواب (کتاب الایمان، کتاب العلم) (**تاریخ**) خضری بک کی تاریخ العلوم الاسلامیۃ۔ (**منطق**) مطالعہ مبادی الحکمۃ، ڈپٹی نذیر احمد صاحب۔ (**مطالعہ کی دیگر کتابیں**) ۱۹۳۶ء اردو: وقائع احمدی، وقائع حضرت سید احمد شہیدؒ، علامہ اقبال کی ضرب کلیم، بال جبریل، اسرار خودی، رموزے بے خودی، پیام مشرق وغیرہ، جاوید نامہ، زبور عجم۔

۱۹۳۸ء عربی: فجر الاسلام، ضحی الاسلام، ظہر الاسلام، (ڈاکٹر احمد امین)، زعماء الاصلاح (ڈاکٹر احمد امین)، حاضر العالم الاسلامی (امیر شکیب ارسلان)، مؤتمر أم القریٰ (عبدالرحمن الکواکبی)

تراجم: معرکہ مذہب وسائنس (ڈریپر)، تاریخ اخلاقیات یورپ (لیکی)، سقوط وزوال روملگبن)، تاریخ فلسفہ جدید (ہوفڈنگ)، ترکی میں مغرب ومشرق کی کشمکش (خالدہ ادیب خانم)، Islam at the Cross Road (طوفان سے ساحل تک) محمد اسد، تلاش حق (گاندھی جی)، میری کہانی (جواہر لال نہرو)، مسلمانوں کا روشن مستقبل (مولانا طفیل احمد)، ترجمان القرآن کے مضامین (مولانا مودودیؒ)

دعوتی اور تحریکی عناصر کی تلاش:- بہر حال اس سرسری جائزہ کے بعد اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مولاناؒ میں دعوتی اور تحریکی عنصر کو کہاں کہاں سے غذا ملی، ان کے اندر فکری و موروثی جو خصائص موجود تھے، اور جن کو پروان چڑھانے میں گھر کا ماحول بہت اہم اور بنیادی لیکن خاموش عنصر کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کو ترقی کے مواقع کس طرح میسر آئے۔

مولانا کے بچپن میں فتوح الشام کے منظوم ترجمہ کا رواج:- مولانا نے بچپن میں اپنے خاندان کے ایک دستور کا ذکر فرمایا ہے کہ جب بھی کوئی غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوتے، یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو واقدی کی "فتوح الشام" کا منظوم ترجمہ "صمصام الاسلام" (جو مولانا کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کے نظم کردہ پچیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا) پڑھا جاتا، یہ مجموعہ جوش و خروش سے بھرا ہوا اور درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے ہیں کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے، اور نبض تیز ہو جاتی، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے کہ خود راہ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہو جاتا۔

مولاناؒ کی بڑی خالہ صالحہ بی جو حافظہ قرآن بھی تھیں، اس کو بڑے پر اثر اور دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، بچے کبھی کھیلتے کھیلتے، سننے کے لئے ٹھہر جاتے، کبھی مائیں بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر سناتیں۔

ایمانی جوش کا پہلا بیج:- دینی حمیت، ایمانی جوش و خروش، شوق شہادت، اسلام کی سربلندی کے لئے تحریک قربانی کا غالباً معصوم عہد طفولیت میں سب سے زیادہ مؤثر بیج یہیں سے پڑا ہوا گا۔

دوسرا تحریکی نقش:- دوسرا تحریکی نقش تحریک خلافت کا تھا، مولاناؒ کی عمر اگرچہ اس وقت آٹھ سال کی تھی، لیکن اس تحریک کے شور، اور طوفان نے ان کی اندرون کی دنیا بھی ہلا دی تھی، مولانا لکھتے ہیں:

"میرے شعور کا آغاز ہی تھا اور میری عمر آٹھ سال کی ہو چکی تھی کہ تحریک خلافت کا لاوا ہندوستان میں پھوٹ پڑا۔

ہندوستان ایک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، بڑے چھوٹے، بوڑھے بچے، مرد و عورت کی زبان پر یہ شعر تھا۔

بولی اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پر دیدو

شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے، امین الدولہ پارک میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے ملے تھے، اور ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی ہوتی تھی ان کو پاؤں سے روندتے، اپنے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

والد صاحبؒ اگرچہ نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے، لیکن تحریک خلافت کی تائید وحمایت میں انہوں نے تھی ایک اپیل شائع کی، جسکا مجھے اپنے بچپن میں دیکھنا یاد ہے، اسی جذبہ کے تحت انہوں نے اس زمانہ میں اس گورنمنٹ گرانٹ کو بند کر دیا جو ندوہ کو ملتی تھی، مولانا محمد علیؒ کی والدہ "بی اماں" جب اپنے دورہ کے سلسلہ میں رائے بریلی آئیں تو والدہ صاحبہؒ سے ملنے اور تعزیت کرنے "جو ایام عدت میں تھیں" تکیہ تشریف لائیں، خاندان کے بزرگوں کا ان کو تخت پر بٹھا کر اور خود اٹھا کر ہمارے گھر لانا ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ (کاروان زندگی ج ا ص: ۷۲۔۷۴)

تعدیہ کی صلاحیت کا فقدان:- مولانا جس وقت دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے اس وقت وہاں کوئی دینی ودعوتی فضا موجود نہ تھی، اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بقول، مولانا "خود ہم اساتذہ کا ذوق وذہن دعوتی نہیں بنا تھا، ہم میں سے جو لوگ دینی ذوق رکھتے بھی تھے، اور خوش اوقات اور معلومات کے پابند تھے، ان میں بھی تعدیہ کی صلاحیت اور طلبہ میں دینی واصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی، ساری فضا پر علمی وادبی تحریری وتقریری ذوق سایہ فگن تھا۔" (کاروان زندگی ج ا ص ۱۵۲)

ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام:- اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شیخ خلیل عربؒ اور برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے جن کو غیر مسلموں میں دعوت دین کی بڑی فکر رہتی تھی، اور وہ اس کی کوشش کسی نہ کسی طرح کرتے رہتے تھے، مولاناؒ کو مامور کیا کہ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے پاس ممبئی جائیں اور ان کے سامنے

دعوت اسلام پیش کریں، ڈاکٹر امبیڈکر اس وقت بمبئی کے (Law) لا کالج کے پرنسپل تھے، ان کے بارے میں اخبارات میں چرچہ تھا کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں، مولانا کی عمر اس وقت اکیس سال کی تھی، مولانا انگریزی کی کچھ تبلیغی کتابیں، اور سیرت کمیٹی پٹی (جس کے "روح رواں" عبدالمجید قریشی صاحب تھے، اور ان کی جماعت بڑی مستعد کارکن اور دعوتی کاموں میں (پیش پیش تھی) کے رسائل اور پکتھال صاحب کا ترجمۂ قرآن لیکر گئے، ڈاکٹر امبیڈکر سے مولاناؒ نے ملاقات کی اور یہ کہا کہ تاریخ میں یہ پہلا ہے اور شاید آخری، اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئیگا، آپ پوری قوم کو نجات دے سکتے ہیں، مسلمان اس گئی گزری حالت میں بھی بڑے سے بڑا امتحان دے سکتے ہیں اسلام کی مساوات پر بھی گفتگو کی۔

علیگڑھ کا پہلا سفر:- ۱۹۳۶ء میں مولاناؒ نے وفد ندوہ کے ساتھ علیگڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی، یہ علی گڑھ کا پہلا سفر تھا۔

تحریک شہیدین سے ربط اور زندگی کا نیا دور:- تحریک شہیدین (جس کا خون مولاناؒ کی رگوں میں تھا، اور جس کی روایات خاندان میں سید قطب الدین مدنیؒ کے دور جہاد سے قائم رہیں) سے ۱۹۳۱ء میں پہلا ربط تو اس طرح ہوا کہ مولوی محی الدین قصوریؒ کے مضمون "تیرہویں صدی کے مجدد اعظم" کا عربی ترجمہ "ترجمۃ الامام السید احمد الشہید" کے نام سے تیار کیا، جو بعد میں مصر سے شائع بھی ہو گیا، اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۱۶ سال تھی۔

پھر جس تحریر نے مولاناؒ کو سید صاحب کی شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر اور متعارف کیا وہ مولاناؒ کے والد کی کتاب "دہلی اور اس کے اطراف" کا سفر نامہ اور روزنامچہ تھا جس کا نام انہوں نے "ارمغان احباب" رکھا تھا۔

مولاناؒ کے رفیق مولانا مسعود عالم صاحبؒ اپنے مسلک اور خیالات اور صادق پور پٹنہ کے اثر سے سید صاحب اور ان کی جماعت کے بڑے معتقد تھے، دونوں ساتھیوں کے درمیان طے ہوا کہ مولاناؒ

ان کی سوانح اور تاریخ پر کام کریں اور مولانا مسعود صاحبؒ ان کی تحریک اور جماعت کا تعارف کرائیں۔

۱۹۳۶ء میں مولاناؒ نے اپنے مشفق استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے ساتھ ان کے وطن ٹونک کا سفر کیا، اور وہاں اپنی چچی (اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحب مرحوم جو سید صاحب کے پرنواسہ سید محمد یونس صاحب کی بیٹی تھیں) کے گھر سے سید صاحب کے حالات و وقائع کا سب سے زیادہ مستند و ضخیم مرقعہ "وقائع احمدی" کئی جلدوں میں ملا اس سفر میں مولاناؒ نے بندوق کی بھی مشق کی۔

اسی سفر میں مئی ۱۹۳۶ء کی ایک صبح دریائے باس کے کنارے بیٹھ کر اور اس میں پیر ڈال کر "سید صاحب" کی سیرت پر ایک اجمالی نظر کے عنوان سے سیرت سید احمد شہیدؒ کا مقدمہ لکھا، مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا۔

اقبال کی "ضرب کلیم" کا سحر:- ۱۹۳۵ء تک مولاناؒ علامہ اقبالؒ کے کلام و پیام کے زیادہ گرویدہ و شیفتہ نہیں تھے لیکن ان کے نظر جب "ضرب کلیم" پر پڑی تو بقول مولاناؒ آنکھیں کھل گئیں، اور ان کے کلام کی بلندی اور تاثیر سے مسحور ہوگئے، لیکن بال جبریل پڑھ کر اس سے زیادہ متاثر ہوئے، اس میں خیالات کی رفعت و جدت کے ساتھ ترنم اور حلاوت جرس زیادہ تھی، پھر اسرار خودی اور رموز بے خودی مثنوی پس چہ باید کرد اے، قوام شرق، پیام مشرق اور بعد میں "جاوید نامہ" "زبور عجم" کا مطالعہ کیا، اور ذہن و قلب نے ان کا وہ اثر قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت (جہاں تک ادب و شاعری و فکر کا تعلق ہے) کا اثر قبول نہیں کیا تھا۔ (کاروان زندگی، ج ا ص: ۱۷۴-۱۷۶)

اقبال سے تاثر کے اسباب:- اقبال سے تاثر کا سبب یہ تھا کہ انکے خیالات و افکار، ان کے سوز و ساز کا سرچشمہ ہماری دسترس سے باہر تھا، اور اس کا تعلق، ذہانت، علم اور وسعت مطالعہ سے نہیں "فیضان" سے ہے۔

سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا

حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے۔ اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا،

مولاناؒ کی فطرت کے تین عناصر:- میں اپنی فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہو، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت:- ۱۹۳۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۹/انیسواں اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تو مولانا نے اس میں ندوہ کی نمائندگی کی، اس موقعہ پر صادق پور کی زیارت کی جو سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

(کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۷۹-۱۸۰)

غیرت ایمان کا شعلہ:- ۱۹۳۹ء میں مولانا کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" طبع ہو کر آئی، مولانا نے اس کتاب میں صرف حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعارف ہی نہیں کرایا جن کو مسلمانان ہند کا حافظہ رفتہ رفتہ فراموش کر چکا تھا، اور جن کے بارے میں اچھے خاصے تعلیم یافتہ اصحاب کی معلومات بھی بہت سطحی تھیں، بلکہ اس کتاب میں مولاناؒ نے سید صاحب کی دعوت و تحریک کے وسیع تر اور بلند تر مقاصد، ان کی جماعت کی ایمانی کیفیات، اخلاقی خصوصیات، ان کی حیرت انگیز تنظیم، جدوجہد اور قربانیوں کا تعارف کرایا، سید صاحب کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں، اور انگریزوں کے ظلم و ستم اور انبالہ جیل اور انڈمان کے مظلومین کے صبر واستقامت کی داستان بھی سنائی، جو حد درجہ اثر انگیز، ایمان آفریں اور سبق آموز تھی، اور جس کو پڑھ کر سرد سے سرد دل میں حرارت ایمانی، غیرت اسلامی کا شعلہ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ (کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۸۶-۱۸۹)

درس کی عدم تاثیر سے بے چینی:- مولانا کا ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک جو دور تدریس رہا اس میں ان کی سب سے بڑی لذت اور دلچسپی طلباء کو پڑھانے اور ان میں قرآن مجید اور ادب عربی کا ذوق

پیدا کرنے میں تھی، لیکن آخری دنوں میں یہ احساس ستانے لگا کہ جس دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی جاتی ہے، اس کے بقدر طلباء پر فائدہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا، بعض مرتبہ خیال ہوتا تھا کہ آج کے درس سے شاید در و دیوار پر بھی نشان پڑ گئے ہوں گے، لیکن نوجوان طلباء کے دل و دماغ پر اس کے نقوش مرتسم نظر نہیں آتے تھے۔

اسی کے ساتھ یہ احساس بھی ابھرنے لگا کہ کسی صالح تحریک دعوت اور طلباء کی صحیح خارجی مشغولیت کے بغیر پند و موعظت کا کام اور تعلیمی و تربیتی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔

تحریکی مطالعہ :- دوسری طرف مولاناؒ کا مطالعہ اس وقت ان کے بقول تفسیر و حدیث اور تاریخ و ادب کے دائرہ تک محدود تھا۔ ۳۷-۱۹۳۸ء سے یہ مطالعہ اپنے خول سے باہر نکل آیا۔

ڈاکٹر احمد امین کی فجر الاسلام، ضحی الاسلام (۱-۲-۳) ظہر الاسلام، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث کے اسلوب اور تحلیل و تجزیہ نے بہت متاثر کیا، امیر شکیب ارسلان کی "حاضر العالم الاسلامی" کے پر از معلومات او اسلامی روح سے معمور حواشی، عبدالرحمٰن الکواکبی کی فکر انگیز کتاب "مؤتمر أم القری" اور "الفتح" رسالہ کے ولولہ انگیز مضامین نے فکر و نظر میں وسعت پیدا کی، اور عالم اسلامی اور اسکے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی لینے کا سامان پیدا کیا۔

مطالعہ سیاسیات و سماجیات :- جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات کا اور اس کے ساتھ سیاسیات کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ بھی اسی دور میں شروع ہوا، اور بعض فکر انگیز اور معلومات افزا کتابیں جنہوں نے بعد کی تحریروں اور مضامین کے لئے مستحکم بنیادیں اور قیمتی مواد فراہم کیا، نیز مغربی تہذیب اور نظام حیات کے تشکیلی عناصر اور پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی۔ مثلاً ڈریپر کی کتاب Conflict Between Religion & Scince کا ترجمہ معرکۂ مذہب و سائنس، مولانا ظفر علی خاں کے جادو نگار قلم سے لیکی کی کتاب History of European Morals کا شستہ ترجمہ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے قلم سے گبن کی شہرۂ آفاق کتاب Declino & fall

Roman Empire کے بعض حصوں کا براہ راست مطالعہ۔ ہوفڈنگ کی "تاریخ فلسفۂ جدید" خالدہ ادیب خانم کی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش"۔ اسی زمانہ میں نو مسلم فاضل محمد اسد کی معرکۃ الآراء کتاب Islam at the Cross Road تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی، اور ان کے پر از اعتماد، اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوشٹ مارٹم اور اس کے اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔

اسی زمانہ میں گاندھی جی کی "تلاش حق" جواہر لال نہرو کی سرگذشت "میری کہانی"، مولانا طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" دیکھی، جس سے جزوی طور پر ذہن نے فائدہ اٹھایا، اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں مولانا مودودیؒ کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں ان کا مضمون "آنے والا انقلاب" پڑھا، اور ذہن نے اس کا تاثر قبول کیا۔

ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا، اور فطرت کی بعض خوابیدہ صلاحیتوں کے بیدار ہونے میں مدد دی۔

مولانا مودودیؒ سے تاثر:- ہندوستان کے مسلمان اس وقت دعوت و اقدام اور قوت و شوکت کے پیغام سننے کے لئے بیتاب تھے، ان میں ہر ایسی تقریر تحریر سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی، جو بلند سطح سے ان کو خطاب کرے ان کی ملی خودی کو غذا پہونچانے، مغربی تہذیب اور ہندوستان کی قومیت متحدہ میں تحلیل ہو جانے کی دعوت پر ضرب لگائے، مسلمانوں کو ان کے قائدانہ مقام سے آگاہ کرے اور ثابت کرے کہ اسلام ہی میں زندگی کے تمام مسائل کا حل اور انسانیت کے تمام مصائب کا علاج ہے۔

اس ضرورت اور اس خلاء کو اس وقت اور اس ماحول میں سب زیادہ مولانا مودودیؒ نے پورا کیا، مولاناؒ کے مضامین و رسائل "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" "پردہ" "سود" جیسے مضامین جو ترجمان القرآن میں شائع ہو رہے ہیں ملت کے باشعور طبقہ کے دل کی

ترجمانی کر رہے ہیں اور اسی طبقہ کیلئے اس میں بڑی کشش تھی، مولانا کے پاس طاقتور قلم اور زوردار زبان تھی۔

اس زمانہ تک مولانا مودودیؒ کی وہ تشریح و تفہیم دین بھی سامنے نہیں آئی تھی جس پر سیاسی تصور غالب ہو، نہ قدیم اصلاحی تجدیدی شخصیتوں پر تنقید سامنے آئی نہ بعض معاصر مقتدر علماء پر طنزیہ تبصرے آئے تھے۔

مولانا منظور نعمانی سے مناسبت و ربط:- مولانا کی مولانا مودودیؒ سے اسی زمانہ میں مراسلت شروع ہوئی، یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مولاناؒ نے اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہید" کا ایک نسخہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کو بھیجا جن سے لکھنؤ میں متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں، اور مناسبت و ربط پیدا ہو چکا تھا۔

مولانا منظور نعمانیؒ نے کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے یہ سوال کیا کہ آپ کی یہ تصنیف برائے تصنیف ہے یا کچھ اور کرنے کا بھی ارادہ ہے۔

مولاناؒ کا اس پر جو ردعمل تھا، وہ ان ہی کے الفاظ میں پڑھئے:

> "جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے شرما حضوری میں لکھ دیا کہ کیوں نہیں؟ اگر مجھ سے کوئی خدمت بن آئے تو میں تیار ہوں، میرا مزاج فطرتاً و وراثتاً تحریکی نہیں تھا، لیکن بہر حال خاندانی اثرات، اور سید صاحبؒ کی نسبت سے دینی حمیت و غیرت کا کچھ حصہ ضرور ملا تھا، اور عملی طور پر تو میں نہیں لیکن نظری طور پر "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" پر "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" کی فضیلت و برتری قلب و دماغ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔"

قیادت سے معذرت:- مولانا منظور نعمانیؒ کے ذہن و دماغ پر اس وقت خاکسار تحریک کے مقابلہ میں اور اس کے متوازی ایک تنظیم قائم کرنے کا خیال غالب تھا، ان کے نزدیک اس کے بغیر حوصلہ مند نوجوان کو خاکسار تحریک کے مضر اثرات سے بچانے کی کوئی صورت نہیں تھی، ان کی نظر مولانا کی کتاب کے مطالعہ کے بعد مولانا پر پڑی کہ وہ اس تحریک کی قیادت کریں، لیکن مولانا نے بقول خود اپنی جسمانی کمزوری، قائدانہ صلاحیت سے محرومی اور غیر تحریکی مزاج کی وجہ سے صاف لفظوں میں معذرت کر دی، اور طلب پر یہ مشورہ دیا کہ حاجی عبدالواحد صاحب ایم، اے اس کے لئے موزوں ہیں۔

تحریک کی تلاش:- اس مشورہ کے بعد دونوں رفقاء اگست ۳۹ء میں حاجی صاحب سے ملنے کے لئے بلوچستان کے فورٹ سنڈیمن جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ سفر کی پہلی منزل لاہور تھی، جہاں مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاں قیام رہا، اور مولانا کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ صاحبؒ کے ساتھ مولانا مودودیؒ سے ملنے گئے، لاہور سے کوئٹہ جانا ہوا، وہاں ایک دن ٹھہر کر فورٹ سنڈیمن (Fort Sandeman) پہونچے، وہاں ایک اسکول میں حاجی صاحب ہیڈ ماسٹر تھے ان سے مل کر یہ طے ہوا کہ تینوں کسی تنظیم و تحریک کی تلاش میں نکلیں، چند ماہ پیشتر مولانا مودودیؒ کا ایک طاقت ور اور مؤثر مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک ودعوت کے سلسلہ میں نکل چکا تھا اور تینوں رفقاء اس کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔

تبلیغی جماعت سے تاثر:- ۱۹۳۹ء کی آخر تاریخوں میں تینوں رفقاء نے ضلع سہارنپور اور دہلی کے دورہ کا پروگرام بنایا، پہلے سہارنپور پہونچے، پھر رائے پور گئے، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی، انہوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا، اور اس کام میں ممکن تعاون کا یقین دلایا، اور یہ بھی فرمایا کہ یہ جگہ بھی حاضر ہے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوریؒ سے اس نو مسلم کو بھی ملایا جو بعض تنظیمی کوششیں کر چکے تھے، لیکن یہ مشورہ دیا کہ حضرت دہلی (مولانا الیاس صاحبؒ) کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں، رائے پور سے دہلی حاضری ہوئی، میوات جانا ہوا، مولانا نے اس کام کا جو کچھ اس پہلے سفر میں مشاہدہ کیا اس کے تاثرات ان کی زبانی سنیئے:

> "اس سفر میں ہم نے جو حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی ہوئی وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تبلیغی کام اور نظام ہے، ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح اور انقلاب حال اور قرن اول کے نو مسلموں کے جوش وجذبہ اور تبلیغ کے ذوق وشوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام پڑھے تھے، گوڑگانواں کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شہاپوری کی یہ گلیوں میں اس کا نمونہ دیکھا، واقعہ یہ ہے کہ یہ چشتی درویش اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور

(حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی "اشاعت اسلام" اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہید رائے بریلویؒ کی "حفاظت اسلام" کی سنت زندہ کر رہا ہے۔" (کاروان زندگی، ج ا ص ۲۲۷-۲۴۱)

جماعت اسلامی کی رکنیت اور انقطاع:- یہ نقش اول جو مولاناؒ کے دل پر حضرت دہلی کی تحریک کے مشاہدے سے قائم ہوا، بتدریج گہرا ہوتا گیا، لیکن مولانا مودودیؒ جن کے مضمون سے متاثر ہو کر ہی یہ دورہ کیا گیا تھا، ان کے قلم اور فکر کا جادو ایسا تھا کہ مولانا ۱۹۴۱ء کے شروع میں جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن بن گئے اور جماعت لکھنؤ کے ذمہ دار۔ ۴یا۵ر جنوری ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کی لکھنؤ اور ندوہ آمد کے موقع پر انتظام مولانا کے ہاتھ میں ہی رہا، دوبارہ جب ان کی آمد لکھنؤ ہوئی تو انہوں نے جمعیۃ الاصلاح ندوہ میں اپنا مقالہ "نیا تعلیمی نظام" اور لکھنؤ یونیورسٹی میں "نوع انسانی کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے پڑھا۔ فروری ۴۲ء میں مولاناؒ نے جماعت کی مجلس عاملہ کے لاہور میں بھی شرکت کی، اور جماعت کے اختلاف کے موقع پر مولانا نے مولانا مودودیؒ کے حق ہی میں ووٹ دیا، اکتوبر ۴۲ء میں جماعت کی دوسری مجلس انتظامیہ دہلی میں بھی مولانا کی شرکت ہوئی، اور علی گڑھ بھی سفر ساتھ ہوا، جہاں دونوں کا اولڈ بوائز لاج میں ساتھ قیام رہا اور وہاں مولانا کی مقبولیت دیکھی۔

لیکن تین سال جماعت کی ذمہ داری نباہنے کے دوران مولانا کے اندر تین احساسات پیدا ہوئے۔

۱- مولاناؒ کے بارے میں جماعت کے افراد کے اندر غلو پیدا ہوتا جارہا ہے اور یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہی دین کو سمجھا۔

۲- ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جارہا ہے۔

۳- ان کے اندر دین کے ذوق و عمل کی کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ، اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔

ان احساسات کے نتیجہ میں مولاناؒ کی طبیعت افسردہ رہنے لگی، تحریریں پڑھ کر جو تاثر ہوتا تھا،

ملاقات اور زیادہ دیر ساتھ رہنے میں اس انجذاب اور وابستگی میں کمی محسوس ہوتی تھی۔

شاید یہ خاندانی اثر تھا کہ طبیعت کسی نمایاں باطنی اور روحانی کشش کے بغیر کسی شخصیت کی زیادہ گرویدہ نہیں ہوتی، اس کے برعکس مولانا کا تعلق مولانا الیاسؒ سے جتنا بڑھتا گیا، (جو مولانا کو مزاج نبوت، سیرت نبوی اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے) تو ذہنی کشمکش بڑھتی چلی گئی اور بالآخر مولانا، مولانا مودودیؒ کو اپنی اس کشمکش کی اطلاع دے کر ادھر سے یکسو ہو گئے۔

مولانا الیاس صاحبؒ سے تاثر کی جذبی کیفیت

مولانا کا جو سفر دہلی جنوری ۱۹۴۰ء میں حاجی صاحب کے ساتھ ہوا تھا اس وقت مولانا الیاس صاحبؒ سہارنپور گئے ہوئے تھے، مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ نے دونوں کو قصبہ نوح ضلع گوڑگانواں کے ایک تبلیغی اجتماع میں بھیج دیا تھا۔ جس کے تاثرات ابھی آپ پڑھ چکے تھے، مولانا کے ذہن و دماغ پر تحریک کا اتنا گہرا، طاقتور اور کیفیت جذب والا اثر پڑا تھا کہ حاجی صاحب کے ساتھ نئی دہلی کچھ دیر کے لئے جانا ہوا، اور مولانا کو ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑا، تو کیفیت یہ تھی "میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم، لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی اور میں اس سے ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر نظام الدین کی طرف دوڑوں، اسی کے ساتھ دعا و انابت کی بھی ایک ایسی حالت پیدا ہوئی جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے، میں نے اپنے کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑا ہے۔

"سب سے پہلے جس چیز نے ہم لوگوں کو متاثر کیا اور جس کا کم سے کم اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا وہ مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی۔

پھر مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔

میں لکھنؤ واپس آگیا، لیکن دل کا حال وہ تھا جو شاعر نے بیان کیا ہے ؎

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

مولانا الیاس صاحبؒ کی ملاقات اور ان کی تحریک و جماعت سے تاثر اور کیفیت جذب

والجذاب کے تجربے نے ضرور مولانا میں یہ احساس پیدا کیا ہوگا، کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے یہی اثرات تھے جن کو انہوں نے ان کی سیرت میں نظری طور پر لکھا تھا اور اب وہ عملی طور پر اپنے باطن میں ان کا تجربہ کر رہے ہیں۔

تبلیغی محنت کا آغاز:- اس کا ہی یہ اثر تھا کہ لکھنؤ واپس آکر مولانا نے اپنے چند سعادت مند اور تعلق والے طلبہ کو لے کر لکھنؤ کے نواحی محلہ کا دورہ کیا۔ اور دوروں کی روداد لکھ کر بھیجنے لگے، جوابات نہایت ہمت افزائی دلجوئی اور قدر افزائی کے آنے لگے۔

مولاناؒ کا بیان ہے کہ یہ خطوط جب ملتے تو میں ان کو اتنی بار پڑھتا کہ اس سے بہت سا حصہ یاد ہو جاتا اور عرصہ تک جیب میں پڑے رہتے اور لوگوں کو سنانے کی وجہ سے مل دل جاتے۔

مولانا ندویؒ کو حضرت دہلویؒ کے ساتھ جو مناسبت اور انجذاب محسوس ہوا اس میں اس کو دخل تھا کہ مولانا "مکتوب امام ربانی، ازالۃ الخفاء، صراط مستقیم اور منصب امامت" پڑھ چکے تھے، اور ذہانت مطالعہ وسعت علم، اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کے رد عمل اور کثرت عبادت وانابت ودعا قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور ہدایت ربانی کے فرق کو خوب سمجھ چکے تھے، مولانا الیاس صاحبؒ کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی۔ ؎

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفاں انچہ کرد آن نرگس مستانہ کرد

دوسری طرف حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت کی وجہ سے خصوصی عنایت۔ اور قرب واختصاص کا وہ معاملہ رہا جس کا تجربہ مولانا کو کہیں اور نہیں تھا، تیسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت علماء فضلاء اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے، ایسے وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک مدرس اور طلباء کا متوجہ ہونا قابل قدر تھا۔

دارالعلوم میں نیا دینی رنگ:- تبلیغی تحریک سے اس ربط اور اس کے شدید تاثر اور صاحب تحریک کی بے انتہا عقیدت اور ان کی طرف بے اختیارانہ انجذاب نے مولانا کو پورے جوش و خروش اور ایمان واحتساب کی کیفیت کے ساتھ اس کام لگادیا، اس کا اثر مجموعی طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء اور ماحول پر کیا پڑا خود مولانا کے الفاظ میں:۔

"دارالعلوم میں ایک نیا دینی رنگ پیدا ہوا، بلکہ ایک نیا دور شروع ہوا جس کو ندوۃ العلماء کی تحریک کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔" (کاروانِ زندگی ج ا ص ۲۸۳-۲۸۵)

اس نقل و حرکت سے دینی واصلاحی فوائد نمازوں میں ترقی، ذکر و شب بیداری کی توفیق کے علاوہ طلباء کو اور بیش قیمت فوائد پہونچے، جن میں سادگی اور جفاکشی، ربط و تعارف، اساتذہ سے ذاتی تعلق، اپنی کمزوریوں کا علم، عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت کا علم اور دینی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا، اور اسی نقل و حرکت میں بعض طلباء سے ایسا ربط و تعلق پیدا ہوا جو بعد میں دینی کاموں اور دارالعلوم کی ترقی میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا۔ (ایضاً ج ا، ص: ۲۸۶-۲۸۷)

دارالعلوم کی ملازمت سے علیحدگی:- اس تحریک سے تاثر اور اشتغال اور اس میں روز افزوں انہماک کا ہی یہ اثر تھا کہ مولانا نے ۵/نومبر ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ملازمت تدریس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تاکہ دعوتی کاموں کے لئے اپنے کو فارغ کر لیں۔

عالم عربی کا تبلیغ دورہ:- ۱۹۴۶ء میں مولانا الیاس صاحبؒ کی وفات ہو چکی تھی، اور اب جماعت کی امارت حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے کاندھوں پر تھی، ان میں حضرت دہلوی کی نسبت پوری طرح منتقل ہو چکی تھی، ان کی امارت میں تحریک عالم عربی اور یورپ تک پہونچی، مولانا یوسف صاحبؒ نے جون ۱۹۴۷ء میں مولانا کا سفر حجاز دعوتی مقاصد کے لئے طے کر دیا، اور پھر سفر ہوا جو چھ ماہ پر مشتمل رہا، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حجاز کے اہل علم طبقہ میں کام کا تعارف کرایا جائے، اور انہیں اس کی تائید و شرکت کے لئے جوڑا جائے۔

جماعت کے نہج میں تبدیلی :- لیکن بایں ہمہ تحریکی جدوجہد اور دعوتی کاموں میں بھرپور شرکت کے باوجود مولانا کا ذہن جماعت کے نظام اور موضوعات ودعوت کے سانچہ میں مکمل طور پر نہیں ڈھلا تھا، ان کی متنوع ثقافت اور ان کا خاندانی، تاریخی اور تعلیمی پس منظر صرف ان نکات اور عمل پر قانع نہیں تھا، مولانا نے اپنے اس تاثر کا یوں اظہار کیا ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچے کی مکمل شکست وریخت عمل میں نہیں آئی تھی، اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی۔"

مولاناؒ نے تاریخ اسلام کی اصلاحی وتجدیدی تحریکات اور کوششوں کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان پر بہت کچھ لکھا بھی، وہ منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل میں ہمیشہ فرق کرتے رہے، ان کے نزدیک ہر تحریک ودعوت کے لئے نمودار نقاء، زندگی کے مسائل سے واقفیت اور ان کی تکمیل اور تطبیق ضروری ہے، ورنہ تحریک نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

مولاناؒ کا کہنا ہے کہ حضرت دہلوی کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

مولانا دہلویؒ کی وفات کے بعد مولانا یوسف صاحبؒ کی امارت میں کام کی وسعت اور نئے حالات کے تقاضوں کی بناء پر مولانا کا یہ احساس تھا کہ اصول دعوت اور موضوعات چھ نمبروں میں کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے، مولانا نے اس موضوع پر مولانا یوسفؒ اور اہل شوریٰ سے متعدد بار گفتگو کی، مگر انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ان حضرات کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا، اور کئی بار توجہ دلانے کے بعد مولانا اس نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک خود مسلسل داعی کے ذہن میں کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضہ پیدا نہ ہو باہر سے مشورہ دینا مفید اور مؤثر نہیں ہوتا، اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے بعد اس سلسلہ کو وہیں روک دینا پڑا۔ البتہ اپنے ذہن کے کام کرتے رہنے کو روکنا قدرت میں نہیں تھا اور یہ فیصلہ کیا کہ جماعت اور اصحاب جماعت سے (جن کے

اخلاص، للّٰہیت، اور دعوتی عمل کی افادیت پر پورا یقین تھا) تعلق باقی رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے زیادہ مفید بنانے اور حالات و ماحول کا لحاظ رکھنے اور دعوت و تفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (کاروان زندگی ج ا ص ۳۱۲-۳۱۶)

تحریکی عمل کا نیا رخ:- تحریکی عمل کا یہی وہ امر تھا جہاں مولانا نے اپنے لئے ایک ایسا پروگرام طے کیا جو تعلیمی، دعوتی، اصلاحی اور ملی کاموں کا میدان بن سکے۔

مولانا جس وقت دعوتی سفر کے سلسلہ میں حجاز میں تھے، ملک کی تقسیم کا عمل ہو چکا تھا، وہ حجاز سے منقسم ملک میں واپس آئے، مولانا کا خاندان جمعیۃ العلماء سے وابستہ تھا، اور حضرت مدنی کا بہت گرویدہ و معتقد۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ جس وقت مولانا لکھنؤ پہنچے اسی دن ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء گاندھی جی کا قتل ہوا۔

ملک میں تعصب و تنگ نظری کی فضاء ایک طرف تھی تو دوسری طرف مایوسی و احساس کمتری کی۔ واپسی کے بعد مولانا کی طبیعت پر اس کا شدید غلبہ ہوا کہ مختلف اداروں اور مکاتب خیال کے ذمہ داروں کو دعوت دے کر ان کے سامنے موجودہ حالات کے مقابلہ کی بات رکھی جائے اور مذاکرہ کیا جائے۔ ۲۶ر اگست ۱۹۴۸ء کو ندوۃ العلماء میں مشاورتی اجتماع میں منعقد ہوا اور مولانا نے اپنا مقالہ "نشان راہ" ان کے سامنے پڑھا جس میں مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب، ہندی و انگریزی میں دعوتی و تعارفی لٹریچر کی تیاری ساتھ ہی ساتھ عمومی تبلیغ اور آزاد اسلامی درسگاہوں کی ضرورت پر توجہ دلائی۔

عربوں میں دعوتی کام:- مولاناؒ نے حجاز کے قیام کے دوران عربوں کے جو حالات دیکھے، دین سے غفلت و مادہ پرستی کے جو مناظر دیکھے ان سے ان کا دل بہت دکھا، اور عربوں میں کام کرنے اور داعیانہ کردار ادا کرنے پر جو اثرات دیکھے جو بڑے امید افزا بھی تھے، اس سفر سے واپسی پر عربوں میں دعوت کام مولاناؒ کے دل و دماغ پر چھا گیا اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہو گیا کہ اس کو اپنی

زندگی کا مقصد و موضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا۔

مولاناؒ کے اس جوش و جذبہ کا اندازہ اس خط سے کیجئے جو انھوں نے اپنے دوست مولانا مسعود عالم ندویؒ کو ۶ر شوال ۱۳۶۸ھ مطابق ۳ر اگست ۱۹۴۹ء کو اس وقت لکھا جب وہ عراق میں تھے۔

دین کی تخم ریزی کیلئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے، دن و رات ایک کر دیجئے، دل کو جلائیے اور بدن کو گھلائیے، دیدہ و خون جگر بہائیے اور اس طرح بہائیے کہ دجلہ و فرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائگی پر ماتم کریں ایک ایک کا گریبان کا تھام کر کہیے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو عالم کی آبرو اے ابراہیم و محمد ﷺ کی آرزو! تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی مثنیٰ بن حارثہ کے خون شہادت ابو عبید الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن ابی وقاص کی علم برداری، علی بن ابی طالب کی جگر سوزی اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کے طوفان خیزی آبروئے شہیداں جگر گوشۂ رسول کی تشنگی اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی احمد بن حنبلؒ کی تعذیر جرم عشق، ابن جوزیؒ حمایت سنت، عبدالقادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ توائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شور قیامت بپا کیجئے کہ ؎

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

شیخ حسن البنا کی شخصیت و تحریک:- عالم عربی کی طاقتور تحریک "الاخوان المسلمون" کے بانی و قائد شیخ حسن البناء سے مولاناؒ کی ملاقات نہ ہو سکی، مولاناؒ کا پہلا و آخری سفر مصر ۱۹۵۱ء میں ہوا جبکہ شیخ ۱۹۴۹ء میں شہید کئے جا چکے تھے لیکن مولاناؒ کے اندر یہ شوق تھا کہ اس تحریک کو سمجھا جائے اور اس کے قائد کے حالات معلوم کئے جائیں جو کچھ ان کے اصحاب اور تلامذہ و مسترشدین سے معلوم ہوا اس سے اس کا یقین پیدا ہوا کہ اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا، وسیع و روشن دماغ گرم و پر محبت و دردمند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کرنے والے اخلاق، دل آویز شخصیت یہ ان کے عناصر ترکیبی تھے، اور اقبال کی زبان میں۔ ؎

نگہ بلند سخن دل ، نواز جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کا رواں کیلئے

مولاناؒ کا یہ کہنا ہے کہ میں جب بھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ شیخ حسن البناء کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے مولاناؒ اس تحریک کے جن پہلوؤں سے متاثر ہوئے وہ یہ تھے۔

(۱) اس تحریک نے ایک بگڑی ہوئی سوسائیٹی میں ایسی قوت عمل، جذبہ سرفروشی، سادگی وجفاکشی پیدا کردی جس کی نظیر ملنی اس زمانہ میں مشکل ہے۔

(۲) دوسری چیز ان کی محبت اور گرم جوشی اور آپس کے تعلقات ہیں، اتنا مستحکم رشتہ، اخلاق و مودت اور احساس اخوت ورفاقت میں نے کم دعوتوں اور جماعتوں میں دیکھا ہے۔

(۳) تیسری چیز اس تحریک کا زندگی سے قریبی تعلق ہے اور اسکی کامیابی اور مقبولیت اور تاثیر میں اسکو بڑا دخل ہے۔

(۴) اسکا چوتھا روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے دینی وعلمی اختلافات سے بچ کر اپنا کام کیا۔

(۵) اخوان کی تحریک کا سب سے کامیاب اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے الحاد ولادینیت کے دھارے کو روکا، اور غیور نوجوانوں اور صاحب حمیت مسلمانوں کا ایک ایسا لشکر پیدا کردیا کہ ملحدین کو اپنے ملحدانہ خیالات وتصنیفات کے اشاعت اور اخبارات ورسائل کو دین اور اسلامی تہذیب کے ساتھ تمسخر واستہزاء کی جسارت باقی نہیں رہی۔

مولاناؒ نے انہیں مشاہدات کی بنیاد پر اپنی ایک تقریر میں آخری بات یہ کہہ دی تھی کہ اخوان سے اسی کو محبت ہوسکتی ہے جس کے دل میں ایمان ہے اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے۔ (کاروان زندگی ج۱ص۳۸۱-۳۸۲)

مولاناؒ کا مزاج اصلاً تحریکی اور تنظیمی نہیں تھا، اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی تحریک کا تنظیمی طور پر آغاز نہیں کیا، انہوں نے تحریکات میں شمولیت اختیار کی، تائید کی، سرپرستی فرمایا، ان کی ذات خود ایک تحریک ودعوت تھی، لیکن انہوں نے کسی تحریک کی باقاعدہ بنا نہیں ڈالی، عام طور پر لوگوں

کے ذہنوں میں یہ خیال ہے کہ "پیام انسانیت" مولاناؒ کی قائم کردہ تحریک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مولاناؒ اور مولاناؒ منظور نعمانی نے ملکر تبلیغی سفروں اجتماعات میں ایک نئے رخ اور شعبہ کا اضافہ کیا، یہ وہ مخلوط اجتماعات تھے جن میں غیر مسلموں، بالخصوص تعلیم یافتہ حضرات کو اہتمام سے دعوت دی جاتی اور ان کو اور انکے ذہن کو سامنے رکھ کر اس زبان میں تقریر کی جاتی جو ان کیلئے زیادہ سے زیادہ قابل فہم اور پرکشش ہو اور یہ اقدام اس خیال پر مبنی تھا کہ اکثریت کو نظر انداز کرنا درست نہیں، ان تک پہونچنے کا راستہ مشترک مسائل اور اخلاق ہیں اسی سے ان کا ذہن مطالعہ اسلام کیلئے بھی آمادہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ کام بڑا نازک تھا، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت "وحدت ادیان" کیلئے راستہ ہموار کر سکتی ہے۔ لیکن ۱۹۵۶ء سے یہ کام رک گیا، پھر اسی تجربہ اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں "پیام انسانیت" کے تحریک کی شکل اختیار کرلی، تحریک کی شکل دینے کا نام اصلاً مولاناؒ اسحاق جلیسؒ ندوی کا کارنامہ ہے جنہوں نے مولاناؒ محمد الحسنی کے مشورہ سے مولاناؒ کی تقریر کی روشنی میں سوالات وجوابات مرتب کئے اور تحریک کا ایک خاکہ مرتب کیا۔

بہر حال مولاناؒ نے جو کچھ بھی تحریکی کام کئے جن پلیٹ فارموں پر انہوں نے اپنی جد جہد صرف کی اس کے پیچھے کیا بنیادی عناصر کام کر رہے تھے، اور کہاں سے ان کو اسکی چنگاری ملی، کہاں سے اس عمل کی قوت اور دعوت کا توازن اور جامعیت ان کو میسر آئی، اس جائزہ سے اس کا کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

روحانی تربیت کا منظر:- تعلیم وتربیت ودعوت تحریک کے بعد جس چیز کا مولاناؒ پر گہرا اثر رہا اور زندگی کے ہر موڑ پر جس کا ساتھ رہا، اور جس نے دماغ کے تقاضوں پر اکثر وبیشتر دل کے تقاضوں کو غالب رکھا، وہ مولاناؒ کی روحانی تربیت اور اسکا مخصوص پس منظر ہے، جس سے جدا کر کے انکی شخصیت کا مطالعہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ہے آئندہ سطور میں ہمیں دیکھنا ہے کہ مولاناؒ کی زندگی کے تانے وبانے کس طرح تیار ہوئے، اور کن عناصر نے مجتمع ہو کر اس "عطر مجموعہ" کی تیاری کا کام کیا۔

سلاسل تصوف سے خاندانی ربط و تعلق:- مولاناؒ کا خاندان جب سے ہندوستان منتقل ہوا،

دعوت جہاد کے ساتھ ساتھ وہ روحانی سلسلوں سے بھی وابسطہ رہا، خاندان کے مورث اعلیٰ امیر کبیر سید قطب الدین مدنی ؒ ۵۸۱ھ - ۶۷۷ھ حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کے سلسلہ سے مربوط اور صاحب ارشاد و تلقین بزرگ تھے، پھر ان کے اخلاق میں سب سے زیادہ نامور سید شاہ علم اللہ ۱۰۳۳ھ - ۱۰۹۶ھ تھے جو حضرت سید آدم بنوریؒ خلیفہ اجل حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے، ان کے اخلاف میں مشہور عالم امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ ہوئے جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ حضرت شاہ عبد القادرؒ کے تربیت یافتہ اور اول الذکر کے خلیفہ تھے مولاناؒ کے والد محترم مولانا سید عبد الحیؒ حسنی مؤرخ ہند حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے تربیت یافتہ اور انکے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے اجازت یافتہ تھے،

مولاناؒ کے نانا حضرت شاہ سید ضیاء النبیؒ حضرت خواجہ سید نصیر آبادی کے تربیت یافتہ اور انکے ایک واسطے سے خلیفہ تھے جن کا تعلق حضرت سید احمد شہید سے تھا، اور تکیہ رائے بریلی میں سلوک و ارشاد کے امام تھے (صاحب نزہت الخواطر نے آپ کو لب لباب العرفان اور سر الوجود کے القاب سے یاد کیا ہے)۔

مولاناؒ کی والدہ ماجدہ اپنے والد مخدوم کی تربیت یافتہ تھیں، پھر ۱۹۴۳ء میں حضرت مولاناؒ الیاس صاحبؒ سے بیعت ہو گئیں، بعد میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کی تجدید کی، مولاناؒ کے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم (جن کا تذکرہ آچکا ہے) کہ جن کا مولاناؒ کی ابتدائی تربیت میں بڑا حصہ ہے اپنے والد حضرت شاہ سید ضیاء النبیؒ کے تربیت یافتہ تھے۔ مولاناؒ کے برادر اکبر ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، اور غالباً اجازت یافتہ تھے۔

احسان تزکیہ، تصوف و سلوک، روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا یہ خاندانی پس منظر تھا۔

مولاناؒ کے اساتذہ میں رنگ تصوف:- مولاناؒ کی ابتدائی تعلیم کے دوران ہی بزرگوں کے تذکرے اور سوانحی کتابوں کے مطالعے، پھر مکتوبات امام ربانی، صراط مستقیم، منصب امامت وغیرہ کتابوں نے اس رنگ کو اور پختہ کیا۔

مولاناؒ کے مشفق استاذ شیخ خلیل عربؒ اگرچہ کسی سلسلہ تصوف سے وابسطہ تو نہیں تھے، لیکن رقت اور خشیت الٰہی اور نماز میں گریہ ان کے تزکیہ قلب کا ہی نتیجہ تھا، اور ان کی صحبت تصوف کا عملی درس تھی۔

مولاناؒ کے دوسرے مشفق و مربی استاد جن سے مولاناؒ نے ابتدائی درس حدیث لیا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، نماز میں ان پر رقت و خشیت کا غلبہ رہتا تھا، آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول تھا۔

۱۹۲۸ء میں حضرت مدنیؒ جب لکھنؤ میں مولاناؒ کے برادر اکبرؒ کے مکان میں قیام پذیر رہے، اس وقت مولاناؒ کی عمر ۱۴ر سال کی تھی، مولاناؒ کا احساس ہے کہ حضرت مدنیؒ کے قیام سے ایک خاص رونق و برکت محسوس ہوتی تھی، جس کو (نورانیت) سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھینچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا، بعد میں کچھ عرصہ تک تلمذ و صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں مزید اضافہ و استحکام ہوا۔

حضرت غلام محمد صاحب بہاولپوریؒ سے بیعت:- ۱۹۳۰ء میں مولاناؒ جب مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تفسیر پڑھنے کے لئے گئے تو مولاناؒ سے بیعت وارادت کا شوق ظاہر کیا، لیکن مولانا نے اپنے شیخ حضرت خلیفہ محمد صاحب بہاولپوری کی خدمت میں دین پور (ضلع خان پور) بھیج دیا، حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت ۹۰ر سال کی تھی۔ حضرت نے بیعت کیا اور ذکر قلبی کی تلقین فرمائی۔ مولاناؒ کا بیان ہے کہ وہ بڑے عالی مرتبہ شیخ اور صاحب نسبت بزرگ تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے عرب و عجم کے سفروں میں کسی کا چہرہ اتنا پر نور دیکھا ہو۔ (کاروانِ زندگی ج ا ص: ۱۲۸)

مولانا لاہوریؒ کی تربیت میں:- ۱۹۳۴ء میں مولاناؒ تیسری بار اپنے شیخ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی صحبت و تربیت میں رہنے اور ذکر و شغل کرنے کیلئے لاہور حاضر ہوئے، مولاناؒ نے ہدایت فرمائی کہ شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہیں، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کریں۔

(کاروانِ زندگی ج ا ص: ۱۳۲)

سنوسی خانقاہ کا نمونہ :- ۱۹۳۹ء میں مولاناؒ جب اپنے دو رفیقوں کے ساتھ دینی مراکز کے دورہ پر نکلے تو پہلی منزل رائے پور (ضلع سہارنپور) تھی، جہاں حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ (خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) کی خانقاہ تھی، وہاں وہ دو تین دن بڑے حظ و کیف کے ساتھ اس گمنام خانقاہ میں گزارے، اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کیلئے مفید اور بعض دینی اور اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں، مولاناؒ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا "مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ ایک باخبر، اور روشن دماغ، جامع عالم، اور شیخ طریقت ہیں اور زمانہ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں جن کے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، مولاناؒ کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری، سیاسی فہم و فراست دینی و دنیوی جامعیت جذبہ علم نے اس خانقاہ میں سنوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کر دی ہے، اور مولاناؒ کے کریمانہ اخلاق، بزرگانِ شفقت، تواضع اور مسافر نوازی نے مشائخ سلف کے اخلاق کریمانہ کی (جن میں صاحب خلق عظیم کا پر تو ہوتا ہے) یاد تازی کر دی"۔

مولاناؒ نے اس سفر میں تبلیغی کام بھی دیکھا اور اس کے بانی کے اثرات دیکھے اور یوں اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

"یہ چشتی درویش اور مجددی عالم قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کی حفاظت اسلام کی سنت زندہ کر رہا ہے۔"

(کاروانِ زندگی ج ۱، ص: ۲۴۰-۲۴۱)

حضرت شیخ الحدیث کی قوت نسبت :- ۱۹۴۶ء میں حضرت شیخ الحدیث کے تقاضہ پر مولاناؒ نے مرکز نظام الدین دہلی میں ان کے ساتھ رمضان گزارا، مولاناؒ نے حضرت کی صحبت میں کیا محسوس کیا۔ فرماتے ہیں:

"میں نے ان کی قوت نسبت اور برکت صحبت کے وہ واقعات اور اثرات دیکھے جو کتابوں میں پڑھے اور بزرگوں کے حالات میں سنے تھے۔"

عید کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولاناؒ کو لے کر حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری کے پاس گئے جن سے مولاناؒ کو پہلے ہی عقیدت و مناسبت تھی، لیکن اس حاضری کے بعد اس تعلق میں استحکام و استقلال پیدا ہوا۔

مولانا لاہوری کی طرف سے اجازت و خلافت :- ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ مولاناؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ کی طلب پر ان کی خدمت میں لاہور حاضر ہوئے، مولاناؒ ہی کے الفاظ میں، "مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلۂ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی، اور اس کے لئے استخارہ اور دعا کا انہوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف میں کیا تھا، اس کا ذکر فرمایا۔ (کاروانِ زندگی، ج ا ص: ۳۲۱-۳۲۵)

حضرت رائے پوریؒ کی خصوصیات :- حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کی خدمت میں مولاناؒ کی پہلی حاضری کے بعد جو نقش دل پر قائم ہوا تھا وہ گہرا ہوتا گیا، تعلق میں مرور ایام سے اضافہ ہی ہوتا گیا، مولانا کو حضرت رائے پوری کی تین باتوں نے بہت متاثر کیا، وہ مولاناؒ ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں۔

(۱) ایک فنائیت و بے نفسی جس کی نظیر کم سے کم میں نے نہیں دیکھی۔

(۲) دوسرے ذہن کی وسعت و حقیقت پسندی جو بڑے بڑے میدانی کام کرنے والے اور زمانہ کے سرد و گرم چنیدہ علماء اور سیاسی قائدین میں بھی (اس درجہ کی) نہ دیکھی۔

(۳) تیسری خصوصیت حضرت کی بے پایاں شفقت تھی، جس کیلئے شفقت مادری سے بڑھکر کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔

حضرت رائے پوری کی طرف سے چاروں سلسلوں کی اجازت :- ۲۶/اپریل ۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ حضرت رائے پوریؒ تکیہ رائے بریلی تشریف لائے تھے، مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مولاناؒ نے فرمایا "میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلے میں اجازت دیتا ہوں۔

(کاروانِ زندگی ج ا ص: ۳۵۳-۳۵۴)

مولاناؒ عبد القادر رائے پوریؒ کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے مولاناؒ کا تعلق مسترشدانہ اور حضرت شیخ الحدیث کا مشفقانہ رہا، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مولاناؒ کی حاضری حضرت کے پاس ہوتی رہتی تھی۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں:- شیخ الحدیث کے بعد مشائخ عصر میں مولاناؒ کو سب سے زیادہ مناسبت بھوپال کے حکیم وعارف شیخ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی سے تھی، حضرت کے یہاں حاضری دینی شروع کی اور حضرت کی بہت جلد توجہ خاص ہوگئی، مولاناؒ فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ ازراہ شفقت مجھے نہ پاکر اور مجھکو نہ دیکھ کر ایک مکتوب میں یہ شعر تحریر فرمایا"۔

ہمہ شہر پرز خوباں کنم و خیال ما ہے
چہ کنم کہ چشم بدیں بجند بہ کس نگاہے

"دل میرا دل رہست، مجھے بھی حضرت کے ارشادات وملفوظات میں تصوف واحسان کے لطیف نکتوں، نادر تحقیقات کے ماسوا بھی زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اور ان کی کمزوریوں، اور مغالطوں کی نشاندہی اور اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانہ کے طبائع واذواق کے مطابق بیان کرنے اور اسکو ایک بدیہی حقیقت اور ضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پیرایہ میں عمیق ودقیق حقائق کو بیان کردینے کا ایسا خداداد ملکہ اور کمال اور اس کے ایسے دلآویز نمونے نظر آئے جن کی مثال کم سے کم اس دور مادیت اور رسمیت میں نہیں دیکھی۔

شاہ وصی اللہ فتحپوری سے ربط وعقیدت:- حضرت شاہ یعقوب صاحب کے بعد حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سب سے زیادہ ربط اور عقیدت رہی، ان کی خدمت میں حاضری ہوتی رہی۔

حاجی عبد الغفور جودھپوریؒ کی تربیت وصحبت کی برکات:- تھانوی سلسلہ کے ایک اور بزرگ حاجی عبد الغفور صاحب جودھپوریؒ سے بھی عقیدت ومناسبت رہی، ان کی سادگی، بے نفسی،

شفقت اور ماحول و خاندان میں ان کی تربیت و صحبت کے برکات دیکھے، تھانوی سلسلہ اور اس کے مزاج و مذاق کی متعدد بہترین خصوصیات کو انہوں نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

بقیۃ السلف مولانا محمد احمد پھولپوریؒ کی خدمت میں حاضری:- ان حضرات کے بعد بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی، اور بقول مولاناؒ ذکر الٰہی، فکر آخرت، اور تواضع و اخلاص کے وہ نمونہ تھے اور وہ مناظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں جو صرف کتابوں کے اندر ملتے ہیں۔

شاہ وارث حسن کی زیارت اور مولانا عبدالشکور فاروقیؒ سے عقیدت:-

"لکھنؤ میں مولانا شاہ وارث حسنؒ مجاز حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں ابتدائی مدرسی کے دور میں حاضری ہوئی، اور مولانا عبدالشکور صاحبؒ فاروقی کی خدمت میں بھی اور بقول مولانا: "مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا اور انکا معتقد بنایا وہ اولاً ان کی سادگی، تواضع، بے نفسی تھی دوسرے ان کا حقانی و ربانی وعظ جو علماء سلف کی طرح ہر طرح کی لفاظی اور تصنع سے پاک، عقائد کی اصلاح، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرت پر مشتمل تھا۔" (کاروانِ زندگی ج ا ص: ۴۴۲-۴۴۶)

مولاناؒ نے کاروانِ زندگی کے سولہویں باب میں مستقل عنوان "مشائخ عصر کی خدمت میں" جو باب کا پہلا عنوان ہے، بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور ان سے تعلق کا حاصل یوں لکھا ہے:

"ملک و بیرونِ ملک کے اسفار، مطالعہ، و تصنیف اور پیچ و تاب رازی، کے ساتھ دوائے دل بیچنے والوں اور عشق و اخلاص کی دکانوں سے برابر تعلق و رابطہ رہا یہ اس دور مادیت اور ادعائے علم میں یہی چیز کسی درجہ میں حفاظت کرنے والی ہے، بقول اقبال۔ ؎

می نہ روید تخم دل از آب و گل
بے نگاہے از خدا وندان دل

خاندانی ماحول، تعلیم و تربیت، تحریک و دعوت و تزکیہ و روحانیت کے یہ وہ عناصر تھے جنہوں نے اس شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا، جس کی مقبولیت و محبوبیت کے اثرات کا ہم آج

(بقیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ایک نامور شخصیت

مولانا بدرالحسن قاسمی
وزارت اوقاف کویت

۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کا دن اس لحاظ سے بڑا ہی المناک ثابت ہوا کہ اس دن عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت نامور مصنف، مشہور صاحبِ قلم اور مصنف اور بابصیرت عالم دین، بلند پایہ مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا اور جن کے جانے سے عجم اور عرب میں یکساں طور پر صفِ ماتم بچھ گئی اور ہر ایک نے ان کے اٹھ جانے کو امت کے لئے ایک زبردست خسارہ سمجھا۔

زندگی کے ساتھ تو موت لگی ہوتی ہے ہی لیکن ایسی زندگی جس نے "دعوت و عزیمت" کی تاریخ لکھی ہو مسلمانوں کے عروج و زوال کا فلسفہ بیان کیا ہو "پرانے چراغ" روشن کئے ہوں "ایمان و مادیت کا معرکہ" سر کیا ہو، عربوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی ہو، مغربی تہذیب پر پرزور تنقیدیں کی ہوں، اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کیلئے ہر طرح کے جتن کئے ہوں ادب کو اسلامی موڑ دینے کی کوشش کی ہو اور انسانیت کا پیغام عام کرنے کیلئے مردہ دلوں میں صور پھونکنے کی کوشش کی ہو ایسی زندگی کا اس طرح اچانک خاتمہ یقیناً المناک ہے ایک زبردست سانحہ ہے ایک ایسا واقعہ ہے جس سے بہت سی آنکھیں بجا طور پر اشکبار ہوگئیں۔ ؎

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب ایک سانحہ سا ہوگیا ہے

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک ایسے گھر میں آنکھیں کھولی تھیں جو علمی و دینی حیثیت سے امتیاز رکھتا تھا اور بچپن سے انھیں ایسا ماحول میسر آیا جس نے ان کی شخصیت کی آبیاری کی۔ عربی

زبان وادب میں امتیاز کیلئے خالص عرب اساتذہ ملے اپنے ذوق اور منشاء کے مطابق علم کے اصول کیلئے مناسب ماحول ملا۔ خلیل عرب اور تقی الدین الہلالی المراکشی عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے میں معاون ہوئے تو مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علم حدیث کے حصول میں مدد ملی، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے قرآن فہمی کا موقع ملا اور عربی کے ساتھ اردو ادب میں ذوق و مہارت کے مقام تک پہونچنے کیلئے "گل رعنا" کے مصنف کی علمی وادبی وراثت بھی کام آئی اور ملک کے ادبی ماحول میں بھی مہمیز کیا پھر ان سب سے بڑھ کر وہ زریں عصر جس میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ظفر علی خان، علامہ شبیر احمد عثمانی، عطاء اللہ شاہ بخاری، اور ڈاکٹر محمد اقبال جیسے یکتائے روزگار مصنفین، مقررین، ادباء، شعراء، سے بر صغیر کا چپہ چپہ جگمگا رہا ہو اور عرب دنیا میں امیر شکیب ارسلان، رشید رضا، عباس محمود العقاد، احمد حسین الزیات، مصطفیٰ صادق الرافعی، مصطفیٰ المنفلوطی، زکی المبارک، طٰہٰ حسین، احمد امین، عبدالقادر مازنی، محمود شاکر جیسے اربابِ قلم اور اربابِ فکر ونظر اپنی نگارشات اور اپنے افکار سے دنیا کو معمور کئے ہوئے ہوں، ایسے ماحول میں صلاحیتوں کا نکھرنا اور کودن کا کندن بن جانا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ایک فطری صلاحیتوں سے بہرہ ور اور اچھے اور صالح ماحول میں پروان چڑھنے والے نوجوان نے نام پیدا کیا ہو۔ یہ بات مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خوش بختی کہی جائیگی کہ بچپن سے انھیں ایسا ماحول میسر رہا کہ وہ فکر نظر کے انتشار سے محفوظ رہے۔ اور ان کے قلم کی طاقت پہ روزِ اوّل سے مقصدیت غالب رہی چنانچہ وہ دنیا کے بہت سے دوسرے ادباء اور اربابِ قلم کی طرح فکری بے اعتدالی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور ان کے قلم کی پاکیزگی ہمیشہ برقرار رہی۔

ان کے قلم سے انتہائی کم عمری میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" جیسی کتاب سامنے آئی جو محققانہ بھی ہے اور تصنیفی خصوصیات سے بھرپور بھی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کیلئے گھر اور خاندان کے علمی اور دینی ماحول کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے ایک مرکزی ادارہ کی وراثت بھی فراغت اور یکسوئی کے ساتھ تقدیرے الٰہی اور پھر اپنی

مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے اور بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو بچپن سے یہ سعادت اور توفیق بھی حاصل رہی ہے کہ انھوں نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں اپنے وقت کے نامور اور باکمال اور مصنفین جیسی صلاحیتوں کے حصول کے پہلے تو ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، لکھنؤ یونیورسٹی، لاہور میں مولانا احمد علیؒ کا حلقہ کا درس ملک اور بیرونِ ملک کے ادبی اور صحافتی اور تصنیفی اور تالیفی مراکز اہل دل کے حلقے اور رائے پور، سہارن پور، بھوپال کی خانقاہیں۔ ہر خرمن سے تنکے اکٹھا کرنے اور ہر باغ سے پھول چننے کا طریقہ اپنایا جس نے ان میں ایسی ذاتی اور شخصی خوبیاں اور کمالات اکٹھا کر دیئے جن کا حاصل کرنا ہر شخص کیلئے آسان نہیں ہوتا پھر انھوں نے سوچ سمجھ کر اپنی صلاحیتوں کا ایک خاص رخ متعین کر لیا اور ساری زندگی بجائے دارالمصنفین یا کسی ملکی یا غیر ملکی تحقیقی ادارہ سے وابستہ ہو کر علم و تحقیق کی داد دینے اور ادبی و علمی موضوعات پر تصنیفات کا انبار لگانے کہ انھوں نے دعوتی و تبلیغی راہ اختیار کی اور اپنے آپ کو ہر کی ملازمتوں کی گرانباری سے آزاد رکھ کر دین وملت کی خدمت میں لگ گئے اور اصلاحی زندگی اور اس کیلئے اپنی قلمی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور خاص طور پر عربوں سے خطاب کو اپنا مشن بنالیا اپنے زمانے کی دینی تحریکوں کا انھوں نے گہرائی سے جائزہ لیا تھا۔ جماعتِ اسلامی کے بانیوں اور موسسوں میں ان کا نام آتا ہے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی راہ مودودیؒ صاحب سے الگ کرلی۔ انھیں سکون نظام الدین کی تبلیغی جماعت اور اسکے نامور بانی الیاس کاندھلویؒ صاحب کے پاس ملا۔ چناچہ اس سے وابستہ ہو کر عرب دنیا کا طویل سفر بھی کیا،، لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی اور ہمدردیوں اور تاثر کے اظہار بلکہ عملی مشارکتوں کے باوجود تبلیغ کا باقائدہ جزنہ بن سکے جس کی داستان انھوں نے خود ہی ''کاروانِ زندگی'' میں قلم بند کردی ہیں اور تبلیغ کے نصاب ونظام میں تھوڑی ترمیم اور بہت کچھ اضافہ کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔

عربوں میں برپا ہونے والی سب سے مؤثر اور بڑی تحریک ''الاخوان المسلمون'' کو بھی انہوں نے قریب سے دیکھا اس کے ساتھ فکری ہم آہنگی محسوس کی اور اس کے بانی ''شیخ حسن البنا'' سے گوکہ

ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن ان کے طرز دعوت طرز فکر مؤثر شخصیت، داعیانہ کمالات کا دل کھول کر اعتراف کیا بلکہ مشہور اخوانی مفکرین و قائدین سے تاحیات قریبی روابط رکھے جن میں ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، شیخ محمد الغزالی، سید قطب، ڈاکٹر سعید رمضان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں بلکہ کہنا چاہئے کہ عربوں میں مولانا کی کتابوں کو عام کرنے میں اخوان کی تحریک کو بڑا دخل ہے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سب سے اہم اور بنیادی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" یا "انسانی دنیا پہ مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کا پہلا ایڈیشن جو نامور ادیب احمد امین کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا اس کا اب کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ کتاب کا وہی ایڈیشن ذریعہ تعارف بنا جس پر مشہور اخوانی لیڈر سید قطب شہیدؒ کا انتہائی مؤثر اور گرانقدر مقدمہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ظاہر ہوا کہ مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے "الاخوان المسلمون" کے حلقوں نے کتاب کو اپنے نصاب یا تربیتی کورس کے ایک جز کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا عربوں کی اس بارے میں جماعتی حساسیت سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اچھی سی اچھی کتاب کو اگر جماعت کے بڑوں کی طرف سے سند قبول نہ ملے تو اسے کبھی عمومی قبولیت نہیں ملتی اور بڑی آسانی سے جماعت کے زیر اثر رہنے والا حلقہ اسے نظر انداز کر جاتا ہے اور اسے چنداں در خور اعتناء نہیں سمجھتا۔

عام طور پر لوگوں کا عرب دنیا کا سفر چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوتا ہے مولاناؒ نے ایک طے شدہ اور باقاعدہ پروگرام کے تحت عرب دنیا کا ایسا سفر کیا جو سال بھر سے زیادہ جاری رہا اور اس کے لئے تعارفی کارڈ کے طور پر اپنے چند رسائل اور اپنی مفید و مؤثر کتاب بھی ساتھ رکھی دو رفیق سفر بھی ایسے رکھے جو ہر جگہ مناسب ماحول کی تیاری میں معاون ہوئے جس کی داستان مولانا نے خود ہی لکھ دی ہے۔ پھر سفر کا ہر لمحہ انہوں نے کار آمد اور مفید بنایا وہاں کے ماحول کو سمجھنے کے نقطہ نظر سے بھی اور آئندہ کے لئے ماحول ساز گار بنانے کے لئے بھی جس کی داستان ان کے سفر نامہ "مذاکرات سائح فی الشرق العربی" یا شرق اوسط کی ڈائری میں پڑھی جا سکتی ہے۔

مولاناؒ نے اس سفر کے بعد سے عربوں کو خطاب کرنے اور انہیں ان کا بھولا ہوا پیغام یاد دلانے

کو اپنا مشن بنالیا اور سیکڑوں رسائل اور کتابچے تقریریں اور پمفلٹ تیار کر ڈالے مولانا ان خوش قسمت لوگوں میں سے بھی ہیں جن کی تقریر و تحریر کا غالباً کوئی حصہ اردو عربی اور بلکہ انگریزی میں بھی شائع ہونے سے باقی نہ رہا اور اس کے ضروری وسائل انہیں مہیار ہے اور انہوں نے ایک ایک لفظ کو اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ فرمائی۔

مولاناؒ نے کتابیں تو بہت سی لکھی ہیں لیکن سب کا محور و اساس ان کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہی ہے اس کے علاوہ انِ کی اچھی کتابوں میں "تاریخ دعوت و عزیمت" "ارکان اربعہ" جو ایک خاص احساس کے تحت اور مؤثر اسلوب میں لکھی گئی ہے اور "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کو قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے اندر انفرادیت لئے ہوئی ہیں۔ اور ہر حلقہ میں ان کتابوں کی پذیرائی بھی ہے۔

ویسے تو سیرت رسولؐ پر "نبی رحمت" شخصیات و تراجم پہ مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا فضل گنج مراد آبادیؒ، مولانا الیاسؒ کاندھلوی، مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، سبھوں کی سوانح انہوں نے لکھی ہیں اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب "التذکیر بسورة الکہف" کے انداز کی معرکہ ایمان و مادیت، غلام احمد قادیانی کی تردید میں قادیانیت تصوف و سلوک پہ "حقیقت تصوف اور دوسری بہت سی کتابیں انہوں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بزرگوں اور معاصرین کا تذکرہ "پرانے چراغ" بھی اپنے انداز کی مفید و مؤثر کتاب ہے اس کے علاوہ اپنی زندگی کی داستان "کاروان زندگی" بھی انہوں نے اتنی تفصیل سے مرتب کر دی ہے کہ آئندہ لکھنے والوں کے لئے زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ انہوں نے خود ہی اس کا اظہار بھی کر دیا ہے کہ ان کی زندگی پہ کئی افراد ایم، اے اور پی، ایچ ڈی کے مقالے تیار کر رہے ہیں۔ انہیں اس کتاب سے مواد مل جائے گا۔

عربی میں نصاب کی کتاب کے طور پر ان کی کتابین "مختارات" "قصص النبیین" اور "القراة الراشدہ" کو مختلف تعلیمی اداروں نے اپنے نصاب کا جز بنالیا ہے جس سے مصنف کی محنت وصول ہوگئی اور بعض عربی کے بلند پایہ ادباء نے مختارات میں ان کے حسن انتخاب کی داد دی ہے۔

ندوۃ العلماء جس کے وہ اپنے والد حکیم سید عبد الحئی الحسنی اور اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی کے بعد جائز وارث ہوئے تھے اس کا فروغ ان کی مطمح نظر تھا۔ ندوہ میں انہوں نے اس رنگ کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جو بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علیؒ کا تھا چنانچہ ندوہ کی فضاء کو تبدیل کرنے میں مولانا مکمل طور پر کامیاب رہے۔

موجودہ ندوہ کا نصاب ندوہ کے اساتذہ، ندوہ کے طلباء کا رخ اور رجحان اور ان کا تبلیغ و دعوت سے قرب واتصال مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی جد وجہد کا کرشمہ اور مولانا کی شخصیت کا پرتو ہے، جس سے خاص طور پر اس سمیت کا خاتمہ ہو گیا۔ جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے زمانہ میں اور خود مولانا علی میاںؒ کے بتدائی زمانہ میں ہونے والی طلباء کی احتجاجی تحریکیوں اور اسٹرائیکوں کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ افسوس ہے کہ دیوبند کی بے لگام جمہوریت اور منتظمین کی اس پہلو سے غفلت نے وہاں کی تاریخ ہی بدل ڈالی اور ادارہ سیاسی بازی گروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

مولاناؒ مرحوم نے اپنی سوانح عمری "کاروان زندگی" کی دوسری اور تیسری جلد جب از راہ عنایت میرے پاس بھجوائی تھی تو پڑھنے کے بعد میں نے خط لکھا کہ دار العلوم کی اسٹرائیک سے متعلق آپ کی تحریر ایک طرفہ معلوم ہوتی ہے حالانکہ قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے اسٹرائیک کا وہی علاج کیا تھا جو اب سے پہلے ندوہ کے منتظمین کر چکے تھے۔ مولاناؒ نے خط کے جواب میں جو عنایت نامہ مجھے ارسال کیا تھا اس میں یہ الفاظ تھے۔

"میں نے تو اپنی دانست میں پوری غیر جانبداری سے لکھنے کی کوشش کی تھی اس کے باوجود آپ کو یہ تاثر ہوا ہے اس لئے اپنی تحریر کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش کروں گا۔"

اس مسئلہ میں مولاناؒ کی پالیسی سے اتفاق نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ بات مولاناؒ کی عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے ایک خرد کی رائے کی تردید یا تکذیب کے بجائے خود اپنی لکھی ہوئی تحریر کو دوبارہ پڑھنے کا وعدہ کا اسلوب اختیار کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی زندگی کے بعض دوسرے اصولوں کی طرح ایک اصول یہ بھی اپنا رکھا تھا کہ بحث و مباحثہ یا رد و قدح سے مکمل طور پر اجتناب کریں جس سے یقیناً ان کو نفع پہنچا۔ اور وہ یکسوئی سے اپنے

اصلاحی و دعوتی کاموں میں لگے رہے اور ان کے گریز کے انداز نے تنقید کرنے والوں کے حوصلے خود ہی پست کر دئے اور ان کی شخصیت نزاعی نہ بن سکی۔

ایک جماعت جس کا شکار ہی "بد گمانی اور بد زبانی" اور جس کی روزی ہی ائمہ دین کی تنقیص و توہین سے وابستہ ہے اس سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان نے جس نے اپنا مستقبل ہی اس پیشہ کو اختیار کر کے محفوظ کیا ہے اس نے ایک ضخیم کتاب مولانا کے خلاف عربی میں لکھ ڈالی اور جب وہ مولانا کے سامنے پیش کی گئی تو مولانا نے پوری صفائی سے یہ بات واضح کر دی کہ اگر اس طرح کی پچاس جلدیں بھی لکھی جائیں تو میں اس کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا چنانچہ وہ کتاب آج تک منظر عام پر نہ آسکی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی سے زیادہ قرب کا موقع تو مجھے نہیں ملا لیکن جب بھی ملاقات ہوئی ان کے تواضع اور اخلاقی عظمت کا اثر طبیعت نے ضرور قبول کیا۔

دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے اجلاس کے دوران جب مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، قاضی زین العابدین سجادؒ کے علاوہ حضرت مولانا مرحوم نے بھی ایک سوال مجھ سے فرمایا تھا جس کا تعلق امام ابن تیمیہؒ کی کتابوں اور ان کی شخصیت سے متعلق تھا میں نے جواب میں تھوڑی سی تفصیل کے بعد مولانا محمد یوسف بنوری کا ایک عربی کا جملہ نقل کیا تھا مولانا نے اس کے بعد جب کبھی دیکھا عزت افزائی فرمائی۔

مولانا محمد رضوان القاسمی کی معیت میں ایک دو دن کے لئے رائے بریلی حاضری ہوئی تو سراپا اخلاق و تواضع نظر آئے اور بڑی محبت اور کرم سے پیش آئے۔

حاضری تو ادب اسلامی کے پہلے سمینار میں بھی میں نے دی تھی جس میں عبدالعزیز الرفاعی، فتحی عثمانی اور دوسرے نامور لوگ شریک ہوئے تھے لیکن خاص طور پر رائے بریلی میں "مؤتمر الدعوة والدعاة" کے موقع پر جب کویت کی "الهية الخيرية الاسلامية العالمية" کے سربراہ شیخ یوسف جاسم الحجی نے اپنے نمائندہ کے طور پر بھیجا تب بھی مولانا کی عظمت کا لازوال نقش قائم ہوا۔

کویت میں مولاناؒ کی آمد دوسری خلیجی ریاستوں کے مقابلے میں کم ہی رہی حالانکہ ان کا نام الهية

الخیریة الاسلامیة العالمیة کے مستقل بانی ممبران میں تھا۔ اور انہوں نے "اسمعی یا زهوة الخلیج" کے عنوان سے کویت کو خطاب کر کے ایک رسالہ بھی تالیف فرمایا تھا۔

ایک سفر تو مولانا کا" المجلس الوطنی للثقافة والفنون والاداب" کی دعوت پر ہوا تھا اس میں مولانا نے بڑا مفید مقالہ پیش فرمایا تھا جس میں حضور اکرم ﷺ کی رسالت کے انسانیت پر عظیم احسانات کا نہایت مؤثر بیان ہے اور جو کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے اور مولانا کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

اس سفر کے موقع پر ہوائی اڈہ پہ مولانا سے ملاقات اس حال میں ہوئی کہ دعوت دینے والوں کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا اس بدنظمی کا بعد میں نوٹس بھی لیا گیا تھا حضرت مولاناؒ نے دیکھتے ہی" طلع البدر علینا" فرما کر گلے سے لگا لیا ۔ جس کی لذت فراموش نہیں کی جا سکتی۔

کویت کے قیام کے دوران خاص طور پر ہوٹل میں مولانا محمد رابع ندوی، سید ابراہیم الحسنی اور دوسرے رفقاء کی موجودگی میں مولانا کی طبیعت بڑی باغ و بہار رہتی تھی اور بہت سے واقعات لطائف اور تجربہ مولانا کی مجلس کا حاصل ہوا کرتے تھے فجر کی نماز کے وقت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے۔ ہندوستان میں تو یہ حال ہے کہ امام صاحب فرماتے ہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو سورج کہتا ہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ اسفار مطلوب ہے لیکن اس میں اتنا مبالغہ طلوع شمس کا وقت قریب ہو جائے یقیناً احتیاط کے خلاف ہے۔

کھانے کی ایک مجلس میں میں نے عرض کیا کہ حضرت اقبال کے شعر میں میں نے ترمیم کر دی ہے

نشان مرد مؤمن باتو گویم
چوں "مرغ" ایک تبسم برلب اوست

کہنے لگے لا حول ولا قوة الا باللہ کیا مرغ بھی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کی اتنی اہمیت ہو۔ اصل شعر میں "برگ" ہے بات صرف لطیفہ اور مزاح کی تھی۔

کویت کے ایک سفر میں مولانا کی ایک اہم اور مؤثر تقریر شیخ عبداللہ العقیل کے دیوانیہ میں

ہوئی تھی جس میں "الاخوان المسلمون" سے وابستہ نوجوان اور دوسرے ارباب فکر و دعوت کی بڑی تعداد شریک تھی مولانا نے اپنے خطاب میں اخوان تحریک کے بانی شیخ حسن البناء کے بارے میں غیر معمولی توصیفی کلمات ارشاد فرمائے تھے اور اس تحریک کے اثرات کا ذکر فرمایا تھا۔

اسی طرح کی ایک نشست مشہور ہفت روزہ مجلہ "المجتمع" کے ہال میں کویت کے نامور مخیّر شیخ عبداللہ علی المطوع نے ترتیب دی تھی جس میں حضرت مولانا مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ النفیسی اور ڈاکٹر حامد الرفاعی بھی شریک تھے مولانا کی طبیعت اس روز بھی کافی شگفتہ تھی اور مجلس پر چھائے رہے انہوں نے بڑے اچھے انداز پہ تصادم کا انداز چھوڑ کر دعوت کے لئے حکمت کا انداز اختیار کرنے پر زور دیا اور خاص طور پر مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندیؒ کے طریقہ کار کو پیش فرمایا کہ انہوں نے اپنی داعیانہ بصیرت اور حکمت و مؤمنانہ فراست سے اکبر کے برپا کردہ فتنہ "دین الٰہی" کو نہ صرف مٹایا بلکہ ایسا ماحول تیار کیا کہ اس کی تیسری پشت میں اورنگ زیب عالمگیر جیسا صالح اور نیک دل بادشاہ تخت تاج کا ملک ہوا۔ اور حکومت کا رخ الحاد و دہریت اور تنفیذ شریعت کی طرف موڑ دے اس لئے ہماری مہم ارباب مناصب کو خوفزدہ کرنے اور ان کی کرسیوں پر قابض ہونے کی کوشش کے بجائے ان ارباب مناصب کے دلوں میں ایمان و یقین کو داخل کرنا اور انہیں دین و شریعت پہ کاربند کروانا چاہئے۔

مولاناؒ سے ایک ملاقات ترکی ادبی سیمینار میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے کویت ایرپورٹ کے ٹرانزٹ لاج میں ہوئی تھی اور غالباً آخری ملاقات دوبئی میں اس موقع پر ہوئی جب مولانا کو خصوصی طور پر دوبئی کے ولی عہد کی طرف سے ایوارڈ کے لئے بلایا گیا تھا۔ مولانا کے چند خطوط بھی میرے پاس ہوں گے جو سیرت النبی کے ترجمہ کی تجویز اور بعض دوسرے استفسارات کے جواب میں ہیں۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی داستان حیات ایک پوری صدی کی داستان ہے۔ اور مولانا کی اٹھان اور ان کے بناؤ اور شخصیت کی تعمیر میں (مکتب کی کرامت) سے زیادہ "فیضان نظر" کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے خود ہی "کاروان زندگی" میں اپنی کامیابیوں کو ماں کی دعاؤں سے جوڑا ہے۔ "کہ ان کے ہم زمانہ لوگوں میں ایک سے ایک باکمال صاحب علم اور علم و تحقیق میں فائق لوگ موجود

تھے اور ان کو قدرت نے ذکاوت اور ذہانت اور عبقریت سے بھی نوازا تھا لیکن مولانا ابوالحسن علی ندویؒ جیسی شہرت اور مقبولیت ان کو نہ مل سکی۔

یہ فیضان نظر تھا یا کتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

مولاناؒ کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی ہر طرح کی عزت وشہرت ناموری اور مقبولیت کے باوجود انھوں نے اپنے زمانے کے اہل دل بزرگوں سے رشتہ ہمیشہ قائم رکھا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، مولانا شاہ یعقوب مجددیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، سبھی سے انھوں نے نیاز مندانہ تعلق قائم رکھا بلکہ بعد کے لوگوں میں اور اپنے سے کم عمر اہل صلاح کی بھی تعظیم کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد صدیق باندویؒ، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ کی بھی غیر معمولی عزت وتوقیر فرماتے رہے اور اپنے حلقہ کے لوگوں کو ان کی خدمت میں بھیجتے رہے، غالباً اس پہلو کا اثر بھی یہ ظاہر ہوا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جتنا علم دیا تھا اس سے زیادہ توفیق وبرکت سے نوازا تھا۔ چنانچہ وہ شہرت ووجاہت اور عالمی شخصیت ہونے کے لحاظ سے جس مقام پر پہونچے ان سے بھی زیادہ علم وفہم، اور ذہانت وذکاوت رکھنے والے ان کے معاصر اور بعض ان سے بزرگ علماء کو بھی وہ مقام نہ مل سکا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی موت بھی مبارک مہینہ، مبارک دن، اور مبارک ساعت میں اور اچھی حالت میں آئی، جسے حسن خاتمہ کی علامت سمجھنی چاہئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ان کے صالح اعمال کو قبول فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے کیونکہ انھوں نے ساری زندگی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام کی سربلندی کا نعرہ لگایا۔

وماذا لك على الله بعزيز

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

چند نقوش و تأثرات

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی (مفتی دارالعلوم دیوبند)

دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ہر دور میں زرخیز رہی ہے۔ یہاں علماء و مشائخ بڑی تعداد میں پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے زریں کارنامے انجام دیئے۔ اس اخیر دور میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی ذات علماء و مشائخ میں بہت نمایاں تھی۔ وہ اپنے خاندان کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ یہ خاندان اس ملک میں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ سید احمد شہیدؒ کو کون نہیں جانتا، جنکے لاکھوں مرید تھے۔ جنھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور مسلمانوں میں مجاہدین کی ایک جماعت پیدا کی۔ جس نے دین و ملت کی خدمت کی۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو جو غیروں کے ظلم و ستم میں مبتلا تھے۔ آزاد کیا۔ اور جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

مولاناؒ کے والد حکیم مولانا سید عبدالحیؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم تھے۔ انھوں نے عربی میں علماء و مشائخ ہند کی آٹھ جلدوں میں نزھۃ الخواطر کے نام سے تاریخ لکھی، جو مولانا علی میاں کی جدو جہد سے چھپی، اس کے علاوہ دسیوں کتابیں انھوں نے تصنیف کیں، تصنیف و تالیف خاص مشغلہ تھا، جب کچھ خالی وقت ملتا۔ اس میں یکسوئی کے ساتھ تصنیف کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ان کے قلم سے علوم و فنون کا ایک عظیم ذخیرہ تیار ہوا۔ اور ایسا ذخیرہ جس کی موجودہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے "کاروان زندگی" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ "والد صاحب کا سارا وقت تصنیف و تالیف، مطب اور ندوۃ العلماء کی نظامت کے کاموں میں گزرتا تھا۔ وہ طبیعت کے بڑے یکسو، خاموش اور مشغول انسان تھے۔ الگ تھلگ ایک کمرہ میں رہتے تھے"۔

آگے لکھتے ہیں "ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے۔ والد صاحبؒ اپنے زمانہ کے عظیم

مصنفوں میں تھے ۔ خاندانی موروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں"۔ (کاروان زندگی ج:۱ص۵۶-۵۷)

مولاناؒ کے دادا بھی ایک بڑے مصنف تھے ۔ انھوں نے بھی تاریخ کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کر رکھا تھا۔ ان کا نام مولانا حکیم سید فخر الدینؒ تھا۔ حضرت مولاناؒ پر خاندانی اثرات بہت تھے، اور یہی وجہ تھی کہ حضرت مولاناؒ کو کتابوں اور کتابوں کے مطالعہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے مولانا کے ذریعہ اس خاندان کو ہمارے اس زمانے میں اجاگر کیا۔ شروع میں مولانا نے عام مولویوں کی طرح ملازمت کی زندگی اختیار کی۔ ندوۃ العلماء میں استاذ ہوئے۔ لیکن اس دور میں آپؒ نے بڑی محنت کی۔ مطالعہ و کتب بینی کا ذوق شباب کو پہونچا خاندانی کتابی ذخیروں کی حفاظت کی۔ اور سینے سے لگائے رکھا۔ اور اپنی علمی استعداد فراہم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ بلکہ اسی دور میں علمی نکھار پیدا ہوا۔ طلبہ میں مقبولیت ہوئی اور شہرت بھی۔

اپنے تدریسی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

"۱۹۳۰ء میں میری عمر ۲۰ سال کی ہو چکی تھی۔ باضابطہ و منظم حصول تعلیم کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ اب مطالعہ و محنت کا زمانہ تھا۔ جس کی کوئی انتہاء نہیں، پہلے یہ خواہش تھی کہ کچھ دنوں دار المصنفین اعظم گڑھ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی و نگرانی میں مطالعہ کا سلسلہ رہے۔ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیں۔ لیکن سید صاحب ایک تجربہ کار مربی کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ: "تمھارے لئے دار العلوم ندوہ زیادہ موزوں ہے۔ اور بالآخر یہی ہوا"۔

مولاناؒ نے آپ بیتی میں لکھا ہے:

"چنانچہ جلسۂ انتظامی منعقدہ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۰ء میں مولانا مسعود علی صاحبؒ نے تدریس پر میرے تقرر کی تجویز پیش کی۔ سید صاحبؒ کی تائید اور ارکان کے اتفاق آراء سے یہ تجویز منظور ہو گئی۔ اور میرا تدریس پر چالیس روپے ماہوار پر تقرر ہو گیا۔ اور یکم اگست سے بحیثیت استاذِ تفسیر و ادب میں نے کام شروع کر دیا۔" (ص:۱۳۹)

مولاناؒ خوش قسمت تھے، پہلے ہی سال ان کے حصے میں قرآن و حدیث کے اسباق آئے اور محنت کا موقعہ ملا۔ خود لکھا ہے:

"پہلے سال مجھے درجۂ ششم میں پڑھانے کے لئے قرآن مجید کے دس پارے، ترمذی شریف کا نصف ثانی، خضری کی تاریخ الأمم الإسلامیة کا پہلا حصہ، حماسہ کا باب الادب والنسیب والمراثی ملا، قیام آپ نے دار العلوم ندوہ میں رکھا۔ اور اللہ کا نام لے کر تدریس کا کام شروع کیا۔ مولانا کی نوجوانی کا دور تھا۔ علمی شباب کا تقاضا تھا کہ خوب محنت کر کے پڑھائیں۔ کہ کوئی خامی نہ رہنے پائے۔ اور طلبہ مطمئن ہوں۔ اور وہ محسوس کریں کہ اچھے استاذ ہمیں ملے ہیں۔ چنانچہ خوب مطالعہ کیا۔ خود لکھا ہے کہ کتب خانہ سے معاون کتابیں لے آیا۔ مثلاً تفسیر کے لئے "کشاف" "معالم التنزیل بغوی" "مدارک التنزیل" "تفسیر المنار"، مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" علامہ آلوسی کی "روح المعانی" اور دل لگا کر ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اور درس کی تیاری کرتا تھا پھر جا کر درس دیا کرتا تھا ——— اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درس و تدریس نے اچھا استاذ بنا دیا۔ اور میرا علم ترقی کرنے لگا۔ اور کیوں ترقی نہ کرتا کہ یہی میدان عالموں کے بننے سنورنے اور علمی کمالات پیدا کرنے کا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے مدرسی کی ہے۔ بالخصوص نوجوانی میں، ان کو اندازہ ہوگا کہ اس میدان میں اترنے کے بعد نوجوان مدرس کے کیا جذبات ہوتے ہیں، آدمی دیکھتا ہے کہ طلبہ میں اس عمر کے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو مدرس کی عمر کے برابر ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ عمر کے بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان طلبہ میں بڑے اچھے اچھے ذہین بھی ہوتے ہیں۔ سبھوں کو اسباق میں مطمئن کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے مدرس جان توڑ محنت کرتا ہے۔ ایک کتاب کی تیاری میں کئی کئی کتابیں دیکھتا ہے۔ جو اشکالات ہو سکتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر حل کرتا ہے"

مجھے یاد ہے جب خاکسار کو "جامعہ مفتاح العلوم مئو" میں دورے کے دوسرے سال عربی کا مدرس بنایا گیا، تو حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمان محدث اعظمیؒ نے فرمایا: کہ تمہارا مطالعہ ایسا ہو کہ آئندہ اس سے اونچی کتاب ملے تو بغیر مطالعہ پڑھانے کی ہمت کر سکو جھجک باقی نہ رہے،

آج کی کمائی زندگی بھر کام آتی ہے۔

مولانا تو ایک فرد تھے اس خانوادۂ علم و عمل کے جس کی پورے ملک میں شہرت تھی۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پوری تیاری کرکے درسگاہ نہ پہونچتے ہوں جب کہ دوسرے نوجوان مدرسین سے مقابلہ تھا۔ الحمد للہ ندوہ کا قدیم کتب خانہ کتابوں کا بڑا نایاب ذخیرہ تھا۔ کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ جن مدرسین سے اکتساب علم کیا تھا وہ اپنے دور کے ممتاز علماء تھے۔ اور مولانا صاحبزادہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انکی تعلیم پر خصوصی توجہ تھی۔ کہ اپنے خاندان کے معیار کے عالم دین ہوں کسی سے پیچھے نہ ہوں۔ خاندانی طور پر جو مقام ہونا چاہئے اس کے طالب تھے۔ درسیات کے علاوہ غیر درسیات سے بڑی مناسبت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر حضرت مولانا ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر کے علمی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ عربی زبان میں مہارت تامہ حاصل کی۔ عرب کا سفر کیا۔ اور مختلف ممالک میں پہونچ کر برجستہ علمی اور دینی تقریریں کیں تصنیف و تالیف کے میدان میں اترے۔

سب سے پہلی کتاب اسی مدرسی کے زمانہ میں "سیرت سید احمد شہید" تصنیف فرمائی، جس کو اللہ نے مقبولیت عطا کی۔ رشتہ حضرت شہیدؒ سے تھا۔ اس لئے پوری محنت سے لکھی، حضرت شہیدؒ کی روح یقیناً خوش ہوئی ہوگی، اخلاص وللّٰہیت تو تھی ہی اس لئے اس چھوٹی سی کتاب سے حضرت مولانا کا رتبہ بلند ہوگیا۔ اہل علم میں اس کتاب سے تعارف ہوا۔ خاندانی وجاہت پہلے سے حاصل تھی۔ جہاں پہونچے ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ علماء و مشائخ کی دعائیں بہت حاصل ہوئیں۔

کون جانتا تھا کہ دارالعلوم ندوہ کا ایک مدرس آفتاب و ماہتاب بن کر پوری دنیا کو بقعۂ نور بنا دے گا۔ اور علمائے عرب و عجم آپ کی ذات پر فخر کریں گے۔ مدرسی ہی کے زمانہ میں حضرت مولاناؒ نے "سیرت سید احمد شہید" نامی کتاب لکھی تھی۔ چونکہ یہ مولانا کی باضابطہ پہلی تصنیف تھی، نوجوانی کا قلم تھا اور مجاہد شہید کی حیات تھی دل نکال کر رکھ دیا۔ سوز و گداز سے لکھی گئی تھی۔ ہر پڑھنے والے پر اثر انداز ہوتی تھی، اور شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں ہوتا تھا، اہل دل پڑھتا تو آنکھیں اشک بار ہوتیں، دل میں جوش و جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ بہت مقبول ہوئی خود مولانا کو اس عمر میں اپنی تصنیف پر فخر و مسرت تھی۔

کاروان زندگی میں مولاناؒ نے لکھا ہے:

"اس سفر ۱۹۳۶ء میں ایک دن جب میں مولانا (حیدر حسن خانؒ) کے ساتھ دریائے بناس کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں سید احمد شہیدؒ اور ان کے پاکباز مجاہدین نے بارہا وضو کیا ہوگا۔ صبح کے سہانے وقت طلوع آفتاب سے پہلے ایک پتھر پر بیٹھ کر دریا میں پاؤں ڈال کر "سیرت سید احمد شہید" کا مقدمہ لکھا۔ جس پر مئی ۱۹۳۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے اور جو "سید صاحبؒ کے سیرت پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔" (۱۶۹/ج:۱)

یہ کتاب جب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور ذوق و شوق سے پڑھی گئی اور سنی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد منجانب اللہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور جب وہ اس طرح کے واقعات پڑھتے ہیں تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ کاش وہ بھی میدان جہاد میں ہوتے اور شہادت کی دولت سے مالا مال ہوتے۔ مولانا نے خود اس کتاب کے متعلق لکھا ہے:

"کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور عقیدت و قدر کی نگاہ سے پڑھی گئی۔ مسجدوں اور مجلسوں میں پڑھکر سنائی گئی، گمنام و نوعمر مصنف کے پاس گہرے تاثرات اور اعتراف و تحسین کے ایسے خطوط آئے جو اسکے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے"۔

مدرسی کے زمانہ میں اپنے برادر معظم مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے حکم سے ڈاکٹر امبیڈکر کے یہاں پہنچے تاکہ ان کو اسلام کی تلقین کریں اور بتائیں کہ اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جہاں انکو اور انکے ہم مذہبوں کو تسکین خاطر اور دنیا و آخرت کی سرفرازی حاصل ہوگی، مگر مولانا اپنی کم عمری اور اپنے نحیف جثہ کو دیکھ کر سوچتے تھے میرا ان پر کیا اثر ہوگا خود مولانا نے لکھا ہے:

"لیکن اسکے لئے جن اہلیتوں اور صلاحیتوں کی جس اثر انگیز، پرکشش شخصیت و جاہت اور انگریزی زبان پر قدرت کی ضرورت تھی میں ان سے عاری تھا۔ جسمانی حیثیت سے نحیف ولاغر سن و سال کے لحاظ سے نوعمر لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے لحاظ سے غیر مؤثر لیکن میرے لئے تعمیل ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا" (۱۵۷/ج۱)

بہرحال حضرت مولانا اللہ تعالےٰ کا نام لیکر اور ان کا پتہ معلوم کر کے ٹرام کے ذریعہ انکی کوٹھی پر

پہنچ کر ان کے ملاقاتی کمرہ میں بیٹھ گئے جب وہ تفریح سے واپس آئے اور اس ملاقاتی کمرہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مجھے اشارہ کیا کہ اوپر آیئے' مولانا لکھتے ہیں:

"اوپر لیکر اپنے ریڈنگ روم پہنچے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا میں نے دیکھا میز پر کتابیں تھیں ان میں پکتھال صاحب کا "ترجمۃ القرآن" بھی تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اسے پڑھا ہے میں نے اپنی گفتگو کا نقشہ بنالیا تھا میں نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا ڈاکٹر صاحب آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہونگے اور انھوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہونگی میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی اور برادری کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اسکے لئے کوئی رشوت یا ترغیب یا لالچ نہیں دیتا پوری گفتگو تو یاد نہیں، لیکن گفتگو کی روح اور جان یہی تھی انہوں نے بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ میری بات سنی اور جواباً کہا کہ معاملہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے میں مطالعہ کر رہا ہوں اور غور بھی اُسکے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا" (ج:۱۵۹۱)

مولاناؒ نے لکھا ہے انھوں نے احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ بہر حال حضرت مولانا نے اپنے بھائی اور استاذ کے حکم پر بڑا عظیم الشان کام کیا فریضۂ تبلیغ آپ نے ادا کر دیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اور مولانا کے خاندان میں اسلام کی اشاعت و ترویج کا ذوق ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جتنا کر سکتے تھے کیا کرتے تھے ایک مسلمان کی یہی شان ہونی چاہیئے۔

مولاناؒ کی زندگی کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان کو اعتراف کرنا ہوگا کہ مولانا کا یہ جذبہ اور ذوق تھا کہ مسلمان اسلام کے تمام گوشوں پر عمل کریں پھر دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا مولانا نے اسی جذبہ کے ساتھ تمام عرب ممالک کا دورہ کیا اسلام کی خوبیوں پر تقریریں کیں اور خواص و عوام کو رحمت عالم ﷺ اور آپ کے دین کا پیغام سنایا دین کی دعوت دی اور خلوص وللّٰہیت کی طرف بلایا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے ایک زمانہ تک ندوہ میں بخاری شریف کا بھی درس دیا تھا مطالعہ آپ کا بہت وسیع و گہرا تھا خود ایک جگہ لکھا ہے۔

"۵۶ء اور ۵۷ء میں، میں نے دار العلوم ندوہ میں بعض اسباق بھی اپنے ذمہ لے لئے اس زمانہ میں بخاری کا درس اپنے ذمہ لیا اس کے مطالعہ اور تیاری کے دوران جسکے لئے اکثر رات کو بھی شروح اور

باریک حواشی دیکھنے پڑتے تھے"۔(۴۴۱/ج۱)

کھلی بات ہے کہ اس کتاب کے پڑھانے کے زمانہ میں شروح حدیث کے مطالعہ کا اہتمام رہا ہوگا اور حدیث پر کافی نظر پیدا ہوئی ہوگی اور متعلقات حدیث بھی نظر سے گزرے ہونگے اسی زمانہ میں آنکھوں کی تکلیف شروع ہوئی اور اس سلسلہ میں کافی تکلیفیں اٹھائیں۔

مولاناؒ کو تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور اہل اللہ سے ملنے کا بڑا ذوق پایا تھا اپنے دور کے تمام قابل ذکر صوفیاء کی خدمت میں حاضری دی اور کہیں کہیں اچھا خاصہ وقت گزارا اس سے تزکیۂ قلب حاصل ہوا۔ اللہ والوں میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ کی خدمت میں بار بار حاضری دی ان کی دعائیں لیں آپ بیتی میں ایک جگہ لکھا ہے:

حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے بعد سب سے زیادہ ربط اور عقیدت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ سے رہی جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفائے کبار میں تھے اور تقسیم کے بعد کم از کم ہندوستان میں ان کے خلیفۂ اجل اور انکے طریقۂ تربیت کے حامل وامین تھے ۱۹۵۴ء میں ان کی خدمت میں ان کے وطن فتح پور تال نرجا۔ حاضری ہوئی اور پہلی حاضری ہی میں انھوں نے ایسی خصوصی شفقت فرمائی کہ مجھے بھی حیرت اور شرمندگی ہوئی مولانا کے فتح پور سے منتقل ہو جانے کے بعد گورکھپور پھر الہ آباد جہاں مستقل قیام فرمالیا تھا وقفوں کے بعد حاضری ہوتی رہی بمبئی کے قیام میں بھی جہاں سے آخر میں مولانا کا خاص ربط تھا حاضری دیتا رہا۔

الہ آباد جاتا تو مولانا ہی کا مہمان ہوتا اور مولانا کی شفقتوں کے عجیب انداز اور ادائیں دیکھتا خط وکتابت بھی رہی ایک مکتوب میں تحریر فرمایا "جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے"(۴۴۴/ج۱)

انکے علاوہ مولانا محمد احمد پھولپوریؒ لکھنؤ کے شاہ وارث حسنؒ سے بھی مولانا کا ربط رہا مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی خدمت میں بھی آنا جانا رہا اور ان کی صحبتوں سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور سبھوں کی توجہ آپ پر رہی شاہ وارث حسنؒ کے متعلق لکھا ہے کہ انکو بیعت حضرت گنگوہی سے تھی اور

اجازت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ سے۔

مولانا علی میاںؒ کو اپنے استاذ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بھی بڑی عقیدت و محبت تھی ان کی خدمت میں دوبار لاہور حاضر ہوئے اور تفسیر قرآن کا درس لیا اور انہی سے بیعت وارادت کا شوق ظاہر کیا حضرت مولانا لاہوریؒ نے خود بیعت نہیں کیا بلکہ حضرت نے خط لکھکر اپنے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب بھاول پوریؒ کی خدمت میں دین پور ضلع خانپور بھیج دیا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس وقت ان کی عمر نوے ۹۰ سے اوپر تھی اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مجھے یاد نہیں میں نے اپنے عرب و عجم کے سفر میں ان سے بڑھکر کسی کا پرنور چہرہ دیکھا ہو حضرت خلیفہؒ نے ازراہ شفقت و محبت مولانا کو بیعت فرمالیا اور کچھ ذکر قلبی کی بھی تلقین فرمائی یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے اسکے دوسرے سال مولانا کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے مولانا کو حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا کہ کچھ دنوں آپکی خدمت میں گزاریں چنانچہ مولانا لکھتے ہیں "ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ جولائی اگست ۱۹۳۲ء کو دیوبند حاضر ہوا مولانا نے اپنے پاس ہی ٹھہرایا اس وقت تعلیم اور درس حدیث اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ مولانا کے یہاں بخاری و ترمذی ہوتی تھی میں نے باضابطہ اس میں شرکت شروع کردی بھائی صاحب نے لکھا اب جب طویل قیام کا ارادہ ہے تو اپنے کھانے کا مطبخ میں انتظام کرلو مولانا سے اس کی اجازت لی تو کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ اسکی اجازت دی لیکن فرمایا ناشتہ ساتھ ہی ہوا کرے گا میں مولانا کے دولت خانہ سے منتقل ہو کر دارالشفاء کے کمرہ میں آگیا۔" (۱۲۸/ج ۱)

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مطبخ کے کھانے کی فیس پانچ روپیہ ماہوار تھی ربیع الثانی سے شعبان کے اوائل تک میرا دارالعلوم دیوبند میں قیام رہا۔

حضرت مولاناؒ کے بڑے بھائی دارالعلوم دیوبند میں پڑھ چکے تھے اور حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کا لکھنؤ میں قیام ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے گھر پر ہوا کرتا تھا۔ لہذا بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ چھوٹے بھائی دارالعلوم دیوبند کے فیوض و برکات سے محروم نہ رہنے پائیں وہاں رہ کر علم حدیث و فقہ سے مناسبت تامہ حاصل کرلیں چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے بہت شوق و ذوق کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں چار پانچ مہینے بحیثیت ایک طالب علم قیام فرمایا اور یہاں کی راہ و رسم سے اپنے کو واقف کیا اور

پھر زندگی بھر دار العلوم دیوبند کے مداح رہے۔ شوری کے ممبر بھی رہے۔

حضرت مولاناؒ کا اصلی ذوق مطالعہ کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا رہا ایک دفعہ مجھ گمنام کو رائے بریلی حاضری کی دعوت دی کہ میں وہاں جاکر مولانا کا خاندانی اور ذاتی کتب خانہ دیکھوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت مولانا مرحوم کا ایک والا نامہ نقل کردوں:

محب گرامی قدر زیدت مآثرہ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا اور تمام گرانقدر علمی و دینی مشاغل حسب معمول جاری ہونگے ادھر چند روز آپکی یاد بار بار آرہی تھی اور آپکو خط لکھنے کا تقاضہ پیدا ہوتا تھا محمد رابع سلمہ نے بتایا کہ آپ میری غیر موجودگی میں تشریف لائے تھے اور مجھے یاد بھی فرمایا تھا۔

دیوبند آتا ہوں تو آپ سے اطمینان سے گفتگو کا موقع نہیں ملتا ہے کیا ایسا ممکن ہے کہ عیدالاضحی کی چھٹی میں (اگر وطن جانا ضروری نہ ہو) آپ رائے بریلی تشریف لائیں آپ سے کچھ علمی گفتگو اور استفادہ بھی ہو، میرا مختصر لیکن منتخب کتابی ذخیرہ بھی دیکھیں اور خاندانی، نیز ہندوستان کے نامور مشائخ علماء اہل فتویٰ ادباء اور مصنفین کے خطوط کا نادر مجموعہ بھی بے تکلف عرض ہے کہ آمد و رفت کا کرایہ میری طرف سے پیش ہوگا انشاء اللہ یہ سفر آپکی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ممکن ہے رابع سلمہ آپکو اس دوران میں خط لکھیں امید ہے مزاج بعافیت ہوگا۔

والسلام

آپکا۔ ابوالحسن علی ۱۹ر ذی قعدہ ۹۴ھ

حضرت کے اس والا نامہ سے دلی خوشی ہوئی اور میں نے عیدالاضحی کی تعطیل رائے بریلی گزارنے کا عزم کرلیا اور ۷ر ذی الحجہ کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوگیا حضرت مولانا میری حاضری سے بہت مسرور ہوئے، میں کوئی آٹھ دس دنوں حضرت کی خدمت میں وہاں رہا حضرت نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب عمل میں لائے بڑے شوق کے ساتھ ذاتی و خاندانی کتب خانہ اور علماء و مشائخ کے قلمی خطوط دکھائے اور کافی آپ کی خدمت میں رہکر بندہ نے استفادہ کیا، مولانا محمد ثانیؒ اور مولانا محمد رابع زید مجدہ

سے بھی برابر ملتا رہا، ایسا یاد آتا ہے کہ مولاناؒ نے کسی کسی وقت مسجد میں امام بھی بنایا یہ دس دن بڑے اطمینان کے گزرے، حضرت سے طبعی مناسبت بھی ہو گئی اور حضرت مولانا بندہ سے بہت محبت کرنے لگے، مولانا کے خطوط کا مجموعہ الگ سے شائع ہو رہا ہے جو خاکسار کے نام ہیں ان خطوط سے تھوڑا بہت اندازہ ہو گا، حضرت مولانا گیلانیؒ کے بعد جو مناسبت اور مسرت مولاناؒ سے ہوئی اور دوسروں سے شاید نہیں ہوئی لکھنے کی باتیں بہت ہیں مضمون لمبا ہو جائے گا اسلئے یہیں ختم کرتا ہوں دعا ہے کہ حضرت کا فیض برابر جاری رہے اور کہنا چاہئے، میرے علمی ذوق کو اساتذہ کے بعد ان بزرگوں سے توانائی حاصل ہوئی!

اللہ رب العلمین مولاناؒ کے درجات بلند فرمائے!

☆☆☆

بقیہ حضرت مولاناؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی

مشاہدہ کر رہے ہیں اور جس کو عالم کا عالم خراج عقیدت پیش کر رہا ہے، اور جو دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے علمی و روحانی امامت کے اس منصب پر فائز ہو چکا تھا جس کی دعا حضرت سیدنا ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں "من ذریتی" کہہ کر جب کی تھی تو اس میں "سید الاولین والآخرین کے بعد ان کی نسل کے وہ ائمہ حق بھی مراد تھے جو قیامت تک ظہور میں آتے رہیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین

اگر مسلمانوں کیلئے...

ترقی کا کوئی راستہ ہے، اس ملک میں عزت پانے کا، قیادت کا تو یہ کہ وہ داعی بن کر قیادت کریں۔ حریف بن کر نہیں۔ عددی قلیت ہونے نے تو ایک طرح سے قسمت پر مہر لگا دی ہے۔ اگر مسلمان داعی کی حیثیت حاصل کر لینگے تو اللہ اسکے طفیل میں آپ کو سب کچھ عنایت کرے گا۔ (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی رح)

عالمِ ربّانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا نور عالم خلیل امینی
(استاذ ادب عربی وایڈیٹر ماہنامہ "الداعی" دارالعلوم دیوبند)

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دلِ بے نیاز

مولانا علی میاںؒ نے شہرت و عزت، مقبولیت ومحبوبیت اور اپنے علمی و فکری، ادبی و قلمی کارناموں اور تبلیغی و دعوتی اور تعلیمی وتربیتی بخششوں اور گفتارِ دلبرانہ، کردارِ مومنانہ، جذبِ قلندرانہ، ذوقِ خدائی و لذتِ آشنائی، مولا صفاتی وندائے آفاقی، ذہن ہندی اور نطقِ اعرابی کے فتوحات و اکتسابات سے دنیا کے گوشے گوشے کو اس طرح بھر دیا تھا کہ ان کے حسنِ بسیار اور شیوۂ ہزار کے سامنے الفاظ و تعبیرات کا سرمایہ ایک قلم کار کی مکمل دست گیری نہیں کرپاتا۔ ان کی خوبیوں کا ہجوم ان پر خامہ فرسائی کرنے والے کو ششدر کردیتا ہے کہ وہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے، کہ متنوع کمالات میں سے ہر کمال کا کرشمہ، دامن دل و قلم وزبان کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ "جاایں جاست"۔

تعلیم و تربیت کی توفیق پانے والا شاید ہی کوئی ایسا مسلمان بلکہ انسان ہوگا جس کے دل میں عظمت وشہرت کے آخری مقام بلند تک پہونچنے کی خواہش چٹکیاں نہ لیتی ہو اور اس کی آرزو کی تکمیل کے لئے اپنی سی کوشش کرنے سے باز رہتا ہو۔ ہر سلیم الطبع انسان یہی چاہتا ہے کہ رزقِ حلال کی طرف سے اطمنان کے ساتھ خدا اور خلقِ خدا کی نگاہ میں اس کو اعتبار و وقار ملے اور دنیا میں سرخ رو اور عقبیٰ میں بھی بامراد ثابت ہو۔ لیکن کم ایسے سعادت مند ہوتے ہیں جنھیں اپنی اس دنیا کی زندگی میں حین حیات اس قدر اور اس تسلسل کے ساتھ عزت واحترام کا خراج ملا ہو، جو مولانا علی میاںؒ کو ملا، کیا خاص اور کیا عام اور کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا عرب اور کیا عجم: معاشرے کے ہر طبقے اور دنیا کی ہر سمت میں

ان پر محبت اور مقبولیت کی موسلادھار بارش ہوئی جو (حدیث پاک کی روشنی میں) رب شکور کے ہاں ان کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ موت بھی ایسی قابلِ رشک پائی کہ شاید و باید ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جمعہ کا دن آخری عشرۂ رمضان، روزہ رکھے ہوئے، خط بنوانے اور غسل فرمانے کے بعد سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے فبشرہ بمغفرۃ و اجر کریم (آپ اس کو بخشش اور معززانہ بدلے کی خوشخبری دے دیجئے) کی آیت پر لب خاموش اور دل گویا ہو جاتا ہے، اور نفس مطمئنہ اور پاک روح خاکی ڈھانچے کو چھوڑ اپنے رب کی اور پرواز کر جاتی ہے اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آجاتا ہے۔

خدائے پاک کی توفیق سے مولانا علی میاںؒ کو شروع سے ہی ایسے اسباب و عناصر میسر آئے جن کی وجہ سے انھیں وہی کچھ ہونا تھا جو وہ ہوئے۔ ان کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ رب کریم نے انھیں خاص طور پر تیار کیا تھا اور ملت و امت کے حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے موجودہ دائرے میں ان کے فکر و عمل کی تابانی، علم و قلم کی ضیاپاشی اور سرگرمیِ مسلسل کی از حد ضرورت تھی۔

۱- انھیں خاندانی عظمت و عزیمت ملی کہ وہ سلالۂ نبوت سے تعلق رکھتے تھے، وہ سرزمین ہند میں صحیح النسب سادات کے خانوادے میں پیدا ہوئے (۱) تقویٰ، زہد اور اسلام کی سربلندی کیلئے سرفروشانہ جد جہد کی تابناک وراثت ان کے حصہ میں آئی۔ ان کا حسنی خاندان جس کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ رائے بریلوی (۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴م۔ ۱۲۴۶ھ / ۱۶۸۵م) ہیں ہمیشہ سے ظاہری و باطنی اخلاق و عادات، اسلامی روایت اور دین و دعوت کیلئے قربانیاں دینے میں ممتاز رہا ہے (۲) امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شاہ علم اللہ حسنیؒ کے پوتے میر محمد معین کے نام ایک خط میں انھیں مندرجہ ذیل القاب سے یاد کیا ہے:

"سیادت و نجابت مآب، عزیز القدر، سلالۃ الکرام، میر سید محمد معین سلمہ اللہ تعالیٰ" اور پھر ان کے خاندان کے امتیازات پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھا ہے "آپ کے اسلاف کرام نے جو کچھ پایا ہے ہمت عالیہ سے پایا ہے۔۔۔ فقیر کا عقیدہ ہے کہ حضرت شاہ علم اللہ کی اولاد میں ہمت عالی اس وقت تک موجود ہے

---سید اور سنی ہونا جو کہ نوادر میں سے ایک نادر شے ہے حضرت سید موصوف کے خاندان میں ہم نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے---"(۳)

دور آخر میں مولانا علی میاں کے جدامجد امام سید احمد بن عرفان شہیدؒ کار زار بالا کوٹ (۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶م-۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱م) نے احیائے اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے باب میں جو محیر العقول مساعی انجام دیں اور جس طرح اپنے پاکیزہ خون سے عزیمت کی تاریخ رقم کی ہے، اس کو ملت اسلامیہ ہندیہ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان کے بعد کے ہمارے تمام علمائے صادقین اور بزرگان دین اپنی اپنی توفیق کے مطابق اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سر فروشی کی تمنا کی پرورش اور دعوت و عزیمت کا سبق انھی کے جہد و عمل سے حاصل کرتے رہے ہیں۔(۴)

۲- علم و عمل سے جامع، دعائے نیم شبی اور لذت سحر گاہی سے آشنا والدین اور بقول ادیب بے مثال اور مفسر باکمال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) باپ-یعنی مولانا سید عبدالحیٔ حسنی صاحبِ "نزہۃ الخواطر" و "گل رعنا" (۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء-۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) اور بھائی-یعنی برادر اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) یکے از تلامذۂ شیخ الہندؒ-دونوں نور علی نور، پاک صاف طاہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے (۵)۔ کی گود میں پلنے بڑھنے اور تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۳- نیز متنوع العلم، روشن دل و روشن دماغ، وسیع النظر سلیم الطبع اور معتدل الخیال اساتذۂ کرام کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی توفیق ملی، جن میں علامہ خلیل عرب بن محمد انصاری یمانی (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء-۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی (جن کا تقرر ندوۃ العلماء میں ۱۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا) مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی (۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء-۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء) مولانا عبدالحیٔ فاروقیؒ لکھنوی، مولانا احمد علی لاہوریؒ (۱۳۰۴/۱۸۸۷ء/۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء) اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء-۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سابق صدر مدرس و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی امروہوی (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء-

۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء) شامل ہیں۔ انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار العلوم دیوبند، اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی (۶) کے علاوہ ایک طرف اسلامی علوم و فنون کے ماہرین اور دوسری طرف عصری ثقافتوں کے اصحاب کمال سے استفادہ کیا اور انگریزی زبان بھی اتنی حاصل کرلی کہ مغربی مصنفین اور مستشرقین کی اسلامی موضوعات سے متعلق کتابوں کا براہ راست مطالعہ ان کے لئے آسان ہو گیا (۷) ان اساتذۂ کرام کی صحبت سے انھوں نے اس طرح فائدہ اٹھایا جیسے شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس چوستی اور خالص، شفا بخش اور شفاف شہد میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ متنوع ثقافتوں کی وجہ سے ان کے قلب و دماغ نے ان کے موروثی اعتدال اور توازن پر رہنے کی صفت کو مزید جلا بخشا۔

۴- مولاناؒ کو موحدین، عاشقان نبی ﷺ، اصحاب استقامت و عزیمت اور رہبان باللیل اور فرسان بالنہار، انسانیت پر ترس کھانے والے اور امت کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے انگاروں پر لوٹنے والے مربیان اور داعیان اسلام کی پر تاثیر اور طویل صحبتیں میسر آئیں۔ ان داعیوں اور مربیوں میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ، بانی دینی دعوت و تبلیغی تحریک مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء-۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء) مولانا عبد القادر رائے پوریؒ (اندازاً ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء-۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء-۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) سرفہرست ہیں۔

حضرت مدنیؒ سے نہ صرف ان کے برادر بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبد العلیؒ ارادت کا تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کی صاحب زادیاں وغیرہ بھی ان کے دست گرفتوں میں تھیں۔ اسی لیے ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں، حضرت مدنیؒ کی کسی پروگرام میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ تشریف آوری کے موقع سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے برادر خرد مولانا علیؒ میں کو ان کے حوالے کیا اور دیوبند میں ان کی خدمت سے مستفید ہونے اور ان کے درس بخاری شریف و ترمذی شریف میں شرکت کا حکم کیا۔ ماہ ربیع الاول سے رجب کے اواخر تک مولانا نے دیوبند میں نہ صرف حضرت مدنیؒ کی شبوں کے گداز، دن کی تپش اور دل کی خلش سے فائدہ اٹھایا بلکہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ سے دیگر طلبۂ دار العلوم دیوبند کے

ساتھ ملا علی قاریؒ (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۶ء) کی مشہور کتاب "شرح نقایہ" بھی پڑھی۔ نیز ڈابھیل سے علامہ انور شاہؒ (۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) کی اس دوران دو ایک مرتبہ دیوبند تشریف آوری کے موقع کو غنیمت جان کر ان کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے رہے نیز دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا قاری اصغر علیؒ سے حفص کی روایت کے مطابق قراءت و تجوید بھی پڑھی (۸)۔ حضرت مدنیؒ کی صحبت و تعلیم سے مولانا علی میاںؒ نے حمیت اور عزیمت کا سبق سیکھا، حوصلہ مندی، سخاوت اور انکساری دعاجزی کا عملی نمونہ دیکھا اور اسے جذب کیا (۹)۔ ان کی عزیمت اور مجاہدے سے بھرپور زندگی نے خاک ساری و جاں سپاری، انسانی خدمت کے جذبے سے سرشاری اور اسلام کے لیے ہر طرح کی جاں نثاری کا حوصلہ بخشا، اور نہ صرف ضیافت و مہمان نوازی کی نبویؐ موروثی صفات کو مہمیز کیا بلکہ مہمانوں کا "غلام" بن جانے کا ذوق دیا۔ (۱۰)

مولانا احمد علی لاہوریؒ سے نہ صرف تفسیر پڑھی بلکہ شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھی، اور ان کی صحبت میں ایک عرصے تک باقاعدہ قلب و نگاہ کو مزکّی بھی کیا ان کی صحبت میں خدا طلبی کا ذوق پیدا ہوا، خدا کے نام کی حلاوت اور مردان خدا کی محبت نے دل میں جگہ لی۔ ذوق ورجحان پہ سان چڑھی، راست روی کی دولت ملی اور تعلق باللہ کے لیے بے قراری کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے۔ ان کی دم سازی و عیسیٰ نفسی نے اخلاص و عقیدے کو صیقل کیا اور عملی و فکری زندگی کو ایک نئی سمت سفر دی۔ (۱۱)

مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی صحبت کیمیا اثر نے انھیں دین کے لیے تڑپنا پھڑکنا سکھایا، اتباع سنت انابت الی اللہ کا ذوق، استقامت و عبادت کا شوق، ایمان و احتساب کی کیفیت سے سرشاری، مقصد کا عشق، درد کی دوا اور درد لادوا، مسلمانوں کے دینی تنزل کا جامع احساس اور دعوت و تبلیغ کا بے پناہ ولولہ دیا اور نشان منزل جاناں سے باخبر کیا (۱۲)۔ ان سے تعلق قلب و نگاہ کی دولت نے خود مولاناؒ کے بقول انھیں اس صلاحیت سے بہرہ ور کیا کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ:

"ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرز فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے جن میں سے ایک کا سر چشمہ ذہانت، مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا رد عمل ہوتا ہے اور

دوسرے کا سرچشمہ، کثرت عبادت وانابت ودعاء، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبویہ کا مشتاقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتہاد اور ہدایت ربانی ہوتی ہے۔"(۱۳)

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی صحبت، تربیت اور تزکیے سے اس احساس کی دولت ملی کہ مادیت کے بحر ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، ایک ایسا جزیرہ بھی ہے جہاں ذکر و فکر کے علاوہ کوئی اور شے موضوع گفتگو اور مشغلۂ زندگی نہیں، وہاں بے نظیر فنائیت و بے نفسی کا درس حاصل ہوا اور شفقت مادری جیسی شفقت ملی، دل کی انگیٹھی کو گرم رکھنے کی کلید حاصل ہوئی۔(۱۴)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا کا تعلق گویا اپنے شیخ مولانا عبدالقادرؒ ہی جیسا رہا۔ مؤخر الذکر کی وفات کے بعد تو گویا اول الذکر ہی ان کے شیخ و مربی کے درجے میں رہے ان کی متعدد عربی کتابوں پر مقدمے لکھے، سہارنپور کے بار بار سفر کیے اور جگر سوزی، علم وعمل کی جامعیت، عبادت وریاضت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے مبارک اور مسلسل مشغلے سے بھرپور زندگی سے اثر پذیر ہوئے۔ شیخ کے ساتھ ان کا یہ تعلق وقت کے ساتھ اور بڑھتا گیا چنانچہ جب تک وہ حیات رہے زندگی کے اہم مسائل میں ان سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا کیوں کہ مولاناؒ کا یہ عقیدہ و عمل تھا کہ زندگی کی وادی پر خار میں کسی روشن دل، بیدار مغز مرد مؤمن کی راہ نمائی کے حصار ہی میں سفر کرنا چاہیے ورنہ حالات کے نکیلے کانٹوں سے دامن کے الجھ جانے کا یقینی خطرہ موجود رہتا ہے۔ محض علم و مطالعے اور ذہانت و فراست کے ذریعے جو لوگ سمت سفر کا تعین کرتے ہیں وہ اکثر کعبہ نہ پہنچ کر ترکستان کو نکل جاتے ہیں اور ان کی عقل و خرد اور فکر و نظر کا جگر لہولہان اور ایمان عقیدے کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ایک صبر آزما طالب اور جہاں دیدہ و نرم و گرم چشیدہ ہونے اور بے شمار انسانوں کا مطالعہ کرنے، دیکھنے اور تجربہ کرنے کی وجہ سے وہ اس حقیقت سے سب سے زیادہ واقف تھے۔

۵- ہمالیے کی چوٹی بلکہ آسمان کی بلندی سے اسلام کی عظمت، مسلمانوں کی رفعت؛ عرب کے ریگ زاروں، صحرا نشینوں، سفر نصیب و صحرا گرد بدویوں؛ اور خبر میں، نظر میں اذان سحر میں یکتائے

کائنات غازیوں اور پر اسرار بندوں اور مومن کے مقام بلند اور کائنات میں اس کی سیادت و قیادت کا پر سوز و سحر خیز، و یقین ریز و ولولہ انگیز اسلوب اور اونچے سروں اور اسرار خودی و رموز بیخودی کی بے مثل لے میں گیت گانے والے اور "محمد عربی سے ہے عالم عربی" کا لازوال و مسرت، و تازگی و توانائی بخش ترانے سنانے والے اور فرنگیوں کے فسادِ قلب و نظر، مغربی تہذیب کی لادینیت، اس کے مادہ پرستانہ مزاج، مغرب کی خود پسند قومیت اور جانب دارانہ وطنیت، سینۂ بے نور میں محروم تسلی دل، تہذیب جواں مرگ کی حرکت مذبوحی کی بے باکانہ، باغیانہ اور غیرت مندانہ دھجیاں اڑانے والے اور آشیانۂ تہذیب مغرب کا خود اس کی بے تاب بجلیوں سے بیکاری و عریانی و بے خواری و افلاس کی بے طرح فتوحات کی وجہ سے، یقینی خطرے میں گھر جانے کی بصیرت مندانہ خبر دینے والے شاعر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے فکر و فن کے لافانی اثاثے سے مناسبت، محبت، اور اس میں جینے اس کو جذب کرنے اور اس کو عالم عرب کے ایوان ہائے حکومت اور عشرت کدوں کے تن آساں قائدین اور مغربی تہذیب و تمدن کی بخششوں کی زرق برق روشنیوں سے مرعوب عرب کے خواص و عوام تک پہنچانے کی مولانا علی میاںؒ کو توفیق ملی۔

مولانا علی میاںؒ نے بلاشبہ اقبال کے حقیقت پسندانہ اور گہری بصیرت سے ترشے ہوئے اشعار، ان کے صور اسرافیل، ان کے بال جبریل، اور ان کی ضرب کلیم، ان کی آواز، انداز و امتیاز سے اپنے کو نتیجہ خیز طور پر ہم آہنگ کر لیا تھا۔ ولایت عشق کے قائد و سپاہی اور سپاہی ساز اور دیار مہر و وفا کے راہی و راہ نما اقبال نے انھیں حرم میں بغاوت خرد سے آمدہ خطرے کے مقابلے کے لیے عشق و محبت کی سپاہ تازہ کی تیاری کا پیغام دیا، جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مولانا علی میاںؒ نے پوری زندگی وقف کر دی۔ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم آنے اور شہر کے خوگر کو وسعت صحرا سے ہم کنار ہونے کی پیہم دعوت دیتے رہنے کے لیے اپنے قول، عمل، سیرت، اخلاق، نشست و، برخاست، دعوت، ملاقات، اسفار، قلم و زبان کی ساری توانائیاں جس حوصلے، ولولے اور دوام کے ساتھ مولانا علیؒ میں نے صرف کیں اسے محض توفیق الٰہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے شعری و تخلیقی سرمایے نے مولاناؒ کی عقل و فکر،

دماغ و نظر کے بند کھول دیئے اسلام کی ابدی حقیقتوں کی ترجمانی کے لے طاقتور وجاد وانگیز اثر آفریں و شعلہ بار و پر جوش تعبیریں۔ دین جن سے تن مردہ میں زندگی کے بے انتہا طاقتور رو دوڑ جاتی ہے اور جمود و گراں خوابی کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اس شاعر بے بدل کے سوز و ساز اور درد و گداز نے عقل کے مقابلے میں عشق کی طاقت، عظمت، اور تازہ کاری و معجز نمائی اور لا تعداد حصول یابیوں اور فتح مندیوں کی قدر و قیمت پر ایمان تازہ کیا اور ساتھ ہی عقل کی زیاں کاریوں، ریابازیوں اور مکاریوں کا علاج، عشق و محبت کی یقینی طور پر اور ہر حال میں شافی و کافی رہنے والی دوا کو بتا کر کئی خفتہ گان کو بیدار کرنے کی راہ پر تا حین حیات محو سفر رہنے کا یارا دیا۔

اقبال کے فکر و فن اور شعر و ادب کو مولاناؒ نے اپنے خوابوں کا ترجمان، دل کی زبان، جذبات و محسوسات کا بیان اور فکر و عقیدے کی لسان پایا، چناں چہ انھوں نے اسے پسند کیا اپنایا اور اپنے تعبیری و تفکیری اثاثے اور تخلیقی و تعمیری، دعوتی و تبلیغی اور علمی و ادبی سرمایے کا اس کو خوب صورت معنی آفریں خیال، افروز، حوصلہ آگیں، مشک بار اور عطر بیز حصہ بنالیا۔ اور اپنی تحریر و تقریر میں اس کو اس طرح سمولیا "برگ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم" اسلوب اور اسلوبیات کا ایک طالب علم آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولاناؒ کے زبان و قلم اور سوچنے اور کہنے کو اقبال کے شعر و فکر نے غیر معمولی خوبی سے غیر معمولی حد تک متاثر کیا ہے۔

مولاناؒ نے اقبال کو بے حساب کیوں چاہا اور ان سے ٹوٹ کر کیوں محبت کی؟ مولاناؒ کے قلم سے اس کی لذت انگیز حکایت کا ایک ٹکڑا آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے:

"اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے۔ انسان بہت خود بیں و خود پسند واقع ہوا ہے، اس کی محبت اور نفرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے؛ اس لیے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے، جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اسکے

احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنے کو اس کلیے سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ،بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انھی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیار نہ بڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لیے ابھارتا ہے؛ جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔

"میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اوز مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں؛ وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت اور اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔(۱۵)

۶- اسی کے ساتھ ساتھ معنوی طور پر کتب واشخاص کے واسطے سے شیخ حسن البناء مصریؒ (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء-۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء) کی سیف و قلم کی جامع دعوت، جمال الدین افغانیؒ (۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء-۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء) کی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی حوصلہ انگیز منصوبہ بندیوں کی حرارت خیز داستانوں اور غلام ہندوستان اور عالم اسلام میں، خدا کی حکمت و قدرت و مشیت سے، دور آخر میں پیدا ہونے والے حوصلہ شعار و اخلاص پیکر قائدین و عمائدین کے حرکت و عمل نے بھی مولانا کے حساس دل، اثر پذیر طبیعت اور اَخذ و استنباط کی صلاحیت سے بھرپور ذہن اور اکتسابی استعداد کے

حامل قلم کو نتیجہ خیز حد تک متاثر کیا اور انھیں ان ساری خوبیوں سے مالا مال کیا جو کسی زوال آمادہ امت اور سر کلیم و خلیل کو اپنی اذانوں سے فاش کرنے کے وظیفے سے وقتی طور پر لاتعلق ہو کر خوابیدہ ہو جانے والی ملت اور لاقانونیت و "مے و قمار و ہجوم زنان بازاری" میں سرمست اور اخلاق و اقدار، و دین و مروت کے خلاف بغاوت کے نشے سے بدمست معاشرے کو بیدار کرنے اور راہ مستقیم پر لانے والے داعی میں خدائے قدیر اپنی مرضی سے، وقت کی آندھیوں کا رخ موڑنے کے لیے ہمہ وقت جہد و عمل کی لذت سے سرشار رہنے کی خاطر پیدا کر دیا کرتا ہے۔

فراست ایمانی و لذت قرآنی، نور بصیرت و دینی عزیمت، اخلاقی برہان و عملی قوت کے حامل، رازہائے شریعت و طریق سے باخبر اور حالات و زمانے کے اشارات پر وسیع و عمیق نظر رکھنے والے علمائے ربانی نے مولانا علی میاںؒ کے سلسلے میں ان کے عنفوانِ عمر سے جو بشارتیں دی تھیں۔ جو توقعات وابستہ کیے تھے، جن بلند الفاظ سے انھیں یاد کیا تھا اور عرب و عجم کے نامور علماء و ادباء و مفکرین نے ان کی عظمت و امتیاز کے جس طرح گیت گائے تھے، مولانا کے علمی و فکری و ادبی اور قیادتی و اجتماعی کارناموں کو دیکھ کر دنیا نے تصدیق کی کہ اتنے سارے علما و مشائخ کا اندازہ ان کے سلسلے میں اتنا صحیح ثابت ہوا، جتنا شاید کسی بڑے سے بڑے سائنس داں کا اندازہ تجرباتی علوم اور برق و بخارات کے سلسلے میں بھی صحیح نہیں ہوتا، جب کہ ثانی الذکر اندازہ محسوسات و مشاہدات کی روشنی میں لگایا جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو اپنی دقت نظری ذہانت اور علمی گیرائی و گہرائی کے لیے شہرت عام رکھتے تھے مولانا علی میاںؒ کے ایک خط کے جواب میں انھوں نے جو خط ان کو اس وقت لکھا تھا، جب ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی، تو انھیں "مجمع الکمالات" لکھا تھا۔ (۱۶)

شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اپنے شاگرد مولانا علی میاںؒ کو ایک خط میں "بمحترم المقام مولوی ابوالحسن صاحب" لکھ کر "بارك الله فی اخلاصکم واعمالکم" کی دعاء دے کر گویا مولاناؒ کے اخلاص اور حسن عمل کی گواہی دیتے ہیں۔ (۱۷)

ایک دوسرے خط میں مولاناؒ کو لکھتے ہیں:

"چوں کہ آپ میرے ہیں؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لیے باعث صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (۱۸) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی اسی طرح، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی و سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔ اب دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور موجودہ دور فتن میں تمام مصائب و آلام سے مامون رکھے۔ آمین یا اللہ العالمین (۱۹)

ایک دوسرے مکتوب میں انھیں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کی ہر کامیابی سے جتنا میرے دل میں سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے، غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جسے اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لیے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے اور اپنی مرضی کے مطابق عمر بھر اشاعت دین کی توفیق عطا فرمائے۔" (۲۰)

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی دعائیں اور تمنائیں مولانا علی میاںؒ کے سلسلے میں بارگاہِ ایزدی میں حرف بہ حرف مقبول نہیں ہوئیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے اپنی زندگی کی ایک آخری مجلس میں مولاناؒ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"مولانا میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں، آپ کی کیا تعریف کروں؟

تعریف کرنا محبت کا اوچھا پن ہے۔" (۲۱)

ایک مکتوب میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ مولانا کو لکھتے ہیں:

"مخدومی و محترمی حضرت سید صاحب دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

"..... آں محترم کی توجہات عالیہ سے تبلیغ کو جس قدر نفع پہنچا ہے، اب تک لگنے والوں میں سے کسی سے نہیں پہنچا اللہ تعالیٰ آپ کی مقدس توجہات کو اس طرف اور زائد سے زائد مبذول فرمائے۔" (۲۲)

ایک دوسرے خط میں مولانا کو ان القاب سے یاد کرتے ہیں۔

"مخدوم و مکرم معظم محترم سلالۂ خاندان نبوت اقامنا اللہ وإیاکم لإعلاء کلمته وإحیاء سُنن نبیه

پھر آگے لکھتے ہیں:

"بخدمت عالی عمدۃ الآمال والامانی مکرم محترم حضرت سید صاحب" (۲۳)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میری امیدوں اور تمناؤں کی ودیعت گاہ محترم سلالۂ خاندان نبوت" (۲۴) ہے کوئی جس کو ان آرزوؤں اور توقعات اور دعاؤں کے لفظ لفظ بارگاہ استجابت میں قبول ہونے میں ذرہ برابر شک کرنے کی جرأت ہو۔"

مجھے یہاں مولاناؒ کے سلسلے میں تمام بڑوں کی دعاؤں و توقعات کا احاطہ مقصود نہیں کہ قارئین کے لیے گراں چشم اور اکتاہٹ کا باعث ہو سکتا ہے، ورنہ عالم عرب کے بڑے بڑے علماء و ادباء اور عالم اسلام کے باکمال اہل علم و قلم کی لاتعداد عقیدت، مندانہ و والہانہ شہادتیں ڈھیر ساری مولاناؒ کی اپنی لکھی ہوئی اور انکے سلسلے میں دوسروں کی تصنیف کردہ کتابوں میں موجود ہیں۔ انھیں اپنی جگہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں صرف ایک بشارت بشکل خواب جو خود انکی عالمہ و صالحہ و عابدہ نیک خود والدہ کی ہے، کو نقل کرنے کے لیے قلم بے تاب نظر آتا ہے، لہٰذا اس کو درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں ان کی والدہ محترمہ سیدہ خیر النساء صاحبہؒ (متوفی ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء) کی شادی ان کے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ کے ساتھ ہونے کی بات چل رہی تھی، انھی دنوں ان نیک بخت و سعادت نصیب خاتون نے جو بشارت آمیز خواب دیکھا، اس کا قصہ خود وہ اپنے قلم سے یوں لکھتی ہیں:

"ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اس مالک کریم و رحمٰن و رحیم کی عنایت و مہربانی سے ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کر سکی، منہ سے نکلنا دشوار تھا اور اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنی دیکھے تو خوشی سے پھول گئی اور تمام؛ فکر و غم بھول گئی اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر رشک کرتا اور والد محترم تو خوشی میں رونے لگے۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے۔

"فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرّة اعین جزاء بما کانوا یعملون" (السجدۃ/۱۷)

ترجمہ: سو کسی کو نہیں معلوم جو چھپا دھرا ہے انکے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو کرتے تھے" (۲۵)

کوئی حد ہے مولاناؒ کے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کی اپنے والدین کے لیے، اپنے اہل خاندان

کے لیے، اپنے مربی برادرِ اکبر کے لیے، اپنے اساتذہ کے لیے، اپنے مربیوں اور شیوخ کے لیے، اپنے متعارفین و محبین و دعاء گویوں کے لیے اور ان تمام مسلمانوں اور انسانوں کے لیے جنھیں ان کی تحریر و تقریر، ان کی صحبت و مجالست، ان کی ملاقات و زیارت، ان سے عقیدت و محبت، ان کے سلوک و کردار، انکے اخلاق کریمانہ کے گوہر آب دار، اور ان کے حب نبویؐ اور اسلام پر فدا ہونے کی کیفیت، ان کی جہد مسلسل و حرکت پیہم و سعی بے کراں سے بھرپور زندگی و بندگی، جاں سوزی و تابندگی سے کسی نہ کسی شکل میں فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہا ہے، یا رہے گا۔

میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادو گروں کو سنا ہے، الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ و معلومات کی گمنام اور تاریک سرنگوں میں بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے بہت سے لوگوں کا علم ہے، لیکن خدا اور رسول کو گواہ بنا کر کہنے دیجیے کہ تحریر و تقریر کے لفظ لفظ نہیں، حرف حرف پر اور ہر زیر و بم پر خلوص کا جو حسن، ایمان و یقین کی جو مہر تابی، دردِ دل کی جو لذت، انسانوں سے محبت کا جو جمال، اعلائے کلمۃ اللہ کا جو جلال، صدائے حق کی جو دل نوازی، اور سوز دروں کی جو تمازت اور فقر غیور و زہد پُر نور کی جو جاذبیت و حرارت میں نے مولانا علی میاںؒ کے ہاں محسوس کی ہے، وہ میرے محدود علم و مطالعے میں ان میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتی۔

میں نے عربی میں..... اور ان کی عربی اردو دونوں یک ساں طور پر روحانیت اور ایمان و یقین میں ڈھلی ہوئی اور قلب جگر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ مولاناؒ کی "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" "کاروان مدینہ" "جب ایمان کی بہار آئی" کو بالخصوص اور ان کی دیگر کتابوں اور دعوتی و فکری کتابچوں کو بالعموم ایک سے زائد بار پڑھا ہے۔ آپ یقین یہ کیجئے کہ بعض دفعہ وفور جوش و جذبات کی وجہ سے مجھے ایسا لگا کہ میرا سینہ چاک ہو جائیگا، چنانچہ میں بیٹھا ہوتا تو کھڑا ہو جاتا اور کھڑا ہوتا تو ٹہلنے لگتا، نہ معلوم کتنی مرتبہ آنکھوں کو غسل صحت ملا، اور عصیاں شعار و توبہ شکن دل پر قلعی ہوئی، میرے جیسے سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے بندگانِ خدا ہوں گے جنھیں مولاناؒ کی تحریر و تقریر سے

اس مبارک کیفیت کا توشہ ملا ہوگا اور انشاء اللہ ملتا رہے گا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ عرب کے بڑے بڑے شاہانِ قلم و زبان، اپنا اپنا تاجِ شہنشاہی مولاناؒ کے قدموں میں ڈال کر عقیدت کا خراج ادا کر کے، ناقابلِ بیان فرحت و انبساط محسوس کرتے رہے ہیں۔

وہ خلوص کے جادو سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے، مجلسوں اور کانفرنسوں پر چھا جاتے تھے۔ میں نے بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ بعض بڑی کانفرنسوں میں جہاں دنیائے عرب و اسلام کے چیدہ و برگزیدہ افراد جمع ہوتے تھے اور دردِ دل کے بیان کیلئے بعض دفعہ الفاظ و تعبیرات کے ذخیرے ان کا ساتھ نہ دیتے اور وہ اپنی پسند کی بھرپور تعبیر کی تراش میں الجھ جاتے تب بھی مجمع پر سکینت طاری رہتی اور سارا مجمع ان کے دل کی جلن کو الفاظ کی چبھن میں محسوس کرتا۔

مولانا علی میاںؒ ایسے مجمع الکمالات تھے جن میں سے ہر کمال انسان کے بڑا بننے کیلئے کافی ہوتا ہے اور اگر یہ سب کسی میں جمع ہو جائیں تو وہ مردِ مؤمن و انسانِ کامل بننے کی ممکنہ صفات و صلاحیتوں کا حامل بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ سب کسی میں جمع ہو جائیں تو وہ علی میاںؒ تشکیل پاتا ہے۔

برِصغیر کے ان کے ہم عصروں میں بعضوں کو بیرونِ ملک شہرت تو ایسی مل گئی، لیکن کسی کے ہاں علمی غرور و خودسری تھی، تو کسی میں فکری کجی۔ چنانچہ کسی کو بھی شہرت و عزت کے افتخار، عمل کی درخشندی سے حرماں نصیبی، توازن کے فقدان اور پھر خلوص و خلقِ خدا کی بے لوث اور بے انتہا محبت کی کمی کی وجہ سے عظمت و محبوبیت کا وہ اعلیٰ اور ارفع مقام عطا نہیں ہوا، جو مولاناؒ کا طرۂ امتیاز ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی یہ بڑائی بھی سبھوں پر بھاری ہے کہ تمام بڑوں کی محبت، عوام و خواص کے اعتقاد، پوری دنیا میں ان کے ہر آن بڑھتے رہنے والے احترام، اور شہرت کے آسمان پر پہنچ جانے کے باوجود وہ علمی افتخار کا شکار ہوئے نہ زہد و ریاضت کے غرور سے شکست کھا سکے، بلکہ وہ جیسے جیسے دنیا والوں کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہوتے گئے، ان کی خاک ساری میں ایسا محسوس اضافہ ہوتا گیا جسے کور چشموں کو بھی محسوس کرنا پڑا اور جس کی گواہی دنیا کے ہر اس انسان نے دی جس کو کسی طور ان سے سابقہ ہوا۔

علم و فکر کی راہ سے بھی دین کی خدمت اور دعوت کا عمل انجام دیا جاسکتا ہے اور دیا جاتا ہے اور مولانا علی میاںؒ اس میدان کے بھی کم یاب شہسوار تھے، لیکن بہتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ علم و قلم کے لئے یک سو ہو جاتے ہیں، اس کے پیچ و خم میں اتنے الجھے رہتے، مطالعہ و معلومات کے گرداب میں مسلسل اس طرح پھنسے رہتے اور لکھنے پڑھنے کی دنیا کی لذت انگیز و طرب خیز تنہائی اور تصنیف و تالیف کے "عشرت کدوں" کی آرام و راحت کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ ملک و ملت کے مسائل، قیادت و دعوت اور اجتماعی خدمات اور امت کے درد و الم میں شرکت کرنے کی انھیں فرصت نہیں مل پاتی، یا اس کے لائق ہی نہیں رہ جاتے، لیکن مولاناؒ نے علم و قلم کی شہسواری کے باوصف دنیا کے چپے چپے کا جس طرح سفر کیا، ملکوں ملکوں جس طرح گئے، قریہ قریہ کوبہ کو جس طرح پھرے، گوشے گوشے میں جس طرح ایمان و یقین کی صدا لگائی، عرب و عجم کو جس طرح محمدیؐ پیغام کے ذریعے جھنجھوڑا، مغربی تہذیب کی فسوں کاری کا جس طرح پردہ چاک کیا، درد و محبت کی جس طرح مینہ برسائی، معاشرے کے قلب پر جس طرح دستک دی، اہل اسلام کو جس طرح صورتِ خورشید بننے کا درس دیا، ہر نوع کی بولہبیوں کے خلاف جس طرح گرجے برسے اور پنجہ آزمائی کی، باطل کو للکارا و شب پرستوں کو رگیدا، وطن کی خدمت کا حق ادا کیا، اور اپنے وطن میں مسلمانوں کے مسائل اور انھیں مسلمان جیتے رہنے کے حق کی بحالی کے لئے جس طرح خداوندانِ حکومت سے پنجہ آزمائی کی، انسانیت اور آدمیت کا جو سبق باشندگان وطن کو دیا، تہذیب و تمدن کی جو سوغات ان میں تقسیم کی۔۔۔ اور جس طرح باہمہ و بیہمہ رہے، اس کی مثال ان لوگوں میں کوئی پیش نہیں کر سکتا جنھیں ہماری نسل نے دیکھا اور برتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ بہر کیف بشر تھے، جس سے غلطی اور بھول چوک کا امکان بہر کیف باقی رہتا ہے، لیکن بشر کی شکل میں فرشتہ ہونے کی زیادہ سے زیادہ خوبی میں نے انھیں میں دیکھی ہے ان کی معصومیت کی قسم تو نہیں کھائی جاسکتی، لیکن جن بزرگوں کو میں نے دیکھا یا برتا ہے (ان سب کے احترام اور ان کے لیے دعائے خیر کے باوجود) میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ انسانیت و شرافت، مروت و انسیت، توازن و فروتنی، سادگی و بے نفسی، دنیا کے مال و منال سے بے رغبتی اور بڑی سے بڑی قیمت پر

نہ بکنے کی صفت میں، ان سے بڑھ کو کسی کر نہ پایا۔ میں نے کم و بیش ۹ سال کی مدت مولاناؒ کی خدمت اور ندوۃ العلماء کی تدریس میں گزاری ہے، جس کا شاید آدھا حصہ مولاناؒ کے ساتھ، مولانا کے پاس اور ان کی خدمت میں گزارا ہے ان کے تصنیفی و تالیفی کام میں ان کا ہاتھ بٹانے کی سعادت سے بہرہ ور رہا ہوں، انھوں نے کبھی کسی کام کو کیوں کیا کیوں نہ کیا نہیں کہا، وہ اپنی موہنی صورت، ادائے دل نوازی، شیریں گفتاری، نرم خوئی و دل جوئی سے دل میں گھر کر جاتے تھے، وہ ہر طرح سے صرف انسان لگتے تھے، کر و فر، شان و شوکت اور ٹیپ ٹاپ سے ان کی ذات، ان کا آشیانہ، ان کا لباس، ان کا خورد و نوش، ان کی زندگی کا ہر لمحہ بالکل مبرا تھا۔ وہاں دربانوں کا ہجوم تھا، نہ پہرہ داروں کی سختی، نہ خدامان جفاکیش کی دھر پکڑ۔

بعض ایسے محرومِ توفیق و سعادت لوگ بھی نظر آئے (اور کیوں نہ نظر آتے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ناقدین و معاندین بھی تو اسی زمین پر بستے ہیں، تو انسان چاہے جتنا بڑا ہو جائے وہ حرف گیری کرنے والوں کی زد سے نہیں بچ سکتا کہ بھنگیوں کی نظر صرف گندگیوں کی تلاش میں رہتی ہے) جو مولانا علی میاںؒ کی سلامت روی اور توازن و اعتدال کو ان کی کمزوری گردانتے تھے بلکہ مداہنت سے تعبیر کرتے تھے، کہ وہ کسی مسئلے میں صاف لفظوں میں دوٹوک رائے قائم نہیں کرتے؛ لیکن انھیں کیا معلوم کہ یہ مولانا کی کمزوری نہیں بلکہ بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ مخالف سے مخالف سے فرد اور جماعت کے لئے زبان اور قلم کو آخری حد تک جانے دینا تو درکنار، کسی طرح کی آلودگی سے ہمیشہ پاک رکھتے تھے۔ ان کی خوبی تھی کہ وہ دل خراش اور مروت کو جراحت پہنچانے والے کسی بھی حرف و صوت سے بہر حال گریزاں رہے؛ اسی وجہ سے مخالف و موافق دونوں قسم کے لوگ ملکی و ملی مسائل میں ان پر اتنے متفق تھے جس کی مثال میں کسی معاصر کو پیش نہیں کیا جاسکتا مسلم و غیر مسلم دونوں ہی ان کی عظمت کا دم بھرتے تھے، صلح جوئی اور نرم روی انکا سب سے بڑا ہتھیار تھی، انھوں نے قلم و زبان سے اشتعال انگیز کوئی بات لکھی نہ کہی؛ اسی لئے ان سے زیادہ متفق علیہ شخص، ہر طبقے اور مذہب و رجحان کے لوگوں کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔

ہر پڑھا لکھا شہرت و عظمت و احترام کا خواہاں تو ہوتا ہے؛ لیکن وہ اس کردار و سلوک پر کاربند نہیں ہو پاتا جو مولانا علی میاںؒ کو ہر دل عزیزی دے گیا۔

☆☆☆

حواشی:-

(۱) مولانا علی میاںؒ اپنی خود نوشت سوانح "کاروان زندگی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت غلو اور مبالغہ کی حد تک کی ہے.....اس خاندان میں ہمیشہ سادات ہی میں یا کبھی کبھی معروف النسب شیوخ میں رشتہ کرنا ضروری سمجھا اور اگر کبھی کسی نے کھلے طور پر کسی غیر کفو سے شادی کر لی تو خاندان نے اگرچہ اس کو برادری میں شامل رکھا، اور اخوت و مساوات کا معاملہ کیا لیکن مصاہرت اور ازدواجی تعلقات منقطع کر لیے اور نسب نامہ میں اس فرد خاندان کے نام کے ساتھ اس اصول سے انحراف کی نشان دہی کر دی (ملاحظہ ہو "سیرت السادات" از مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالی) اور یہ بات خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ معلوم رہی "کاروان زندگی" ج ا ص ۲۱ طبع اول ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

(۲) مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں: خاندانی تذکرے اور انساب کی کتابوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اس کے اکثر تاریخی عہدوں میں قائم رہا مردانگی، حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ہے اس خاندان کی تاریخ میں بار بار ان اولوالعزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا اور شہادت سے سرخ رو ہوئے"۔ (حوالہ بالا، ص ۲۳)

(۳) نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ج ا، ص: ۳۰۳-۳۰۴، مرتبہ حضرت شاہ عبدالرحمن پھلتی، شرح و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی، طبع اول ۱۴۱۹ھ، پھلت، ضلع مظفر نگر (یوپی)۔

(۴) مولاناؒ کاروان زندگی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:- ایک مرتبہ مسجد (تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین، نئی دہلی) کے بالائی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں (حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے) صاحب زادۂ گرامی مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا قیام رہتا تھا، مولانا (محمد الیاسؒ) چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا! ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں" (کاروان زندگی، ج: ا، ص: ۲۸۱)

(۵) "معاصرین" از مولانا عبدالماجد دریابادی، مطبوعہ ادارہ انشائے، ماجدی، کلکتہ، ص: ۲۱۷۔

(۶) ۱۹۲۷ء میں انہوں نے لکھنو یونیورسٹی میں مولانا خلیل عرب کے اصرار پر داخلہ لیا جو وہاں شعبۂ عربی کے استاذ تھے اور ۱۹۲۹ء میں فاضل ادب عربی کی ڈگری لی اس سلسلے میں مولاناؒ ۱۵-۱۶ سال کی اپنی نو عمری کی قابل رشک دینی غیرت اور اسلامی حمیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"دسمبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (CONVOCATION) میں گورنر یوپی "سر مالکم ہیلی" نے سندیں تقسیم کیں.....اور یہ ستم ظریفی میری زندگی میں پیش آکر رہی کہ عربی ادب اور زبان کی سند ایک انگریز حاکم اور دشمن اسلام قوم کے فرد سے لی جائے" (کاروان زندگی" ج: ا ص: ۱۰۵)۔

(۷) مولانا نے کسی اسکول کالج میں داخلہ لیے بغیر اپنے خاندان کے بعض انگریزی داں حضرات اور انگریزی کے دیگر ماہرین سے استفادہ کیا، بعد میں اس میں خاصا انہماک ہو گیا اور انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابوں کو حل کرنے اور امتحان میں بیٹھنے کے ارادے کا ان کی والدہ محترمہ خیر النساء بہتر صاحبہ کو علم ہوا تو انہوں نے دردمندانہ خط کے ذریعے انہیں اس ارادہ سے باز رہنے اور انگریزی تعلیم سے یکسر دست کش ہو جانے کا مشورہ دیا، جس میں والدہ نے انہیں لکھا کہ:

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے؟ علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یا رب العالمین" (ذکر خیر ص: ۵۳، کاروان زندگی: ۱ص: ۱۲۲+ ۱۲۳)۔

(۸) کے لیے دیکھیے "کاروان زندگی"، ج ۱ص: ۱۲۸-۱۳۲۔

(۹) مولانا پرانے چراغ میں فرماتے ہیں: "میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی (یعنی حضرت مدنیؒ کی) زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے ایک عزیمت دوسرے حمیت پرانے چراغ، ج ۱ ص: ۱۰۵-۱۰۶، طبع سوم ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء مکتبہ فردوس لکھنؤ)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: "ہم نے اہل بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو واقعات پڑھے ہیں، ان کا پرتو مولانا کی زندگی اور ان کے بعض معاصرین کبار کے اخلاق میں پایا ہے" (حوالۂ بالا، ص: ۱۱۳)

مزید فرماتے ہیں: "اس افتاد طبع کے ساتھ (یعنی ں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی عادت کی وجہ سے) جب مولانا (مدنیؒ) کو دیکھا، انسانیت و آدمیت، شرافت و سیادت اور اخلاق و کردار کی بڑی بلندی پر پایا" (ص: ۱۰۹)

(۱۰) پرانے چراغ، ج: ۱، ص: ۱۱۲-۱۱۳۔

(۱۱) مولانا خود ایمان کو تازہ کرنے والی کیفیت اور روحانی لذت کے ساتھ رقم طراز ہیں: "میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی، جب مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور سے نیاز حاصل ہوا۔ میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں، جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا: پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے پاس پہنچایا۔

"اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوئی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال موجودہ زندگی سے بہت

مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا۔ خدا شناسی اور خدا رسی، راہ یابی اور راست روی تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کے حلاوت اور مردان خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا" (پرانے چراغ ج:۱ص:۱۳۴-۱۳۵)

(۱۲) کے لیے دیکھیے "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت" باب ہفتم و ہشتم ص:۱۹۶-۳۲۸، مطبوعہ ادارہ اشاعت دینیات، حضرت نظام الدین نئی دہلی، (۱۳) پرانے چراغ، ج:۱ص:۲۸۴

(۱۴) پڑھیے ص:۳۵۲-۳۵۳، کاروان زندگی، ج:۱، نیز "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ"، بقلم مولانا علی میاں ندویؒ

(۱۵) "نقوش اقبال" بقلم مولانا علی میاں ندوی، ص:۳۳-۳۴، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ چھٹا ایڈیشن ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔ (۱۶) پرانے چراغ، ج:۱، ص:۱۲۴۔ (۱۷) مکتوبات شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ ص:۵۱۔

(۱۸) شیخ التفسیر کے فرزند اکبر۔ (۱۹) پرانے چراغ، ج:۱ص:۱۶۱۔ (۲۰) حوالہ بالا ص:۱۶۲۔

(۲۱) کاروان زندگی ج:۱ص:۲۸۶ (۲۲) مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ص:۸۱

(۲۳) حوالہ بالا، ص:۸ (۲۴) حوالہ بالا ص:۱۷۔

(۲۵) "الدعاء والقدر" مصنفہ سیدہ خیر النساء بہتر والدہ ماجدہ مولانا علی میاں ندویؒ، ص:۲۳۔ بحوالہ "کاروان زندگی" ج:۱، ص:۳۲-۳۳

☆ ☆ ☆

حضرت مولانا علی میاںؒ

شخصیت کے چند گوشے

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری — مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام نوادہ مبارکپور اعظم گڑھ

زندگی کے مسائل اور اس کی ضروریات بے شمار ہیں، ان مسائل کے درمیان سرگرم رہنے والا گوناگوں حالات سے دوچار ہوتا ہے، مختلف انواع کے افراد سے سابقہ پڑتا ہے، مختلف ذہن و مزاج کے لوگوں کو جھیلنا پڑتا ہے، پھر جس شخص کا مقام و مرتبہ جتنا اونچا ہوتا ہے، اسی اعتبار سے شخصیات و افراد بھی اس سے ملنے آتے ہیں یا اسے ملنا پڑتا ہے۔

اگر زندگی میں سرگرم اور مصروف عمل ہونے کا جذبہ نہ ہو، تو کسی گوشے میں خاموش زندگی گزاری جا سکتی ہے، نہ کہیں آنا، نہ جانا، نہ ملنا نہ جلنا، لیکن یہ وہ زندگی ہے جو کسی بلند پایہ عالم کے شایان شان نہیں، عالم باعمل اور عالم عالی مرتبہ کی شان شیخ سعدیؒ کے الفاظ میں یہ ہوتی ہے

صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ ؛ بشکستہ عہدِ صحبتِ اہلِ طریق را!
گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود ؛ تا کردی اختیار ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می برد ز موج ؛ ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

(گلستان باب دوم حکایت ۱۲)

"ایک بزرگ خانقاہ سے مدرسہ میں آگئے اور اہل طریق کی صحبت کے عہد کو توڑ دیا، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے عالم اور عابد میں کیا فرق پایا جس کی وجہ سے اس جماعت کو اختیار کیا؟

انھوں نے جواب دیا کہ عابد تنہا اپنی گدڑی موج سے بچاتا ہے اور عالم کوشش کرتا ہے کہ ڈوبنے والے کو بھی بچائے"۔

پھر جو مدرسہ و خانقاہ کو ساتھ لیکر چلتا ہو اور "گلیم خویش" اور "عزیق" دونوں کی فکر، دونوں کیلئے اضطراب رکھتا ہو، اس کی زندگی کی شان عجیب ہی ہوتی ہے۔

اسی فکر و اضطراب نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنوں سے بھی ملوایا، غیروں سے بھی، عام آدمی سے بھی اور اہالیانِ سلطنت سے بھی، خود اپنی اپنی اغراض کیلئے ان کے درِ دولت پر حاضری دینے والے ہر طرح کے افراد تھے، مسلم و غیر مسلم، اصحابِ ثروت و ارباب اقتدار، انتظام و سیاست سے وابستہ، علم و صنعت کے خوشہ چیں۔

ایک بلند پایہ عالم سے مسلم عوام و خواص ملیں یا ان سے وہ ملے تو فطری بات ہوئی، لیکن غیر مسلم خواص اہل علم اور اہل سیاست کا ملنا، یا ملت کے مسائل کے تحت خود ان سے ملنے جانا مخلوق خدا اور ملت کے تئیں فکر مندی کی دلیل ہے، یہ غم ذات بھی ہے، غم دیگراں بھی اور کسی بھی مخلص، دردمند قائد کے اخلاص و دردمندی کا ثبوت بھی، یہ درد و فکر، یہ اضطراب حضرت مولانا کی زندگی میں اس طرح رچ بس اور گھل مل گیا تھا کہ زندگی اسی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔

اگلی سطور حضرت مولانا کی زندگی کے انھیں گوشوں اور پہلوؤں سے متعلق ہیں:۔

ملک کیلئے فکر مندی

آدمی جہاں پیدا ہوا ہو، پلا بڑھا ہو، جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا ہو، اس سے محبت ہونا فطری بات ہے، اس کی ترقی پر خوشی اور تنزل و انحطاط پر صدمہ پہونچنا بھی فطری ہے، مولانا کی تحریروں میں اپنے ملک ہندوستان کیلئے اس قسم کے جذبات اس انداز میں اجاگر ہو رہے ہیں:۔

"یہ بات بالکل فطری اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اس کو رہنا ہے اور جہاں اس کی عزیز متاع اور زندگی کی پونجی ہے، اور جس کے بنانے سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں

صرف ہوئی ہیں، یہ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے، عقل و ہوش کی موجودگی میں نہ اسپر خود تیشہ چلا سکتا ہے اور نہ کسی کو تیشہ چلانے کی اجازت دے سکتا ہے"۔

(کاروان زندگی حصہ دوم ص۱۱۱)

اس کے بعد مولانا نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی بلکہ قومی و اجتماعی خودکشی کی طرف بڑھ رہا ہے، اخلاقی قدریں پامال کی جارہی ہیں ـــــ باستثناء چند معدودے افراد سب پر خود غرضی کا جنون سوار ہے، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کا احترام ختم ہو رہا ہے، ملک کیلئے یہ چیزیں انتہائی خطرناک ہیں، ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ملک کے عوام کے ضمیر کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، اور اسی ضرورت کے احساس نے حضرت مولانا کو بھی میدان میں آنے پر مجبور کیا:۔

"بہت انتظار کرنے کے اپنی بے سروسامانی، تنہائی و بے اثری کا پورا علم و احساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلا تفریق مذہب و ملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا، جب کسی محلہ یا گاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلا اٹھتے ہیں اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں"۔ (کاروان زندگی حصہ دوم ص۱۱۱)

یہ اوراوپر کا اقتباس ان سوالوں کا جواب ہے جو حضرت مولانا سے "تحریک پیام انسانیت" کے دواعی اور محرکات کے سلسلے میں کئے گئے تھے، دوسرے اقتباس کی آخری سطروں میں ملک کی بہی خواہی اور ہمدردی میں مولانا کے درد دل نے ایسا پیکر اختیار کر لیا ہے جو دوسروں کے دلوں کے تاروں کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد پورے ملک میں فسادات کی جو لہر اٹھی، خاص طور پر بمبئی و سورت

احمد آباد اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کے جان و مال کو جس طرح تباہ و برباد کیا گیا، فرقہ پرست عناصر نے سفاکی اور ظلم و بربریت کا جو مظاہرہ کیا اس نے ہر دردمند انسان کو خون کے آنسو رلا دیا، ہر محب وطن جانتا تھا کہ یہ وطن دوستی نہیں وطن دشمنی ہے، ملک کو تباہ و برباد کرنیکی سازش ہے، ایسے موقع پر خاموشی اور سکوت ظلم کی حمایت قرار دی جاتی ہے۔

انھیں حالات میں حضرت مولانا کی یہ تقریر جو ۶ جنوری ۱۹۹۳ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی بارہ دری میں ہوئی اور جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مخلوط مجمع تھا، ان کے شدت درد کی عکاس بن گئی ہے۔

"اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اور ہمارے پولیٹکل لیڈر نکل آئیں اور ہاتھ پکڑ پکڑ کہیں کہ اس ملک کی عزت رکھ لو، اس ملک کی شہرت پر بٹہ نہ لگاؤ، آدمی بن کر رہو، ایک دوسرے سے محبت کرو، زندگی کا سارا لطف اس میں ہے کہ آدمی آدمی کو دیکھے، آدمی آدمی کو پہچانے اور امید رکھے کہ ہم پر اگر کوئی آفت پڑے گی، ہم پر کوئی مصیبت آئے گی تو یہ بچائیں گے، اسی کا نام تمدن ہے اور اسی کا نام حب الوطنی ہے اور اسی کا نام سیاست بھی ہے، سیاست بھی یہی ہے کہ ملک میں سب مل جل کر رہیں۔" (کاروان زندگی حصہ پنجم ص ۱۲۹)

اہل پاکستان کو مشورے

تقسیم سے قبل پاکستان ہندوستان کا ہی ایک حصہ تھا، اس لئے اپنے ملک کی بہتری اور بہی خواہی کے ساتھ پاکستان کی بہی خواہی اور اس کو مفید مشورے دینا، اسلام اور انسانیت دونوں کے عین مطابق ہے، چنانچہ حضرت مولانا اس سے بھی کبھی غافل نہیں ہوئے اور جب جب موقع ہاتھ آیا ان کے دلی جذبات نوک زبان یا نوک قلم پر آگئے۔

بہت سے مخلص و محترم قائدین ملت کی طرح مولانا کے خیالات بھی یہی تھے کہ "اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو اس کو باقی رہنا چاہیئے اور ترقی کرنا چاہیئے۔"

مولانا کا خیال تھا اور اپنی جگہ بالکل صحیح تھا اور ہے کہ اسلامی تاریخ اور دیگر ملتوں اور سلطنتوں

کے عروج و زوال کی داستانوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ مسلمان طاقتوں، حکومتوں اور معاشروں کو سب سے زیادہ نقصان مسلمان اقتدار پسندوں اور طالع آزماؤں کی نفسانیت اور جاہ طلبی سے پہونچا۔

اس حقیقت کی روشنی میں مولانا نے ۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کو پاکستانی قومی اتحاد کے جنرل سکریٹری پروفیسر غفور احمد (وفاقی وزیر صنعت و پیداوار حکومت پاکستان) کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں جس میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما، دینی و تعلیمی و سماجی حلقوں کی نمائندہ شخصیتیں، ممتاز ادیب و صحافی اور علمی و دینی طبقہ کے معروف اصحاب کی معتدبہ تعداد موجود تھی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آپکو تین طرح کی قربانیاں دینی ہیں، ہماری ہر قربانی کیلئے ہماری تاریخ میں ایک امام موجود ہے، ایک قربانی وہ ہے جو سیدنا خالد بن الولیدؓ نے یرموک میں دی تھی کہ ان کو عین میدانِ جنگ میں معزول کر دیا گیا، لیکن ان کی پیشانی پر شکن نہ آئی اور انھوں نے کہا کہ اگر میں عمرؓ کیلئے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کیلئے لڑتا تھا تو میرے جوش اور سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دوسری قربانی وہ ہے جو نواسۂ رسولؐ حضرت حسن بن علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں خلافت سے دستبردار ہو کر امت کے انتشار کو ختم کرنے کیلئے دی تھی۔

تیسری قربانی وہ ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی مملکت اور معاشرہ کو اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کی راہ پر لگانے کے لئے اپنی زندگی کو بدل کر اور اپنے خاندان کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے دی تھی، اب یہ تینوں قربانیاں پاکستان کی ملتِ اسلامیہ کو درپیش ہیں"۔ (کاروان زندگی حصہ دوم ص۲۶۱)

ایک اور موقع پر مئی ۱۹۸۴ء میں اہلِ پاکستان کو بتایا کہ انھیں پاکستان کے اسلامی تشخص کی

حفاظت اور اسے مزید اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، پاکستان کی عام زندگی میں یہ پہلو بہت تشویشناک اور موجب تنقید ہے کہ وہاں کے رہن سہن میں اسراف، تقریبات اور مظاہر میں صرف بے جا، اور معیار زندگی بلند کرنے کیلئے جنون کی حد تک مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے جس سے بیشمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیاں اور زندگی کے بے شمار مسائل پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

اربابِ انتظام اور اہلِ سیاست سے ملاقاتیں

سالار قافلہ اور میر کارواں کو، کارواں کی سلامتی، سلامت روی اور کارواں کے تئیں بیدار و ہشیار اور فعال و سرگرم رہنے کیلئے اربابِ انتظام اور اہل سیاست سے بھی ملنے کی ضرورت پڑتی ہے، خود صاحبان اقتدار اور ایوان سیاست میں خانہ نشیں حضرات بھی ملنا چاہتے ہیں دونوں کی ملاقات، دونوں کا ایک دوسرے کے پاس جانا اور ملنا الگ الگ مقاصد کے تحت ہوتا ہے اور زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، عام طور پر اہل سیاست اور ارباب اقتدار اپنی اغراض لے کر جاتے ہیں، اقتدار و سیاست کیلئے میدان بنانا چاہتے ہیں، لیکن میر کارواں کے سامنے ذاتی مفادات نہیں ہوتے، وہ کارواں کے راہ کی رکاوٹیں دور کر کے کارواں کا میدان بنانا چاہتا ہے۔

میرِ کارواں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ سے ملی مسائل و حالات کے تحت مختلف مواقع پر جن اہم غیر مسلم سیاسی و انتظامی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں ان کی خواہش پر ہوئیں یا جو خود ہی ملاقات کرنے آئے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

مسز اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، وشوناتھ پرتاپ سنگھ، نرسمہا راؤ، دیو گوڑا، چندر شیکھر (سابق وزرائے اعظم) اٹل بہاری واجپئی (موجودہ وزیر اعظم) کرشن کانت (موجودہ نائب صدر جمہوریہ) ـــــ اس فہرست میں گورنر صاحبان، وزرائے اعلیٰ اور مرکزی و ریاستی وزراء کو شامل کیا جائے تو بڑی طویل ہو جائے گی۔

صرف مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہو جائیگا

کہ مولانا ارباب اقتدار کو ملک کیلئے کس سوچ اور کس راہ پر لانا چاہتے تھے، مولانا نے جن جن وزرائے اعظم، گورنر صاحبان یا وزرائے اعلیٰ یا وزراء سے ملاقات کی یا وہ خود ملنے آئے اب سے اسی انداز میں گفتگو کی اور سب کے ساتھ آپ کی دعوت کا لب لباب ایک ہی تھا، الفاظ و انداز بدلا ہوا، لیکن سوچ اور فکر ایک، درد و اضطراب ایک ۔

مسز اندرا گاندھی سے مولانا کی ملاقات ایمرجنسی کے دوران ۱۹۷۶ء میں خود اندرا کی خواہش پر ہوئی، صدر موریٹانیا مختار ولد داداہ کے اعزاز میں وزیر اعظم کی طرف سے لنچ تھا اسمیں شرکت کیلئے مولانا کو رائے بریلی سے بلایا تھا، مولانا کے الفاظ میں "شاید عربی دانی اور میرے اسلامی ممالک کے دوروں کی مناسبت سے اس میں شرکت کیلئے مجھے بھی دعوت دی گئی ہو یا ممکن ہے اس کے ذریعہ مجھے قریب و مانوس کرنا مقصود ہو" (کاروان زندگی ص ۲۱۲)

ایمرجنسی میں اندرا گاندھی، سنجے گاندھی اور ان کے حواریین کے ذریعہ نشۂ اقتدار کے جو مظاہر سامنے آرہے تھے، وہ مکمل طور پر ملک کی تباہی کا پیش خیمہ تھے، حضرت مولانا کو بہت سی مسلم و غیر مسلم شخصیات نے مشورہ دیا، بلکہ زور دیکر کہا آپ اندرا گاندھی سے مل کر سمجھائیں اور حالات کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں، انھیں وجوہ سے حضرت مولانا خود ہی وزیر اعظم سے ملنے کے خواہشمند تھے، مگر اس کی کوئی صورت ابھی تک نہیں بن پائی تھی، اب جب خود وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ہی دعوت دیدی تو اس مقصد کے پورا ہونے کا وقت بھی آگیا، چنانچہ مولانا نے زبانی گفتگو کے علاوہ مسز اندرا گاندھی کو جو خط دیا اس کی چند سطریں یہ ہیں:

"ادھر تقریباً چھ مہینے سے جب سے نسبندی پر عمل کرانے کی مہم شروع ہوئی ہے، صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ تک صحیح حالات و واقعات پہونچنے نہیں دئے جاتے ورنہ آپ اس صورت حال کو کسی طرح باقی نہ رہنے کی اجازت نہ دیتیں، صورت یہ ہے کہ آپ کے منشا و مقاصد کے خلاف ریاستی حکومتوں نے اس قانون کے نفاذ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کو اپنے اقتدار کی

بقا اور سرخروئی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے اور اس میدان میں وہ ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو کسی زخم خوردہ، انتقامی ذہنیت رکھنے والی غیر ملکی حکومت اور اس کے ایجنٹوں کے ذریعہ کسی ملک کے پُرامن شہریوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ سارا ملک ایک کیمپ میں تبدیل ہو گیا ہے، خوف و ہراس کی ایک فضا قائم ہے، لوگ اپنی مقصد براری کیلئے اور اپنا اپنا کوٹہ پورا کرنے کیلئے نہایت ذلیل بلکہ وحشیانہ حرکتیں کر رہے ہیں، جس طرح جنگل کے جانوروں اور چڑیوں کا شکار کھیلا جاتا ہے، اسیطرح غریب مزدوری کرنیوالوں، دیہاتیوں اور شاگرد پیشہ لوگوں کو پکڑا جاتا ہے اور پیسے کا لالچ دے کر یا دھمکا کر یا پھسلا کر اپنا حساب پورا کیا جاتا ہے ..... ہر مجلس کا یہی موضوع سخن بنا ہوا ہے اور ہر شخص پریشان نظر آتا ہے ..... اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ وہ اخلاقی گراوٹ ہے جو لالچ یا خوف سے ایک ایسے ملک میں پیدا ہو سکتی ہے جس میں تعلیم و تربیت کی پہلے بھی کمی تھی ..... اس وقت ملک کی بہت جلد خبر لینے کی ضرورت ہے"۔

(کاروان زندگی حصہ دوم ص۲۱۸ تا ص۲۲۰)

مشترک مسائل کی طرف غیر مسلمین کو دعوت

مسلمانوں بالخصوص علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت دین کا اندرونی کام تو کریں ہی غیر مسلموں تک بھی اسے پہنچائیں اور اسلام کے قریب لائیں، لیکن یہ کام بڑا نازک اور حساس ہے، بڑی اہم ذمہ داری والا ہے ..... دعوت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ براہ راست اسلام کی طرف بلایا جائے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عالم انسانیت کے مشترک مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے، حالات کی وہ خطرناکیاں سامنے لائی جائیں جن کیلئے ہر باشعور اور صاحب فہم و دانش فکر مند ہو اور سدھار چاہتا ہو، وہ معاملات

جو مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو جکڑے ہوں، سب پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہوں، ان کو سامنے رکھ کر اسلام کی تعلیمات پیش کی جائیں، لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔

حضرت مولانا (نور اللہ مرقدہٗ) نے یہ کام بڑل دلسوزی، جانکاہی لیکن سوجھ بوجھ کے ساتھ شروع کیا، حقیقت یہ ہیکہ غیر مسلموں کو قریب لانے میں حضرت مولاناؒ کی "تحریک پیامِ انسانیت" نے زبردست کام کیا ہے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں :۔

"لیکن غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت و اخلاق اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل و مصائب کے حل کی نشاندہی کے سوا نہیں، اور یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خداداد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کر سکتا ہے"۔

(میرِ کارواں صہ ۳۰۵)

غیر مسلمین سے روابط قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان ہریانہ، پنجاب، دہلی، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، کرناٹک وغیرہ صوبہ جات کے مختلف مقامات پر کامیاب جلسے ہوئے، جن کے سامعین میں انتظام و انصرام سے جڑے تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات اور مذہبی و سماجی حیثیت کے حامل اہم برادران وطن کی بڑی تعداد رہتی تھی، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو مسلمانوں کو بالکل ہی برداشت کرنے کیلئے آمادہ نہیں، چنانچہ ۱۹۷۷ء میں اندور (مدھیہ پردیش) کی ایک تقریر سننے کے بعد مولانا کی قیام گاہ پر آر، ایس، ایس کے لیڈروں کا ایک وفد آیا، اس نے گہرے تاثر کا اظہار کیا اور کہا "کل کی تقریر سے ہم کو معلوم ہوا کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے"۔ (کاروان زندگی حصہ دوم صہ ۱۲۴)

اسی طرح حیدر آباد دکن میں ۱۹۸۸ء میں وشو ہندو پریشد اور ہندو مہا سبھا کے قائدین نے آکر کہا کہ "آپ کی دعوت قومی یکجہتی اور اخلاقی قدروں کی بحالی اور انسانی عزت و آبرو کے تحفظ و احترام پر مبنی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" (کاروانِ زندگی حصہ چہارم ص ۶۲)

ایک موقع پر وی، پی سنگھ (سابق وزیر اعظم) سے ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وی، پی سنگھ جی نے کہا: میں آپ کے مضامین اور تحریریں جو "پیام انسانیت" کے سلسلے میں ہیں پڑھتا رہتا ہوں، بلکہ جب کوئی اہم پبلک اسپیچ دینے جانے لگتا ہوں تو آپ کی کوئی تقریر یا رسالہ پڑھ لیتا ہوں، آپ نے ایک جگہ بہت صحیح لکھا ہے کہ "آگ کو جب کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تو وہ اپنے آپ کو کھانے لگتی ہے۔"

(کاروانِ زندگی حصہ چہارم ص ۲۱۲)

بہر حال اس جہت سے بھی حضرت مولانا کی خدمات کا ایک عظیم سلسلہ ہے جو زبانی تقریر و گفتگو سے گزر کر تحریر و تصنیف کے عظیم ذخیرہ میں تبدیل ہو چکا ہے اور آنے والوں کیلئے مشعلِ راہ ہے۔

ایک سوال

مسلمانوں میں اسراف کی جو وبا آئی ہوئی ہے، شادیوں اور دیگر تقریبات میں جس طرح اسراف و تبذیر جاری ہے، غیر اسلامی رسوم کی پابندی کی جا رہی ہے وہ کسی بھی قوم و ملت کیلئے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ جس قوم کے لاکھوں لوگ نان جویں کے محتاج ہوں اور ستر پوشی کے لباس سے عاری ہوں اہل ثروت اللہ کی عطا کردہ دولت کا بے جا استعمال کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں اس قوم کے مستقبل کا کیا ہوگا؟

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رح

۱۵ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ایک موہوب شخصیت

مولانا اسعد قاسم سنبھلی
استاذ ادب مدرسہ عربیہ امدادیہ مرادآباد (یوپی)

بائیس رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو عالم اسلام نے یہ خبر کلیجہ تھام کر سنی کہ خادم ملت، مجدد دین عالم بے بدل، مفکر و داعی، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دنیا سے کوچ کر گئے، دعوت و عزیمت کی ممتاز شخصیات کے غموں کو امت نے ہر دور میں جھیلا ہے، اور تاریخ و تراجم کے ہر صفحے میں ہم نے یہی پڑھا ہے کہ علم و فضل کی بدولت یہ حضرات ایسی عظمت و مقبولیت کے حامل تھے کہ ان کی وفات ملت پر بجلی بن کر گری، انکی جدائی پر ہر آنکھ روئی، ہر دل تڑپا اور درد و غم کی یہ ٹیسیں ایک دنیا کو غمگین کر گئیں، ہفتوں، عشروں تک اہل دل نے ان کی قبروں پر قرآن خوانی کی، مہینوں ان کا غم تازہ رہا اور سالہا سال تک لوگوں میں انکے دلدوز مرثیے پڑھے گئے، تاریخ میں جب ان حادثوں کا ذکر آتا ہے تو ہر زندہ دل کی طرح درد و غم ہم بھی محسوس کرتے اور محبت و عقیدت سے دل سرشار ہو جاتا، لیکن اس المناک منظر کی شدت کو پوری طرح محسوس کرنا اس شخص کیلئے ممکن نہیں، جس نے ان واقعات کو دیکھنے کے بجائے پڑھ کر جانا۔

۲۲ رمضان کو جب یہ خبر ملی تو گویا بجلی گر گئی، ہر طرف آہ و فغاں کا منظر نظر آیا اور اس مقام پر ہر شخص کو آنسوؤں کی اس حرارت اور غموں کی اس شدت کا اندازہ ہوا جو اسلاف و اکابر کی وفات

پر متقدمین نے ہمارے لئے ورثہ میں چھوڑی تھی۔

علماء امت کی روشن قندیلیں ہیں، اس لئے کسی عبقری عالم کی موت دراصل پورے عالم کی موت ہے، اور اس چراغ کے بجھ جانے سے کوئی مخصوص علاقہ نہیں، مشرق و مغرب میں تاریکی چھا جاتی ہے، خصوصاً اس وقت یہ غم کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے، جب صف اول کی تمام شخصیات یکے بعد دیگرے رخصت ہوتی جائیں اور پچھلی صفوں میں ایسے قد آور دل کا ظہور بظاہر مشکل نظر آتا ہو، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، علی طنطاوی، مصطفےٰ زرقاء، ناصر الدین البانی، مولانا عبدالرشید نعمانی اور مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری کے بعد حضرت مولانا کی وفات اس صدی کا ایسا ہی حادثہ ہے جس کے نتائج کو محسوس کر کے ہر دردمند دل تڑپ اٹھے گا، ہر آنکھ رو دے گی۔

مولانا موصوف کی شخصیت ہمہ گیر اور انکی علمی، دعوتی، تصنیفی اور ملی خدمات کا دائرہ تقریباً پون صدی پر پھیلا ہوا ہے، وہ ایک متبحر عالم، ممتاز مؤرخ، محقق ادیب، عمدہ مقرر، صاحب دل مفکر، پرسوز داعی، دلوں کو پلٹ دینے والے مصنف، کتاب و سنت کے رمز شناس، اسلاف واکابر کے ترجمان اور اس دور میں اسلام کی حقانیت کا ایک روشن چراغ تھے، خداوند قدوس نے انھیں علمی رسوخ، وسعت نظر، فکری حمیت، مومنانہ بصیرت، پرسوز اسلوب اور ایک ایسا عارفانہ دل عطا کیا تھا جو دنیا میں صرف انھیں لوگوں کو ملا کرتا ہے جنھیں دیندار ماؤں نے جنا ہو اور مشیت ایزدی ان سے کوئی عظیم کام لینے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ ملت کی زبوں حالی پر کڑھنا، دین کے زوال پر رو دینا، باطل کی سرخ روئی پر تڑپ اٹھنا، فتنے کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہونا، دین کی حفاظت میں تمام صلاحیتوں کا جھونک دینا، جاہلیت کی آندھیوں سے لڑنا اور شریعت کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی کوئی سمجھوتہ نہ کرنا۔ یہ انکی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو تاریخ میں صرف عبقری شخصیتوں سے ہی وابستہ رہی ہیں۔

اصلاح و تجدید، دعوت و تبلیغ اور علم و فضل کے میدان میں جن حضرات نے تاریخ ساز

کارنامے انجام دئے اور جن کی تاثیر و مقبولیت کی گونج اب تک ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے، وہ امت کو یوں ہی نہیں مل گئے، ان کی شخصیت کی تعمیر میں صلاحیت و قربانیوں کا ایک طویل سلسلہ کار فرما ہے ـــــ نسبی شرافت، سلامتِ قلب، ذہن کی آفاقیت، حساس ضمیر، محنت و عرق ریزی، عمدہ تربیت، بلند حوصلے، جواں عزائم، اخلاص اور سوزِ دروں، جذبوں کی حرارت، دلی صفت والدین اور ان کی پرسوز دعائیں، ممتاز شخصیات کی توجہ، اہلِ دل کی قربت، لائق اساتذہ کی شاگردی، شب زندہ داروں کی صحبت، نالۂ نیم شب کا نیاز، خلوت و انجمن کا گداز، دین کیلئے کچھ کر گذرنے کی دُھن، تاریخ دعوت و عزیمت کے بلند کرداروں کی کامل اتباع اور قدم قدم پر سایہ فگن توفیقِ باری ـــــ یہ تمام عناصر مل کر جب کسی وجود میں سماتے ہیں تو اس میں تلاطم بپا ہوتا ہے اور دنیا ایک علی میاں سے آشنا ہوتی ہے۔

ماضی کی طرح دورِ حاضر میں بھی ایسے مصنفوں کی کمی نہیں جن کے قلم سے درجنوں کتابیں نکلیں اور انکی تصنیفی صلاحیت کو ایک دنیا نے تسلیم کیا، لیکن حضرت مولانا اس بزم میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، انکی تصانیف میں یہ رُوح ہر سطر اور ہر لفظ میں بھری ہے کہ اسلام ایک ابدی اور آفاقی پیغام ہے، جو قیامت تک ہر دور میں انسانی ضروریات و تقاضے کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، وہ مسلمانوں کے مستقبل کو ماضی کے خطوط پر سنوارنا چاہتے ہیں، ان کی تحریر قرآن و سنّت کی ترجمانی اور اسلاف کے موقف کی توضیح ہے، اسلئے وہاں اعتماد و یقین کی وہ فضا نظر آتی ہے جس سے دِلوں کو زندگی ملتی ہے، اور منزل کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑتا، وہ دین کو ہر پہلو پر منطبق کرتے ہیں، اور اسلام و مسلمان کے درمیانی فاصلے کم سے کم ہوتے جاتے ہیں انہیں مرتب اور نتیجہ خیز اصولی گفتگو کا سلیقہ ہے اور ہر تحریر کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف مرکزی عنوان کی ڈور میں اپنی معلومات کو اس طرح پروتا ہے کہ ہر چیز مابعد کا مقدمہ اور ماقبل کا نتیجہ نظر آتی ہے، ان کا مخاطب کوئی مخصوص دور و حلقہ نہیں، بلکہ عالمِ اسلام کے تمام طبقے ہیں وہ عصبیت سے اوپر ہو کر لکھتے ہیں اور وحدتِ امت کی آرزو سطر سطر سے پھوٹتی ہے، انکے الفاظ

خوبصورت، اسلوب رواں، اور معلومات جادو کا سا اثر رکھتی ہیں، قلم سلوک و تصوف سے آشنا ہے، اسلئے اکابر کی عقیدت و احترام میں اس سے کبھی لغزش نہیں ہوتی، بلکہ معاصرین کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ انکی علمی زندگی کے کمزور پہلوؤں کی بھی وہ توجیہ و تاویل تلاش کر لیتا ہے اور حقیقت کے برملا اظہار کے باوجود وہ اکرام مسلم پر کہیں حرف نہیں آنے دیتا، تاریخ و تراجم کے ضمن میں انہوں نے جو اہلِ دعوت و عزیمت کی نقاب کشائی کی ہے، خصوصاً اخلاص و للّٰہیت، تعلق باللہ انابت و عبادت اور آہِ سحر گاہی کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ خود ان کے عارفانہ مزاج اور باطنی پہلو کی عکاسی کرتا ہے، قلب و قلم کی یہی قربت قاری کو اتنا متاثر کرتی ہے کہ وہ آخر آخر تک کسی مقام پر ان سے نہیں بچھڑتا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ کھلی فضا میں علوم و روحانیت کا ایسا سماں بندھ رہا ہے جو قاری کو مزاج نبوت سے آشنا کر کے اسے شرعی نظام کا متوالا بنا دیتا ہے حلاوت و شستگی انکے قلم کا خاصہ ہے، اور ہر تحریر میں آبشاروں کا شور سنائی دیتا ہے، لیکن زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آئے جب ان کے عنبر قلم سے انگارے اور چنگاریاں نکلیں، عربی قومیت اور صدر ناصر کے خلاف لکھے جانے والے مضامین میں یہی کیفیت طاری ہے، لگتا ہے ایک مجاہد حمیت و غیرت سے مجبور ہو کر دشمن سے اکیلا ہی بھڑ گیا ہے، اور اسے دنیا کی کوئی پرواہ نہیں انہوں نے نئی منزلوں کو تلاش کیا، نئی وادیوں میں قدم رکھا، تحقیق کی نئی رزم گاہیں دریافت کیں، ذہنوں کو آفاقیت بخشی، دلوں کو درد عطا کیا اور زبان و قلم کو ایسے اسلوب و بیان سے نوازا جس سے معاصر دنیا زیادہ مانوس اور حد درجہ متاثر ہے تو اس لحاظ سے وہ بلاشبہ امامِ وقت اور ایک نئے دور کے بانی ہیں۔

مولانا جیسے کثیر التالیف مصنف کو لوگ عموماً بس ایک عالم و محقق اور مورخ و متکلم کا درجہ دیتے ہیں جس کا سلوک و ربانیت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا اور اس کا امتیاز تحقیقی تفردات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اسے اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا ہے، مولانا یہاں بھی مختلف نظر آتے ہیں، انہیں ہر جگہ انعامات سے نوازا گیا، یونیورسٹیوں کے سرپرست مقرر ہوئے، مدارس و جامعات کے ذمہ دار بنائے گئے، ان کی حیات و خدمات پر سیمینار ہوئے، انہیں کعبہ کی کنجیاں تک دی گئیں،

دولت کی بارش ہوئی، عرب فرماں رواؤں نے ٹوٹ کر چاہا، علماء نے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا، اگر مولانا چاہتے تو دولت کے انبار لگ جاتے، خود کو نہیں تو کم از کم عزیز و اقارب ہی کو خلیجی ممالک میں عہدے دلوا دیتے اور پورا خاندان انکی شخصیت و روابط سے مستفید ہوتا، لیکن واہ رے فقیر بوذر اذرا دلائے سلمانی ہر جگہ سے دامن جھاڑ کر واپس ہوئے، خود فائدہ اٹھایا نہ اہل خاندان کو مستفید ہونے دیا حتی کہ انکی آرزوؤں کا مرکز بندہ بھی ان انعامی رقومات سے محروم رہا اور وہ سب کی سب دعوت و جہاد کے مختلف میدانوں میں صرف ہوئیں، زہد و تجرد اور سخاوت و ایثار شیخ ابن القیم کی تشریح کے مطابق شرح صدر کا نتیجہ ہیں جو نبوت کی میراث اور نیابت رسول کی انتہا ہے، حضرت مولانا کے حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ انھیں یقین اور مشاہدہ کی دولت حاصل تھی اور شرح صدر سے وہ پوری طرح بہرہ ور تھے، صداقت و ولایت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، اور حضرت تھانوی کی ملاقات و صحبت، حضرت مدنی کی قربت حضرت رائے پوری کی توجہ اور آخر میں حضرت شیخ سہارنپوری کی عنایت سے بھی انھوں نے قبولیت و سعادت کا بھرپور حصہ پایا تھا۔

شہرت و تعارف، روابط و مقبولیت اور خلق خدا کا رجوع وہ چیز ہے جو مقتدر شخصیات کے علمی مشاغل خصوصاً تصنیف اور مطالعہ پر بہت اثر انداز ہوتی ہے اور ان کا زیادہ وقت پھر خلق ہی کی نذر ہو جاتا ہے، حضرت مولانا بھی اُن چند گنے چنے لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے عرب و عجم کی قیادت کے باوجود اپنے علمی و روحانی مشاغل پر آنچ نہ آنے دی، اور تصنیفی سلسلہ اس وقت بھی قائم رکھا جبکہ زیارت و ملاقات، مکاتیب و مراسلت اور ملی مسائل کے ہجوم کے باعث ان کیلئے ایک ایک منٹ نکالنا مشکل تھا، اس میں اسوہ ہے ہم ناواقفوں کیلئے جو معاشرہ میں معمولی تعارف ہوتے ہی شدید غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور آخذ و مراجع سے یکسر نابلد ہو کر عام معلومات ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علمی تنزلی کے آخری اسٹیج پر پہونچ جاتے ہیں اور معمولی باتوں کا بھی استحضار نہیں رہتا۔

ت بلا حدیث میں آتا ہے کہ جب باری تعالیٰ کے حضور میں کوئی بندہ تقرب و قبولیت حاصل کرتا ہے
تو زمین و آسمان کی مخلوق کے دل میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔ حضرت نانوتوی اور حضرت
تھانوی نے لکھا ہے کہ "مقبولیت و محبت ملأ اعلیٰ سے چل کر پہلے فرشتوں میں آتی ہے پھر دنیا
کے علماء اور نیکو کاروں کے دلوں میں اس کا الہام کیا جاتا ہے تا آں کہ اس خوشبو سے امت
کا کوئی طبقہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا" اصلاح و تجدید کی تاریخ کے تمام روشن مینارؤں کا یہی
حال ہے کہ انکی مقبولیت عوام سے خواص تک نہیں بلکہ خواص سے عوام تک پہنچی ہے اس سلسلے
کی روشن کڑی بلاشبہ ہمارے دور میں حضرت مولانا تھے، بلند پایہ تصانیف کی بدولت پہلے انھیں
اہل دل نے جانا، پھر علماء اور طلباء واقف ہوئے اور آخر میں ہوائیں ان کا نام لیکر ایسی اڑیں کہ
کیا مسجد و خانقاہ، کیا جامعات و مدارس، کیا ایوان و محلات، ہر جگہ انھی کا شور سنائی دیا اور انکے
دیدار کیلئے عرب و عجم کی خلقت امنڈ پڑی۔

اللہ کی شان پوری زندگی اتنا نوازا کہ اب وہ حسن خاتمہ ہی کی تمنا کر سکتے تھے مولیٰ نے
انھیں وہ بھی قابل رشک عطا فرمایا، ماہ رمضان، آخری عشرہ، جمعہ کا دن، نماز کی تیاری، سورۂ
یٰسین کی تلاوت اور "فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم" کی قرأت اور پھر تیسویں شب کی تدفین جس کو حضرت
ابی ابن کعبؓ نے قسم کھا کر لیلۃ القدر بتلایا ہے ـــــ سعادت و حسن خاتمہ کی تمام علامات جمع
ہوگئیں، یہ موت بلاشبہ صدیقوں کی موت تھی جس پر تمام اہل دل تڑپ اٹھے اور کیا حرم مکی، کیا
مسجد نبوی، عالم اسلام کے ہر ہر خطے میں غائبانہ نماز جنازہ کے وہ روحانی مناظر دکھائی پڑے
جو عہد قریب کی تاریخ میں صرف انھی کا امتیاز ہے۔

مولانا کی شخصیت پر دنیا میں بہت کچھ لکھا جائے گا اور ان کی حیات و خدمات پر روشنی
ڈالنے والے اہل قلم عظمت و مقبولیت کے اسباب کے ضمن میں اس نکتے پر خصوصی غور کریں
گے، کہ اتنی طاقت ور شخصیت آخر کس طرح ظہور پذیر ہوئی اور اس کی تعمیر میں کون کون سے
عوامل کارفرما ہیں، موروثی اثرات، وہبی صلاحیت، عمدہ تربیت اور محنت و لگن سے قطع نظر ہمارے

نزدیک مولانا کی شخصیت دراصل ان کی والدہ کی الہامی دعاؤں کا نتیجہ ہے، ان کی منظوم مناجات کا مطالعہ کرنے والے جان سکتے ہیں کہ اللہ کی اس مقبول و خدا ترس بندی نے کس خضوع و تضرع کے ساتھ ـــــ "علی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو" ـــــ کی دامن پھیلا کر دعا مانگی ہے، اخلاص میں ڈوبی اور آنسوؤں میں بھیگی یہ دعائیں تاریخ کے ہر دور میں کرامات و کرشموں کا باعث بنی ہیں اور تمام عبقری شخصیتوں کو اہل دل نے انہی کا فیض اور پرتو قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا کی مثال ظلمتِ شب میں ایک روشن چراغ کی سی تھی جسکے گرد علماء پروانوں کی طرح منڈلاتے اور راہِ حق کے مسافران سے ہدایت اور روشنی حاصل کرتے، ہندستان میں جب بھی کوئی بُرا وقت آیا، سب کی نگاہیں بے اختیار ان پر جاٹکیں اور انہوں نے حکمت و تدبر سے بھرپور جرأتمندانہ قدم اٹھا کر پوری پوری حکومتوں کو جھکا دیا، شاہ بانو کیس اور وندے ماترم کا قصہ اس کی زندہ مثال ہے، اور جب جبکہ وہ جوارِ رحمت میں پہونچ چکے ہیں، ہمیں انکی جدائیگی تڑپائے گی، خصوصاً اسلامیانِ ہند کو ہر نازک موڑ پر انکی ضرورت کا احساس ہوگا، خداوندِ قدوس ہمیں مولانا کا بدل نصیب فرمائے، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، کیا عجب ہے وہ پھر کوئی حکمت و تدبر، عزم و حزم اور علم و فضل سے پُر شخصیت قیادت کیلئے نمودار کردے اور وہ اس شرعی نظام حیات کی تکمیل خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، جس کے قیام کی جد و جہد کرتے ہوئے مولانا نے اس دنیا سے کوچ کیا۔

آخر میں اس خواہش کے اظہار کیلئے دل مچل رہا ہے کہ جس شخصیت نے عمر بن عبدالعزیزؒ سے حضرت شاہ ولی اللہؒ تک اصلاح و تجدید کی تاریخ کو سنہرے حروف سے لکھا ہم پر اس کا حق ہے کہ تاریخ دعوت و عزیمت کی آخری جلد ہم اسی کے نام سے موسوم کریں، جو حضرت مولانا کے عہد حالات و انقلابات، حیات و خدمات اور ان ممتاز کارناموں پر مشتمل ہو جنھوں نے حال و مستقبل پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔

★★★

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ایک نادرۂ روزگار شخصیت

مولانا اختر امام عادل
مہتمم جامعہ ربانی - منورواشریف، سمستی پور - بہار

۲۳ رمضان کی شب تھی، ۲۲ کا دن اپنی تمام تر برکتوں، رحمتوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ رخصت ہو چکا تھا، موسم انتہائی سرد تھا، پوری فضا سفید دھند کی چادروں میں لپٹی ہوئی تھی، ٹھنڈ کی شدت سے دانت بج رہے تھے اور ماحول میں ایسا سناٹا کہ پتوں کے کھڑکنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی، شہر میں ہوتا تو شاید ہیٹر کے بغیر چارۂ کار نہ ہوتا، لیکن اپنے گاؤں کے مکان میں بند دروازے اور بند کھڑکیاں بھی غنیمت تھیں، نماز تراویح کے بعد میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا اور ہندوستانی ریڈیو اپنی خبریں نشر کرتے ہیں کہ اچانک ایک خبر نے ہزاروں قیامتیں برپا کر دیں، اور دوپہر بارہ بجے کی خبر نے رات کے شاداب لمحوں میں بھی مجھ میں بارہ بجے کی جھلسی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ——— اس وقت مجھے صحیح احساس ہوا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مجھے کتنا والہانہ تعلق ہے؟ زندگی میں تو ہر چیز معمول پر نظر آتی ہے، لیکن موت کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ رشتہ اپنے اندر کتنی معنویت اور کتنی گہرائی رکھتا ہے؟ اور اسکی جڑیں کتنے اندر پیوست ہیں؟ -

آنکھیں تھیں کہ بہی چلی جا رہی تھیں، دل تھا جو پھٹا جا رہا تھا، سینہ پر درد کی چوٹیں پڑ رہی تھیں پورا وجود لرز رہا تھا، جیسے کوئی میری سب سے محبوب ہستی گزر گئی اور یہ حادثہ رائے بریلی کے کسی گاؤں کا نہیں بلکہ خود میرے گھر کا ہے، اور میں سمجھتا ہوں شاید بہتوں کی یہی کیفیت تھی، ہر شخص اس کو اپنے گھر کا حادثہ سمجھ رہا تھا ـــــ ایسے ہی مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ صداقت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ (الحدیث)

ایک صاحبِ علم کی موت سے گویا پورا عالم اجڑ جاتا ہے اور اس کا جھٹکا ایک شخص یا ایک خاندان کو نہیں، بلکہ دنیا کے ہر خاندان کو لگتا ہے ـــــ ایسی ہی موت، عالمی موت اور ایسی ہی مصیبت عالمی مصیبت کہلاتی ہے ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون

"موت اس کی ہے....."

آج جب میرا دل رو رہا تھا اور میری آنکھوں سے اشکوں کا سیل بے کراں رواں تھا، اور صرف میں ہی نہیں بلکہ ساری کائنات رو رہی تھی اور میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہیبت سناٹا غالباً اسی کی تصدیق کر رہا تھا، مجھے میر تقی میر بہت یاد آئے، وہ بے چارہ عمر بھر روتا رہا اور جب اس کی موت ہوئی تو سارا زمانہ اس پر رویا، کیا اچھی بات کہہ گئے ہیں ـــــ

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو آئے ہیں سبھی دنیا میں مرنے کیلئے

پہلی معرفت میرے شعور کی دنیا میں یہ عظیم شخصیت اس وقت وارد ہوئی، جب میں رسمی شعور کی منزل میں بھی نہیں پہونچا تھا (حقیقی شعور سے تو آج تک محروم ہوں) تو غالباً یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ شخصیت میرے شعور میں نہیں، بلکہ لاشعور میں نازل ہوئی، (اور اہل تحقیق جانتے ہیں کہ لاشعور کا رشتہ انتہائی گہرا اور حقیقی ہوتا ہے) میں غازی پور

میں مدرسہ دینیہ کا طالب علم تھا اور ہماری انجمن کی لائبریری کے لئے نئی کتابیں خرید کر آئی تھیں اس میں ایک چھوٹی سی کتاب "جب ایمان کی بہار آئی" بھی شامل تھی، بقامت کہتر و بقیمت بہتر کی شاندار مثال، اس وقت تو اس کا احساس نہ تھا، لیکن اب احساس ہوتا ہے، کتاب میں ہندوستان کی ایک عظیم دینی و ایمانی تحریک کی تاریخ پیش کی گئی ہے، مجھے اپنی عمر کی منزلِ نوبہاری میں یہ کتاب اپنے نام و مقام دونوں لحاظ سے بہت پسند آئی، پوری طرح کتاب سمجھ میں آئی یا نہیں؟ لیکن اس کی سطر سطر چاٹ ڈالی، بچپن ہی سے میرے اندر زیادہ حساسیت پائی جاتی ہے، اور درد و کرب سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت مجھے ملی ہے، میں اس کتاب سے کافی متأثر ہوا —— اس وقت عمر کی اس منزل میں تو نہیں تھا کہ کتاب کے ساتھ صاحبِ کتاب کے بارے میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن ایک انجانا سا انس صاحبِ کتاب کے ساتھ ضرور پیدا ہو گیا، جو بعد میں آہستہ آہستہ شعور و ادراک کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

انسان کی تعریف

اسی دور کی بات ہے کہ ایک روز فلسفہ کے درس میں یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ انسان کی صحیح تعریف کیا ہے؟ پھر فیصلہ کن انداز میں اہل حقائق کے حوالہ سے استاذ محترم نے فرمایا کہ "انسان وہ ہے جس کے نہ رہنے کی صورت میں اس کی کمی محسوس کی جائے، میں پھڑک اٹھا تھا، ممکن ہے انسانیت کی کوئی اس سے بھی اچھی تعبیر موجود ہو، لیکن اس وقت مجھے انسان کی یہ تعریف سب سے اچھی لگی تھی، مجھے یاد ہے میں بہت دنوں تک یہ سوچتا رہا تھا کہ وہ انسان ہی کیا جس کے رہنے کا کچھ فائدہ نہ ہو اور جانے سے کوئی نقصان نہ ہو، انسان تو وہ ہے کہ جہاں جائے اپنا اثر چھوڑ کر جاتے اور جانے پر لوگوں کو اس کی جستجو ہو، اس کی کمی کا احساس ہو —— اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ میں بہتوں کو اپنی محدود سوچ کے مطابق اس آئینے میں دیکھا اور پرکھا کرتا تھا، کبھی اپنے کو دیکھنے کا خیال تو نہ آیا، لیکن دوسروں پر نگاہ تیز دوڑتی تھی، سوچتا تھا کہ فلاں صاحب موجود ہیں اگر وہ نہ ہونگے تو کیا ہوگا؟ ان سے کیا کمی پیدا ہو جائے گی؟ اور کتنے لوگوں کو ان کی کمی کا احساس ہوگا؟

پیکرِ انسانیت

پتہ نہیں اسوقت کی طفلانہ ذہنیت کے لحاظ سے کوئی اس معیار پر اترا یا نہیں لیکن رسمی شعور کی عمر میں آجانے کے بعد لکھنؤ میں جب پہلی بار مجھے اپنی اس خیالی ہستی کی زیارت کا موقع ملا، اور حضرۃ الاستاذ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مدظلہ، مفتی دارالعلوم دیوبند کی معیت میں گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تو عہد لاشعور کی اس تلاش کا جواب برسوں کے بعد مجھے لکھنؤ کے ایک انسان میں مل گیا، پہلی ملاقات میں ہی محسوس ہوا کہ انسان کی صحیح تعریف ان پر صادق آتی ہے اور یہ وہ شخصیت ہے جو پیکر انسانیت کہلا سکتی ہے "انسان کامل" کی تعبیر و اصطلاح نہ معلوم کتنی بار کتابوں میں پڑھی تھی، لیکن پوری طرح سمجھ کر اس کو دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ندوۃ العلماء کے پر رونق احاطہ میں ہوا۔

رسمِ اجراء کی تقریب

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس تھا، لکھنؤ میں حضرت مولانا علی میاں کی مشہور معرکۃ الآرا کتاب "المرتضیٰ" کے رسم اجراء کی تقریب تھی، پورے ملک سے ارباب علم و تحقیق اس میں شرکت کر رہے تھے، غالباً حضرت مولانا کی یہ پہلی کتاب تھی جس کے لئے باقاعدہ رسم اجراء کا اہتمام کیا گیا، نہیں معلوم وہ کیا پس منظر تھا جس کی بناء پر مولانا کی عام تصنیفی روایات سے ہٹ کر عہد جدید کی ایک نئی علمی روایت کو اختیار کیا گیا ـــــ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، اس پروگرام کی کافی اہمیت تھی، حضرت علیؓ کی نسبت، مولانا کی شخصیت اور مسئلہ کی نزاکت نے رسم اجراء کی اس تقریب کو کافی اہم بنا دیا تھا، استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ بھی اس تقریب میں مدعو تھے، مفتی صاحب کے حکم پر میں رفیق سفر اور خادم کی حیثیت سے ان کے ساتھ شامل ہو گیا، یوں بھی لکھنؤ میرے خوابوں کی ایک منزل تھی، لکھنؤ سے اس ملک و ملت ہی کی نہیں، میرے خاندان کی تاریخ بھی وابستہ ہے، میرے والد عارف باللہ حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نقشبندی، قادری مدظلہ، میرے جد امجد قطب الہند حضرت مولانا حکیم حاجی احمد حسن منوروی اور پر دادا عالم ربانی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب

مظفر پوریؒ تلمیذ رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سب کسی نہ کسی درجے میں لکھنؤ سے وابستہ رہے۔

ہم لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر اترے اور اس شہر طلسمات کے بام و در اور رنگین نظاروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے گلمرگ ہوٹل پہونچے، اسی ہوٹل کا ایک کمرہ ہمارے لئے مخصوص تھا، بعد میں ہم ندوہ کے مہمان خانے میں منتقل ہو گئے۔

رسم اجراء کی تقریب ہوئی، بڑے بڑے اصحاب علم و تحقیق نے داد تحقیق دی، بعض وزراء اور اعیانِ حکومت بھی شریک تھے، انہوں نے صاحب تصنیف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شان میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا، حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے کتاب کی رونمائی فرمائی اور عہد حاضر کے میر ڈاکٹر کلیم عاجز نے درد و تاثیر میں ڈوبا ہوا اپنا کلام سنایا۔

شخصیت کا سب سے قیمتی عنصر

کسی کتاب کی یہ پہلی رسم اجراء تھی جو دیوبند سے باہر میں دیکھ رہا تھا اور یہی وہ پہلا موقعہ تھا جس میں حضرت مولانا کے کئی شخصی، علمی اور فکری عناصر میرے سامنے آئے، ہر عنصر اپنی جگہ حیرت انگیز تھا، ہر ایک اس لائق تھا کہ اس پر سو جان سے قربان ہوا جائے، لیکن ان کی شخصیت کے جس پہلو سے میں زیادہ متأثر ہوا وہ ان کی انسانیت (بمعنی حقیقی) تھی، ایک سادہ روپ میں سچا اور عظیم انسان اندر اور باہر دونوں سے انسان، بلکہ سراپا انسانیت، پاؤں میں سخت تکلیف تھی، مسجد تک جانے سے معذور تھے، مگر وارد ین و صادرین کا اس درجہ خیال کہ اس ضعف و پیری میں اس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں۔

اس سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی بہت سے علماء و مشائخ کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا مگر انسانیت کے ناطے (بایں عظمت) کسی سے اس درجہ متأثر نہیں ہوا، جتنا حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے ہوا۔

عمومیت و آفاقیت

ان کی تحریک پیام انسانیت کے پیچھے ان کے اندر کی یہی انسانیت کارفرما تھی، وہ انسانیت کے جس مقام بلند پر تھے ان کو بجا حق تھا کہ وہ یہ تحریک چلاتے اور بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل ساری انسانیت کو اپنا پیغام دیتے۔

اسی لئے ان کے یہاں بڑی آفاقیت ملتی ہے، کبھی وہ عرب کو مخاطب کرتے ہیں تو کبھی مغرب کو، کبھی وہ مصر کو اپنا پیغام سناتے ہیں "اِسمعِی یَا مِصر" تو کبھی زہرۃ الصحراء کویت اور ایران کو:۔ "اِسمعِی یَا زَہرَۃ الصَّحراء، اِسمعِی یَا اِیرَان"۔

انہوں نے دنیا کے ہر خطہ کو پکارا، اور انسانیت کے ہر خاندان کو آواز دی، اور دنیا کے ہر حصے میں ان کی آواز کو اہمیت دی گئی، ہندوستان میں پیام انسانیت کی تحریک چلی جس کے قائد خود مولانا رہے۔

ایک ہندی کی آواز پہ عرب چونک اٹھا

مولانا ندوی ہندوستان کے پہلے عربی ادیب ہیں جو عالم عرب میں بحیثیت ادیب و مفکر اس درجہ عمومیت و آفاقیت کے ساتھ جانے گئے، یہاں تک کہ اگر کسی عربی کو مولانا کا نام معلوم نہیں تو وہ نرا جاہل قرار دیا گیا (بقول مولانا نور عالم خلیل الامینی) یہ وہ امتیاز ہے جو ہندوستان کے کسی عربی مصنف و ادیب کو حاصل نہیں، ان کا لب و لہجہ، اسلوب بیان، طرز ادا، زبان و بیان اور تفکیری زاویہ اتنا اچھوتا تھا کہ عالم عرب ایک ہندی کی آواز پہ چونک اٹھا جب مولانا کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" عربوں کے پاس پہونچی اور اسلامی فکر و تاریخ کی ایک نئی سمت ان کے سامنے آئی تو پوری دنیائے عرب میں ہلچل مچ گئی، اسی کتاب نے مولانا کا وہ تعارف کرایا جو ان کے شایانِ شان تھا۔

مشہور عربی ادیب شیخ علی طنطاوی کا بیان ہے کہ جب میں نے یہ کتاب پڑھی تو حیران رہ گیا کہ یہ کون ہندی ہے جو عربوں کی طرح صاف ستھری عربی میں بات کرتا ہے اور اتنی بصیرت کیساتھ

تاریخ اسلامی کے تناظر میں مسلمانوں کے احوال و کوائف کا تجزیہ کرتا ہے، میں اس وقت تک مصنف کتاب سے واقف نہیں تھا، بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اس ہندی کا شجرۂ نسب بھی اسی سرزمین عرب سے ملتا ہے اور اسی لئے اس کے نغموں میں حجازی لے پائی جاتی ہے۔

؎ عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمۂ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

کتاب اور صاحبِ کتاب

مولانا کی ایک عظیم خصوصیت یہ تھی کہ ان کے یہاں قول و عمل میں حد درجہ یکسانیت پائی جاتی تھی، عام مصنفین اور ادیبوں کی طرح نہیں کہ "یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ" اپنی کتابوں اور تحریرات میں کچھ اور اپنی زندگی میں کچھ، جلوت میں ایک رنگ اور خلوت میں دوسرا رنگ، دوسروں کے لئے ایک پیغام اور اپنے لئے دوسرا کام ـــــ بڑے بڑے لوگوں کی ذاتی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اپنی تحریرات سے بالکل مختلف نظر آئیں گے۔

؎ بہت آساں ہے جلوت میں معاذ اللہ کہہ دینا
بہت مشکل ہے خلوت میں مے گلگوں سے بچ جانا

مولانا کے یہاں معاملہ یہ نہیں تھا، وہ جیسے اپنی قلمی کتابوں میں نظر آتے ہیں، کتاب زندگی میں بھی بالکل وہ ویسے ہی تھے، اس بات میں ان کے یہاں خلوت و جلوت کا فرق اور من و تو کا امتیاز نہیں تھا۔

عظیم سے عظیم تر

اس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے مولانا کو پہلے کتابوں سے جانا پھر اسے ان سے ملاقات و مصاحبت کا موقع ملا، وہ فرق نہیں کر سکتا کہ کتاب کے مولانا علی میاں اور تھے اور عملی زندگی کے علی میاں دوسرے؟ بلکہ میرا احساس تو یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جتنے عظیم تھے وہ اپنی ذاتی اور عملی زندگی میں اس سے بھی زیادہ عظیم تھے، اسی لئے پڑھنے کے بعد مولانا سے جو تعلق دل میں پیدا ہوتا تھا، برتنے کے

بعد یہ تعلق محبت و عقیدت سے تبدیل ہو جاتا تھا، کتابوں میں مولانا عظیم مفکر تھے تو ملاقاتوں سے محبوب مربی بن جاتے تھے۔

محبوب اور محترم شخصیت

مثالوں کی کمی نہیں، میں ایک طنطاوی ہی کو پیش کرتا ہوں جو "ماذا خسر العالم ..." سے قبل مولانا کو جانتے بھی نہ تھے اور کتاب پڑھنے سے ان کو حیرت ہوئی تھی کہ ایک ہندی کو یہ مقام کہاں سے حاصل ہوا کہ پورے عالم اسلام کو اتنے آفاقی انداز میں مخاطب کرے اور اسی شستہ و شگفتہ زبان میں جو عربوں کا امتیاز ہے ـــــ لیکن مولانا سے ملاقات کے بعد نہ صرف ان کی حیرت جاتی رہی بلکہ مولانا ان کی محبوب و محترم شخصیات میں شامل ہو گئے۔

مولانا کی زندگی میں طنطاوی نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے اپنے تعلق کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میرے نزدیک اس باب میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) کچھ لوگ مجھے محبوب ہیں محترم نہیں (۲) کچھ محترم ہیں محبوب نہیں (۳) اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جو محبوب بھی ہیں اور محترم بھی۔

مولانا علی میاں ندوی میرے نزدیک ان نادر شخصیات میں ہیں جو مجھے محبوب بھی ہیں اور ان کی بے پناہ عزت و احترام بھی میرے دل میں ہے۔

ظاہر ہے صرف تحریرات سے یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے، محبت کیلئے ملاقات شرط ہے۔

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں جہاں ان کے اساتذہ و مشائخ کی تربیت کا دخل ہے، وہیں ان کے بلند اور پاکیزہ خاندانی پس منظر کا بھی حصہ ہے، انہوں نے جس خانوادے میں اپنی آنکھیں کھولیں وہ علم و تقویٰ اور خاندانی شرافت و نجابت میں اپنی نظیر آپ تھا، اسی ہاشمی گھرانے کے عظیم فرزندوں نے ماضی میں بھی علم و تحقیق، ورع و تقویٰ اور سیاست و قیادت کے میدانوں میں اپنی تاریخ بنائی تھی اور ملک و ملت کو ایک نئے عہد اور نئے انقلاب سے روشناس کرایا تھا ـــــ جس گھرانے

کی عورتیں بھی مصنفہ، ادیبہ اور شاعرہ ہوں اس گھرانے کے مرد کس شان کے ہوں گے؟ اندازہ کیا جاسکتا ہے، پھر اس گھر میں پلنے اور بڑھنے والا بچہ مولانا علی میاں نہیں تو کیا بنے گا؟

کسی شخصیت کی تشکیل میں اس کے گھرانے اور بچپن کے نشو ونما کا بڑا حصہ ہوتا ہے، مولانا کے والد عظیم مؤرخ اور عالم، والدہ عالمہ فاضلہ، مصنفہ، ادیبہ، شاعرہ، بڑے بھائی ڈاکٹر، عالم فاضل، صاحبِ تحقیق، بہن مصنفہ وادیبہ اور اوپر جائیے تو حضرت سید احمد شہید سے لیکر شاہ علم اللہ اور ان سے اوپر جہاں تک چلے جائیے ع این خانہ ہمہ آفتاب است۔

سارے جہاں کا درد

مولانا عالمی فکر اور دین وامت کا درد رکھنے والے رہنما تھے، وہ ہندوستان کے پہلے اسلامی مصنف ہیں جنھوں نے مشرق ومغرب اور عرب وعجم کا اتنی کثرت سے سفر کیا، لیکن یہ تمام اسفار طلبِ مال یا طلبِ جاہ کیلئے نہیں، بلکہ دین اور امت کے مفاد کیلئے کئے، وہ جہاں گئے یہ درد وغم ساتھ لے کر گئے اور جہاں جہاں ان کو اظہار خیال کا موقعہ ملا یہی فکر والم انسانیت کے سامنے پیش کیا، انہوں نے عرب وعجم سب کو جھنجھوڑا، پوری جرأت اور صفائی کے ساتھ اپنی بات رکھی، اور دین کے معاملے میں کسی بے جا چشم پوشی، یا اعراض کا مظاہرہ نہ کیا۔

غم بھی بانٹا اور کرم بھی

اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے کبھی کسی سے کسی مادّی منفعت کی امید وابستہ نہیں کی، انہوں نے جو بھی کہا بے لوث اور بے غرض کہا، آخری دور کی بات تو جانے دیجئے! جب ان کے لئے فتوحات کے دروازے کھل گئے تھے اور سارے عالم سے قیمتی انعامات، اعترافات ایوارڈ اور عطایا کی شکلوں میں دنیا ان کے قدموں میں نچھاور ہو رہی تھی اور وہ اس کا ایک حبہ بھی اپنے پاس رکھنے کے بجائے دنیا کے غریبوں، محتاجوں، دینی اداروں اور دیگر مستحقوں کو تقسیم کر رہے تھے اور اس طرح انہوں نے ساری دنیا میں اپنا فکر وغم بھی بانٹا اور نعم وکرم بھی، لیکن ذرا اور پہلے اس دور کی طرف جائیے جب ان کے پاس مالی وسائل کی کمی تھی، اور خود ان کا مدرسہ ندوہ مالی پریشانیوں سے

دو چار تھا ـــــ اس دور کی چشم دید شہادت مولانا کے مخلص نیاز مند اور عصر حاضر کے نامور محقق و مصنف ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی زبانی سنئے! کہتے ہیں:۔

ڈاکٹر کو غیور ہونا چاہیئے

مجھے یاد ہے، تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا، قطر میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی مالی مشکلات کا اظہار فرما رہے تھے، بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہم اس کیلئے بعض شیوخ اور تجار سے ملاقات کریں تو یہ مشکلات حل ہو سکتی ہیں، مولانا نے فرمایا یہ میرے بس کی بات نہیں ہے ہم نے پوچھا کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ یہ بیمار قوم ہے، ان کی بیماری حُبّ دنیا ہے اور ہم ان کے ڈاکٹر ہیں، ڈاکٹر کسی ایسے مریض کا علاج کیسے کر سکتا ہے جس کے سامنے وہ خود مدد کا ہاتھ پھیلائے؟ اور وہی چیز اس سے طلب کرے جس کا علاج مقصود ہے؟ ـــــ ہم نے کہا آپ اپنے لئے تو نہیں مانگیں گے، آپ کا سوال مدرسہ اور طلبہ کیلئے ہوگا تاکہ ادارہ قائم و جاری رہے، مولانا نے کہا: جب تک آپ کی حیثیت طالب اور امیدوار کی ہے یہ قوم کوئی فرق نہیں کرتی کہ آپ اپنے لئے طلب کر رہے ہیں یا دوسرے کے لئے؟

ڈاکٹر قرضاوی کہتے ہیں کہ ہم نے کہا آپ رمضان کے عشرۂ اخیرہ تک قیام فرمائیں، ہم آپ کی طرف سے خود یہ کام کریں گے، مولانا نے کہا کہ عشرہ اخیرہ کا میرا ایک معمول ہے، یہ میرے اور رب کے درمیان تخلیہ و فرصت کے لمحات ہیں، میں اس معمول کو توڑنا نہیں چاہتا۔

ان کی یہی بے لوثیت اور غیرتِ ایمانی تھی کہ وہ حق بات کہنے سے کبھی جھجکتے نہیں تھے، اگر ان میں ذرا بھی لالچ یا طمع ہوتی تو اظہار خیال میں ضرور کچھ چشم پوشی سے کام لیتے، مگر انہوں نے ہمیشہ برملا کہا اور روبرو کہا، مثلاً:۔

مصر کی سب سے حیرت انگیز چیز

مشہور مصری ادیب شیخ احمد الشرباصی کو انٹرویو دیتے ہوئے جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو مصر کی حیرت انگیز چیز کیا لگی؟ تو شیخ کا جواب تھا: مجھے یہاں سب سے عجیب چیز یہ لگی

کہ یہاں کے علماء ڈاڑھی منڈواتے ہیں، یہ کسی ایسے شخص کیلئے بڑے صدمہ کی بات ہے جس نے اپنے وطن میں اپنی زندگی میں کسی عالم کو ڈاڑھی منڈاتے نہ دیکھا، اور یہ مغرب زدوں اور بے دین لوگوں کی علامت جانتا ہو، وہ جب یہاں آکر علماء کی عام روش ڈاڑھی مونڈنے کی دیکھے گا تو اسے یقیناً اسے بڑی حیرت ہوگی ـــــ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ازہر کے بعض شیوخ جو ازہر کو پرانی قدروں پر لیجانے کے خواہشمند ہیں، وہ طلبہ کیلئے عمامہ لازم کرنے کو سوچ رہے ہیں، جبکہ یہ محض تقلید ہے، لیکن انھیں ڈاڑھی لازم کرنے کا خیال نہیں آیا جو بلاشبہ ایک اسلامی سنّت ہے۔

(ڈاکٹر قرضاوی کا تعزیتی مضمون)

دل دریا

مولانا اپنی تمام تر عظمتوں کے باوجود انتہائی سادہ، مسکین طبع، متواضع اور خلیق و ملنسار شخص تھے ان کے یہاں واردین وصادرین کی کمی نہیں تھی، لیکن خلق ومروّت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جو ہر کہہ ومہ کیلئے رواں دواں تھا، کیف بھوپالی نے تو شاید عالم خیال میں کہا ہو، لیکن یہاں ایک سچی حقیقت تھی۔

ہے کیف پیدا کر سمندر کی طرح
وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

ان کے دل میں جو درد اور سینے میں جو سوز تھا، وہ ہر ایک فرد میں منتقل کر دینا چاہتے تھے، وہ اگر اپنا دروازہ بند یا تنگ کر لیتے تو ان کا درد وسوز انسانوں میں کیسے عام ہو پاتا، یوں تو وہ سارے عالم کے مسلمانوں کیلئے درد رکھتے تھے، لیکن بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ان کا فکر والم کچھ زیادہ ہی تھا، کہ یہاں سے ان کا وطنی تعلق تھا، اور ان کے آباء واجداد نے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی عظیم خدمات انجام دی تھیں۔

مدارس کی ضرورت کا شدّت سے احساس

ان کا ذہن اس نکتہ کو پا گیا تھا کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا سب سے مضبوط ذریعہ بڑی تعداد میں مدارس ومکاتب کا قیام ہے، وہ ایسے ہر عمل

کی حوصلہ افزائی کرتے جو اس قبیل سے ہوتا، اور ممکن ہوتا تو اس کیلئے ایثار بھی فرماتے، ہندوستان کے سینکڑوں نہیں ہزاروں مدارس ان کی نظر عنایت سے قائم ہوئے اور ترقیات کی منزلیں طے کیں۔

جامعہ ربانی کا پس منظر

ذاتی طور پر خود مجھے بھی اس کا تجربہ ہے، میں دار العلوم حیدرآباد میں مدرس تھا، میرا ضلع سمستی پور بالعموم اور میرا علاقہ بالخصوص مدتوں سے جہالت وظلمت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، دور دراز بھٹکتے تاروں کی اکا دکا کرنیں جو کبھی ادھر نمودار ہو جاتیں وہ ظلمتوں کی یلغار سے دم توڑ دیتی تھیں۔

کچھ لوگوں نے بعض بزرگوں کی توجہ سے تعلیم کی طرف توجہ بھی دی تو پڑھنے کے بعد ان کا اس علاقہ میں رہنا گویا حرام ہو گیا، کچھ یہاں کے حوصلہ شکن اور ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے اور کچھ خود ان کی ذہنیت کی بنا پر اس جانب کسی نے توجہ نہ دی، بعض معمر پڑھے لکھے موجود تھے، لیکن حالات سے اس قدر دل شکستہ کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، میں نے شہر سے یہ تحریک چلائی، بڑی اجنبیت کا احساس ہوا، قدم قدم پر رکاوٹیں، ملازمت کرتے ہوئے زیادہ وقت دینا ممکن نہ تھا، لیکن اپنے طور پر پھر بھی کافی وقت نکالنے کی کوشش کی، سمجھدار کہے جانے والے لوگوں نے نا سمجھی، اور بزدلی کی باتیں کیں ـــــ میں دل شکستہ ہو کر شاید بیٹھ جاتا اگر حضرت مولانا علی میاں میرا ہاتھ تھام نہ لیتے

میں نے ایک خط حضرت مولانا کو لکھا، سارے حالات لکھے، نام کے انتخاب کے بارے میں بھی درخواست پیش کی ـــــ یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے، حضرت ان دنوں جنوبی ہند کے ایک طویل سفر پر تھے جس میں ایک مہینہ سے زیادہ وقت صرف ہوا، واپسی پر حضرت نے خط ملاحظہ فرمایا، اور خود اپنے ہاتھ سے انتہائی حوصلہ افزا جواب تحریر فرمایا، نام بھی انتخاب فرمایا اور کام شروع کرنے کی تاکید بھی فرمائی اور میری دل بستگی کیلئے لکھنؤ آنے کی دعوت بھی دی، حضرت نے تحریر فرمایا:

"آپ کے دینی جذبہ و بلند ہمتی سے مسرت ہوئی، اس وقت ہر جگہ اسی کی ضرورت ہے آپ یہ کام ضرور شروع کریں، جامعہ ربانی اچھا نام ہے، اللہ اس کو اسم بامسمیٰ بنائے ..... اور کبھی موقعہ ہو تو لکھنؤ آئیں، ہمارے عزیز مہمان ہوں گے، اور انشاء اللہ

فائدہ ہوگا۔" (۲۰ رجون ۱۹۹۸ء)

حضرت کے خط سے مجھے بڑی تقویت ملی، "جامعہ ربانی" کا نام مجھے بیحد پسند آیا ایک تو اس لئے کہ یہ قرآنی نام ہے

"وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ"

دوسرے اسلئے کہ "ربانیہ" مولانا کے یہاں "احسان وتصوف" کی ہم معنیٰ اصطلاح ہے، ان کی ایک مشہور کتاب بھی اس نام پر ہے "ربانیۃ لا رہبانیۃ" حضرت کے یہاں ناموں اور عنوانات کے انتخاب میں کافی جدت وندرت تھی اور عنوان سے معنون کی دیکھنے کی خواہش ابھرتی تھی۔

۳۰ رجون کو میں نے ایک خط لکھ کر حضرت کا شکریہ ادا کیا اور قیام مدرسہ کے پختہ عزم کا اظہار کیا، تو حضرت نے ۸ رجولائی ۱۹۹۸ء کو اس کا جواب تحریر فرمایا :۔

"عنایت نامہ مورخہ ۳۰ رجون پہونچکر باعثِ مسرت ہوا، آپ کو نام پسند آیا اس سے اور خوشی ہوئی، اللہ مبارک فرمائے، آپ دعوتی اور اصلاحی کام ضرور کریں، اس وقت سارے ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے، مسلمانوں کا ملی تشخص اور آئندہ نسل میں اسلام کا تسلسل خطرہ میں پڑ گیا ہے، آپ مجلس کے رسائل کی بھی اشاعت کیجئے اگر آپ لکھنؤ آئیں، تو مجلس ضرور جائیے گا، جو پسند آئے گا وہ آپ لے سکتے ہیں، ہمیں دعا میں یاد کر لیا کریں۔" (۸ رجولائی ۱۹۹۸ء)

مدرسہ کے قیام کے بعد حضرت کو اس کی اطلاع دی تو وہاں تکیہ میں حضرت کی رہائش گاہ پر حکومت کی چھاپہ ماری کی وجہ سے بحرانی حالات پیدا ہو گئے تھے، حضرت نے اس خط کا جواب اپنے خادم خاص جناب مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی سے املا کرایا :۔

"آپ کا خط بحرانی حالات میں ملا، حالات معلوم کر کے مسرت ہوئی، دعا ہے کہ جس مقصد سے مدرسہ قائم کیا گیا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے اور غیب سے اس کیلئے وسائل اور اسبابِ ترقی مہیا فرمائے، اخلاص اور ثواب کی نیت سے رضائے الٰہی

کے حصول کے جذبے سے یہ کام کریں گے تو عبادت میں شمار ہوگا"۔ (۲۷،۸،۱۴۱۹ھ)

ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کام کیلئے مامور ہوں، سخت سے سخت حالات میں بھی وہ اصلاح و تلقین اور ہدایت و رہنمائی کے فریضے سے غافل نہیں ہوتے تھے ـــــ مدرسہ کے بارے میں اسکے بعد بھی حضرتؒ سے مراسلت جاری رہی اور حضرتؒ حسبِ موقع رہنمائی فرماتے رہے۔

آج کوئی اُن کے جیسا نہیں

آج آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو پورے ہندوستان میں اب ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس طرح چھوٹوں کو گلے لگاتا ہو، گرتے ہوؤں کو تھام لیتا ہو، بے سہاروں کو سہارا دیتا ہو اور مظلوم و مقہور لوگوں کی دل بستگی کرتا ہو ـــــ آج زیادہ تر لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہیں، کوئی نہیں جو ڈوبتے سورج کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے، اگر سورج ڈوبے نہیں تو اہلِ زمین کو ٹھنڈی چھاؤں کیسے میسر ہو؟۔

عالم ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر باعقیدہ، ایسے باایمان ایسے باحوصلہ ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا اپنی جگہ کھڑا ہے راستہ بتاتا ہے۔ جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتادے گا۔ ہندوستان میں بتائے گا دوسرے ملک میں بتائے گا۔ پہاڑ پر رکیں تو بتائے گا، پل پر رکیں تو بتائے گا یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے۔۔۔

(۲)

امتیازات و خصوصیات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

نقوش وتاثرات اور خصوصیات

مولانا عتیق احمد قاسمی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں اور دل ودماغ پریشان ہے کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے، ان کے فضائل وکمالات کے کن کن پہلوؤں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جائے، حضرت مولانا کی شخصیت اور زندگی کے اس قدر پہلو ہیں کہ چند مضامین بلکہ چند کتابوں میں بھی ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

بیس (۲۰) سال تک مسلسل حضرت مولانا علی میاںؒ کے سایہ عاطفت میں رہنے اور کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، قدم قدم پر انکی رہنمائیاں اور کرم فرمائیاں ساتھ رہیں، انکی بے پایاں شفقت ومحبت سے بہرہ آور ہوتا رہا، انکی رحلت سے ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے، لگتا ہے کہ گھنیرے سائے سے چلچلاتی دھوپ میں آگئے ہوں، وقت گزرنے کے ساتھ سانحہ کی شدت کا احساس بڑھتا جاتا ہے، ملت اسلامیہ میں جو زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے اسکا پر ہونا انتہائی مشکل نظر آرہا ہے، اللہ تعالی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، جنت الفردوس میں صدیقین، شہداء، صالحین کے ساتھ مقام بلند عطا فرمائے اور امت اسلامیہ کو ان کی رحلت کے ضرر سے محفوظ رکھے، طبقۂ علماء میں ایسے افراد کو پیدا فرمائے جو انکی رحلت سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کریں۔

ربط وارتباط کا آغاز:- آج جب ذہن پر زور ڈال کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ دل ودماغ کے کشت زار میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت ومحبت کا تخم کب پڑا اور زیارت وملاقات کا سلسلہ کب شروع ہوا تو ذہن کوئی قطعی وفیصلہ کن بات نہیں کہتا اور عرب

شاعر کا یہ شعر ہی زبان پر آتا ہے۔ ؎

عرفت هواها قبل ان اعرف الهویٰ　　فصادف قلباً خالیاً فتمکن

(میں نے محبت سے آشنا ہونے سے پہلے اسکی محبت کو جانا اسکی محبت میرے دل کو خالی پاکر اس میں جاگزیں ہوگئی)

پرانے خطوط وکاغذات پلٹ رہا تھا، اسی انبار میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے چند قیمتی خطوط ملے، بعض خطوط کے ساتھ میرے ان خطوط کا مسودہ بھی تھا جن کے جواب میں حضرت مولاناؒ کے گرامی نامے صادر ہوئے، میرے ایسے ہی ایک خط میں حضرت مولاناؒ سے ابتدائی تعارف وملاقات کا تذکرہ بھی ہے، اس وقت حافظہ تر وتازہ تھا اس لئے امید ہے کہ اسکے مندرجات درست ہونگے، اس خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، حضرت مولانا کا جواب تو کہیں آگے مناسب مقام پر درج کیا جائے گا۔

مفکر ملت، مصلح قوم، نذیر عریاں　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

یقیناً مشاغل کے ہجوم میں ایک گمنام وبے کام شخص کا خلل انداز ہونا باعث زحمت ہوگا، لیکن جذبات وحالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہ جرأت بے جا کر رہا ہوں، امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

پیکر اخلاص! طالب علمی کے ابتدائی زمانہ سے آپ کی تصانیف کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مطالعہ کیا جس کی بنا پر ایک روحانی تعلق پیدا ہوگیا، لیکن کافی عرصہ تک زیارت سے محرومی رہی۔ حسن اتفاق کہ نور العلوم بہرائچ آپکی تشریف آوری ہوئی اور آپ کی زیارت سے بہرہ آور ہوا، لیکن اس وقت گفتگو وکلام کی جرأت کہاں تھی؟ دار العلوم دیوبند حاضر ہوا، غالباً دو سال قبل آپ کی تشریف آوری کے موقع پر تقریر سامعہ نواز ہوئی، اس نے دل کے خوابیدہ گوشوں کو بیدار کیا، اسی دوران دماغ میں چند سوالات نے انگڑائیاں لیں، مگر آپ کے ارد گرد خلقت کا ہجوم دیکھ کر ہمت نہ ہوئی حتی کہ آپ تشریف لے گئے، آخر کار وہ سوالات الفاظ وحروف کا لباس پہن کر آپ کے پاس حاضر ہوئے، آپ نے ازراہ ذرہ نوازی انکا خندہ پیشانی کے ساتھ جواب تحریر فرمایا، دوبارہ تحریری حاضری ہوئی، اس کا بھی آپ نے خیر مقدم کیا، اسکے بعد اب تک میں نے آپ کے گراں مایہ وقت

کا اس غیر اہم کام میں صرف ہونا مناسب نہیں سمجھا، آج پھر چند گذارشات لے کر حاضر ہوں"۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصنیفات و رسائل کے مطالعہ کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا، حافظہ پر زور دینے سے یاد پڑتا ہے کہ والد صاحب (اللہ تعالیٰ انکی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے) کی مختصر ترین لائبریری میں معارف الحدیث کی دو جلدیں موجود تھیں،

ان میں سے ایک پر محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کا مقدمہ تھا اور ایک جلد پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مقدمہ تھا، دونوں مقدمے بڑے جاندار اور فکر انگیز تھے، اسی مقدمہ نے حضرت مولانا علی میاںؒ کے مضامین و مولفات کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا اور میں تلاش کر کے انکی تحریریں پڑھنے لگا۔

پہلی زیارت:- مشرقی یوپی کی مشہور درس گاہ مدرسہ عربیہ نور العلوم بہرائچ میں میری طالب علمی کا زمانہ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء کے دوران ہے، اسی مدرسہ میں پہلی بار حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت ہوئی، حضرت مولانا شہر بہرائچ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت مولانا شہر بہرائچ تشریف لائیں اور مدرسہ نور العلوم بہرائچ کو عزت نہ بخشیں، مدرسہ نور العلوم بہرائچ کے بانی حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن نائیؒ کا حضرت مولانا علی میاںؒ سے گہرا تعلق تھا، انکی وفات کے بعد مدرسہ نور العلوم کے دوسرے ذمہ داران (حضرت مولانا کلیم اللہ نوری صاحبؒ وغیرہ) نے اس رشتہ و ربط کو باقی رکھا بلکہ بڑھایا، اور ہمارے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ جن افراد یا اداروں سے انکا ربط قائم ہو جاتا اسے زندگی کے آخری لمحے تک نبھانے کی کوشش کرتے، حضرت مولانا علی میاںؒ میں بھی وفاداری و استواری کا یہ مومنانہ وصف بہ درجہ اتم موجود تھا۔

مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ میں چرچا تھا کہ لکھنؤ کے ایک بڑے عالم اور مصنف تشریف لانے والے ہیں، تمام لوگ چشم براہ تھے، حضرت مولانا تشریف لائے، اساتذہ و طلبہ نے عقیدت و محبت کے ساتھ مصافحہ کیا، حضرت مولاناؒ کے بعض دعوتی رسائل (مثلاً آنکھوں کی سوئیاں، صورت اور حقیقت) طلبہ میں بہت مقبول تھے، طلبہ انہیں یاد کر کے ہفتہ واری پروگرام میں تقریریں کیا کرتے تھے، اس لئے

وہاں کے ماحول میں حضرت مولانا کی شخصیت کسی حد تک متعارف تھی، حضرت مولانا نے تقریباً ایک گھنٹہ مدرسہ میں وقت گزارا، اور طلبہ کی لائبریری دیکھی، اور مدرسہ کا نظم ونسق دیکھ کر مسرور ہوئے، مدرسہ کے لئے کچھ رقم بھی پیش فرمائی،

ایک خلش:- پہلی زیارت کا یہ تصور اب بھی ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کو چوڑی موہری کا پائجامہ اور رام پوری کیپ کے طرز کی ٹوپی میں ملبوس دیکھا تو ذہن میں ایک خلش اور الجھن پیدا ہوئی، کہ کیسے بزرگ ہیں کہ اس طرح کا پائجامہ اور ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، غالباً طلبہ میں اسکا چرچا بھی تھا۔ لباس کا شرعی حدود میں ہونا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، خصوصاً علماء اور داعیوں کو اس کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے، لیکن بسا اوقات لباس کی کسی خاص تراش وخراش کو شرعی لباس کا نام دے کر ایسا ذہن بنادیا جاتا ہے کہ اس ماحول کے پروردہ لوگ اس خاص لباس کے باہر علم، تقویٰ اور بزرگی کا تصور نہیں کرسکتے، اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہت سے اہل علم اور تقویٰ کے بارے میں ذہن غلط فہمیوں کا شکار ہوجاتا ہے اور استفادہ سے محرومی ہوجاتی ہے۔ لباس کی تراش وخراش کے بارے میں غیر معمولی حساسیت نے ہمارے بہت سے علماء کو بلاد عربیہ کے علماء سے کلیۃً بدظن کردیا ہے، اور انہوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ علم وبزرگی صرف برصغیر ہندوپاک میں ہے، حالانکہ یہ خیال حقائق سے دور اور بلاد عربیہ کے بہت سے علماء کی حق تلفی اور ان سے بدظنی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی اس پہلی زیارت کے بعد دوسری بار زیارت دارالعلوم دیوبند میں ہوئی جس کا کچھ تفصیلی ذکر اگلے صفحات میں آئے گا، حضرت مولانا کی تحریروں کا مطالعہ جاری رہا، نورالعلوم بہرائچ کے طلبہ کی لائبریری (نامی لائبریری) میں تین ماہنامے پابندی سے آتے تھے (۱) معارف اعظم گڈھ (۲) برہان دہلی (۳) الفرقان لکھنو، الفرقان میں حضرت مولاناؒ کی تحریریں کثرت سے شائع ہوتی تھیں اور ہم لوگ انہیں شوق وعقیدت کے ساتھ پڑھتے تھے، حضرت مولاناؒ کی تحریروں میں "از دل خیزد بر دل ریزد" والی تاثیر شروع سے پائی جاتی تھی، زبان وبیان کی خوبیوں کے علاوہ دعوتی سوز وگداز اور اخلاص ومحبت کی بھینی خوشگوار مہک سطر سطر سے ہویدا تھی۔

دار العلوم دیو بند میں:- ۱۹۷۰ء میں احقر تعلیم کی تکمیل کے لئے دار العلوم دیو بند پہنچا، اتفاق کی بات ہے کہ اسی سال دار العلوم ندوۃ العلماء کے چند ہونہار طلبہ بھی دار العلوم دیو بند بہ غرض تعلیم پہنچے، ان میں نمایاں رفیق محترم مولانا عبید اللہ الاسعدی زید مجدھم (استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا) ہیں، میری زیادہ تر ہم نشینی انہیں ندوی طلبہ کے ساتھ رہی، یہ لوگ بڑی گرویدگی اور عقیدت سے حضرت مولانا علی میاںؒ کا ذکر کرتے تھے، ان لوگوں کے ساتھ رہ کر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ کی تصنیفات کا چسکہ لگا اور ان حضرات کی تقریباً تمام اہم تصنیفات کا مطالعہ کر ڈالا، حضرت مولانا علی میاںؒ کی جن تصنیفات نے دل و دماغ پر زیادہ اثر ڈالا اور میرے فکر و خیال کی تشکیل میں زیادہ حصہ لیا وہ یہ ہیں (۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر (۲) اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش (۳) سیرت سید احمد شہید (۴) ارکان اربعہ (۵) تاریخ دعوت و عزیمت۔

حضرت مولانا سے مراسلت کا آغاز:- ۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ معروف بہ علی میاںؒ دار العلوم دیو بند تشریف لائے، دار الحدیث کے پر شکوہ ہال میں حضرت مولاناؒ کا خطاب رکھا گیا، ہال طلبہ سے کھچا کھچ بھر گیا، مولاناؒ کا بڑا موثر اور فکر انگیز خطاب ہوا، طلبہ نے خلاف معمول بڑی دلجمعی اور سکون کے ساتھ یہ تقریر سنی، میں بھی اس خطاب میں شریک تھا، یہ یاد نہیں پڑتا کہ اس موقع پر قریب جا کر حضرت مولاناؒ سے ملاقات کی ہو، لیکن حضرت مولانا کے واپس تشریف لے جانے کے بعد ایک تاثراتی خط حضرت مولانا کے نام روانہ کیا، حضرت مولانا نے اس خط کا بڑا حوصلہ افزا جواب دیا، ذیل میں اپنا خط اور حضرت مولانا کا گرامی نامہ دونوں چیزیں درج کی جا رہی ہیں، کیونکہ اس گرامی نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نوجوانوں کی کس طرح ہمت افزائی فرماتے تھے اور انہیں کس طرح مہمیز کرتے تھے، انکی نگاہیں ادارتی حد بندیوں سے بہت بلند تھیں۔

۷ رجب ۱۳۹۲ھ

محترم المقام مفکر ملت — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون، کے خدمت اقدس میں گذارش عرض یہ ہے کہ احقر بحمد للہ ابتداء سے آنجناب کے تحریری جواہرات سے مستفید ہوتا رہا، خصوصاً تاریخ دعوت و عزیمت، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ارکان

اربعہ، ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین، سوانح سید احمد شہید کو آپکا شاہکار تصور کرتا ہے، لیکن آنجناب نے دارالعلوم میں طلبہ کو خطاب فرماتے ہوئے جو جواہر عنایت فرمائے وہ انمول ہیں، آپ نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا، مگر ایک بات عرض کرنے کے لئے میرا دل بے چین تھا، جس کو پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا، وہ یہ کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کی تمام ہستیاں کسی نہ کسی مربی و راہبر کی رہین منت ہیں، لیکن اس دور میں امت مسلمہ خصوصاً نئی نسل کی یہ بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ انہیں بانگ رحیل اور خطرے کی گھنٹی بجانے والے میسر آجاتے ہیں، مگر راہبر اور طریق مدافعت واقدام بتانے والے عنقا ہو چلے ہیں، نئی پود کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے مگر اس کے لئے کوئی ناخدا نہیں ملتا۔

آنجناب نے نئے چیلنج کے قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور اسلام کش تحریکوں پر مطلع فرمایا، لیکن آپ نے ان خطوط کو متعین نہیں فرمایا جن پر چل کر ہم اس اہم کام کی انجام دہی کے قابل بن سکتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ آنجناب تنگی وقت کے باعث اس گوشے پر روشنی نہیں ڈال سکے، لہٰذا گذارش ہے کہ گرامی نامہ کے ذریعہ مطلع فرمائیں کہ وہ کون کون سے ذرائع ووسائل ہیں جنکو اختیار کر کے ہم اس چیلنج کے قبول کرنے کے قابل ہو سکیں گے اور علمی وعملی طور پر ہمیں اس کام کے لئے کون سے خطوط اپنانے ہوں گے، اور کیا کیا تیاریاں کرنی پڑیں گی۔

ایک اور زحمت دینے کی جرأت کروں گا اور وہ یہ کہ میرا رجحان تفسیر کے مطالعہ کی طرف بہت زیادہ ہے، لہٰذا برائے کرم تحریر فرمائیں کہ تفسیر کا مطالعہ کس طرح کیا جائے اور اس سلسلہ میں کون کون سی تفسیریں اور کتابیں مفید ثابت ہوں گی، مجھے آنجناب کی ذات اقدس سے امید ہے کہ جواب سے نوازیں گے، کیونکہ آپ کے سینے میں وہ دل دردمند ہے جو امت مسلمہ کی بدحالی پر تڑپتا رہتا ہے، اگر آپ جیسے بزرگوں نے ہماری برمحل رہنمائی نہیں کی تو ہم راستہ میں بھٹکتے رہیں گے اور منزل ہم سے دور ہوتی جائے گی۔

فقط والسلام

سراپا انتظار بندہ عاصی عتیق احمد متعلم دارالعلوم دیوبند

یہ خط ان بے شمار طلبائے مدارس دینیہ کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہے جنہوں نے اپنی قسمت دینی مدارس سے وابستہ کرلی ہے، اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا قیمتی سرمایہ لے کر مدارس کی چہار دیواری میں ایسے جوہریوں کی تلاش میں ہیں جو تراش خراش کر انہیں قیمتی ہیرا بنادیں، ان کے اندر عزم وحوصلہ ہے، امنگیں اور تمنائیں ہیں، دین کی خدمت اور اسکی سربلندی کا جذبۂ بیتاب ہے، لیکن صحیح تعلیم

وتربیت اور حکیمانہ رہنمائی سے محروم ہونے کی بنا پر امت کا یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو رہا ہے، مدارس کے ذمہ داروں کی عام توجہ افراد سازی اور شخصیت سازی کے بجائے عمارت سازی پر ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مدارس کے تاج محل تو بے شمار تیار ہو رہے ہیں لیکن رجال کار کی تیاری تقریباً موقوف ہے اور خدمت دین وملت کے ہر میدان میں مہیب سناٹا نظر آتا ہے۔

پہلا مکتوب گرامی:- میرے مذکورہ بالا خط کے جواب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا گرامی نامہ موصول ہوا، حضرت مولانا کا یہ مکتوب انکی خطوط نگاری، حوصلہ افزائی اور خورد نوازی کا بہترین نمونہ ہے، اس لئے اسے مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

رائے بریلی (۲۲ اگست ۷۲ء)

عزیز مکرم زید لطفہ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۷ رجب میں نے اپنے مستقر پر واپس آکر دیکھا اور اسی وقت جواب دے رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سے دیوبند میں تعارف کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی، اگر ایسا ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی اور شاید اس خط کی زحمت سے آپ بچ جاتے، آپ کے مطالعہ، سلامت فکر اور طلب سے بڑی خوشی ہوئی، میں تو ایسے فکر مند و باصلاحیت نوجوانوں کا جویا اور متمنی رہتا ہوں، اگر آئندہ کبھی ملنا ہو سکے تو ضرور ملیے۔

میری اس تقریر کا اصل مقصد جس کا آپ نے ذکر کیا ہے ذہنی حرکت اور خلش پیدا کرنی تھی، اور اس مقصد کو کبھی اس سے ضعف پہنچ جاتا ہے کہ کوئی ادھورا علاج یا تشنہ رہنمائی کی جائے، بہتر یہی ہوتا ہے کہ ایک سوال پیدا کر دیا جائے، پھر اسکا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میری دوسری تقریر (جب کبھی اس کی نوبت آئے) اس موضوع پر ہوگی جس کا آپ نے اس موقع پر اظہار کیا ہے۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو زبانی بھی عرض کر دوں گا۔ معلوم نہیں کہ آپ کی نظر سے میرا رسالہ "طالبان علوم نبوت کا مقام" گذرا ہے یا نہیں؟ یہ وہ مضمون ہے جو میں نے طلبائے دارالعلوم دیوبند کے سامنے ۱۵۔۱۶ برس پہلے پڑھا تھا اور اس میں ذہنی تربیت وتیاری کے خطوط بھی پیش کئے تھے۔ آپ نے نہ دیکھا ہو تو شعبہ تعمیر وترقی ندوۃ العلماء سے منگوا لیجئے، میرا حوالہ دیجئے گا۔

تفسیر کے سلسلہ میں میرا تجربہ ومشاہدہ ہے کہ متن قرآن زیادہ سے زیادہ پڑھیں، حضرت شاہ ولی اللہ کا رسالہ

الفوز الکبیر ضرور مطالعہ میں رکھیں، باقی کسی ایک تفسیر کا مشورہ دینا بہت مشکل ہے،

آب کم جو تشنگی آور بدست
تاکہ آبت جو شد از بالا و پست

والسلام دعاگو

ابوالحسن علی

بقلم محمد فاروق بھٹکلی

ایک نو عمر طالب علم کے لئے حضرت مولانا کا یہ ہمت افزا، اپنائیت اور محبت سے لبریز گرامی نامہ کس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا قارئین کے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا، اس مکتوب کے بعد حضرت مولانا سے ذاتی ربط و تعلق، عقیدت و محبت میں اضافہ ہوا اور مجھے یہ جسارت ہوئی کہ مختلف علمی امور میں مشورہ کرنے کے لئے حضرت مولاناؒ سے وقتاً فوقتاً مراسلت کروں، حضرت مولانا کا ہمیشہ سے یہ معمول رہا کہ آنے والے خطوط کا جواب بہت پابندی سے تحریر فرماتے اور روز آنہ اپنے قیمتی اوقات کا ایک معتد بہ حصہ اس کام میں لگاتے، ان خطوط سے لاکھوں بندگان خدا کو بے پناہ فائدہ پہنچا۔

حضرت مولانا کے نام دوسرا خط:- پہلے خط کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک دوسرا خط حضرت مولاناؒ کی خدمت میں روانہ کیا، حضرت مولانا نے اس خط کا جواب بھی تحریر فرمایا، اپنا عریضہ اور حضرت مولانا کا گرامی نامہ دونوں اتفاق سے محفوظ رہ گئے انہیں بھی درج کیا جاتا ہے۔

۲۴ شعبان ۹۲ھ

محترم المقام مفکر ملت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون کے خدمت اقدس میں عرض یہ ہے کہ عرصہ ہوا آنجناب کا عنایت نامہ موصول ہوا تھا، ذرہ نوازی کا شکریہ۔ امتحان سالانہ کی ہمہ وقتی مشغولیتوں کی بنا پر آپ کی کتاب "طالبان علوم نبوت کا مقام" کا مطالعہ نہ کر سکا، امتحانی مشاغل سے فراغت کے بعد بمشکل کتاب دستیاب ہوئی، مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا گویا کہ میرے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ واقعۃً طالبان علوم نبوت کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں، ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے بہت زیادہ جد و جہد کی ضرورت ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ اکثر طلبہ

کو اپنے مقصد کی خبر نہیں ہے، اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے، اور جن گنے چنے افراد کو اپنے مقصد اور ذمہ داریوں کا علم ہے انکو کوئی مشیر نہیں ملتا جو انکی صحیح رہنمائی کر سکے اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جن وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے انکی نشاندہی کر سکے، اگر آنجناب اس موضوع پر بالتفصیل تحریر فرمائیں تو یہ نئی نسل پر آنجناب کا بہت بڑا احسان ہوگا، اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ کم از کم مرکزی مدارس میں چند ایسے مخلص و تجربہ کار حضرات کا ہونا نہایت ضروری ہے جو باصلاحیت طلبہ کی کماحقہ رہنمائی کر سکیں۔

آنجناب نے الفوز الکبیر کو مطالعہ میں رکھنے کا مشورہ دیا ہے، اس کے بارے میں عرض ہے کہ الفوز الکبیر امسال احقر کی درسیات میں داخل تھی، اس کے مطالعہ کے بعد فن تفسیر سے پر امید ہوا ہوں۔

اس سال رمضان میں تفسیر کے مطالعہ کی غرض سے دار العلوم میں ٹھہرنے کی نیت ہے، اگر آنجناب قرآن پاک کے مطالعہ کے طریقہ پر کچھ تفصیلی روشنی ڈالیں تو آپ کا کرم ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ آنجناب مشغولیتوں کے باوجود جلد از جلد جواب کی زحمت گوارا فرمائیں گے"۔

اس عریضہ کے جواب میں حضرت مولانا کا مختصر گرامی نامہ موصول ہوا، یہ گرامی نامہ ۲۷ شعبان کا تحریر کردہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولاناؒ خطوط کا جواب جلد سے جلد لکھوانے کی کوشش کرتے تھے، میرا عریضہ ۲۴ شعبان کو لکھا گیا اور حضرت مولانا کا مکتوب گرامی ۲۷ شعبان کو لکھا گیا، خط کا متن یہ ہے:

لکھنؤ

۲۷ شعبان ۹۲ھ

عزیز مکرم زید لطفہ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسرت نامہ ملا، اس سے خوشی ہوئی کہ رسالہ آپ کو مل گیا اور پسند آیا۔ دیوبند کی تقریر بھی چھپ گئی ہے، مولوی بلال احمد صاحب عثمانی سے مل سکتی ہے، آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ایک مفصل کتاب یا رسالہ کی ضرورت ہے جس سے طلبہ رہنمائی حاصل کر سکیں، جہاں تک تفسیر کا تعلق ہے مجھے تو اب مطالعہ کی نوبت بھی بہت کم آتی ہے، جو کچھ پہلے کا دیکھا ہوا ہے اسی سے کام لیتا ہوں اور اب تو متن قرآن ہی سے مربوط رہنے کا جی چاہتا ہے، بہتر ہے کہ آپ اس سلسلہ میں محب مکرم مولانا محمد اویس صاحب ندوی سے خط و کتابت کریں، جو ہمارے دار العلوم میں استاذ تفسیر ہیں، انکی نظر وسیع و عمیق ہے۔

والسلام

مخلص — ابو الحسن علی

دور طالب علمی کے بعد:- دارالعلوم دیوبند میں میرے شب و روز گزرتے گئے، درسیات کے مطالعہ اور تیاری کے ساتھ غیر درسی مطالعہ بھی تیزی کے ساتھ جاری رہا، برصغیر کے دور آخر کے مصنفین میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وغیرھم کی تصنیفات مطالعہ میں رہیں، حضرت مولانا علی میاںؒ کی تازہ بہ تازہ تحریروں اور تصنیفوں کے مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آپہنچا جو طلبہ کی زندگی میں بڑا نازک اور فیصلہ کن ہوتا ہے یعنی رسمی تعلیم مکمل ہو جانے کا وقت، مدارس سے فراغت و تکمیل کے سال طلبہ بڑی ذہنی کشمکش میں ہوتے ہیں، غیر واضح مستقبل سامنے ہوتا ہے، آزادی و بہار کے دن ختم ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ اب کیا کریں، کدھر جائیں زندگی کا کیا رخ متعین کریں؟ میں بھی اسی کشمکش کا شکار تھا، ایک طرف گھریلو حالات کا تقاضا تھا کہ وطن میں والدین کے ساتھ رہوں، دوسری طرف یہ خوف دامن گیر تھا کہ وطن میں قیام کی صورت میں تعلیمی ترقی رک جائے گی، علمی ماحول سے کٹ جاؤں گا۔ ایسی ذہنی کشمکش میں کسی تجربہ کار مخلص رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جس کے مخلصانہ مشورہ کی روشنی میں کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے، اس وقت نگاہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی طرف گئی، ایک خط میں اپنے گھریلو حالات، ذہنی کشمکش وغیرہ کا ذکر کر کے مشورہ چاہا گیا، بعض علمی سوالات بھی کئے گئے، اس کے جواب میں یہ والا نامہ صادر ہوا،

ایک اور مکتوب:-

رائے بریلی ۸/۷/۱۳۹۵ھ

محبی زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ مورخہ ۲ جولائی مجھے ۱۵ جولائی کو اپنے مستقر پر واپس آنے پر ملا، آپ نے اپنا جو تعارف کرایا اس سے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو علم و عمل میں ترقی عطا فرمائے، اور ذہناً و عملاً صراط مستقیم پر چلائے۔ افسوس ہے کہ میں ایک طویل بیرونی سفر کی تیاری کی وجہ سے آپ کے خط کی صرف رسید دینے پر مجبور ہوں، نہایت اختصار کے ساتھ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

آپ اپنے حالات کو خود بہتر سمجھتے ہیں، علمی مشاغل جاری رکھیے اور گھر واپس جانے کے بارے میں خود ہی فیصلہ کریں، باقی جب علم ودین کا صحیح ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو آدمی جہاں بھی رہے اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے طرز فکر کے بارے میں نسبتاً میری زیادہ واضح رائے میری تازہ تصنیف "منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین" سے معلوم ہو جائے گی، جو دو ہفتہ کے اندر انشاء اللہ پریس سے باہر آجائے گی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے مل سکتی ہے، میں جتنا مطالعہ کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کے اثرات جتنے زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں اس دعوت کے مزاج ومنہاج سے میرا بعد بڑھتا جاتا ہے۔

یطیقونہ کے بارے میں اس وقت کچھ لکھ نہیں سکتا، نہ وہ کتاب میرے سامنے ہے جسکا آپ نے حوالہ دیا ہے، نہ اس وقت غور کرنے کی فرصت ہے، کسی اور صاحب علم کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۱۸/۷/۷۵ء

دارالعلوم دیوبند سے فراغت اور افتاء کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء آنے سے قبل پانچ سال کا عرصہ تین مدارس میں گزرا، ایک سال علاقہ میوات کے ایک مدرسہ میں، ایک سال مدرسہ ہدایت المسلمین کرہی ضلع بستی میں اور تین سال مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں، اس مدت میں گاہے بہ گاہے حضرت مولانا علی میاںؒ سے مراسلت رہی، مراد آباد تین سال قیام کے دوران حضرت مولاناؒ کی مراد آباد میں کم از کم دوبار تشریف آوری ہوئی، ایک بار پیام انسانیت کے پروگرام میں تشریف لائے تھے، بڑے کامیاب جلسے ہوئے، حضرت مولاناؒ کی مراد آباد کی ایک تقریر میں نے مرتب کی تھی، جو پہلے تعمیر حیات میں شائع ہوئی، پھر کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئی، مراد آباد کے زمانہ میں حضرت مولاناؒ سے قربت بڑھی، حضرت سے قریبی رابطہ قائم کرانے میں مراد آباد کے مشہور داعی جناب افتخار احمد فریدی مرحوم کا بڑا حصہ ہے، حضرت مولانا کی دعوت پر اس دوران تکیہ کلاں رائے بریلی حاضری ہوئی، اس حاضری کے کچھ نقوش وتاثرات ذاتی ڈائری سے نقل کئے جاتے ہیں۔

۲۶.اکتوبر ۱۹۷۹ء م ۴.ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ

۸.بجے صبح لکھنو پہنچا، ندوہ حاضر ہوا، مولانا سید مرتضی صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ مولانا علی میاں ابھی رائے بریلی تشریف لے گئے ہیں، میرا پروگرام تھا کہ نذیر آباد میں مولانا نعمانیؒ سے ملاقات کرنے کے بعد رائے بریلی کے لئے روانہ ہو جاؤں گا

۷۔۲/ابجے (شام کے وقت) حضرت مولانا علی میاں کے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی پہنچا، برآمدہ میں حضرت مولانا علی میاں، مولانا محمد رابع صاحب، مولانا معین اللہ صاحب وغیرھم موجود تھے، ہر ایک سے سلام و مصافحہ ہوا، حضرت مولانا بہت تپاک اور محبت سے ملے، انہوں نے فرمایا: میں آپ کا انتظار ۱رذی الحجہ سے کر رہا ہوں اور آپ آج تشریف لائے۔

مولاناؒ نے میرے مضامین "تحریک خلافت میری نظر میں" "ایک عہد آفریں شخصیت مولانا سید جعفر علی بستوی" کا تذکرہ کیا اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا، فرمایا کہ "تحریک خلافت" (تصنیف قاضی عدیل عباسی) کے بارے میں میرے بھی وہی خیالات ہیں جو آپ نے تحریر کئے ہیں اور میں نے قاضی صاحب کو اپنے خیالات سے مطلع بھی کر دیا ہے، میں نے عرض کیا کہ قاضی صاحب میرے تبصرہ پر خوش نہیں ہیں۔۔۔۔۔ مولاناؒ نے فرمایا: وہ مشکل سے اپنی غلطی تسلیم کریں گے۔

دوران گفتگو اس بات کا ذکر آ گیا کہ قاضی صاحب نے گاندھی جی کی بہت تعریف کی ہے اور انہیں تحریک خلافت کا روح رواں قرار دیا ہے، مولانا نے فرمایا: واقعۃً قاضی صاحب گاندھی جی کی تعریف میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں، نیشنلسٹ مسلمان جو عقیدہ و دین میں پختگی کے بغیر کانگریس میں شریک ہو کر گاندھی جی وغیرہ کے قریب رہے ان لوگوں کے دلوں میں گاندھی وغیرہ کی عقیدت و محبت رچ بس گئی، میں نے ان میں سے بعض کے کمروں میں گاندھی جی کی مورتیاں دیکھی ہیں۔۔۔۔ انہیں واقعات کو دیکھ کر قرآن کریم کے اس حکم کی حکمت ظاہر ہوتی ہے کہ کفار سے موالات نہ کی جائے۔

مولانا علی میاںؒ نے فرمایا: حضرت مدنیؒ کا مسئلہ دوسرا تھا، انکو عقیدہ و عمل کی ایسی پختگی حاصل تھی کہ کفار کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ملاقاتوں سے انکے دل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، وہ کتنے اہم

جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوں انکی نماز باجماعت، وظائف، معمولات، تعلق مع اللہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی، کانفرنسوں میں شریک ہوتے، بہ قدر ضرورت بحث و گفتگو کرنے کے بعد وظیفہ اور مراقبہ وغیرہ میں لگ جاتے۔۔۔۔۔۔۔کافی دیر اسی موضوع پر گفتگو ہوئی، ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی حالات کا بھی تذکرہ ہوا، اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھی گئی۔۔۔۔۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۷۹ء م ۵ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ

دائرہ شاہ علم اللہ میں بہت سکون و طمانیت ہے، محسوس ہوتا ہے گویا رحمت و سکینت کی بارش ہو رہی ہے، میرے خیال میں یہ ان مشائخ و بزرگان دین کی روحانی برکت ہے جو صدیوں سے یہاں محو خواب ہیں، اور جن کی ضربوں اور مجاہدوں نے اس مقدس وادی کی فضاؤں کو نور و سرور سے معمور کر دیا ہے، اس سر زمین پر پہنچتے ہی حضرت سید احمد شہیدؒ اور انکے قدسی صفات رفقاء یاد آتے ہیں، جنہوں نے اپنی للہیت، اخلاص، جوش و جذبہ، سرفروشی و مجاہدات سے خیر القرون کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی تھیں، یہاں کے چپہ چپہ پر اب بھی انکے لازوال اثرات ہویدا ہیں، سادہ اور پرعظمت مسجد، لب دریا وضو کرنے کے لئے پتھروں کا گھاٹ، اس وادی کے کھنڈرات اپنے سینوں میں ان مجاہدین کی حسین و دلکش یادیں بسائے بیٹھے ہیں اور زبان حال سے ہر آنے والے کو ان حسین و سادہ رنگین ایام کی داستان سناتے ہیں، اس وادی کا ذرہ ذرہ ہر حساس، غیرت مند مسلمان کو زندگی کا پیغام دیتا ہے اور عظمت رفتہ کے کھنڈرات سے حال و مستقبل کے لئے رہنمائی کرتا ہے۔

آج ہفتہ کے روز ناشتہ کرنے کے بعد حضرت مولانا علی میاں نے فرمایا: میں اپنے تصنیفی کام میں مشغول ہونے جا رہا ہوں، آپ کے لئے کتابوں کی الماریاں کھلوا رہا ہوں، اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کا مطالعہ کریں، پھر انشاء اللہ فرصت کے وقت گفتگو کریں گے۔

میں مختلف الماریوں کی کتابوں کی زیارت کرنے لگا، بہت سی کتابوں پر نگاہ ٹھہری اور انکا نام ڈائری میں نوٹ کیا، پاکستان میں اردو زبان میں دائرہ معارف اسلامیہ مرتب کر کے شائع ہو رہا ہے، اسکی اکثر جلدیں مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہیں، میں نے جستہ جستہ اسکا مطالعہ کیا، خاص طور پر ترک

عبدالحمید ثانی، کمال پاشا کا مطالعہ کیا، ترک پر لکھنے والے مقالہ نگار نے عبدالحمید کی بہت مذمت کی ہے اور کمال پاشا کی تعریف کی ہے، اور عبدالحمید پر لکھنے والے نے عبدالحمید کی قدرے تعریف کی ہے، میں نے مولانا علی میاں کے سامنے اسکا تذکرہ کیا، انھوں نے فرمایا: عربی اردو میں دائرہ معارف مرتب کرنے والوں نے انصاف سے کام نہیں لیا، انصاف کی بات تو یہ تھی کہ لکھنے والا حقائق وواقعات پیش کرنے پر اکتفا کرے، اپنی ذاتی رائے اور رجحان نہ ٹھونسے، لیکن اکثر لکھنے والے تاریخ نویسی کے اس بنیادی اصول کو مدنظر نہیں رکھ سکے، میں نے بھی مختلف جگہوں سے اسکا مطالعہ کیا لیکن اکثر اختلاف ہی رہا۔

۲۸. اکتوبر ۱۹۷۹ء م ۶. ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ

ناشتہ کرنے کے بعد حضرت مولانا علی میاںؒ نے میری درخواست پر وہ الماری کھلوادی جس کے اندر تین چار صدیوں کے علماء، مشائخ، مجاہدین، ارباب علم وفضل کے مکاتیب، فتاویٰ اور مختلف تحریریں رجسٹروں میں سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے محفوظ کردی گئیں ہیں۔

میری نگاہ پہلے اس رجسٹر پر پڑی جس میں مولانا عبدالحی صاحب کے نام مشاہیر کے مکاتیب محفوظ ہیں، اس رجسٹر میں اس دور کے اکثر علماء، مشائخ، ادباء شعراء، دانشوروں اور مفکروں کے قلم کی لکھی ہوئی تحریریں محفوظ ہیں، نزہۃ الخواطر میں درج کرنے کے لئے مولانا عبدالحی مرحوم نے مختلف مشاہیر سے حالات معلوم کئے تھے، اس کے جواب میں ان مشاہیر کے خودنوشت حالات زندگی کا ریکارڈ اس رجسٹر میں ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے نام آئے ہوئے خطوط کا ایک ضخیم رجسٹر مستقل ہے، اس میں مولانا مدنیؒ کے بھی سیکڑوں مکاتیب ہیں، مولانا علی میاں کے نام مکاتیب کے ۷، ۸ رجسٹر ہیں، دو تین رجسٹر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے مکاتیب کے ہیں، دو رجسٹر عرب علماء، امراء ومصنفین کے مکاتیب کے ہیں، دو رجسٹر اور مختلف مشاہیر کے مکاتیب کے ہیں، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا گیلانیؒ، مولانا دریابادیؒ وغیرہم۔

پہلے کے خاندانی بزرگوں کے نام مکاتیب کا الگ ضخیم رجسٹر ہے، جس میں شاہ علم اللہ، سید احمد

شہید، خواجہ احمد، سید عبدالسلام، سید ابوالقاسم وغیرھم کے نام آئے ہوئے خطوط ہیں، اس میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد حسین صاحبؒ شاگرد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بہت سے خطوط ہیں، اس میں مولانا سید جعفر علی بستوی کا بھی ایک خط شریک ہے، جو خواجہ احمد کے نام لکھا گیا ہے، میں نے اسکو بہت محنت سے نوٹ کیا، بعض جگہ پڑھا نہ جاسکا، مفتیان کرام کے فتاویٰ کا ایک ضخیم رجسٹر ہے جس میں سیکڑوں فتاویٰ محفوظ ہیں، اس میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، مولانا گنگوہیؒ، مفتی سعد اللہ رامپوریؒ، مولانا ارشاد حسین رامپوریؒ، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالقاسم فتحپوریؒ وغیرھم کے فتاویٰ کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔۔۔۔

تقریباً ایک بجے تک میں ہر چیز سے بے خبر ہو کر اس عظیم ذخیرہ کا جائزہ لیتا رہا، نماز ظہر ادا کرنے والے کے بعد کھانے کے دوران حضرت مولانا علی میاںؒ نے سوال کیا کہ آج آپ نے کیا خاص چیز دیکھی؟ میں نے عرض کیا کہ آج میں دو تین صدیوں کے فقہ و فتاویٰ، تذکرہ و تاریخ کے ذخیرہ کی ورق گردانی کرتا رہا، دو تین صدیوں کے اکابر و مشائخ اور مصنفین کے مکاتیب، فتاویٰ، تحریروں کا اس سے بڑا ذخیرہ شاید کہیں ہو۔ اس پر تو آپ کی نگرانی میں کام ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسباب اور کام کرنیوالے افراد دیے ہیں، آپ کی ادنیٰ توجہ سے یہ علمی، ادبی، تاریخی کام آسانی کے ساتھ انجام پاسکتا ہے، مولانا نے فرمایا: بہت سے ضروری کام میرے سامنے ہیں، عرصہ سے میری خواہش ہے کہ اس پر کام ہو لیکن پتہ مار کام کے لئے اچھے افراد نہیں ملتے، میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ کوئی صاحب ذوق رائے بریلی آکر مکاتیب و فتاویٰ کے ضروری حصوں کو مرتب کریں میں انکی رہائش اور آرام کا پورا نظم کروں گا"۔ ۲۹. اکتوبر ۱۹۷۹ء م ۷. ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ

آج بھی مکاتیب و فتاویٰ کے مطالعہ میں مصروف رہا، کچھ دیر مصری مصنف شیخ محمد حسین الذہبی کی کتاب التفسیر والمفسرون کے مطالعہ میں منہمک رہا، مصنف نے تفسیر کے تدریجی ارتقاء اور دور حاضر تک کے تفسیری ذخیرہ کا بہت تحقیق و تلاش اور دیدہ وری سے جائزہ لیا ہے، تفسیر ابن جریر طبری اور تفسیر کشاف کے بارے میں مولف کی فاضلانہ بحث کو غور سے پڑھا۔

آج مختلف اوقات میں حضرت مولانا علی میاں کی زبان سے تاریخ وتذکرہ وغیرہ سے متعلق باتیں سنیں، ان میں سے چند کو درج کرتا ہوں۔

مولاناؒ نے فرمایا: جنگ آزادی میں شریک ہونے کی مولانا مدنیؒ اور جمعیۃ العلماء کی پالیسی بالکل صحیح اور ضروری تھی، کیونکہ اگر ہم لوگ جنگ آزادی میں شریک نہ ہوتے تو آزادی کے بعد بالکل اچھوت بن کر رہ جاتے، اور ہمیں اپنے مطالبات پیش کرنے کا بھی حق نہ ہوتا، اسکی مثال بالکل اسی طرح ہے کہ اگر کسی گھر پر ڈاکو حملہ کردیں تو گھر کے جو افراد انکا مقابلہ کرکے گھر کی حفاظت کرتے ہیں وہ سرخ رو ہوتے ہیں، اور گھر پر انکا حق ہر ایک تسلیم کرتا ہے، اسکے برخلاف جو لوگ چھپ کے بیٹھ جائیں وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوتے، اور اگر وہ لوگ کوئی مطالبہ کریں تو کوئی انکی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا: کہ یہ تاریخ کا کھلا ہوا سبق ہے کہ کسی ملک میں جب آزادی کا علم بلند ہوتا ہے تو جو قوم اس میں جتنا پیش پیش ہوتی ہے ملک آزاد ہونے کے بعد ملک کے انتظام میں اس کا اتنا ہی حصہ ہوتا ہے۔

مولاناؒ نے فرمایا: تحریک خلافت کے دور میں اگر ملک آزاد ہوتا تو ملک کے انتظام وانصرام میں مسلمانوں کا حصہ کہیں زیادہ ہوتا، کیونکہ اس تحریک کے دور میں جنگ آزادی میں مسلمان پیش پیش تھے، لیکن اس تحریک کے بعد مسلم لیگ کی سیاست نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا، اور مسلمانوں کو جنگ آزادی سے دور کردیا، اس دور میں احرار تحریک نے اس نقصان کی قدرے تلافی کی، کیونکہ مسلمان احرار کے پلیٹ فارم سے جنگ آزادی میں حصہ لے رہے تھے، مولانا عبدالقادر رائے پوری تحریک احرار کی پوری پشت پناہی کررہے تھے۔

۳۰.اکتوبر ۱۹۷۹ء م ۸.ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ

آج بھی زیادہ وقت مکاتیب وفتاویٰ کے مطالعہ میں گذرا، ابن الجوزی کی کتاب صید الخاطر کی ایک جلد دستیاب ہوئی، جستہ جستہ اسکا مطالعہ کیا، کتاب بے مثال اور ادب عربی میں اونچا مقام رکھتی ہے۔

آج بعد ظہر گھر کی طرف روانگی کا پروگرام تھا، اس لئے میں نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ

سے تنہائی میں گفتگو کے لئے وقت مانگا، انہوں نے فرحت وبشاشت کے ساتھ مجھے تنہائی میں ملاقات کرنے کے لئے وقت دیا۔

میں نے مدارس عربیہ کے ناگفتہ بہ حالات، خانشار، بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ مدارس کے موجودہ ماحول میں کچھ دینی کام کیسے کیا جائے؟ مولانا کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، وہ بہت غمگین نظر آنے لگے، انہوں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا: کہ مدارس کے حالات واقعۃً ابتر ہیں، اکثر مدارس میں اساتذہ اور ذمہ داروں کی توجہ طلبہ کی تعلیم وتربیت سے ہٹ کر مکمل طور پر حصول زر، جلسہ جلوس، جاہ ومنصب کی طرف مبذول ہوگئی ہے، اخلاق وکردار کا معیار بھی پست ہے، اب تو مدارس میں کام کرنے کی صرف ایک شکل ہے وہ یہ کہ آدمی گردوپیش اور ماحول سے آنکھیں بند کرکے اپنے فریضہ کی ادائیگی اور علمی، دینی مشاغل میں مصروف رہے۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے قدرے مضمون نگاری کا بھی شوق ہے، میرے مختلف مضامین غالباً آپ کی نگاہ سے گزرے ہوں گے، اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی درکار ہے، مختلف موضوعات پر میں نے مضامین لکھے، میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مجھے کس فن سے زیادہ مناسبت ہے، آپ نے میرے مضامین سے کیا اندازہ لگایا اور آج کل کس موضوع پر لکھنے کی زیادہ ضرورت ہے؟

مولاناؒ نے فرمایا: کہ میں نے آپ کے چند مضامین کا مطالعہ کیا جن کا تعلق تذکرہ وسوانح سے ہے، مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو اس فن سے خاص مناسبت ہے، علماء، مشائخ، صوفیاء کے حالات پر نئے انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے، دنیا کو آج کل انکے فرمودات، حالات، پیغامات میں سکون وراحت مل سکتی ہے، ابھی تک شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پر کوئی قابل ذکر تصنیف سامنے نہیں آسکی۔

میں نے مولانا سے سوال کیا: مضامین ومواد سے قطع نظر صرف زبان سیکھنے کے لئے اردو کے کن مصنفین کا مطالعہ کیا جائے؟

مولاناؒ نے فرمایا: علمی مضامین کی تعبیر واظہار کے لئے ابھی تک اردو زبان میں مولانا شبلی سے عمدہ کوئی دوسرا اسلوب پیدا نہیں ہوسکا، تاریخ وسوانح کے لئے انکا قلم بہت مناسب ہے۔ ہمارے والد ماجد مولانا

عبدالحیؒ صاحب کی زبان بھی تذکرہ وسوانح کے لئے نہایت موزوں ہے، انکی کتاب "یادایام" تاریخ نویسی کا اعلیٰ نمونہ ہے، آپ زبان سیکھنے کے لئے ان دونوں حضرات کی کتابیں خاص طور پر مطالعہ میں رکھیں۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی مضمون نگاری کا بھی شوق ہے، اگرچہ عرصہ دراز سے عربی زبان میں مضمون نہیں لکھا لیکن اب از سر نو محنت کرنے کا ارادہ ہے عربی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لئے کن مصنفین کا مطالعہ مفید ہوگا؟

مولاناؒ نے جواب دیا: تاریخ کی عربی کتابیں اس سلسلہ مین زیادہ مفید ثابت ہوں گی، مثلاً وفیات الاعیان لابن خلکان، تاریخ ابن اثیر وغیرہ، تاریخ کی کتابیں زبان سیکھنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی، دور حاضر کے مصنفین میں کرد علی، ڈاکٹر احمد امین کی کتابیں زبان وادب کے بارے میں زیادہ مفید ہوں گی، ان دونوں کا آپ ضرور مطالعہ کریں۔

میں نے سوال کیا: منفلوطی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مولانا نے فرمایا: اچھے ادیب ہیں، سادہ اور عام فہم لکھتے ہیں، لیکن انکا اسلوب ادیبانہ مضامین کے لئے مناسب ہے، تاریخ وتذکرہ کے لئے نہیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ میں ان سے مختلف سوالات کرتا رہا اور مولاناؒ بہت شگفتہ مزاجی کے ساتھ برابر تفصیل کے ساتھ جوابات سے نوازتے رہے۔

آخر کار میں نے اجازت چاہی، مولانا نے بطور شفقت ۱۰۰ روپے عنایت فرمائے، میں نے ابتداءً معذرت کی لیکن حضرت مولانا کے اصرار پر انکار کرتے نہ بنا

نماز ظہر کے بعد مولانا نے بہت شفقت ومحبت کے ساتھ مجھے وطن کے لئے روانہ کیا اور فرمایا: فرصت ملنے پر کبھی کبھی یہاں تشریف لے آیا کیجئے، مولانا کی عنایتوں اور دعاؤں سے سرشار ہوکر میں بذریعہ بس لکھنو کی طرف روانہ ہوگیا، اس سفر کی خوش گوار یادیں برابر مشام جاں کو معطر کرتی رہیں گیں۔

چند اور خصوصیات:- حضرت مولانا علی میاںؒ زبان کی آفات سے محفوظ تھے، اس زمانہ میں شاذ ونادر ہی اللہ کے ایسے بندے ملیں گے جو غیبت کے مرض سے محفوظ ہوں، حضرت مولانا علی میاںؒ انہیں

چند مستثنیات میں سے ہیں، انہیں خلوت وجلوت میں کبھی غیبت کرتے نہیں سنا، انکی مجلس میں اگر کسی نے کسی کی برائی شروع کی تو یا تو سختی سے روک دیتے یا انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بات کا رخ موڑ دیتے، انکی گفتگو اور مجلس کا ایک خاص معیار تھا جس سے نیچے اترنے پر وہ قادر نہیں تھے، انکی طبیعت پر شرم وحیا کا بہت غلبہ تھا، انکی ذات میں حیاء عثمانی کی جھلک صاف طور سے دیکھی جاسکتی تھی، زبان وقلم سے معیار سے گری ہوئی بات کہنا اور لکھنا انکے بس سے باہر تھا، انکی گفتگو پر لطف اور پر مزاح ہوتی تھی، لیکن مزاح میں دل آزاری کا ادنیٰ شائبہ نہیں ہوتا تھا، متین اور باوقار تھے، بے تکلف احباب کے ساتھ بھی انکی بے تکلفی سنجیدگی اور وقار کے دائرہ میں ہوتی تھی، گھر کے بچوں اور نیاز مندوں کے سامنے بھی انتہائی مجبوری کے بغیر پیر پھیلا کر بیٹھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستگی: ۔حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے عقیدت ومحبت کا تعلق برابر بڑھتا ہی رہا، انکی ہر تصنیف وتحریر کا شدت سے اشتیاق وانتظار رہتا، اور انکے مومنانہ افکار اور داعیانہ جذبات سے فکر ونظر، قلب وجگر کو غذا ملتی، دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ سے مراسلت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ وقتاً فوقتاً جاری رہتا تھا، حضرت مولانا کے گرامی ناموں سے حوصلہ ملتا، راہ عمل طے کرنے میں مدد ملتی، مراد آباد کی تین سالہ تدریسی زندگی میں یہ تعلق مزید استوار اور مستحکم ہوا، مراد آباد، لکھنو اور رائے بریلی میں کئی بار حضرت مولانا سے ملاقات، استفادہ اور تفصیلی گفتگو کا موقع ملا، حضرت مولانا کی غیر معمولی شفقت، خورد نوازی، اخلاق وتواضع، امت کے لئے دردمندی اور فکرمندی نے دل ودماغ کو اسیر بنالیا، مراد آباد میں ایک شخصیت جناب افتخار احمد فریدی مرحوم کی تھی، وہ تبلیغ کے پرانے کارکنوں اور بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے تربیت یافتوں میں سے تھے، غیر مسلموں میں تبلیغ دین کا بڑا جوش وجذبہ پایا تھا، تمام بزرگوں کے یہاں انکی پہنچ تھی، بزرگوں کے کے سامنے اپنی بات بڑی سادگی اور بے تکلفی سے کہہ لیا کرتے تھے، ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود بڑے سرگرم اور متحرک تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بھی انکا گہرا تعلق تھا، خط وکتابت کے علاوہ سال میں ایک دوبار لکھنو اور رائے بریلی آکر حضرت مولاناؒ کے یہاں قیام کرتے اور

تفصیلی باتیں کرتے، مجھ سے بھی انہیں انس ہو گیا تھا، مختلف کتابیں مطالعہ کے لئے دیتے اور بعض موضوعات پر لکھنے کے لئے اصرار کرتے، انکی یہ خواہش تھی کہ میں مراد آباد کے بجائے لکھنؤ حضرت مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں آجاؤں، اور انکے زیر سایہ تصنیف و تدریس کی خدمت انجام دوں۔

متعین طور پر تو نہیں معلوم لیکن پورا اندازہ ہے کہ انہوں نے ہی حضرت مولانا سے مجھے لکھنؤ بلانے کی بات چلائی ۱۹۸۰ء میں خاص عید کے روز مراد آباد میں انتہائی ہولناک فرقہ وارانہ فساد ہوا، پولیس اور پی۔اے۔سی نے نہتے نمازیوں کے خلاف ظلم و بربریت کا بدترین مظاہرہ کیا تھا، مراد آباد کے گلی کوچے مظلوموں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے، اس وقت میں اپنے وطن میں تھا، غالباً اسی دوران حضرت مولانا علی میاںؒ کا والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، افسوس ہے کہ وہ مکتوب بظاہر میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکا، اس مکتوب کا ایک جملہ مجھے اب بھی پوری طرح محفوظ ہے، مولانا نے تحریر فرمایا تھا "آپ کی صلاحیتیں وسیع تر میدان کی طالب ہیں، میرے نزدیک آپ کے لئے موزوں ترین جگہ دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے، لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اس سے پہلے چند مہینے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام کریں، اس سے آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی" حضرت مولانا کا یہ مکتوب میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا، کیونکہ میری طرف سے کوئی طلب اور پیشکش نہیں تھی، اور جناب افتخار فریدی مرحوم کے بارے میں بھی نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے میرے بارے میں کوئی بات چلائی ہے، حضرت مولانا کی خدمت میں میں نے اپنا اتفاق اور شکر گزاری کا خط روانہ کر دیا اور کچھ دنوں بعد لکھنؤ انکی خدمت میں حاضر ہو گیا، مولانا نے مجھے فوری طور پر "مجلس تحقیقات و نشریات لکھنو" سے وابستہ کر دیا اور تصنیف و تحقیق کا کام میرے حوالہ کیا، ازراہ نوازش اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں مجھ سے مدد لیتے، مآخذ اور حوالوں کے کام خاص طور سے میرے ذمہ کرتے، اور تھوڑے سے کام اور محنت پر غیر معمولی قدر دانی اور ہمت افزائی فرماتے، انکی شفقت و محبت اور حوصلہ افزائی سے تحقیق و تلاش کا لطف دوبالا ہو جاتا اور کتابوں کی ورق گردانی کی لذت فزوں ہو جاتی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری دل بستگی ابتداء تنہا حضرت مولانا علی میاںؒ کی ذات گرامی

سے تھی، حضرت مولانا کے علاوہ میری کسی اور سے واقفیت نہیں تھی، شروع ہی سے دونوں وقت کا کھانا حضرت مولاناؒ کے ساتھ کھانے کا معمول بن گیا تھا، حضرت مولانا حد درجہ خیال فرماتے اور کرم فرمائی کی انتہا کردیتے، حضرت کو غالباً اس بات کا احساس تھا کہ انکے لئے یہاں کا ماحول نیا اور نامانوس ہے، لوگوں سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، اس لئے حضرت کی توجہات اور کرم فرمائیاں میرے ساتھ کچھ زیادہ تھیں، ویسے تو حضرت مولانا نے اخلاق نبوی کا بھرپور فیض پایا تھا، ہر ایک کے ساتھ انکا سلوک و برتاؤ بڑا کریمانہ تھا۔

کچھ اور یادیں:- مجھے دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے ہوئے چند ماہ گذرے تھے، ایک بار حضرت مولانا نے تنہائی میں بلا کر فرمایا کہ میں نے آپ کو دارالمصنفین اعظم گڈھ کے لئے بلایا تھا لیکن اب دل چاہتا ہے کہ آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی قیام کریں تاکہ تدریس سے آپ کا رشتہ منقطع نہ ہو اور یہاں قیام کر کے آپ تدریس و تصنیف دونوں لائن سے دین کی خدمت کریں، میں نے حضرت مولانا کی اس تجویز سے پورا اتفاق کیا اور عرض کیا کہ آپ میرے لئے جو فیصلہ فرمائیں انشاء اللہ اسی میں میری بہتری ہوگی، چند روز کے بعد حضرت مولانا کی ایماء پر بعض کتابوں کے اسباق میرے ذمہ کردیے گئے، اس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی کس کس کرم فرمائی اور ذرہ نوازی کا تذکرہ کیا جائے، انکی شفقت و محبت، تواضع وحسن اخلاق کے بے شمار نقوش دل و دماغ پر ثبت ہیں، انکی یادوں سے دل کی قندیل روشن ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ انکی یادوں کے نقوش مدھم ہونے کے بجائے شوخ ہوتے جارہے ہیں، میں بھی ان خوش نصیبوں میں تھا جنہیں طویل عرصہ تک حضرت مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور انکی شفقتوں سے بہرہ ور ہونے کا خوب خوب موقع ملا، حضرت مولانا مختلف علمی کام اس ناچیز سے لیا کرتے تھے، اور تھوڑے سے کام پر غیر معمولی قدردانی اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے، انکے کام دینے کی وجہ سے اپنا بہت کچھ علمی فائدہ ہوا اس بہانہ بے شمار کتابیں مطالعہ میں آئیں جن کا مطالعہ عام حالات میں شاید میں نہ کرپاتا، اسی طرح حضرت مولانا کی علمی معاونت سے تصنیفی ذوق و سلیقہ بھی پیدا ہوا، لیکن

حضرت مولانا کی شرافت طبع، بلند اخلاقی اور خورد نوازی کی بات تھی کہ انہوں نے میری ذات سے ملنے والے معمولی علمی تعاون کا نہ صرف بار بار زبانی شکریہ ادا کیا اور ممنونیت کا اظہار فرمایا بلکہ اپنی تصنیفات و تحریروں میں اسکا تذکرہ کر کے اپنی غیر معمولی علم نوازی، طبعی فراخی کا ثبوت دیا مثلاً "المرتضیٰ" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں "آخر میں اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ مجھی مولوی عتیق احمد صاحب بستوی (مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء) نے دوران تصنیف بعض مطلوبہ معلومات اور حوالوں کی تلاش میں مدد کی، مصنف انکا شکر گزار ہے" (المرتضیٰ ص ۲۳)۔

اس دور میں جب کہ بہت سے حضرات پوری پوری کتابیں دوسروں سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرا لیتے ہیں اور جس شخص نے پتہ ماری کر کے کتاب لکھی ہوتی ہے اسکا نام تک کہیں نہیں آنے دیتے، حضرت مولانا کا یہ طرز عمل بڑا قابل ستائش اور قابل تقلید ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کے مقدموں میں ان لوگوں کا بڑے اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے جن سے ان کی کتابوں کی تصنیف میں ذرا بھی مدد ملی، اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کی یہ کرم فرمائی بھی یاد آرہی ہے کہ میرے لکھنو آنے کے چند سال بعد جب جناب والد صاحب دامت برکاتہم کا حج کا سفر ہوا، اور وہ سفر سے پہلے لکھنؤ تشریف لائے، حضرت مولانا سے بھی ملاقات کی، حضرت مولانا کو جب معلوم ہوا کہ والد صاحب تنہا سفر کر رہے ہیں، ساتھ میں کوئی رفیق اور معاون نہیں ہے تو حضرت مولانا نے مولانا محمد شمیم صاحبؒ ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے نام ایک گرامی نامہ لکھا، حضرت مولانا کا یہ مکتوب بعینہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، یہ خط مولانا کی مکتوب نگاری اور محتاط تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔

(ندوہ۔ لکھنو)

۵ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ

محب و عزیز گرامی قدر مولانا محمد شمیم صاحب زیدت مکارمہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوگا، میں اگرچہ بہت احتیاط کرتا ہوں اور آپ کی مشکلات سے واقف ہوں، پھر بھی کچھ استثناءات ہوتے ہیں انہیں استثناءات میں ہمارے محترم محمد رفیق صاحب شامل ہیں جن کے

صاحبزادہ مولانا عتیق احمد صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کے خاص اساتذہ میں ہیں اور میرے علمی و تحریری کاموں میں بہت معاونت کرتے ہیں انکے والد محترم اس سال عازم حج ہیں، عمر و صحت کا تقاضا ہے کہ وہ حرم شریف کے قریب کہیں قیام کریں، کوئی ایسا عزیز و معاون انکے ساتھ نہیں ہے جس سے انکو خاص مدد ملے، اگر آپ انکے قیام کا اپنے یہاں کوئی انتظام فرمادیں تو میں ممنون ہوں گا۔

والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

حضرت مولاناؒ کی فکر مندیاں: - تقریباً بیس سال حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے زیر سایہ کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس طویل عرصہ میں حضرت مولانا کی شفقتوں، نوازشوں کا جو تجربہ ہوا، انکے جن محاسن و کمالات کا مشاہدہ کیا اور ان کی دینی حمیت، ایمانی غیرت، اتباع سنت اور دعوتی جذبہ و تڑپ کے جن بے شمار واقعات کو اپنی نگاہوں سے دیکھا انہیں قلم بند کرنے کے لئے ایک مفصل کتاب کی ضرورت ہے، ایک مضمون میں ان مشاہدات و واقعات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے تعلق سے حضرت مولانا کی فکر مندی کا سب سے بڑا موضوع یہ تھا کہ خدانخواستہ ہندوستانی مسلمان اپنی دینی و ایمانی شناخت نہ کھو بیٹھیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری نئی نسل سرکاری تعلیم گاہوں میں جاکر ایمان و عقیدہ کا عزیز ترین سرمایہ کھو بیٹھے، ہندوانہ تہذیب و ثقافت کو اختیار کرلے، اور اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہو جائے، اس فکر و خیال نے حضرت مولانا کو بے چین کر رکھا تھا، انکی ہر تقریر میں بڑی درد مندی اور بے چینی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا جاتا، کبھی وہ قرآن پاک کی آیت "یأیہا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً" کی تلاوت اور ترجمہ کرکے مسلمانوں کو جھنجھوڑتے کہ وہ پورے ملک میں ہر گاؤں اور ہر محلہ میں بچوں کے لئے بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب و مدارس کا جال بچھادیں، اپنے اسکول قائم کرکے ان میں عصری علوم کے ساتھ بنیادی دینی تعلیم کا بھی انتظام کریں اور کبھی اس آیت کی تلاوت فرماکر "أم کنتم شہداء

اذحضریعقوب الموت إذ قال لبنیه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد إلٰهك واله آبائك ابراهیم واسمٰعیل واسحٰق إلٰهاً واحداً ونحن له مسلمون (کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کی موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کس کی عبادت کروگے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ، دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق ہیں وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے فرمابردار ہیں) مسلمانوں کے ایمانی جذبات کو بیدار کرتے کہ جب ایک نبی کو اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کے ایمان کی اس قدر فکر تھی جبکہ وہ دینی وایمانی ماحول میں پلی تھی تو ہمیں اپنے بچوں کے ایمان وعقیدہ کی سلامتی کے لئے کس قدر فکر مند ہونا چاہئے، خصوصاً اس لئے کہ ہمارے ملک کا ماحول حد درجہ ایمان سوز اور مشرکانہ ہے، ہر طرف بچوں اور نوجوانوں کو دین و ایمان، اخلاق وکردار کو بگاڑنے والے محرکات پھیلے ہوئے ہیں۔

اس موضوع پر حضرت مولانا کی تحریروں اور تقریروں نے خدا جانے کتنے مسلمانوں کے دلوں میں فکر مندی کے چراغ جلائے ہوں گے، اور حضرت مولانا کی تحریک وترغیب سے بے شمار دینی مکاتب ومدارس اور مسلم اسکولس قائم ہوئے ہوں گے، آج حضرت مولانا کے اس درد دل کو عام کرنے اور اس پیغام کو پھیلانے کی شدید ضرورت ہے۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اسٹیج سے بھی حضرت مولانا نے یہی آواز لگائی کہ مسلمان شادی بیاہ، نکاح وطلاق اور میراث وغیرہ کے مسائل میں بھی کتاب وسنت کی تعلیمات پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں، کیونکہ اسلام کا عائلی قانون بھی اسلامی شریعت کا بہت اہم حصہ ہے، مسلمان اس سے کسی حال میں دست بردار نہیں ہوسکتے، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اسٹیج سے حضرت مولانا نے حکومت ہند سے بار بار بڑے واضح اور قطعی انداز میں فرمادیا کہ مسلمان اپنے پرسنل لاء میں کسی ادنیٰ ترمیم کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے، مسلمانوں پر یونیفارم سول کوڈ لادنے کی کوشش ملک کے لئے اچھے ثمرات واثرات ظاہر نہیں کرے گی۔

بلاد عربیہ کے تعلق سے حضرت مولانا کی فکر مندی کا سب سے اہم موضوع عرب قومیت و

وطنیت کا وہ نعرہ تھا جس نے عربوں کے ایک بڑے طبقے کو مسحور و مخمور کر دیا تھا، عرب قومیت کا بت تراش کر یہ کوشش کی گئی تھی کہ عربوں کی جذباتی وابستگی اسلام اور ایمان سے ختم کر دی جائے اور عربوں میں یہ رجحان پیدا کیا جائے کہ وہ قبل از اسلام کی مشرکانہ عربی تہذیب و ثقافت اور مشرک عرب فرمارواؤں پر فخر محسوس کرنے لگیں، تاکہ رفتہ رفتہ اسلام سے انکا رشتہ کمزور پڑتا جائے، صدر جمال عبدالناصر نے عرب قومیت کا صور اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا تھا کہ بلاد عربیہ میں عرب قومیت کے خلاف کچھ لکھنا یا بولنا اپنے کو نکو بنانا تھا، حضرت مولانا علی میاںؒ نے پوری ایمانی جرأت اور ادبی بلاغت کے ساتھ عرب قومیت کے خلاف مضامین اور کتابچے لکھے، اور بڑے پیمانہ پر بلاد عربیہ میں انکی اشاعت کرائی، حضرت مولانا کی تحریروں کے اثر سے خود بلاد عربیہ میں اسلامی ذہن رکھنے والے اہل قلم کو یہ جرأت ہوئی کہ انہوں نے بھی عرب قومیت کے خلاف مدلل، پرزور تحریریں لکھیں، اور رفتہ رفتہ قومیت عربیہ کی دعوت اور سحر انگیزی کمزور پڑتی گئی۔

عالم اسلامی خصوصاً بلاد عربیہ میں ذرائع ابلاغ اور تعلیم گاہوں کی نامسلمانی بھی حضرت مولاناؒ کو مضطرب رکھتی تھی، مولانا کا احساس تھا کہ بلاد اسلامیہ میں جامعات، کالجز اور اسکولوں کا نصاب و نظام تعلیم بڑی حد تک ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو مغربی تعلیم گاہوں کے ساختہ پرداختہ ہیں، یا مغرب کے تعلیمی افکار و نظریات سے مرعوب و متاثر ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ان تعلیم گاہوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کا ذہن و دماغ مغربی سانچے میں ڈھل رہا ہے، اسلام کی ابدیت وافادیت کے بارے میں انکا عقیدہ متزلزل ہو رہا ہے، یہ نوجوان نسلی اور خاندانی طور پر مسلمان ہونے کے باوجود بہت تیزی کے ساتھ ذہنی و فکری ارتداد کا شکار ہو رہے ہیں، انکے ذہنوں میں یہ فکر و خیال راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ دور حاضر میں اسلامی نظام حکومت اور اسلامی قوانین قابل عمل نہیں، حضرت مولانا کی دعوت تھی کی بلاد اسلامیہ میں اسلامی تحریکات سے وابستہ افراد اور اسلام کی سربلندی کے لئے فکر مند حضرات کو جامعات، کالجز اور اسکولوں کے نصاب و نظام پر خصوصی توجہ دینی چاہئے، نصاب و نظام تعلیم کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے کی انتھک کوشش کی جانی چاہئے، حضرت مولانا کے خیال میں بلاد اسلامیہ میں برپا

کشمکش کا بنیادی سبب یہی ہے، کہ وہاں کی تعلیم گاہوں کا پورا ڈھانچہ مغربی طرز پر ہے، ان تعلیم گاہوں سے نکلنے والے نوجوان جو سیاست و حکومت پر قابض ہوتے ہیں ملک میں مغربی تہذیب وثقافت، مغربی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں، جبکہ ملک کے عوام دینی ذہن کے ہوتے ہیں، انکی عقیدت و وابستگی تمام تر اسلامی احکام و تعلیمات سے ہوتی ہے، اس لئے مغرب پرست حکام اور اسلام پسند عوام کے درمیان برابر کشمکش جاری رہتی ہے، اور یہ کشمکش بسا اوقات بہت خونریز صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حضرت مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ بلاد اسلامیہ کے ذرائع ابلاغ، صحافت و نشریات پر بھی بڑی حد تک مغرب زدہ افراد اور اداروں کا قبضہ ہے، ملک کے عوام و خواص کا ذہن بنانے اور انکے رجحانات کی تشکیل میں ذرائع ابلاغ، صحافت و میڈیا کا بہت بنیادی کردار ہے، لہٰذا بلاد عربیہ میں ذرائع ابلاغ کو صحیح اسلامی رخ دینے اور صالح افکار و نظریات کی ترویج میں ان سے مدد لینے کی بہت سخت ضرورت ہے، مولانا کا احساس تھا کہ مسلم ممالک کے اسلامی حلقے ذرائع ابلاغ کی طرف کم توجہ کر رہے ہیں، اس لئے ذرائع ابلاغ پر مغرب پرست افراد اور اداروں کا کنٹرول بڑھتا جا رہا ہے، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نوجوان نسل کو بگاڑنے، انہیں اسلام سے بیزار کرنے کا کام بڑے پیمانہ پر انجام دیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے، پوری دنیا کے مسلمان انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مولانا نے بھی تمام ممالک کے مسلمانوں کے مشکلات و مسائل سے واقف ہونے اور انہیں صحیح مشورہ دینے کی ہر ممکن کوشش کی، اپنے اعذار و امراض، ضعف و ناتوانی کے باوجود دین کے لئے فکر مند مسلمانوں کی دعوت پر پوری دنیا کا سفر کیا، اور جہاں بھی گئے مادی منافع حاصل کرنے کے بجائے پرسوز داعی اسلام اور وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے وہاں کے مسلمانوں کے دینی و روحانی امراض کی تشخیص کر کے انکا علاج تجویز کیا، پوری دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ انہیں قیمتی مشوروں سے نوازا اور پیار و محبت کی سوغات تقسیم کی۔

امتیازات و خصوصیات:- مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بہت ہمہ جہت اور ہشت پہل تھی، ان کے امتیازات و خصوصیات کا احاطہ چند صفحات میں انتہائی دشوار

ہے، حضرت مولانا کی اکثر تحریریں نظر سے گزری ہیں، قلب و نظر نے ان کا گہرا اثر قبول کیا اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کم و بیش بیس سال تک حضرت مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس مطالعہ و مشاہدہ کی بنا پر حضرت مولاناؒ کی چند نمایاں خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

دل سوزی اور فکر مندی:- حضرت مولاناؒ کی سب سے بڑی خصوصیت ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت کے لئے ان کی دل سوزی اور فکر مندی ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلمانوں کی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی، دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں مسلمان مغربی سامراج کا لقمۂ تر بن چکے تھے، مسلمانوں کو رفتہ رفتہ امامت وسیاست، معیشت واقتصاد، سائنس و ٹکنالوجی کے میدانوں سے بے دخل کیا جا چکا تھا، اور ان سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ انہیں ایمان و عقیدہ، توحید و رسالت اور اسلامی احکام واقدار سے محروم کرنے کی کوششیں بڑے پیمانہ پر جاری تھیں، مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ بے حیثیت اور بے وزن قوم بن چکے تھے، اور بالکل وہی منظر تھا جس کی تصویر کشی زبان نبوت نے ان الفاظ میں کی تھی "یوشك الامم ان تداعی علیکم کماتداعیٰ الآکلة الیٰ قصعةٍ (وہ زمانہ قریب ہے جب دوسری قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں جس طرح کھانے والے پیالے پر ٹوٹتے ہیں) مغربی سامراج کی سازشوں کا شکار ہو کر ترک نادان خلافت اسلامیہ کی قبا تار تار کر چکا تھا، شیوخ عرب کو عرب قومیت کا جام پلا کر ایسا مدہوش کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے شاندار ماضی سے بے تعلق اور حال و مستقبل سے بے خبر ہو چکے تھے، برصغیر میں تقسیم ملک کے نام پر خون کی ندیاں بہادی گئی تھیں، اور ہندوستان میں بسنے والی دونوں قوموں (ہندو اور مسلمان) کے درمیان نفرت و عداوت کی ایسی خلیج پیدا کر دی گئی تھی جس کا پر ہونا انتہائی مشکل کام تھا، نام نہاد آزادی کے بعد آزاد ہندوستان میں ساری قوموں پر مشرکانہ تہذیب اور آرین کلچر تھوپنے کی مہم پوری قوت کے ساتھ جاری تھی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایک ایسے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا محبوب ترین مشغلہ تصنیف و تالیف اور پیشہ علاج و معالجہ تھا، انکے دادا حکیم سید فخر الدین خیالی زبردست مورخ وادیب اور حاذق طبیب تھے، انکی کتاب "مہر جہاں تاب" انکے ذوق علم و تحقیق کا بہترین نمونہ

ہے، مولانا کے والد ماجد حکیم سید عبدالحی حسنی بلند پایہ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کے زبردست فاضل، تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے زبردست محقق اور بلند پایہ ادیب وانشاپرداز تھے، اس خاندانی پس منظر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ستم ہائے روزگار اور ناموافق حالات سے آنکھیں بند کر کے اپنے تصنیفی خلوت کدہ میں مصروف کار رہتے اور اپنے خامہ گہربار سے علوم وفنون کے کشت زار میں نئے نئے لالہ وگل کھلاتے، اور اگر مولانا موصوف کی طبیعت اس پر قانع نہیں تھی تو تحریک ندوۃ العلماء اور اسکی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء انکی جولانیوں کا بہترین میدان تھے، ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی خود اتنا بڑا کام تھا کہ اس کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی علمی وفکری توانائیاں بہترین مصرف تھیں، لیکن قسام ازل نے مولانا مرحوم کو جو دل درد مند عطا کیا تھا اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ تصنیفی خلوت کدہ اور انتظامی جلوت کدہ پر اکتفا کریں، ماضی قریب کی اصلاحی وتجدیدی شخصیتوں میں سے مولانا نے جس شخصیت کو اپنا آئیڈیل بنایا تھا وہ انہیں کے خاندانی بزرگ حضرت سید احمد شہیدؒ تھے، مولانا موصوف نے عنفوان شباب ہی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح وجہاد کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، اور تحریک کے خدو خال بڑی محنت اور جانفشانی سے سیرت سید احمد شہید میں اجاگر کئے تھے، اس لئے ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ امت مسلمہ کے عالمی اور مقامی حالات سے آنکھیں بند کر کے اپنی علمی وفکری توانائیاں ایک محدود دائرہ کے لئے وقف کر دیں، انہوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کا درد اپنے دل میں محسوس کیا، اور اپنی بساط بھر سب کے درد کا مداوا کرنے اور ہر ایک کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کی، انہوں نے عربوں کو جھنجھوڑا کہ تمہاری سربلندی اور عزت کا راز عرب قومیت میں نہیں بلکہ اسلام میں ہے، تمہاری قسمت اسلام سے وابستہ کر دی گئی، اگر اسلام سربلند ہوگا تو تم کو عزت حاصل ہوگی اور اگر اسلام کمزور پڑے گا تو تمہاری ذلت ہوگی، مولانا کی مسلسل تنقیدوں اور ضربوں سے عرب قومیت اور وطنیت کا بت پاش پاش ہو گیا، اور قومیت عربیہ کے خوبصورت غبارے کی ہوا نکل گئی۔

ہندوستان کے مسلمان تقسیم ہند کے بعد ارتداد کی صورت حال سے دوچار تھے، سرکاری

درس گاہوں میں مشرکانہ نصاب تعلیم اور دیومالائی کلچر مسلط کرنے کی وجہ سے اس بات کا پورا خطرہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں ایمان و عقیدہ کی دولت سے محروم ہو جائیں، اور ہندوانہ تہذیب میں اس طرح ضم ہو جائیں کہ انہیں اپنے بنیادی عقائد اور مذہبی تشخصات کا ذرا بھی خیال نہ رہ جائے، اس خوفناک صورت حال نے مولانا کو بے چین کر دیا، رات کی نیند حرام ہو گئی، انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ گاؤں گاؤں اور محلہ محلہ بنیادی دینی تعلیم کا جال بچھانے کا بیڑہ اٹھایا، اور دینی تعلیمی کونسل قائم کر کے مسلمانوں کو ایک مثبت راہ عمل دکھائی، ہندوستان میں بچے کھچے اسلامی قوانین کی حفاظت کے لئے مسلم پرسنل لاء کی تحریک کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور اپنے دور صدارت میں تحفظ شریعت کی مہم کو بہت آگے بڑھایا، امت مسلمہ ہندیہ کے انتشار، سیاسی بے وزنی کو دور کرنے اور تمام مسلم جماعتوں کو امت کے مشترک مسائل کے خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے چند دوسرے فکر مند اور درد مند قائدین ملت کے ساتھ مل کر "مسلم مجلس مشاورت" کی بنیاد ڈالی جس سے امت مسلمہ کو نیا عزم و حوصلہ ملا، اور مسلمانان ہند مایوسی اور پست ہمتی کے دلدل سے باہر نکل آئے، حضرت مولانا علی میاںؒ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو انکا کھویا ہوا مقام یاد دلایا، پوری فکر مندی کے ساتھ انکے امراض کی نشاندہی کی اور انکا علاج بھی تجویز کیا، دنیا کے کسی ملک میں مسلمانوں پر مظالم ہوئے تو مولاناؒ نے درد کی کسک اپنے دل میں محسوس کی، اس طرح کی کسی خبر پر مولانا کی تڑپ، فکر مندی دیدنی ہوتی تھی، انکا یہ حال تھا۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

قلب ونظر کی وسعت اور اتحاد امت: ۔حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک اہم خصوصیت انکے قلب و نظر کی وسعت اور فراخی تھی، انہوں نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا کہ امت مسلمہ کو مسلک و مشرب اور فرقوں کے نام پر الگ الگ بانٹ دیا جائے اور گروہوں کے درمیان نفرت و بدگمانی کی اونچی دیواریں کھڑی کر دی جائیں، اس طرح یہ عظیم امت اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور آسانی کے ساتھ دشمنوں کا لقمہ تر بن جائے، حضرت مولانا نے طالب علمی ہی کے زمانہ سے قلب و نظر میں وسعت

وفراخی پائی تھی اس لئے جہاں جہاں سے انہیں خیر کی توقع ہوئی اس کی طرف لپکے اور ہر چشمہ فیض سے فیضیاب ہونے کی کوشش کی، ادارتی اور جماعتی تعصبات انکے لئے اخذ واستفادہ کی راہ میں مانع نہیں بن سکے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بڑے بلند پایہ اساتذہ سے علوم کی تحصیل کے بعد انہوں نے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور وہاں کے بعض ممتاز ترین اساتذہ سے کسب فیض کیا، تفسیر قرآن میں مہارت پیدا کرنے کا شوق انہیں کشاں کشاں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی درس گاہ تک لے گیا، انکی بیتاب اور جویائے حق طبیعت کبھی انہیں مولانا مودودیؒ کی تحریک سے قریب لائی اور کبھی انہوں نے حضرت مولانا الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو اپنی تمناؤں کا مرکز اور جدوجہد کا محور بنایا، تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا جذبہ لے کر وہ اپنے زمانہ کے بہت سے مشائخ طریقت اور بزرگان دین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ہر ایک سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا، طلب صادق، سلامتی طبع، تواضع وفروتنی اور عالی نسبی کی وجہ سے بزرگوں کے محبوب نظر بنے اور اہل دل سے درد دل کا وہ متاع گراں مایہ حاصل کر لیا جس نے انکی شخصیت کو مرجع خاص وعام اور عالم اسلام کی امید گاہ بنادیا۔

دور حاضر میں امت مسلمہ قوم ووطن، فرقہ ومسلک کے نام پر بے شمار خانوں میں بٹی ہوئی ہے، فرقہ بندیوں نے امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور مسلمان جنہیں وحدت کلمہ کی بنیاد پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہونا چاہئے تھا سیکڑوں فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو کر اسلام کی رسوائی کا ذریعہ بن گئے ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خواہش اور کوشش تھی کہ عصر حاضر کے مسلمان اپنے ثانوی اور ذیلی اختلافات کو کچھ دیر کے لئے بھلا کر امت کے مشترک مقاصد کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں، اور اسلام نیز مسلمانوں کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے پیغام ہدایت کو پوری دنیا میں پھیلانے کے لئے اپنی توانائیاں مجتمع کریں اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اتحاد امت کا جذبہ مولانا کو تحریک ندوۃ العلماء سے ورثہ میں ملا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ کتاب الٰہی کے گہرے مطالعہ، تاریخ اسلام پر وسیع نظر اور دشمنان اسلام کی سازشوں کی واقفیت نے بھی

انہیں اس نتیجہ تک پہنچایا تھا کہ امت مسلمہ میں اتحاد فکر و عمل جذبہ تعاون و تناصر پیدا کئے بغیر دور حاضر کے فتنوں کا مقابلہ آسان نہیں، حضرت مولانا کو ہر آن امت کو جوڑنے کی فکر رہتی تھی اور وہ ہمیشہ ایسے اقدامات اور کاروائیوں سے گریزاں رہتے تھے جن سے اعتماد کی فضا مجروح ہو اور مختلف فرقوں اور اداروں کے درمیان دوریاں اور غلط فہمیاں بڑھیں اسی لئے جب کبھی وہ کسی جماعت یا گروہ پر تنقید کرنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے ناصحانہ لب ولہجہ اختیار کیا اور جارحانہ انداز اختیار کرنے سے ہمیشہ گریز کیا، انکی تنقیدی تحریروں کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تنقید نگار کا دل ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے معمور ہے، تنقید کا مقصد استہزاء اور نمک پاشی نہیں بلکہ اس فرد اور گروہ کے دل ودماغ میں اتر جاتا ہے جس کے خلاف تنقید کی جارہی ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کے اس شریفانہ اور خیر خواہانہ رویہ کا اثر تھا کہ انکے مخالفین بھی دل سے انکا احترام کرتے تھے اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ہر حلقہ میں انہیں احترام وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، عالم اسلام اور برصغیر میں صحیح بنیادوں پر کی جانے والی اتحاد ملت کی ہر کوشش کو انہوں نے بھرپور تعاون دیا، مسلم پرسنل لاء بورڈ کو وہ امت مسلمہ ہندیہ کا متاع گراں مایہ تصور کرتے تھے اور پرسنل لاء بورڈ کی شکل میں اتحاد ملت کے جس عظیم پلیٹ فارم سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانان ہند کو نوازا ہے اسے باقی رکھنے اور ترقی دینے کو وہ اپنا اولین فریضہ تصور کرتے تھے، مسلمانوں میں افتراق وانتشار کی ہر خبر ان پر بجلی بن کر گرتی تھی اور امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کے لئے وہ ہمیشہ فکر مند رہتے۔

اخلاق وتواضع:- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک امتیازی وصف انکی خوش اخلاقی اور تواضع تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق حسنہ کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا، انکی سیرت میں اخلاق نبوی کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی تھی، اپنی سلامتی طبع، خاندانی خصوصیات، مشائخ اور اہل اللہ کی تربیت کی وجہ سے وہ اخلاق رذیلہ سے پاک اور اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے، انکے اخلاص وللہیت، تقویٰ وطہارت، پاکیزہ سیرت کا غیر شعوری اثر انکے ہم نشینوں پر پڑتا تھا، انکی زندگی کو جو جتنے قریب سے دیکھتا وہ اتنا ہی زیادہ انکا گرویدہ ہوتا، اپنے شاگردوں مریدوں اور خوردوں کے ساتھ بھی انکا رویہ حد درجہ شفقت ومحبت،

اکرام واحترام کا تھا، بڑے بڑے مناصب پر فائز ہونے کے باوجود وہ آمرانہ لب ولہجہ سے ناآشنا تھے، کسی نے اگر انکا کوئی معمولی کام بھی کر دیا تو ان کی ممنونیت اور جذبات تشکر دیدنی ہوتے تھے، اپنے شدید ترین مخالفین اور ناقدین کے ساتھ انکا رویہ حد درجہ بلند اخلاق، اکرام واحترام، تواضع ومدارت کا ہوتا تھا، انہوں نے اپنے حسن اخلاق ہی کے ذریعہ اپنے بہت سے مخالفین اور ناقدین پر فتح پائی، انکا دل جیت لیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند ترین مناصب اور عہدوں پر فائز کیا، عزت وشہرت کے اس مقام تک پہنچایا جس سے زیادہ بلندی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن حضرت مولانا علی میاںؒ کے تواضع اور فروتنی میں کوئی فرق نہیں آیا، انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک فقیرانہ اور درویشانہ زندگی گزاری، نہ ابتدائی دور کے فقر وفاقہ میں انکا قدم ڈگمگایا، نہ دور آخر کی فتوحات سے انکا دامن تر ہوا، اللہ تعالیٰ کے ہر انعام وافضال پر انکا دل جذبات تشکر سے لبریز ہو جاتا اور زبان سے شکر وستائش کے الفاظ نکلتے، انہیں ہر دم اس بات کا احساس رہتا کہ مجھے جو مل رہا ہے میری قابلیت وصلاحیت اور میرے اعمال کی وجہ سے نہیں مل رہا ہے، بلکہ یہ سب کچھ خالص فضل الٰہی، والدین، اساتذہ اور بزرگوں کی دعاؤں کا ثمرہ ہے، انہوں نے اللہ کے لئے اپنے کو جھکایا، فروتنی کی، اللہ جل شانہ نے انہیں بلندیوں سے نوازا "من تواضع للہ رفعہ اللہ"۔

حضرت مولانا علی میاںؒ اصلاً داعی الی اللہ تھے:- مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جدوجہد اور کوشش تھی کہ پوری دنیا کے مسلمان پکے مسلمان بن جائیں، انکی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھل جائے، اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہو کر پھر اپنا کھویا ہوا منصب، قیادت وامارت واپس لے لیں، خدا بیزار اور خود فراموش مغربی قیادت سے دنیا کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اور ایمانی واخلاقی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہیں اسکا مداوا کر کے عالم انسانیت کو آب حیات فراہم کریں، حضرت مولانا کی یہ بھی خواہش اور تمنا تھی کہ امت مسلمہ از سر نو پوری منصوبہ بندی اور سرگرمی کے ساتھ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کو ادا کرے، اور دور حاضر کے انسانوں کو جو مختلف مذاہب اور فلسفوں کو آزما کر مختلف نظاموں اور ازموں سے مایوس ہو کر ہدایت اور قلبی سکون واطمینان کی تلاش میں سراسیمہ اور سرگرداں ہیں، علم وحکمت کے ساتھ اسلام کے چشمہ صافی کی طرف بلائیں۔ اور دنیا پر واضح کریں کہ

انسانوں کی دنیوی اور اخروی فلاح، انکے مشکلات و مسائل کا حل تنہا اسلام ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کیا کچھ نہیں تھے، آپ بلند پایہ مفکر، زبردست داعی الی اللہ، شہرہ آفاق مصنف، مورخ، مفسر، ادیب وانشاء پرداز، سحر بیان مقرر وخطیب اور ممتاز ترین مربی و عالم ربانی تھے، لیکن میری نظر میں انکی شخصیت کی شاہ کلید دعوت الی اللہ ہے، انکا دعوتی پہلو تمام دوسرے پہلوؤں پر حاوی اور غالب ہے، جب وہ سیرت نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تاریخ اسلام کی ان شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جنکی حیات اور کارناموں میں دعوت وعزیمت کا پہلو بہت نمایاں ہے، "السیرۃ النبویۃ" لکھتے ہیں تو حیات نبویؐ کے دعوتی پہلو کو سب سے زیادہ اجاگر کرتے ہیں، نصابی کتابیں مرتب کرنے میں انبیاء کرام کے ایمان افروز قصوں کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں، اور قصص النبیین جیسی البیلی کتاب وجود میں آتی ہے جس کی سطر سطر میں ادب کی چاشنی اور دعوت کی تڑپ ہے، مختارات میں ادب عالی کا انتخاب کرنے بیٹھتے ہیں تو عربی ادبیات سے ایسے شہ پارے تلاش کر کے لاتے ہیں جن میں دعوتی برق ورعد پنہاں ہیں "ماذا خسر العالم" میں امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان سناتے ہیں تو امت مسلمہ کو اسکا کھویا ہوا داعیانہ وقائدانہ مقام یاد دلاتے ہیں، ہندوستان کے مقامی حالات میں انکا داعیانہ ذہن "پیام انسانیت" کے نام سے ایک نیا عنوان تراشتا ہے اور پیام انسانیت کے غلاف میں اسلام کی دعوت برادران وطن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، غرضیکہ انکی تمام تحریروں اور تحریکوں میں دعوت کی روح رچی بسی ہوئی ہے، اس لئے میرے خیال میں حضرت مولانا علی میاںؒ سب سے اول اور سب سے آخر میں جلیل القدر عالم ربانی اور داعی اللہ تھے، انکے سارے کاموں اور کارناموں کو اگر ہم ایک لفظ میں کشید کرنا چاہیں تو وہ لفظ دعوت ہے۔

داعی کا لفظ اس دور میں بڑا ہلکا اور پامال سا ہو گیا ہے، حالانکہ یہ لفظ بڑا پر عظمت ہے، انبیاء کرام کی کوششوں کا سر عنوان "دعوت الی اللہ" ہے، صحابہ کرام کی دینی جدوجہد کا خلاصہ دعوت الی اللہ ہے، داعی انبیاء کرام کا وارث وامین ہوتا ہے، اسکے دل میں تمام انسانیت کے لئے خلوص ومحبت، فکر مندی ودل سوزی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، داعی الی اللہ بڑا حساس وزیرک ہوتا ہے، زمانہ کی حرکات ورفتار کا

نباض، حقیقت سے آگاہ اور حق شناس ہوتا ہے، خلوص و محبت کے ساتھ حکمت و دانائی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، اسکی لغت میں مایوسی اور پست ہمتی کے الفاظ نہیں ہوتے، وہ ناامیدوں میں امید کے چراغ جلاتا ہے۔

ایک بلند پایہ داعی عظیم مفکر بھی ہوتا ہے، اپنے دور کی فکری گتھیوں کو اسلامی بنیادوں پر سلجھاتا ہے، امت کی ذہنی و فکری رہنمائی کرتا ہے، اسی لئے علوم اسلامیہ سے وابستہ معرکۃ الآراء فکری مسائل میں بھی اسے اپنا موقف واضح کرنا ہوتا ہے۔

غیرت، دینی حمیت اور خودداری:- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مجسمۂ غیرت و خودداری تھے، بہت غیور اور خوددار طبیعت پائی تھی، غیرت ایک ایمانی صفت ہے جس سے مومنانہ کردار وجود میں آتا ہے، اور اسکے ذریعہ انسان بے شمار برائیوں اور گھٹیا باتوں سے مجتنب رہتا ہے، حضرت مولانا کی پوری زندگی خواہ وہ عسرت و فقر کی ابتدائی زندگی ہو یا کشائش و فراخی کا آخری دور ہو غیرت و خودداری کی کامل آئینہ دار تھی، حضرت مولاناؒ کی زندگی کے آخری ۱۵، ۲۰ سال میں انکی شہرت و عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، بڑے بڑے امراء، اصحاب ثروت انکے لئے بہت کچھ نچھاور کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت مولاناؒ نے ہمیشہ اپنے کو زر طلبی اور زر کشی سے محفوظ رکھا، اور ہر ہر قدم پر اپنے فقر غیور کی حفاظت کی، اپنی ذات اور خاندان کے لئے اشارۃً بھی مولانا کی طرف سے کوئی بات کہی جانی ناقابل تصور ہے، انہوں نے اپنی سرپرستی اور نگرانی میں چلنے والے تعلیمی و دینی اداروں کے لئے مالی مدد طلب کرنے میں بھی کافی احتیاط سے کام لیا، حضرت مولانا کی عام طرز زندگی کی عکاسی کسی حد تک اس شعر سے ہوتی ہے۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

بلاد عربیہ کے علماء، امراء اور تجار کے حلقوں میں حضرت مولاناؒ کو جس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، مسلم حکمرانوں میں شاہ فیصل شہید مرحوم اور ضیاء الحق

شہید مرحوم حضرت مولانا کے بہت معتقد و مداح تھے لیکن ان تمام لوگوں کے سامنے حضرت مولانا ایک بلند نگاہ اور دردمند داعی کی حیثیت سے تشریف لے گئے، انہیں خیر خواہانہ مشوروں اور قیمتی نصائح کی سوغات پیش کی، اس بات کو بھی گوارا نہیں کیا کہ اپنے تعلیمی و دعوتی اداروں کے بارے میں اشارۃً کوئی بات زبان پر لائیں، ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر بعض زبانوں پر بدگمانی کی بعض نامناسب باتیں آئیں اور حضرت مولانا تک اسکی اطلاع پہنچی تو انہوں نے وضاحت کے لئے اپنے کو مجبور پاکر بڑے درد و کرب اور غیرت کے ساتھ فرمایا:

"میں آپ سے صاف کہتا ہوں ہم اپنے عہد پر قائم رہیں گے، مملکت سعودی عربیہ جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے جس سے ہمارے سب سے زیادہ گہرے روابط ہیں، اسکے سابق سفیر شیخ انس یوسف یاسین مرحوم جب ہماری ایک عمارت کی سنگ بنیاد کی تقریب میں شریک ہوئے تو میں نے انکی موجودگی میں اس جلسے میں یہ شعر پڑھے تھے اور میرے ایک دوست نے جو انکے قریب بیٹھے ہوئے تھے اسکا عربی میں ترجمہ کر کے بتایا تھا۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

بلا استثناء کسی جمشید کے ہم ساغر نہیں، آج بھی ہمارا اس اصول پر ایمان ہے کہ ۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خدا ہم کو اس وقت سے پہلے دنیا سے اٹھالے جب ہم مخلوق کو اپنا رازق سمجھنے لگیں ۔

اپنے رزاق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارو جم

میں آپ کے سامنے صاف اعلان کرتا ہوں کہ میں کسی سے اصول و ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں، یہ سونے کی چڑیاں سب اڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، ہماری قسمت اس ملک سے وابستہ ہے اور اس ملک کی قسمت اگر میں کہوں (کوئی تعلی نہیں) کہ ہم سے وابستہ ہے، ہمیں اس ملک میں جینا اور مرنا ہے

اور ہمیں اس ملک کو پیغام زندگی بھی دینا ہے، ہمارا اس ملک کا چولی دامن کا ساتھ ہے"۔

دینی حمیت حضرت مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اور یہ اثر تھا خاندان شاہ علم اللہ اور خانوادۂ سید احمد شہید سے نسلی و نسبی رشتہ اور جذباتی تعلق کا، نیز یہ اثر تھا ان اہل اللہ اور بزرگان دین کی تربیت اور فیضان نظر کا جنکی صحبت میں حضرت مولانا نے بہت کچھ سیکھا تھا، دینی حمیت کے سلسلہ میں حضرت مولانا کے پیش نظر ہمیشہ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ تاریخی جملہ رہا کرتا تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا "اینقص الدین وأنا حیی" (کیا میرے جیتے جی دین میں کمی کردی جائے گی) حضرت ابو بکرؓ نے یہ تاریخی جملہ اس وقت فرمایا تھا جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد پھیلنے اور مسلمانوں کی عسکری حالت کمزور پڑنے کی وجہ سے بڑے بڑے صحابہ کا رجحان یہ ہو گیا تھا کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف فی الحال قتال نہ کیا جائے اور انکی سرکوبی کو کچھ دن کے لئے موخر رکھا جائے، حضرت مولانا علی میاں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے مذکورہ بالا تاریخی جملہ کو اپنی بے شمار تحریروں اور تقریروں میں استعمال کیا ہے، اور اپنے رسالہ "ردۃ ولا أبابکر لہا" میں اس تاریخی جملہ کے حوالہ سے دور حاضر کے ذہنی و فکری ارتداد کے بارے میں بڑی فکر انگیز پر درد باتیں فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ بڑے نرم طبیعت، صلح جو انسان تھے، اسلام کی دعوت واشاعت کے لئے لینت و حکمت کی روش پر قائم رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، بیجا تشدد و انتہا پسندی کو ناپسند فرماتے تھے، لیکن جہاں مسئلہ دین کی حفاظت وصیانت اور دین میں کتر بیونت کا ہوتا مولانا کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت جاگ اٹھتی اور وہ اپنے عام اسلوب کے برخلاف بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ سخت

لہجہ میں اپنی آواز بلند کرتے اور دین کے عقائد واحکام، شریعت کی تعلیمات کے خلاف ہر سازش و کوشش کو ناکام بنانے کے لئے اپنی تمام توانائی صرف کر دینا چاہتے، ایسے مواقع پر حضرت مولانا کی بیتابی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی تھی، عرب قومیت کے خلاف حضرت مولانا کی فکری و قلمی جنگ، وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے خلاف مولانا کے گرم بیانات، ائمہ مساجد کی سرکاری تنخواہ کے سلسلہ میں مولانا کی دوٹوک رائے انکی دینی حمیت وایمانی غیرت کے چند نمونے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جب حضرت مولانا علی میاںؒ پر فالج کا اٹیک ہوا اور انکی حالت بہت نازک ہوگئی تو لکھنو اور دہلی کے بڑے ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہوئی کہ حضرت مولاناؒ کو فوری طور پر دہلی کے کسی بڑے ہاسپٹل میں داخل کیا جائے، ڈاکٹروں نے اس سلسلہ میں حضرت مولانا کے عزیزوں اور تیمارداروں پر بڑا زور ڈالا اور اصرار کیا تھ مولانا کو ایڈمٹ کرنے کی بات کہی، اس مرحلہ میں حضرت مولانا محمد رابع صاحب وغیرہ کے لئے بھی اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے سے اتفاق رائے کرتے ہوئے حضرت مولانا کو فوری طور پر دہلی منتقل کرنے کی کوشش کریں، دشواری یہ تھی کہ شام کا ٹائم ہوچکا تھا اور دہلی کی سب فلائٹیں جا چکیں تھیں، اتفاق کی بات اسی وقت ضلع لکھنو کے D.M حضرت مولانا کی شدید علالت کی خبر پاکر مزاج پرسی کے لئے ندوہ آئے، انکے علم میں حضرت مولانا کی شدید علالت اور مولانا کو فوری طور پر دہلی منتقل کرنے کے بارے میں ڈاکٹروں کے اصرار کی بات آئی تو انہوں نے خود پیشکش کی کہ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں یوپی گورنمنٹ کا جہاز فوری طور پر اس کام کے لئے حاصل کروں، اس نازک صورت حال میں اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا کہ D.M کی پیشکش قبول کرلی جائے، D.M صاحب نے تھوڑی دیر میں فون کے ذریعہ صوبائی اور مرکزی اتھارٹیز سے گفتگو کر کے منظوری حاصل کرلی اور کہا کہ ایک گھنٹہ کے اندر یوپی گورنمنٹ کا جہاز حضرت مولانا کو لیکر دہلی کے لئے پرواز کر سکتا ہے، D.M صاحب کو شوق ہوا کہ حضرت مولانا کو سلام کرلیں چنانچہ انہوں نے پہنچ کر سلام کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے بذریعہ ہوائی جہاز آپکو دہلی بھجوانے کا انتظام کر دیا ہے، یہ سننا تھا کہ

حضرت مولانا برہمی کے ساتھ چیخ پڑے کہ "کون لے جارہا ہے؟، میں تو دلی نہیں جاؤں گا" حضرت مولانا کے غصہ کی کیفیت دیکھ کر سب تیمار دار، اہل تعلق اور ڈاکٹرس گھبرا گئے، ان لوگوں نے تسلی دی اور یقین دلایا کہ آپکو دہلی نہیں لے جائیں گے تو حضرت مولانا کو کچھ سکون ہوا، حضرت مولانا کے اس قطعی اور بے لچک فیصلہ کے بعد ڈاکٹروں نے ہتھیار ڈال دئے کہ اب جو کچھ بھی علاج و معالجہ ممکن ہو یہیں پر کیا جائے، بعد میں معلوم ہوا کہ یوپی حکومت اور مرکزی حکومت میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ سرکاری سطح پر حضرت مولانا کا علاج کیا جائے گا، مولانا کا جہاز دہلی پہنچنے پر وزیر اعظم اور دوسرے بعض وزراء ایر پورٹ پر استقبال کے لئے موجود ہونگے، حضرت مولانا کی ایمانی غیرت وفراست نے مرتے مرتے بھی اس حکومت کا احسان اپنے کندھے پر لینا گوارا نہ کیا جو حکومت دار العلوم ندوۃ العلماء اور دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی میں چھاپے ڈلوا چکی تھی اور جس نے ابھی جلد ہی اسکولوں میں وندے ماترم جیسے مشرکانہ گیت کو لازم قرار دیا تھا، سرسوتی پوجا کا اسکولوں میں Order دیا تھا، اور اسکے خلاف حضرت مولانا کے مومنانہ بیان پر اس حکومت کے وزراء چراغ پا ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت مولاناؒ کے خلاف بہت نازیبا بیانات دیئے تھے۔

یہ مدارس فی الاصل شفا خانے ہیں

ندوہ پر پولیس کے چھاپے کے بعد ندوہ کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا تھا:

"یہ مدارس فی الاصل شفا خانے ہیں جہاں بیمار انسانیت کی شفا کا اہتمام ہوتا ہے، اگر یہ مدارس نہ رہے تو اس ملک کا زبردست نقصان ہوگا۔

وہ لوگ جو دینی مدرسوں کو بیکار سمجھتے ہیں یا ان کے وجود سے خوف زدہ ہیں اگر انکو معلوم ہو جائے کہ مدرسے ملک وقوم اور انسانیت کیلئے مایۂ افتخار ہیں تو یہ مخالفت سے باز آجائیں۔

ہمارا فرض ہے کہ مدارس کی افادیت وضرورت سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

(حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رح)

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

فکر و نظر کے چند امتیازات

ڈاکٹر شمس تبریز خاں

(استاذ شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عظیم شخصیت جامع الجہات جامع کمالات اور مجمع فضائل و حسنات تھی وہ اسلاف کرام کی طرح اسلامی جامعیت و کاملیت کا ایک نادر نمونہ تھے جنکو دیکھ کر ماضی کے ممتاز و نامور علماء و مشائخ اور مفکرین و مصنفین کے فضل و کمال کی تصدیق آسان ہو جاتی تھی اور اسلام کی آدم گری و مردم سازی پر یقین بڑھ جاتا تھا۔ اور جنکی خدمات جلیلہ اور اوصاف جمیلہ کو یاد کر کے حال و مستقبل کے اہل نظر بصد حسرت و حیرت یہ کہیں گے کہ ؎

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

حضرت مولانا علی میاںؒ ایک روشن دماغ عالم ربانی، ایک روشن ضمیر صوفی و شیخ طریقت، ایک فاضل و دیدہ ور و محقق و مؤرخ ایک بلند پایہ سیرت نگار، ایک کامیاب استاذ و معلم، ایک صاحب نظر مفسر قرآن، ایک مقبول و محبوب رہنما، اردو اور عربی کے ایک صاحب طرز مصنف و ادیب تھے لیکن ان کی اصل حیثیت و شخصیت ایک داعی الی اللہ اور دین کے داعی و مبلغ، اور اسلام کے وکیل و ترجمان کی تھی اور انکی یہ بنیادی خصوصیت ان کے تمام اوصاف و کمالات میں روح کی طرح جاری و ساری تھی اور ان کا وصف امتیازی بن گئی تھی۔

بیسویں صدی کے نصف اخیر میں اللہ نے ان سے اپنے دین کی طاقتور، مؤثر اور ہمہ گیر ترجمانی

کا کام لیا اور انہوں نے فراست ایمانی سے کام لیتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں اور انسانی دل و دماغ کے مطالبوں اور ذہنی و فکری سطح کو سامنے رکھ کر عصری اسلوب میں اسلام کی مؤثر و طاقتور، دل پذیر و دلنشیں تفہیم و ترجمانی کی اور ایسا وقیع علمی و دینی لٹریچر فراہم کر دیا جو اسلامیات میں قیمتی اضافے کے ساتھ عصری ادبیات کا بھی ایک گرانمایہ حصہ ہے۔

دین کا صحیح فہم و ادراک:- انکا ایک بڑا اور امتیازی وصف دین کی صحیح فکر اور حقائق دینیہ کا فہم و ادراک تھا جو کتاب و سنت میں غور و فکر اور تدبر و مطالعہ تاریخ اسلام پر نظر اور علماء مشائخ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ اس معتدل و متوازن دینی فکر کا نتیجہ تھا کہ وہ دینی امور میں انتہا پسندی و غلو سے دور رہے اور اپنے فکر و عمل کو اسلاف کے سانچے میں ڈھالتے رہے اور دین کے اصول و مبادی کی روشنی میں زندگی اور زمانہ کے نئے، مشکل، اور نازک مسائل کا حل پیش کرتے رہے ان کے تصور دین میں مادیت و روحانیت، اخلاق و عبادت، سیاست و قیادت، ظاہر و باطن، اور دین و دنیا بڑے تناسب سے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں، وہ مبالغہ آمیز تقریروں اور تحریروں کو دیکھ کر اکثر یہ تنبیہ کرتے تھے کہ اشیاء کی طرح الفاظ کا بھی درجۂ حرارت ہوتا ہے اس لیے ان کے استعمال میں بڑی ہوشمندی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے اور الفاظ کا بیجا استعمال افکار و خیالات کے عدم وضاحت اور عدم توازن کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وہ اسلام کی اصالت و خود کفالتی و خود اکتفائی اور اسکی تمام نظاموں پر برتری پر زور دیتے تھے اور ہر طرح کی تقلید و اتباع اور تشبہ سے نفور تھے اس موضوع پر انکا ایک مستقل رسالہ "اسلام ایک مکمل نظام حیات و مستقل تہذیب سے اسکی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ مغربی الحاد و بے دینی اور مادی تہذیب کے اقبالؒ اکبر، مولانا مدنیؒ اور مولانا الیاسؒ کی طرح بڑے ناقد رہے انکے صحیح و سالم دینی فکر کا نتیجہ تھا کہ اپنے زمانہ کی منحرف تحریکوں کے زیغ و ضلال پر گرفت و نکیر کی قادیانیت، مشرقیت، پرویزیت و انکار حدیث، دین کی سیاسی تعبیر، اور عرب قومیت، کمال کے تجدد اور خمینی کے "اسلامی" انقلاب، اور مبالغہ آمیز و متشدد "اسلامی بیداری" سے بیزار اور دین کے جادۂ اعتدال و صراط مستقیم پر قائم رہے وہ قوم کے عاجلانہ ظاہر پسندانہ مزاج اور جذباتیت پر نکیر کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ مزاج بنتا

جارہا ہیکہ جو پر جوش انداز میں بات کرے اور مخالف کو چیلنج کرے قوم اس کو ہیرو بنا لیتی ہے مسلم ممالک میں اسلامی قیادت کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کے اصلاح پر زور دینے کے بجائے علم بغاوت بلند کر دینا ہے جس سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور دونوں فریق کمزور ہو جاتے ہیں اور اسلام دشمنوں کو مداخلت کا موقع مل جاتا ہے۔

دینی غیرت اور اسلامی حمیت:- دین و مذہب کے لئے کسی انسان میں غیرت و حمیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کے اس کے دل میں اللہ اور رسول ﷺ اور ان کے احکام کی قدر و قیمت جان و دل سے زیادہ ہو اور ان سے قلبی لگاؤ اور جذباتی تعلق ہو، اور یہ چیز تو عام مسلمان سے بھی مطلوب ہے ،اہل اللہ اور خاصان خدا کی تو بات ہی الگ ہے جن کے زبان حال یہ پکارتی ہے کہ ؎

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ہمارے حضرت مولانا علی میاںؒ کو اللہ تعالیٰ دیگر فضل و کمال کے ساتھ سب سے بڑا غیرتِ دینی و حمیت اسلامی کی شکل میں عطا کیا تھا جس سے ان کی شخصیت خود بھی تاباں، درخشاں، جاوداں بنی اور ان کی صحبت اٹھانے والوں کو بھی اس کی گرمی و تابانی ملتی رہی۔ یہ دینی غیرت و حمیت اکتسابی سے زیادہ موروثی اور وہبی تھی، اور دراصل عزت سادات میں غیرت سادات کو بھی بڑا دخل رہا ہے، پھر حضرت سید احمد شہیدؒ کی غیرت بھری تاریخ جہاد اور سلسلۂ ولی اللّٰہی کی دینی حمیت بھی ان کے شعور و وجدان کی تربیت کرتی اور اسے مہمیز کرتی رہی۔

"سیرت سید احمد شہیدؒ" "اور تاریخ دعوت و عزیمت" اور ان جیسی تحریروں میں کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی حمایت دین میں اٹھی ہوئی تلواروں نے مولانا علی میاںؒ کے زریں رقم قلم کی شکل اپنالی ہے اور اس کی روشنائی میں ان غیور شہداء اور ان کے رفقاء کے پر جوش لہو کی گرمی اور روانی آگئی ہے اور شاعر کا قول سچ ثابت ہو رہا ہے کہ ؎

خون شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا
فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند!

اس دینی غیرت، خدمت دین کے جذبۂ بے پناہ اور اصلاح حال کے لئے بے چین طبیعت کے

تقاضے سے انہوں نے تلاش حق کے دور دراز کے سفر کئے۔احیائے دین وملت کے امکانات کا جائزہ لیا اور مختلف و متنوع افکار و نظریات رکھنے والے علماء و مشائخ اور دینی جماعتوں سے رابطہ قائم کیا عوام و خواص کی غیرت دینی کو للکارا اور مغربیت و مادیت کی تقلید کے بجائے مسلمانوں کو دعوت و عزیمت کے راستے پر چلنے کی تلقین کی انہیں دنیا پرستی کی گلیوں سے نکل کر آخرت کی وسعتوں اور رفعتوں کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی اور انہیں ان کا منصب و مقام اور مقصد و پیغام یاد دلا کر خیر امت بننے کے لئے ابھارا اور اس عظیم منصب کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب ممالک میں قومیت اور دوسرے اسلامی ملکوں میں مغربیت کا رجحان سامنے آیا تو حضرت مولاناؒ کی دینی غیرت کو ٹھیس لگی اور انہوں نے اسلامی اخوت کی وسعت کو چھوڑ کر عرب قومیت کی تنگ نظری اپنانے پر زوردار تنقید کی اور کرنل ناصر دوسرے عرب رہنماؤں کی کھل کر تردید کی جس کے اچھے نتائج بر آمد ہوئے، اسی کیساتھ مسلم ممالک میں "اسلامیت مغربیت" لکھ کر عالم اسلام کو مغربی سازشوں سے آگاہ کیا بیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلمانان عالم جب دوسرے بڑے ملی حادثے (قیام اسرائیل ۱۹۴۸ء) اور بیت المقدس سے محرومی سے دوچار ہوئے تو مولانا نے بڑی بلند آہنگی سے مسئلہ فلسطین کو دنیا کے سامنے رکھا اور مسلمانوں اور عربوں کے اتحاد اور جذبۂ جہاد کو اس کا حل بتایا ہندستان میں جب سرکاری اسکولوں کے نصاب سے مسلمان بچوں کے عقائد کے لئے خطرات پیدا ہوئے تو مولانا کی غیرت دینی بیدار ہوئی اور مسلم بچوں کے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے اپنے مخلص رفقاء (قاضی محمد عدیل عباسی وغیرہ) کے ساتھ مل کر دینی تعلیمی تحریک چلائی جو بحمد للہ اب تک سرگرم کار ہے یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے جب مسلم پرسنل لا کے لئے خطرات لاحق ہوئے تو مولانا دوسرے علماء کے ساتھ شریعت اسلامیہ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا جو علماء اور مسلم دانشوروں کے بڑے مؤثر و مؤقر اور متفقہ ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے (۱) اس سلسلے میں شاہ بانو کیس کے موقع پر بورڈ نے حکومت سے یہ تسلیم کرالیا کہ شریعت کی ترجمانی علماء کا حق ہے نہ کہ سپریم کورٹ کا۔ بابری مسجد کی شہادت کے غم میں وہ پوری

ملت کے ساتھ شریک تھے اس کی چوٹ شدت کے ساتھ محسوس کی تھی، اور کچھ دنوں بعد بارہ دری قیصر باغ میں ہونے والے احتجاجی جلسے کے سامنے اپنا درد دل رکھا اور فرقہ پرور تنظیموں کی اس دہشت گردی کی کھلی مذمت کی، انہیں دنوں جب ہندستان گیر احتجاج کے تحت لوگ ان کے پاس کالی پٹی باندھنے آئے تو ان سے فرمایا کہ "میرے تو دل پر پٹی بندھی ہوئی ہے" پھر بابری مسجد کی بازیابی اور تعمیر نو کی تحریکوں کو ان کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔

آخری علالت کے دوران جب حکومت یوپی نے سرکاری اسکولوں میں "بندے ماترم" کا مشرکانہ گیت رائج کرنا چاہا تو مولاناؒ کی غیرت دینی کو جوش آیا اور انہوں نے نعرۂ توحید بلند کرتے ہوئے یہ جرأت مندانہ بیان دیا کہ "اگر مسلمان بچوں کو اس سے مستثنیٰ نہ رکھا گیا تو وہ سرکاری اسکولوں کا بائیکاٹ کریں گے" ان کی صدائے حق حکومت کے ایوانوں سے ٹکرائی اور اسے اس حق کو ماننا پڑا۔

فتنہ ارتداد کے موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ کی زبان سے نکلے ہوئے تاریخی کلمات "أینقص الدین و أنا حی" (کیا میرے جیتے جی دین کو نقصان پہنچایا جائے گا؟) کو انہوں نے اپنے دل میں اتار لیا تھا اور موقع موقع سے اسے دہراتے تھے اور اس سے اپنی اور دوسروں کی غیرت کو مہمیز کرتے تھے۔ اسی وجہ سے دین و مذہب کے سلسلے میں ان کے یہاں ذاتی مسئولیت و ماموریت کا انداز ملتا ہے، عرب و عجم میں جہاں دین پر آنچ آئی یا صحیح فکر کو خطرہ لاحق ہوا تو ہر ممکن طریقے سے اس کا احتساب کیا اور اپنے کو ذمہ دار اور جواب دہ محسوس کیا۔

فکر و نظر کی وسعت و آفاقیت:- حضرت مولاناؒ کی جامع وہشت پہلو شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی وسعت فکر و نظر، بلند نگاہی و آفاقیت، جہاں بینی اور مطالعہ و مشاہدہ کی گیرائی و گہرائی، تاریخی بصیرت اور تاریخ اسلام کے ساتھ تاریخ عالم سے عبرت پذیری و سبق آموزی، اور نئے زمانہ کے حالات و انقلابات، سیاسی و فکری تحریکات و تنازعات، مشرق و مغرب کے اختلافات، اور مغربی الحاد و مادیت، استعمار و استبداد سے واقفیت اور باخبری بھی ہے جو انہیں عصر حاضر کے علماء و مفکرین میں امتیاز خاص عطا کرتی ہے، اپنی فطری دینی بصیرت و ایمانی فراست کے ساتھ مغربی تہذیب کی کمزوریوں اور

اسکے غیر فطری و غیر انسانی پہلوؤں کے سمجھنے میں انہوں نے اکبرؒ واقبالؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بھی استفادہ کیا، پھر اس سلسلے میں ان کی جہاں بینی و جہاں نوردی، بین الاقوامی اسفار اور ذاتی مطالعہ و مشاہدہ بھی ان کے کام آیا، انہوں نے مغربی استعمار کی دودھاری تلوار کی دوہری ضرب کو پوری شدت سے محسوس کیا کہ صلیبی جنگوں کی نفسیات اور انتقامی و جارحانہ ذہنیت کے ساتھ اس نے کس طرح عالم اسلام کو اقتدار سے محروم کر کے اپنا غلام بنایا اور پھر اس کے مفکرین و مستشرقین نے امت مسلمہ کو جسمانی غلامی کے ساتھ ذہنی و فکری، تہذیبی و ثقافتی غلامی میں بھی مبتلا کر دیا اس تلخ حقیقت کو انہوں نے بڑی فراست و بصیرت اور حکمت و لیاقت کے ساتھ اپنی مشہور عالم کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" میں بیان کیا ہے جس میں انہوں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں کس طرح انسانی و روحانی اقدار کو فروغ ہوا اور پھر مغرب کے ہاتھوں ان کے انحطاط وزوال کے بعد انسانی دنیا کو کیسا ناقابل تلافی نقصان و خسارہ اٹھانا پڑا، مولاناؒ کی یہ کتاب ایک منفرد اور اچھوتے موضوع پر ہے اور اسلامی لٹریچر میں اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی، ان کی کتاب مسلمانوں کے لئے تو بصیرت افزا و چشم کشا ہے ہی، غیر مسلموں خصوصاً اہل مغرب کے غیر جانبدار و غیر متعصب لوگوں کو بھی کھلے دل و دماغ سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس طرح ان کی دوسری اہم کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" بھی مسلم ممالک میں مغرب کے اثر سے برپا ہونے والے ذہنی و فکری اختلافات و تنازعات، سیاسی و ثقافتی کشمکش اور دینی ولادینی رجحانات کے تصادم کی نہ صرف تصویر کشی اور پردہ کشائی کرتی ہے بلکہ مثبت طور پر اس کشمکش کے اسباب و عوامل کا جائزہ لیکر صحیح فکری و دینی رہنمائی بھی کرتی ہے، مولانا کے فکری توازن واعتدال کا یہ بڑا کمال ہے کہ مغرب پر تنقید میں بھی وہ جادۂ اعتدال پر قائم رہے اور اس کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا اور مسلمانوں کو مغرب کے علم و سائنس، صنعت و حرفت، نظم و ضبط، پابندیٔ وقت، صفائی ستھرائی، کاروباری، امانت ودیانت، اور معیار زندگی کو بہتر بنانے کی کاوشوں کی قدر کرنے کی طرف متوجہ کیا اور

خذ ما صفا و دع ما کدر کے تحت اخذ و ترک کا اصول اپنانے کی دعوت دی۔

یہ مولاناؒ کی فکر و نظر کی بلندی و ہمہ گیری تھی کہ انہوں نے مغربی تہذیب جیسے بڑے اور نازک موضوع کو اپنا ہدف بنایا اور عالم اسلام کے ساتھ عالم انسانی کے لئے اس کے خطرات اور برے اثرات و نتائج سے آگاہ کیا اس کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھی اور اس کے انسان دشمن پہلوؤں کی نشاندہی کی اور اس کے مقابلے میں معذرت خواہانہ انداز کے بجائے جرأتمندانہ اور مؤمنانہ انداز سے کلمۂ حق بلند کیا، اور اس کے متبادل کے طور پر مثبت انداز میں اسلام کی انسان نواز تعلیمات، اس کے فطری نظام حیات، اس کے اخلاقی و تعمیری، پر امن اور صالح و صحت مند اقدار و افکار کی پیش کش کی اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات و مستقل تہذیب کے طور پر پیش کیا۔

حکمت و موعظت کے ساتھ دعوت:- حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر حکمت و موعظت اور موقع و مخاطب کی رعایت کے ساتھ دعوت اسلام دینے کی نادر صلاحیت عطا کی تھی، تحریر و تقریر میں ایسی نرمی و حلاوت، اور ایسی کشش اور تاثیر تھی جو مخاطب اور قاری کے دل و دماغ کو مسخر اور مسحور کر دیتی تھی اور مخاطب کو ان کی بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی اور وہ آسانی سے ہم خیال ہو جاتا تھا، مولاناؒ نے بہت سے علمی و دینی، سیاسی و ثقافتی موضوعات پر لکھا ہے، لیکن ان کا اصل موضوع کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کی دعوت و تبلیغ ہے جو روح بن کر ان کی تمام تقریروں اور تحریروں میں سمائی ہوئی ہے۔

ان کے معاصر علماء نے بہت سے علمی و دینی موضوعات پر لکھا ہے جن کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے، لیکن یہ مولاناؒ کے ذہن کی جامعیت اور قلب کی وسعت ہے کہ انہوں نے ان موضوعات میں دعوتی روح اور تبلیغی رنگ پیدا کر دیا ہے اور ان میں علمی بحث و نظر اور تحقیق و تدقیق کے جمود کے بجائے زندگی کی حرکت و حرارت پیدا کر کے انہیں زندگی اور زمانے کے مسائل کا حل، عصری تقاضوں کی تکمیل اور انسانی ضروریات کی تعمیل کی شکل دیدی ہے۔

ان کی قلبی کیفیات، باطنی جذبات و احساسات، ایمان و یقین کی صلابت و حرارت دل کی سوز و

گداز، ذہن کی رفعت پرواز، حال سے بے اطمینانی اور دین وملت کے مستقبل کی تابانی کی آرزو، آتش رفتہ سراغ یابی، اور کھوئے ہوؤں کی جستجو، مغربی تہذیب سے تنفر و تکدر اور صالح و صحت مند اسلامی انقلاب کی تڑپ، اظہار و غلبۂ دین کی تمنا، اور ایک عادلانہ، پرامن صالح، انسان دوست اور ذمہ دار و خدا ترس اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جذبۂ فراواں وہ عناصر و عوامل ہیں جو مولاناؒ کی تقریروں اور تحریروں میں کبھی شعلے کی طرح بھڑکتے ہیں، کبھی شبنم کی طرح چمکتے دمکتے ہیں کبھی ستاروں کی مانند جگمگاتے ہیں، اور کبھی پھولوں کی شکل میں لہکتے اور مہکتے ہیں۔

کتاب وسنت سے اشتغال، تاریخ اسلام اور تاریخ عالم سے عبرت پذیری، عصری افکار و خیالات سے واقفیت، زمانہ کے تقاضوں اور رجحانات سے باخبری، صدق واخلاص اور جذبۂ اصلاح وخیر خواہی نے ان کے دعوتی اسلوب کو گزشتہ پچاس برسوں کا بہترین اور موزوں ترین طرز اسلوب بنادیا ہے، جو عرصۂ دراز تک دین کی داعیوں اور اسلام کے خادموں کے لئے مشعل راہ چراغ منزل، قندیل ایمانی اور روشنی کا مینار بنا رہے گا۔

دین و رسالت کی ابدیت و صلاحیت کا یقین:- مغرب و مشرق کے ملحدین کے اس پروپگنڈے سے بہت سے خام ذہن کے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ دین ومذہب پرانے زمانے کی باتیں ہیں اور جدید سائنس و ٹکنالوجی نے مذہبی واخلاقی اقدار سے بے نیاز کردیا ہے، ملحدین ہر زمانے میں اس خیال خام میں مبتلا رہے ہیں اور دنیا کی چمک دمک نے انہیں غیبی حقائق کے مشاہدے کا قابل نہیں چھوڑا ہے..... بیسویں صدی میں مغرب کے اثر سے عقل پر حد سے زیادہ بھروسہ کیا جارہا تھا اور غیبی و معنوی، روحانی واخلاقی حقائق واقدار کو بھی عقل کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی سعی ناکام کی جارہی تھی جبکہ انسان کی ناقص عقل کے دائرہ سے وہ باہر کی چیزیں تھی مگر خلاف عقل نہیں تھیں چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ إن صريح المعقول لايخالف صحيح المنقول (خالص عقلی چیز صحیح منقول روایت کے خلاف نہیں ہوتی ہے)۔ اسی طرح کچھ حلقوں میں یہ غلط فہمی تھی کہ دین کے کچھ اصول ومبادی اور حقائق ودقائق قرون اولی میں نہیں سمجھے جاسکے جن کو

اب بہتر طور سے سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے، یہ خیال دین کے فہم اور اس کی روایت کی طرف سے بد اعتمادی پیدا کرسکتا ہے اور انہیں مشکوک بنا سکتا ہے اور دین کے اصول و مبادی پر ہر ایرے غیرے کو رائے زنی پر آمادہ کرسکتا ہے۔

اس طرح کے عقلی و فکری ماحول و پس منظر میں حضرت مولاناؒ نے مثبت طور پر اپنا تصنیفی کام شروع کیا اور اپنے زمانے کے تقاضوں، ذہنی و فکری بے چینی اور عقلیت پر حد سے زیادہ اعتماد، مادیت اور دنیا طلبی کے بڑھتے ہوئے شوق اور انبیاء و اولیاء کے طرز فکر و عمل سے دوری اور رسالت محمدیہ کے فیوض اور برکات سے محرومی کو دیکھتے ہوئے، منصب نبوت کی عظمت و اہمیت اجاگر کی اور نبوت کو انسان کے لئے سایہ رحمت ثابت کیا اور دنیا کو حضور خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین ﷺ کی سیرت طیبہ ان کے لائے ہوئے دین رحمت اور اسلام کے عالمی اور ابدی سرچشمۂ ہدایت و سفینہ نجات سے استفادہ کی دعوت دی اور یہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات عالم انسانیت کی مثالی شخصیت اور ان کی سیرت و سنت زندگی کا بہترین لائحہ عمل اور فلاح دین و دنیا کی ضمانت ہے اور اسلام اپنے تجدیدی اور اجتہادی طریقہ کار کی وجہ سے ایک ابدی اور دائمی، عالمی و بین الاقوامی دین ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی شاندار تاریخ اس کی گواہ ہے، اس کے ساتھ ہی ہر عہد میں اسلام کے ایسے اصحاب دعوت و عزیمت آتے رہے ہیں جنھوں نے اس کے مضمر احکامات کو اور روشن کردیا ہے اور دین کی احیاء و تجدید کا کارنامہ تسلسل کے ساتھ انجام دیا ہے۔

مولاناؒ نے اپنی دعوت کی بنیاد عقل کی بجائے عشق پر رکھی جو ہر زمانے میں عقلی سیلاب کے مقابلہ میں ایک سیلاب ثابت ہوا بقول علامہ اقبالؒ۔

عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

مولانا نے محبت الٰہی کے ساتھ عشق رسول پر عاشقانہ انداز میں زور دیا جسکا خاطر خواہ اثر ہوا، مولاناؒ کی تحریروں اور تقریروں میں موجود عشق نبوی کا مشک و عنبر قلب و روح کو معطر کردیتا ہے اس سلسلے میں ان کی کتابیں "کاروان مدینہ" "نبی رحمت" "محسن عالم" و سیرت نبوی دعاؤں کے آئینے میں،

خاص طور سے دیکھی جاسکتی ہے۔ اقبال کی طرح مولانا نے بھی عشق نبوی کی تاثیر و قوت تسخیر سے افادہ واستفادہ کی سعی مشکور کی۔

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

دین وملت کے لئے خلوص و خیر اندیشی:- حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی دین وملت کے لئے خلوص و خیر خواہی اور خدمات جلیلہ کے لئے وقف رہی اپنی گرانقدر علمی و دینی خدمات کے معاوضے، ستائش کے تمنا اور صلے کی پرواسے پوری طرح بے نیاز رہے اور دین وملت کی خدمت کار ثواب اور عبادت سمجھ کر کرتے رہے حتی کہ اخیر عمر میں جو بڑے بڑے انعامات ملے انہیں بھی دین و ملت ہی پر نچھاور کر دیا اور قرون اولیٰ کی بے غرضی وخودداری اور سیر چشمی واستغناء کی روایت تازہ کر دی صبح سے دوپہر تک پابندی کے ساتھ ان کا تصنیفی انہماک دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص وصدق دلی اور حسن نیت کے سبب انہیں قوت اور ان کے وقت میں برکت عطا کی تھی کہ انہوں نے اہم علمی ودینی موضوعات پر اردوے معلیٰ اور عربی مبین میں اتنا اور ایسا وقیع لٹریچر تیار کر دیا، شوق تصنیف، اظہار علمیت اور جذبہ تفوق سے دور رہتے ہوئے انہوں نے اپنے کو دین وملت کیلئے مفید اور ضروری موضوعات تک محدود رکھا اور اپنے کو زمانے کے رنگ میں رنگنے کے بجائے زمانہ کے مادی اور غیر مذہبی رجحانات کو بدلنے کی کوشش کی، مغرب سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی آنکھوں سے آنکھ ملا کر جرأت وصراحت سے اسلام کی وکالت وترجمانی کی اور مستشرقین کی افتراء پردازیوں کا پردہ چاک کیا، مغرب کی غیر انسانی تہذیب کے خطرات سے دنیا کو آگاہ کیا اور اسکی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور اس کی استعماری واستبدادی فطرت سے پردہ اٹھایا اور عالم اسلام کو خودداری وخوداعتمادی، آزادی و خودمختاری کا سبق دیا اور یہودی، صلیبی سازشوں سے خبردار کیا عربوں کو قومیت عربیہ کی تنگنائے سے نکل کر قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کی طرح عصر حاضر میں عالمی سطح پر تعمیری وثقافتی انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی عمومی طور پر مسلمانوں کو خیر امت، بن کر دنیا کی فکری وسیاسی رہنمائی کے لئے غیرت

دلائی اور دنیا تک اسلام کی خیر و برکت پہونچانے پر ابھارا، ہندوستان کے بدلتے سیاسی و ثقافتی حالات میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو دین پر ثابت قدمی، صبر و ضبط، اصلاح معاشرہ کے ذریعہ صالح و صحت مند اسلامی معاشرہ کے قیام، غیر مسلموں میں دعوت اور ان سے شریفانہ سلوک، اور حقوق طلبی کے بجائے احساس ذمہ داری، اور اپنے کو ایک مفید و مثالی امت بن کر رہنے کی تلقین کی اور سیاسی اور مادی حقوق سے زیادہ انہیں اپنے دین و ایمان کے لئے فکر مندی، اسلامی تہذیب و ملی تشخص کے لئے حساسیت، مسلم پرسنل لا کی حفاظت، اور ایک صالح صاحب صلاحیت اور زندہ قوم بن کر رہنے کی وصیت کی۔ حضرت مولاناؒ کے فضائل و کمالات اور خصائص و امتیازات کا ان چند صفحات میں احاطہ تو در کنار انکی طرف اشارہ بھی مشکل ہے اور اس کے لئے مستقل سوانح حیات کی ضرورت ہے اقبال نے مرد مؤمن کا جو تصور پیش کیا اور اس کی تصویر کشی کی اس کا بڑی حد تک اطلاق حضرت مولانا علی میاںؒ پر بھی ہو سکتا ہے اس لئے اس خراج عقیدت کا اختتام اقبال ہی کے ان ایمان افزا اور بصیرت افروز اشعار پر کرنا موزوں و مناسب ہے ؎

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب ، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز الخ

---

(۱) یہاں تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ بورڈ کے قیام سے کچھ پہلے ہی سے حضرت مولاناؒ مسلم پرسنل لا کے تعارف اور اس کے تحفظ کے لئے فکر مند تھے انہیں دنوں رفیق کے حیثیت سے میرا تقرر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء میں ہوا اور مولاناؒ کے ایماء پر میں نے ۱۹۶۹ء میں "مسلم پرسنل لا" پر کتاب تیار کی جو بہت مقبول ہوئی۔
فالحمدلله علی ذالك

☆☆☆

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ

کے دعوتی اصول

تحریر: علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ: محمد سلمان خاں ندوی

حضرت مولانا علی میاںؒ کی دعوت وفکر کے بیس انمول جواہر پارے ہیں جو آپ کی دعوت کے لئے رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۱) **مادیت کے مقابلہ میں ایمان کی ترسیخ:-** حضرتؒ کے ان رہنما اصولوں میں بنیادی اصول خدا پر ایمان کی پختگی اور رسوخ فی العقیدہ ہے۔ "اللہ واحد کا یقین، اسکی ربوبیت کا اقرار یوم آخرت پر ایمان جو جزاء وسزا کا دن ہے۔ اسکے مقابلے میں مادیت دنیوی زندگی ہی کو اصل سمجھتی ہے اس میں فنا اور زوال کے بعد کوئی دوسری زندگی کا تصور نہیں، قرآن مجید مین فرمایا گیا "اور یہ کہتے ہیں کہ بس زندگی تو دنیا کی ہے اسکے بعد ہم دوبارہ نہیں بھیجے جائیں گے"۔ (الانعام ۲۹)

یہی بنیادی فکری خصوصیت آپ کی بیشتر تحریروں اور تصانیف میں ملتی ہے۔ "ایمان ومادیت کی کشمکش"؛ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"۔ "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" وغیرہ میں بہت نمایاں ہے۔

(۲) **عقل پر وحی کی برتری اور تفوق:-** دوسری خصوصیت وحی الٰہی کو ایسا محفوظ سرچشمہ سمجھنا جہاں سے دین کے حقائق اور احکام صادر ہوتے ہیں، اور نور نبوت نور عقل سے برتر ہے، عقل بغیر نور نبوت کے محفوظ اور قابل اعتبار نہیں مختلف فلسفے خدا، دنیا، انسان اور زندگی کا صحیح تصور نہیں پیش کر سکتے، خواہ مذہبی فلسفے اور علم کلام ہی کیوں نہ ہو، جو بھی اس گہرائی میں جائے گا وہ ڈوبنے اور

غوطہ کھانے سے محفوظ نہیں رہ سکتا بڑے بڑے متکلمین اور فلاسفہ جیسے علامہ فخر رازیؒ اور آمدی وغیرہ نے اس باب میں عقل کی نارسائی کو واضح کیا ہے، اسی طرح جدید نظریہ حیات بھی انسان کو صحیح راستہ پر نہیں لا سکتے، حضرت مولاناؒ نے اس نکتہ کو اپنی مختلف کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ان میں "النبوۃ والانبیاء" اور "مذہب وتمدن" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۳) **قرآن کریم سے گہرا اتصال:-** آپ کی دعوت وفکر کا تیسرا خاصہ قرآن کریم سے گہرا ربط ہے، اور اسے ایک زندہ جاوید کتاب اور مکمل دستور حیات کے طور پر پیش کرنا ہے، کیونکہ مذہب اور عقیدے کی بنیاد قرآن ہی پر قائم ہے، آیات ومضامین قرآنی کی تفسیر وتشریح میں مقررہ اصول وقواعد کی پابندی لازم ہے، ہوائے نفس کی قطعاً گنجائش نہیں، فہم قرآن کے سلسلہ میں قادیانی فرقۂ ضالہ کی بیان کردہ تحریفات پر حضرت مولاناؒ نے سخت تنقید کی ہے۔

حضرت علامہؒ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والا واضح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ آپ کا قرآن کریم سے گہرا ربط ہے۔ حسب موقع آیات سے استشہاد اور برمحل استدلال ہوتا ہے، آپ آیات کے سمجھنے اور مدلول بیان کرنے میں منفرد ذوق کے حامل ہیں "معرکہ ایمان و مادیت" "النبوۃ والانبیاء" اور "المدخل فی الدراسات القرآنیہ" کے اندر قرآنی حقائق کو واضح کیا ہے، آپ نے ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علوم قرآن پر درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔

(۴) **حدیث اور اسوۂ نبوی سے گہرا جوڑ:-** انہی خصوصیات میں حدیث اور اسوۂ نبوی سے آپ کا گہرا تعلق ورشتہ ہے، اس لئے کہ حدیث قرآن مجید کی نظریاتی شارح ہے، اور نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ اور طریقہ قرآن کا عملی آئینہ ہے آپ کے اخلاق اور سیرت میں قرآن کی عملی تفسیر سامنے آتی ہے، نبی کا اسوہ اور طریقہ عام لوگوں کے لئے ایک معیار ہے یہی وجہ ہے کہ سیرت نبوی کے گھنے سایہ میں زندگی گزارنا، اور آپ ﷺ کے اخلاق واعمال کو اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

حضرت مولانا نے اپنی کتابوں میں اسلامی زندگی کے اندر حدیث نبویؐ کا کردار اور سیرت

رسول ﷺ کے نقوش واثرات کو واضح کیا ہے آپ نے بڑوں اور بچوں کے لئے سیرت کے موضوع پر مختلف کتابیں تحریر کی ہیں آپ کی تحریریں ایک نکتہ اس محقق اور عاشق زار کے دلی سوز و گداز کی جامع ہیں یہی خصوصیات آپ کی بیشتر تصانیف میں واضح طور پر موجود ہیں۔

(۵) **روحانی جذبات واحساسات کو ابھارنا (مثبت للٰہیت):-** پانچواں خاصہ مسلمان کے دل کی سرد انگیٹھی کو شعلہ ایمانی اور روحانی جذبات سے فروزاں کیا جاتا ہے اور اسلامی زندگی کے اندر اسی بنیادی پہلو کو نمایاں کرنا ہے، حضرت مولانا نے اپنی کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" میں تزکیہ واحسان کے پہلو کو اجاگر کیا ہے، اس کتاب کا نام "ربانیہ لا رہبانیہ" رکھنے کے دو سبب ہیں اول مدلول تصوف سے احتراز، کیونکہ یہ اصطلاح مرور زمانہ کے ساتھ ناانصافی کا شکار ہوتی، اور اسے حشو وزوائد کا مجموعہ سمجھ لیا گیا، جو حقائق سے ماوراء فوق الفطرت چیزوں کو بتائے جب کہ تصوف تزکیہ نفس ہی کا ایک گوشہ ہے، مشہور حدیث جبرئیل میں احسان کا مصداق یہی ہے۔ دوم: مطلوبہ روحانی زندگی کے لئے مثبت عنصر کا نمایاں کرنا، اسی کو علامہ بہی الخولی نے مثبت روحانیت کا نام دیا ہے، کیونکہ یہ انسانی زندگی سے مربوط اور منسجم ہے۔ اور دنیوی زندگی کو آخرت کی کھیتی قرار دیتی ہے جہاں ہمیشہ ہمیش کی زندگی ہے۔

حضرتؒ اپنی کتاب "ارکان اربعہ" میں اسلامی شعائر و احکام کے اہم اور بنیادی ستونوں کی وضاحت کی ہے، عبادات و شعائر کے دنیوی زندگی پر نمایاں ہونے والے اثرات کو بیان کیا ہے ارکان اسلام نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی تصویر کشی بالکل نئے اسلوب میں کی ہے۔

(۶) **تعمیری اور مثبت طرز زندگی، اجتماعیت اور اتفاق:-** حضرت مولاناؒ دعوت و فکر کو مثبت اور تعمیری کاموں میں لگانا اجتماعیت کا راستہ اختیار کرنا، تفریق انتشار سے دور رہنا اپنا مقصد حیات بنالیا تھا، آپ کی دعوت و فکر تحریک اخوان کے بانی حسن بناء شہید کی دعوت و فکر سے بہت مشابہ تھی، جو اس شعار پر انسانی زندگی کو منطبق کرنے کے حریص تھے، کہ ہم تعمیر کے لئے ہیں تخریب کے لئے نہیں، لوگوں کو اپنے سے قریب کرنے کے لئے ہیں دور کرنے کے لئے نہیں انہوں نے زریں اصول

پر اپنی دعوت وفکر کی اساس رکھی اور فرمایا" کہ متفق علیہ مسئلہ پر ہم ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف رائے رکھتا ہے، تو ہم معذرت پیش کر دیتے ہیں۔ بعینہ یہی خصوصیات حضرت علامہؒ کی تھیں، آپ حتی الامکان سخت کلامی سے احتراز فرماتے، جزوی اور اختلافی مسائل سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حضرت علیہ الرحمہ دین کے سلسلے میں مداہنت برتنے والے تھے، یا منکر دیکھتے ہوئے بھی اپنی زبان بند رکھتے، آپ ہمیشہ حق بات فرماتے، منکر اور باطل کی پوری قوت سے نکیر فرماتے، لیکن یہ نکیر وتردید ہمیشہ نرمی اور خوش اسلوبی سے ہوتی، جیسا کہ آپ نے "دو متضاد تصویریں" میں شیعیت پر ضرب کاری لگائی ہے، اور التفسیر السیاسی للاسلام میں علامہ مودودیؒ اور سید قطب کے افکار وخیالات کی تردید کی ہے۔

(۷) **راہ خدا میں جذبہ جہاد کا احیاء:-** حضرت علامہؒ نے امت کے اندر جہاد کی روح پھونکنے، اور اسے اپنا مقابلہ کرنے کے لئے امادہ اور مجتمع کرنے، دین کی چنگاری اور شعلہ ایمانی کو فروزاں کرنے جسے باطل طاقتیں ختم کر دینے پر کمربستہ ہیں نیز بیکاری اور بے روزگاری سے نپٹنے اور امت کو وہن نفسی یعنی دنیا کی محبت اور موت کی کراہیت سے نکالنے کے لئے ایک عظیم خدمت انجام دی "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور "جب ایمان کی بہار آئی" اس کی واضح مثال ہیں، ان کتابوں کے اندر سید احمد شہید صلاح الدین ایوبیؒ اور دیگر مجاہدین اسلام کے کارنامے ذکر کئے ہیں آپ کی تحریریں امت کے اندر جذبہ جہاد کی روح پھونکنے اور ایمانی شعلوں کو بھڑکانے میں بہت ہی کارآمد ہیں۔

(۸) **تاریخ اسلام کا اِحیاء:-** آپ کی دعوت وفکر کا آٹھواں پہلو امت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے تاریخ اور خصوصاً تاریخ اسلامی کا اِحیاء ہے کیونکہ تاریخ امت کے لئے دماغ کا درجہ رکھتی ہے، نیز اس کے تابندہ اور درخشندہ کارناموں کی محافظ وامین ہوتی ہے، حضرت مولانا تاریخ کا منفرد ذوق رکھتے تھے، تاریخ کے اندر رونما ہونے والے واقعات اور ان سے حاصل ہونے والے نصائح

وعبر کا انوکھا شعور رکھتے تھے، یہ خصوصیات "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" اور "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" میں بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، تاریخ کا دائرہ ان کے نزدیک صرف امراء اور اعیان سلطنت تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اقوام وملل، علماء، مصلحین، ومجددین، نیز سیاسی وسماجی تہذیبی و ثقافتی ایمانی وجہادی جملہ پہلوؤں کو محیط تھا، اسی لئے حضرت علامہؒ تاریخ کو اس کے وسیع مفہوم میں لیتے، آپ تاریخ کے ظاہری مراجع پر ہی اکتفانہ کرتے، بلکہ دینی وادبی مراجع اور طبقات کو شامل کرتے، بلند پایہ شخصیات کے موقف مجددین ومصلحین کی مثالی زندگی اور ان کی سیرت سے سبق لیتے۔ "رجال الفکر و الدعوة" "تاریخ دعوت وعزیمت" میں یہ خصوصیات ظاہر ہیں۔

امت کی اصلاح وتجدید کی تاریخ ایک مضبوط کڑی ہے، جس کا ایک دور ختم ہوتا ہے تاکہ دوسرا دور شروع ہو۔ ایک ستارہ غروب ہوتا ہے تاکہ دوسرا ستارہ طلوع ہو، یہ نقص تاریخ میں نہیں بلکہ اس کے مرتب کرنے والے میں ہے۔

(۹) **مادی تہذیب وتمدن اور مغربی طرز فکر پر کھلی تنقید:-** نویں خصوصیت عصر حاضر کی جاہلی تہذیب پر تنقید ہے جو مغربی فکر اور عصر حاضر کی مادی تہذیب کی شکل میں ظاہر ہیں۔ آج مغربی تہذیب وتمدن کی حقیقت پورے طور پر کھل کر سامنے آچکی ہے اِس کے دو عظیم سرچشمے یونانی اور رومی تہذیب وتمدن ہیں ان میں پائی جانے والی بت پرستی مادہ پرستی اور قوم پروری جیسی مہلک بیماریاں۔

روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ حضرت مولاناؒ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان موجودہ کشمکش اور خصوصاً تعلیمی، تربیتی، ثقافتی اور اخلاقی کردار کے درمیان ہونے والی کشمکش پر گہری نظر رکھتے تھے اہل مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں پر سخت نکیر فرماتے اسی طرح ان لوگوں کو بھی اچھا نہ سمجھتے جو ان کے خیر کے پہلو کو بھی ٹھکرادیتے ہیں بلکہ آپ تیسرے فریق کے حامی تھے جو نہ تو اندھی تقلید کا قائل ہے اور نہ ہی اسے شر کا مجموعہ سمجھتا ہے، بلکہ اس کے طرز زندگی سے کنارہ کش رہ کر علوم و فنون اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور مغربی تہذیب کے ان اصول وکلیات کو اختیار کرتا ہے جو اسلام کے عقیدے اور اصول سے میل کھاتے ہوں اور ان کلیات کو ٹھکراتا ہے جو اس سے ٹکراتے ہوں۔

آپ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار نقل کرتے ہیں جنہوں نے بہت گہرائی سے اس مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا تھا پھر طرز فکر کی شدید مخالفت کی تھی، حضرت مولاناؒ کی تصانیف میں مغربی افکار ور جحانات کی تردید ملتی ہے۔

(۱۰) عصبیت جاہلیہ اور قوم پرستی کے نعروں کی مخالفت:- حضرت مولانا نے عالم اسلام خصوصاً عالم عربی میں جاہلانہ عصبیت کا نعرہ لگانے والی اور اسے ہوا دینے والی قومی فکر پر کڑی تنقید کی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو عالمی برادری پر یقین رکھنے والا اور اخوت و بھائی چارگی سے متصف فرمایا تھا، حضرت کو اس بات کی زیادہ فکر رہتی کہ یہ عصبیت عربوں میں کیوں سرایت کر گئی جب کہ وہ اسلام کے اولین داعی اور کتاب و سنت کے حامل وامین ہیں۔ حضرت خود بھی نسبی فکری اور روحانی رشتہ سے عرب ہیں اسی لیے آپ اسلام مخالف عرب قومیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، جس نے مسلمانوں کے اندر تفرقہ اندازی اور انتشار پیدا کیا، اسی قومیت کو بعض اصحاب فکر نے نئے دین اور نئی نبوت سے تعبیر کیا ہے، جو عربوں کو ایسے افکار و نظریات کے تحت جمع کرنے والی ہے جو حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین، عقیدے اور نظریئے کے مخالف ہے آپ ﷺ کے ذریعہ عرب کو دین اسلام جیسی بڑی نعمت ملی، آپؐ نے ان کے انتشار وافتراق کو ختم کیا، اور انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

حضرت مولانا نے عرب قومیت پر نکیر کے ساتھ ساتھ عربوں کے فضل اور ماضی میں ان کی قیادت وسیادت کا اعتراف کیا ہے، آپ مسلسل تحریر و تقریر کے ذریعہ عربوں کو اسلام کی بار قیادت سنبھالنے اس کی گرانمایہ دعوت کو عام کرنے اور اس پر کاربند ہونے کے لئے ابھارتے رہے جیسا کہ حضرت ربعی بن عامرؓ نے ایرانیوں سے مقابلہ کے وقت کیا تھا، وہ اپنی کتاب (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عرج وزوال کا اثر) میں لکھتے ہیں "حضرت محمد ﷺ عالم عربی کے لئے روح کا درجہ رکھتے ہیں" اسی طرح دیگر تصنیفات میں آپ نے عربوں کو خوب جھنجھوڑا ہے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کی پیہم کوشش صرف کی۔

(۱۱) ختم نبوت کے عقیدے پر زور اور فتنہ قادیانیت کا مقابلہ :- آپ کی دعوت وفکر کا ایک محور عقیدہ ختم نبوت پر اصرار اور فتنہ و قادیانیت کا مقابلہ ہے، ختم نبوت کا عقیدہ صدیوں سے مسلم چلا آرہا ہے کسی نے آج تک شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، قادیانیت کے نت نئے فتنوں نے عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور بڑھادی ہے حضرت علامہؒ نے اس فتنہ کو نبوت محمدی ﷺ کے خلاف ایک بغاوت اور اسلام پر ایک حملہ اور ڈاکہ سے تعبیر کیا ہے، اس ضمن میں بہت کچھ لکھا گیا، لیکن آپ نے ایک خاص ذمہ داری سمجھتے ہوئے مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے بارے میں لکھا اور یہ واضح کیا کہ ختم نبوت کا عقیدہ انسانیت کے لئے فخر و عزت کا سبب ہے کیونکہ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ انسانیت اب اپنے کمال کو پہونچ چکی۔ اور ایک ایسا کامل و مکمل دین پاچکی جو اصول و کلیات بیان کرتا ہے۔ اور شرح و تفصیل کا کام عقل انسانی پر چھوڑ دیتا ہے، وہ عقل انہی اصول و کلیات کی روشنی میں معاشرہ کے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرتی ہے جو جھوٹے نبیین کا سدباب کرتی ہے، اور خدا پر بہتان تراشی کا دروازہ بند کرتی ہے۔

حضرت، مولاناؒ نے اپنی کتاب "النبوۃ والانبیاء" کے اندر حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کو بیان کیا ہے، پھر "نبی خاتم" تصنیف کی، اور بچوں کے لئے "سیرۃ خاتم النبیین" لکھی، فتنہ قادیانیت پر ایک مفصل تحلیل و تجزیہ "القادیانی والقادیانیۃ" تصنیف کی جس میں غلام احمد قادیانی اور اسکی دعوت کا تحقیقی جائزہ پیش کیا اور اس کے انگریزی سامراج کے پروردہ ہونے اور اس کی مختلف کتابوں میں تحریروں کے ذریعہ فریضۂ جہاد معطل کرنے اور انگریزوں کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا بھرپور جائزہ لیا ہے حضرتؒ نے قادیانیت کے سلسلہ میں بہت ہی صراحت کے ساتھ اپنا موقف واضح کیا ہے، فرماتے ہیں "ہم قادیانیت کو دین اسلام کے مقابلے میں ایک نیا دین اور امت محمدیہ ﷺ کے مقابلے میں ایک نئی امت گردانتے ہیں" اس طرح آپ نے قادیانیت کو تحریف قرآن اور عربی زبان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق کرنے پر ہدف ملامت بنایا ہے اس اعتبار سے یہ کتاب قادیانیت پر ایک علمی مرجع کا درجہ رکھتی ہے اس میں قادیانیت کے نہایت اہم مراجع دلائل کے ساتھ

پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۲) فکری ارتداد کا مقابلہ :- اس فکری ارتداد کی سرکوبی جس کی وبا سے عرب اور عام مسلمان یہاں تک کہ پڑھا لکھا طبقہ بھی محفوظ نہ رہا جس طرح حضرتؒ نے قادیانیت کے شکل میں اٹھنے والے فتنے اور حملۂ ارتداد کا مقابلہ کیا جسے پاکستانی علماء غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر اصرار کرتے رہے، اسی طرح حضرتؒ عقلی، ثقافتی اور تہذیبی فتنے کی سرکوبی کے لئے ہر ممکن جد و جہد کی اور بلاشبہ آپ کی علمی کاوشیں اس کھوٹ کو ظاہر کرنے اور باطل سرگرمیوں کو روکنے نیز اس چنگاری کو دبانے میں صرف ہوئیں اس ضمن میں آپ نے ایک رسالہ "ردة ولا ابا بكر لها" کے عنوان سے تحریر فرمایا۔

(۱۳) امت مسلمہ کے مثالی اور تاریخ ساز کردار کی تاکید :- حضرتؒ کی دعوت و فکر کا ایک ناحیہ انسانی فلاح و بہبود اور رشد و ہدایت کا پیغام عام کرنے اور اس امت کے دیگر اقوام پر گواہ بننے اور اس روئے زمین پر صرف خدا کی عبادت و وحدانیت کو قائم کرنے کے سلسلے میں امت کے کردار کو تقویت بخشی ہے جیسا کہ حضرت محمد ﷺ نے بدر کے موقع پر فرمایا تھا" اللهم ان تهلك هذة العصابة فلن تعبد فى الارض" اے اللہ اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دے گا تو اس روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ امت ہمہ گیر پیغام رسالت اور مکمل طرز زندگی کی حامل ہے۔ اس نے مادیت اور روحانیت میں گہرا رشتہ قائم کیا اور زمین و آسمان کا تعلق بتلایا، دنیا کو آخرت کے ساتھ مربوط کیا، علم و ایمان کو جوڑا انسانی حقوق کی رعایت کے ساتھ ساتھ معاشرے کی مصلحت کا بھی لحاظ کیا، یہ امت اس کاروان انسانی کے لئے بحیثیت عظیم سالار و قائد کے ہے۔ انسانیت اس امت کے فیض سے اس وقت بہرہ مند ہوئی، جب کہ دنیا میں یہ پہلی امت تھی پھر بعض عوامل و اسباب کی بنا پر قافلہ سے بچھڑتی چلی گئی، اس کے زوال سے انسانی دنیا متاثر ہوئی، انہیں اسباب و علل کا جائزہ حضرتؒ نے اپنی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" میں پیش کیا، یہی وہ کتاب ہے جو عالم عربی میں حضرت مولانا کے تعارف کا سبب بنی اور عالم اسلام کے عبقری علماء اور دعاۃ نے

اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، علامہ ڈاکٹر محمد یوسف موسی فرماتے ہیں "اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص پر لازم ہے جو احیاء دین کے لئے کھڑا ہو اور دعوت اسلام کا فریضہ انجام دے۔"

حضرت مولاناؒ نے اپنے ایک محاضرہ "قیمة الامة الاسلامية بين الامم و دورها فی العالم" میں امت اسلامی کے قائدانہ کردار کی ذمہ داری اور اس عظیم فریضہ کی انجام دہی کے لئے عربوں کو بار بار توجہ دلائی ہے

(۱۴) صحابہؓ کا دین میں مقام و مرتبہ :- انہیں خصوصیات وامتیازات میں مثالی امت کے فضائل و مکارم کا ذکر ہے، یہی صحابہ رضوان اللہ علیہم کی جماعت ہے جو دل کی صفائی وپاکیزگی اور علم و فضل کی گہرائی گیرائی سادگی اور بے تکلفی میں اپنی مثال آپ تھے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اپنے حبیب ﷺ کی معیت اور دین اسلام کی نصرت کے لئے منتخب فرمایا تھا اور غزوہ بدر و خندق و حنین کے موقعہ پر فرشتوں کے ذریعہ ان کے مدد فرمائی تھی یہی وہ قدسی جماعت ہے جس کی قرآن میں تعریف و توصیف فرمائی گئی ہے، اور رسول ﷺ نے ان کے کامل نمونہ ہونے کی بشارت دی ہے۔ تاریخ و سیرت کے واقعات اس کی پوری تائید کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کو یاد رکھا، احادیث کی روایات دوسروں تک پہنچائیں، مختلف فتوحات حاصل کئے اور دعوت دین کا کام کیا، یہی مدرسۃ النبی ﷺ کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے، انہیں پر خدا کا یہ فرمان پورے طور پر صادق آتا ہے

"كذلك جعلناكم امة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس "(البقرة ۱۴۳)

اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو

اور یہ فرمان "كنتم خير أمة اخرجت للناس" "تم بہتر امت تھے جو لوگوں کے لئے نکالے گئے (آل عمران ۱۱۰)

اور یہی اس امت کے قائد ہیں اور علم و عمل کے سچے نمونہ ہیں، جہاد اور اجتہاد کے امام ہیں بعد میں آنے والے تابعین کرام مقام و مرتبہ میں ان کے کہیں پیچھے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر امت میری امت ہے پھر وہ جو اس کے بعد آئے گی، جو لوگ صحابہ کرام کے کردار کو

شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں در حقیقت وہ حضور ﷺ کی دعوت و مشن کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے ہیں اور یہی وہ بد نما تصویر ہے جو شیعیت کے ماننے والوں نے صحابہ کرام کے سلسلہ میں پیش کی ہے۔ اسی نتیجۂ فکر کو ہمارے حضرت علیہ الرحمۃ نے اپنے رسالہ "صورتان متضادتان" میں حضور ﷺ کی دعوتی و تربیتی نتائج و اثرات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ سیرت صحابہؓ کے متعلق شیعہ، امامیہ اور اہلسنت والجماعت کے نظریات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

۱۵- **مسئلہ فلسطین اور اس کی بازیابی کے لئے کوشش:-** فلسطین کا مسئلہ صرف باشندگان فلسطین کا مسئلہ نہیں اور نہ ہی فقط عربوں کا مسئلہ ہے بلکہ اس رشتہ ساری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ آج امت کو پیش آمدہ خطرات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے اور بازیابی کے لئے بھرپور اور سرگرم رہ کر حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ اور ایسے اسباب و رسائل اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو اس کی کامیابی کے لئے ممد و معاون بن سکتے ہوں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے امت کے اندر ایسے بے مثال داعی افراد پیدا کئے جنہوں نے نئی نسل خصوصاً نوجوان طبقہ کے اندر ایمان کی تازہ روح پھونک دی، جنہوں نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور اپنے کو قربان کر دیا ان میں نور الدین اور صلاح الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضرت مولاناؒ نے اپنی متعدد کتابوں و رسائل میں ان کی جہادی سرگرمیوں کو خوب سراہا ہے۔

آزادی فلسطین کا صرف یہی واحد راستہ ہے کہ ایمان کی تازہ روح پھونکی جائے اور افراد کو جہاد کی تربیت دی جائے۔ اس ضمن میں حضرت مولانا کے متعدد مقالات و رسائل ہیں جن میں "المسلمون وقضیۃ فلسطین" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

(۱۶) **آزادانہ اسلامی تربیت پر زور:-** انہی امتیازات میں خالص اسلامی تربیت پر زور دینا ہے جو نہ تو مشرقی تہذیب سے پورے طور پر ماخوذ ہو اور نہ ہی مغربی طرز سے بالکلیہ متاثر ہو، عقیدے، دین اور اخلاق و اقدار کے لحاظ سے اس کا سرچشمہ اسلام ہو، جہاں تک وسائل اور طریقے کار اختیار کرنے کا

تعلق ہے، تو اسلامی تربیت کے مقررہ اصول و قواعد کے مطابق اختیار ہے کیونکہ حکمت عملی ایک مومن کا گمشدہ سرمایہ ہے، جہاں اسے مل جائے وہ لینے کا مستحق ہے۔

حضرت مولاناؒ قدیم نظام تعلیم کی لفظی اور مناظرانہ بحثوں کو ہرگز پسند نہ فرماتے، اسی طرح اب جدید نظام تعلیم کے روحانی انخلاء اور اس کے مقصد حیات سے دور رہنے کی ہمیشہ نکیر فرماتے حضرت مولاناؒ نے تربیتی پہلو پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی کیونکہ نسل نو کو ایمان واسلام پر باقی رکھنے کا واحد حل اسلامی تربیت ہے۔ اس جانب غفلت برتنا امت کے قیمتی سرمایہ کو ضائع کرنے کے مرادف ہے حضرتؒ اس مناسبت سے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بار بار نقل کرتے:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس ضمن میں حضرت مولاناؒ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں "التربیة الاسلامة الحرة" اور "کیف ینظر المسلمون إلی الحجاز وجزیرة العرب" خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس میں حضرت مولانا نے تربیت کے مختلف گوشوں پر تحقیقی جائزہ پیش کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ عملی طور پر بھی اس میدان میں شریک رہے۔

(۱۷) **نوخیز بچوں کی تعلیم وتربیت پر زور:**۔ حضرت مولاناؒ نے نسل نو کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ مرکوز فرمائی۔ اور انکی ذہنی ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آسان زبان میں انبیاء اور اولیاء کے واقعات وحکایات پر مشتمل کتابیں لکھیں، کیوں کہ یہی بچے مستقبل کے روشن چراغ اور تاریخ کے آئینہ ساز ہیں۔ آپ نے نوخیز طلباء کے لئے انبیاء کے قصص وواقعات نہایت آسان اور شفتہ اسلوب بیان میں تحریر فرمایا۔ آپ نے اس مجموعہ میں سبق آموز واقعات اور عقائد واصول جمع کئے ہیں، بعض عرب اہل علم وفضل نے اس مجموعے کو "علم التوحید للاطفال" کا نام دیا۔ معروف سید قطب شہیدؒ نے توصیفی کلمات ثبت کئے ہیں۔ جنہوں نے بذات خود اس میدان میں عملی طور پر حصہ لیا۔

حضرت مولانا نے تیس سال کی عمر میں قصص الانبیاء کے نام سے ایک مجموعہ کتب ترتیب دیا

اور اس مجموعہ کو حضور ﷺ کی سیرت پر ختم کیا، اسی طرح قصص من التاریخ الاسلامی" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی اس کے مقاصد کو ذکر کرتے ہوئے حضرتؒ فرماتے ہیں "اس اقدام کے ذریعہ میں چاہتا ہوں کہ دعوت وتربیت کے حامل افراد کی مجھے رہنمائی اور تعاون ملے۔

(۱۸) عصر حاضر میں ربانی علماء اور کار پردازان دعوت کی تربیت :-

حضرت علیہ الرحمۃ کی دعوت وفکر کا ایک محور ایسے ربانی صفت علماء اور داعیوں کو تیار کرنا ہے جو اسلامی حقائق اور عصر حاضر کے تقاضوں سے پورے طور پر واقف ہوں اور وہ غیرت ایمانی، حمیت دینی اور بلند اخلاق وکردار کا پیکر ہوں اسی جذبے کے تئیں حضرتؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ایک زمانہ تک تدریسی خدمات انجام دیں پھر آپ نے نظام تعلیم میں جدت پیدا کرنے اور درسی کتابوں کو تیار کرانے نیز ملکی وغیر ملکی تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کے ذریعہ ایک اہم خدمت انجام دی۔ آج ایسے ہوش مند داعی اور جید علماء کی ضرورت ہے جو امت کے مسائل کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کر سکیں، حقائق وبراہین کی روشنی میں فتوے دے سکیں اور دعوت کے کام کو پوری بصیرت کے ساتھ انجام دیں۔

(۱۹) اسلامی بیداری اور تحریکات کی سمت مقرر کرنا :- حضرت مولانا کی دعوت وفکر کا ایک گوشہ اسلامی تحریکات اور دینی رجحانات کو صحیح سمت پر لگانا ہے عالم اسلامی آج انہی مسائل سے دوچار ہیں۔ بلکہ پوری دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں، خواہ یورپ ہو یا امریکہ انہیں اس بیداری کا سامنا ہے اور یہ بیداری ذہنی وفکری اور عزم وحوصلے کی بیداری ہے لکن اس بیداری کو غیروں سے زیادہ اپنوں سے خطرہ لاحق ہے، قبل اس کے کہ باہر سے کوئی حملہ آور ہو وہ اندر ہی اندر کھوکھلی ہوتی چلی جارہی ہے۔

اس بیداری کو جہاں دوسرے خطرات لاحق ہیں وہیں سب سے بڑا خطرہ حد سے زیادہ غلو اور بیجا مبالغہ آرائی ہے۔ اصل اور لب لباب کو چھوڑ کر غیر ضروری چیزوں کو پکڑ لینا، جزئیات اور اختلافی مسائل

سے حد درجہ شغف ہے کہ اپنوں ہی کو کافر گر دانے اور گنہگار قرار دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔

حضرتؒ متوازن فکر، معتدل مسلک اور میانہ روز ندگی کے حامل تھے، وہ بیک وقت قدیم و جدید مورروثی اور اثری صفات کا حسین امتزاج تھے ،اسی طرح اسلاف کی سچی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی تصوف کے آئینہ دار بھی تھے، ایک طرف عقیدے اور شریعت کے پابند دوسرے جانب زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے والے تھے، مزاج میں ریشم کی سی نرمی اور لوہے کی سی صلابت تھی۔

ہو حلقہ ٔ باراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرت مولاناؒ ایک خاص جماعتِ فکر کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے آزاد فکر کے حامل تھے اور مختلف تنظیموں اور جماعتوں کی سر پرستی فرماتے تھے، نقائص اور خامیوں کی طرف اشارہ فرماتے ایسے عیوب و نقائص جو اصل اراکین سے بھی پوشیدہ رہتی اس تنقید و تعریض کے پسِ پشت صرف جذبہ خیر کار فرما ہوتا اس طرح حضرتؒ نے مسلم حکمرانوں اور لیڈروں کی رہنمائی میں بھی کوئی دقیقہ نہ رکھ چھوڑا، آپ مناسب صلاح و مشورہ دیتے رہے، کبھی ان سے مال و جاہ کے طالب نہ ہوئے۔

(۲۰) **غیر مسلموں میں دعوتِ اسلام:-** حضرت مولاناؒ کی دعوت و فکر کا ایک اہم گوشہ غیر مسلموں میں دعوت کے کام کو آگے بڑھانا ہے یہ وہی دعوت ہے جسے امت اسلامیہ نے ابتدائی دور میں انجام دیا، اس دعوتِ مشن کا آغاز آپ نے عہدِ شباب ہی میں کیا جب آپ کی عمر بمشکل ۲۲ر سال کی تھی، اور اسکا آغاز ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے ذریعہ کیا، اور آپ نے اس مقصد کے تحت بمبئی کا سفر کیا حضرت مولاناؒ یہ سمجھتے تھے کہ دعوت امت اسلامیہ کا ایک خاص امتیاز ہے اگر اس نے دعوتی مشن کو چھوڑا تو دوسری امتوں پر اس کی عظمت و برتری ناممکن ہے، آج انسانیت ترقی کے اس مینار پر پہونچنے کے بعد اور ٹکنالوجی اور مادی علوم کے نقطۂ عروج پر فائض ہونے کے باوجود اسلام کے پیغام کی محتاج ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا علی میاںؒ

چند امتیازات و خصوصیات

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی : استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

حضرت مولانا علی میاںؒ پیدائشی عظیم تھے، پھر ان کی جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم نے ان کی عظمت میں چار چاند لگا دیا تھا، عرب شعراء انسان کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں :-

؎ إنّ الفتیٰ مَن یقول ھا أنذا

لیس الفتیٰ من یقول کانَ أبی

"جوان و بہادر تو وہ ہے جو اپنے آپ پر اعتماد رکھتا ہو، بہادر و جوان وہ نہیں ہو سکتا جو اپنے آباء کے مکارم سناتا رہے اور انھیں پر اتراتا رہے اور خود کچھ نہ کرے"۔

حضرت مولانا علی میاں میں حسب و نسب کی شرافت کے ساتھ علم و ادب کا کمال بھی جمع ہو گیا تھا، یہ ایسا امتیاز ہے کہ اس کے سامنے سارے امتیازات ہیچ ہو جاتے ہیں۔

مولانا کا ایک قابلِ قدر اور قابلِ ذکر امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے قدیم و جدید دونوں کو نہایت اعتدال و توازن کے ساتھ اپنے اندر سمو لیا تھا، دونوں جگہ سے لعل و جواہر منتخب کر لئے تھے اور ذرّات و فضلات چھوڑ دیئے تھے، ان کا اعلان تھا کہ :-

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر۔
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

قدیم صالح اور جدید نافع کا یہ حسین ترین امتزاج (جس کو اخذ کرنے کی ہر حلقہ و طبقہ میں ضرورت بڑھتی جا رہی ہے) مولانا کا امتیازی وصف تھا، جسے اپنانے کی کوشش مولانا کے سارے متعلقین و منتسبین کر رہے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔

حضرت مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف "مختارات" کا دوسرا حصہ پڑھئے تو اس میں ایک مضمون "صفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ہے، میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ان اوصاف کی تجسیم مولانا کی شخصیت میں بھی نمایاں دکھائی دیتی تھی۔

زہد و استغناء مولانا کی زندگی کا ایک بہت ہی روشن باب ہے، اعزازات، مناصب، انعامات اور ایوارڈ جتنے مولانا کے حصے میں آئے شاید اس صدی کے کسی اور عالم کے حصہ میں نہ آئے ہوں حجاز، سوڈان و مصر، شام و عراق، ایران و افغانستان، پاکستان و بنگلہ دیش، لبنان و ترکی کویت و امارات، اردن و مراکش، امریکہ و برطانیہ، سری لنکا و افریقہ، سمرقند و تاشقند، اندلس و بخاری، یمن و قطر، ملیشیا و انڈونیشیا، برما اور جاپان اور نہ جانے کتنے ملکوں اور شہروں میں مولانا بلائے گئے، کانفرنسوں اور سیمناروں میں مدعو ہوئے، عہدے دئے گئے، مال و دولت کی پیشکش ہوئی، لیکن ہر جگہ مولانا نے اپنا پیام پہونچایا اپنی فکر دی اور لیا کچھ نہیں، ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا، مولانا نے اس کی رقم جہاد افغانستان اور بعض دینی اداروں کے سپرد کر دی۔

جنرل ضیاء الحق شہید نے علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم پر مولانا کا مقدمہ دیکھا اور قدر دانی کرتے ہوئے مولانا کو حکومت پاکستان کی طرف سے ایک لاکھ کا عطیہ دینے کا اعلان کیا، مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں اس عطیہ کا کسی طرح مستحق نہیں، براہ کرم اس کا نصف حصہ دار المصنفین اعظم گڑھ کو پیش کر دیا جائے، جس نے یہ کتاب دریافت کی اور اس کی اشاعت کا انتظام کیا ہے، بقیہ نصف حصہ حضرت سید صاحبؒ کے پس ماندگان کی خدمت میں پیش

کردی جائے جو کراچی میں مقیم ہیں ۱۹۹۸ء میں دبئی و امارات کے سربراہوں نے مولانا کو عالمی شخصیت کا ایوارڈ دیا، اور ایک خطیر رقم پیش کی، لیکن مولانا نے وہ رقم بھی دینی مدارس اور اداروں کیلئے وقف کردی، دمشق یونیورسٹی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور عالم عرب کے متعدد اداروں اور جامعات کی طرف سے تدریس اور اعلیٰ درجہ کی سہولیات اور تنخواہوں کی بار بار پیشکش مولانا سے کی گئی، مگر ہر موقعہ پر مولانا نے صاف صاف معذرت کردی، شاہان ممالک جن میں سعودیہ عربیہ کے سربراہان، شاہ فیصل شہید، شاہ خالد اور شاہ فہد، والی اردن وقدس شاہ عبداللہ، حاکم شارقہ سلطان محمد القاسمی، پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق وغیرہ سے خصوصاً مولانا کی ملاقاتیں اور مراسلت رہی، مولانا نے ہر موقعہ پر بغیر کسی غرض کے مخلصانہ طور پر انھیں خطرات سے باخبر کیا اور ذمہ داریاں یاد دلاتے رہے، ۱۹۸۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں اسلامک سینٹر قائم ہوا، تو اسکی صدارت کیلئے بھی مولاناؒ ہی کا انتخاب ہوا، خود ہندوستان کے بہت سے اداروں سے بار بار مولانا کو پیشکش کی گئی، حکومت نے کئی بار پدم بھوشن کا اعزاز دینا چاہا، مگر مولانا کا زہد اور متاعِ دنیا سے ان کا بیزاری کا رویہ تا آخر قائم رہا، مال و دولت کے ڈھیر اور انبار ان کے قدموں میں پڑے تھے، دنیا بہت جھک کر ان کے پاس آئی تھی، مگر مولانا کا قلندرانہ انداز اور مومنانہ کردار کبھی سرِ مو بھی نہیں بدلا، قرآنی اصول

"قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا"

"آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سرمایہ زندگی تھوڑا ہے اور آخرت ایک خدا ترس انسان کیلئے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہیں کیا جائے گا"

اور لَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُورُ

"دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے"

ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہے، جہاں بینی ہمیشہ ان کی فطرت رہی، لیکن وہ کسی جمشید کا ساغر کبھی نہیں

بنے، گویا بزبانِ حال انھوں نے یہ پیغام دیدیا۔

ے یخبرك من شهد الوقيعة أنني
أغشى الوغى وأعف عند المغنم

"جنگ میں شریک ہر آدمی تم کو خبر دے گا کہ میں معرکہ میں سربکف ہو کر لڑتا ہوں لیکن مالِ غنیمت کی تقسیم کے موقعہ پر کنارہ کش ہو جاتا ہوں"۔

اسی لئے جہاں جہاں انھوں نے اپنی بات رکھی وہ تلخ نوائی کے باوجود سنی گئی اور اثر انداز ہوئی، اس لئے کہ وہ کتاب وسنّت سے ماخوذ اور مولانا کے دل کی آواز اور اندرون کی صدا ہوتی تھی، جس کی تاثیر اور کشش ہر شبہ سے بالاتر ہے، مولانا زہد وتقویٰ کے اعلیٰ ترین مقام پر تھے پر ان کا زہد حقیقی تھا، دنیا سے بالکل ناآشنا اور اپنی ذات کے حصار میں چکّر لگا کر رہ جانیوالوں کا زہد نہیں تھا، مولانا نے مشرق ومغرب کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، اکابر واصاغر سے ملے تھے، وہ دنیا سے بخوبی آشنا تھے، ان کا زہد محرومی کا ردعمل نہیں تھا، دل کی پاکیزگی اور قلب ونظر کی شفافیت کا نتیجہ تھا۔

معاصر علماء، ادباء، داعیان، مفکرین ومصنفین میں مولانا کو اس لحاظ سے بھی برتری حاصل تھی کہ مولانا کی پوری زندگی علم وعمل، تقویٰ ودیانیت اور قول وفعل کی جامعیت کی بے مثال ورقابلِ رشک زندگی تھی، وہ سلف صالح کا جیتا جاگتا نمونہ اور تصویر تھے، ان کے ظاہر وباطن، گفتار وکردار، سیرت وصورت اور حرکات وسکنات ہر چیز سے اعتدال ٹپکتا تھا، باجماعت نماز کی پابندی اور اس کیلئے تڑپ، حمیت وحمایتِ دین اور اعلاء کلمۃ الحق میں بھی انکو امتیاز حاصل تھا۔

مولانا کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے اساتذہ اور محسنوں کے کرم واحسان کا اعتراف واظہار کرتے رہے اپنی محسن کتابوں (جن میں قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی "رحمۃ للعالمین" سرِفہرست ہے) اور محسن افراد (جن میں ان کے برادرِ بزرگ اور اصل مربّی ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحبؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ وغیرہ سرفہرست ہیں) کا ہمیشہ برملا ذکر خیر کرتے رہے،

جن کتابوں اور شخصیات سے وہ متأثر رہے ان کا بھی ذکر کیا، ان کتابوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی "اظہار الحق" مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی "حیاۃ الصحابہ" اور شخصیات میں مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت رائے پوریؒ، حضرت مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، علامہ اقبالؒ مفتی امین الحسینیؒ، شیخ حسن البناءؒ اور سید قطب شہیدؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا کی آفاقیت، ہمہ گیری، جامعیت اور عالمیت ان کا بڑا امتیازی وصف ہے جو بہت کم کسی کے حصہ میں آپاتا ہے، مولانا کی علمی و دعوتی و فکری سرگرمیوں، خدمات و تصانیف کی کثرت اور تنوع ان کے وقت کی برکت کا ثبوت ہے، ورنہ خدمات کی وسعت کا وقت سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے، لیکن مولانا ان اولیاءِ صالحین میں تھے جن کے ہمراہ برکت و رحمت ہوتی ہے اور لمبا کام تھوڑے سے وقت میں وہ کر لیتے ہیں، آیاتِ قرآنی اور احادیث ہر موقعہ پر مولانا کیلئے توجہ کا مرکز بنی رہیں، بہت سی ایسی حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی جو عرصہ سے پردہ میں پڑی ہوئی تھیں، مولانا کی دعوتی سرگرمیوں خصوصاً خطبات میں قرآن کی آیت "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" (اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ) حضرت ربعی بن عامرؓ کا رستم کے دربار میں تاریخی جملہ "اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد إلیٰ عبادۃ اللہ و من جور الادیان إلیٰ عدل الإسلام" ومن ضیق الدنیا إلیٰ سعۃ الدنیا والآخرۃ (اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم چاہنے والوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دیں دیگر مذاہب کے ظلم و بربریت سے اسلام کے دامانِ عدل میں پناہ دیں اور دنیا کی تنگیوں اور کشاکشوں سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتیں اور فراخیاں عطا کریں) اور حضرت صدیق اکبرؓ کا تاریخی فقرہ "أینقص الدین وأنا حیّ (کیا میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہو سکتی ہے) اور حضرت علیؓ کا مشہور جملہ "کلموا الناس علی قدر عقولھم" (لوگوں سے ان کے عقلی مدارج کا لحاظ کرتے ہوئے گفتگو کرو) سے خوب خوب استدلال و اقتباس ملتا ہے۔

مذہبی، فکری، اور فروعی اختلافات سے مکمل گریز، اتحاد بین المسلمین کی ہر طرح سے

جدوجہد میں بھی مولانا کا ثانی ملنا مشکل ہے، مولانا نے بڑی سادہ اور متواضعانہ زندگی گذاری ہے اپنے تو اپنے غیروں سے بھی انکا اچھا برتاؤ اور حسنِ سلوک ان کی عالی ظرفی کی واضح دلیل تھی۔

مولانا اس پر ایمان رکھتے تھے کہ :۔

؎ آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

انھوں نے ہمیشہ یہ فکر رکھی کہ سب کا بھلا ہو جائے، کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے، بڑی احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھا گویا :۔

؎ تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کبھی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

مولانا کا توسّع، رواداری اور اعتدال ضرب المثل ہے۔

ان کا مسلک فقہِ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ ہی کی پیروی تھا، جس پر وہ ہمیشہ عامل رہے، اور کبھی انحراف نہیں کیا، بلکہ بے جا تعصب اور تشدد سے کوسوں دور رہے، مولانا کی زندگی کے آخری دہے میں خاص طور سے ایک غیر معتدل فرقے نے مسلک حنفی کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے شد و مد سے مولانا کو اپنا نشانہ بنایا، انھیں ضال اور کافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا گیا، انھیں قبر پرست بھی ثابت کیا گیا، تصوّف کی مخالفت میں انھیں صوفی کہہ کر سب و شتم کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا، کتابیں بھی آئیں، بعض نے تو انھیں منافق بھی ثابت کرنا چاہا اور "موحدٌ فی العرب و مشرکٌ فی الہند" (عرب کا موحد اور ہندوستان کا مشرک) تک کہہ ڈالا جس سے مولانا کو قلبی اذیت بھی پہونچی، جبکہ مولانا کا تعلق ایسے خاندانِ عالی مقام سے تھا جو صدیوں سے توحید کے عقیدۂ خالص، کامل اتباعِ سنّت اور ائمۂ سلف سے پوری عقیدت اور ان کے اعتراف و احترام کا خوگر چلا آرہا ہے خود مولانا نے اپنے استاد خلیل عرب صاحبؒ سے بے انتہا فائدہ اٹھایا اور بہت کچھ استفادہ کیا جو مسالک اربعہ میں سے کسی مسلک پر عامل نہیں تھے، اسی طرح اہل حدیث کے معاصر علماء و شیوخ سے احترام و محبت کا معاملہ

بھی مولانا نے کیا، خصوصاً محدث کبیر علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری کی شرح ترمذی "تحفۃ الاحوذی" سے بھی مولانا نے فائدہ اٹھایا اور ان سے سند حدیث بھی مولانا کو حاصل ہوئی۔

لیکن جب مسالکِ اربعہ اور تقلید ائمہ کے خلاف (جس میں اپنی شہرت اور اشاعت کی وجہ سے مسلکِ حنفی ہی خاص نشانہ بنا) ایک خاص مہم شروع ہوئی اور تقلید کو بدعت، تعلیماتِ اسلام کی مخالفت اور ضلالت قرار دیے جانے کی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ اس مہم کے خلاف کوئی مخالفانہ اور مقابلانہ مہم شروع کرنے کے بجائے (جس میں مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا ہونے کا خوف ہو) حضرات علماء الحدیث کو ایک داعیانہ و مخلصانہ خط لکھیں جس میں ان کو "جہاد فی غیر جہاد و نضال فی غیر مدد (بے موقع جہاد اور دشمن کے بغیر لڑائی) سے بچانے کی کوشش ہو مولانا نے یہ مکتوب عربی میں مرتب کیا، اور دس ممتاز و نامور عرب سلفی علماء کے پاس بھیجا، اس میں مولانا نے وقت کی نزاکت اور معنوی نسل کشی کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اصل توجہ و توانائی حقیقی دشمن اور سنگین خطرہ کے مقابلہ پر صرف کرنے کی دعوت دی، اس میں یہ بھی لکھا کہ "احناف کے خلاف جد و جہد اور جنگ شروع کرنے کے بجائے اس کی شدید ضرورت ہے کہ مشرکانہ عقائد و اعمال کے خلاف پوری توجہ اور پوری طاقت لگا دی جائے۔" (۱)

اس مراسلہ کا جواب شیخ بن باز نے بھی دیا جس میں انہوں نے ائمہ اربعہ کی واضح الفاظ میں تعریف و اعتراف اور تقلید کے بے کم و کاست جواز و صحت کا ذکر کیا ہے۔

لیکن مولانا نے اپنے اوپر کئے گئے ان حملوں سے تکلیف کا برملا اظہار کبھی نہیں کیا جو ان کے صبر و تحمل اور حلم و درگذر کا ثبوت ہے، اس تفصیل کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ابھی حال ہی میں ایک نئی کتاب "مولانا علی میاں اور علم حدیث" آئی ہے، جس کے مصنف مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء ہیں، موصوف کا تعلق بھی اسی فرقہ سے ہے جس کا ذکر چل رہا ہے، انھوں نے اپنی کتاب میں ایک نیا انکشاف کیا ہے، اور مولانا علی میاںؒ کو غیر مقلد ثابت کرنا چاہا ہے، اور اس کیلئے عامل بالحدیث کا لفظ استعمال کیا ہے، مولانا ابوسحبان ندوی نے

اس کی ایک دلیل یہ بیان کی ہے کہ :-

"شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کے درس نے مولانا علی میاں کے فکر و خیال میں وسعت پیدا کی اور عمل بالحدیث کی راہ آسان کر دی"۔ (۲)

ہم بڑے ادب سے ان سے عرض کریں گے کہ مولانا حیدر حسن خاں کے بارے میں خود مولانا علی میاں نے یہ لکھا ہے کہ وہ متصلب حنفی تھے، مسلک حنفی سے ان کی عقیدت عقیدہ کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، اور اس کے نتیجہ میں بسا اوقات مسلکِ حنفی کے ناقدین کے حق میں ذرا سخت اور تنقید و شکوہ و احتجاج کے الفاظ بھی ان کی زبان سے نکل جایا کرتے تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ حدیث اور اتباع حدیث پر بھی کم زور نہ دیتے تھے (۳) یہ جذبہ مولانا کے اندر بھی منتقل ہوا تھا۔ (متعدد واقعات اس کی دلیل کے طور پر ناچیز کے علم میں ہیں جو اس مختصر مضمون میں طوالت کا موجب ہوں گے) عمل بالحدیث کے ہم بھی داعی اور قائل ہیں اور کون سا مسلمان ایسا ہے جو حدیث پر عمل سے گریزاں اور مخالف ہو۔ لیکن مسلک حنفی کی بنیادیں بھی تو احادیث رسولؐ پر استوار ہوئی ہیں مولانا اس لحاظ سے تو واقعی عاملین بالحدیث کی صف میں شامل رہے، لیکن عمل بالحدیث کا وہ مفروضہ اور مخترعہ شکلیں جو فی زمانہ ایک خاص حلقہ میں معیارِ حق و باطل اور میزان و کسوٹی بنا دی گئی ہیں اور جن سے سرِ مو انحراف بھی کفر سے کسی طرح کم نہیں مانا جاتا (اور مولانا علی میاںؒ اسی لئے نشانہ تنقید و تشنیع بنے رہے) مولانا ان سے کوسوں دور اور بیزار تھے اور کوئی ایک مثال بھی اسکی تائید میں پیش نہیں کی جاسکتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا نے وحدتِ امت کا خیال رکھتے ہوئے ہمیشہ اس طبقہ سے بھی اپنے آپ کو مربوط رکھا، مولانا کی ذات والا صفات سے اس طبقہ کو بڑے فوائد بھی پہونچے جن کی تفصیل ہم کرنا نہیں چاہتے۔

یہ مولانا کا ظرف تھا جس میں سمندر کی سی وسعتیں اور گہرائیاں تھیں، مگر جانبِ ثانی کا ظرف بھی ملاحظہ ہو کہ پھر بھی تکفیر و تضلیل سے کم پر قناعت نہیں کیا یہی عمل بالحدیث ہے؟ کیا یہ "مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ" (جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کیا وہ اللہ کا شکر گذار بھی نہ ہوا) پر عمل ہے؟

کیا یہ ان احادیث پر عمل ہے جن میں فرمایا گیا ہے "من دعا رجلا بالکفر او قال عدو اللہ ولیس کذلک الا حار علیہ" (جس نے کسی انسان کو کافر یا دشمن خدا کہہ کر بلایا اور واقع میں نہ وہ کافر ہے اور نہ دشمن خدا تو یہ کہنا کہنے والے پر لوٹ جائے گا) ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔

محترم مولانا ابوسحبان صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"غالباً مولانا علی میاں اپنے اسی توسع کی وجہ سے ابویحییٰ امام خاں نوشہروی (متوفی ۱۳۸۶ھ) کی مشہور کتاب "تراجم علمائے اہل حدیث ہند" میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے" (۴)

ہم مولانا سے پوچھتے ہیں کہ پھر اسکی کیا توجیہ کی جائے گی جو طوفانِ بدتمیزی آپ کے حلقہ سے مولانا کے خلاف برپا کیا گیا اور مجروح کرنے میں سارا زور لگا دیا گیا، آپ اگر مولانا کو واقعی عامل بالحدیث سمجھتے ہیں تو اس نازک موقعہ پر آپ کو آگے بڑھ کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ انجام دینا چاہئے تھا کہ یہ بھی تو قرآن کریم اور ان احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جن پر تن تنہا عمل کرنے کا دعویٰ آپ کی جماعت کو ہے، آپ کو میدان میں آکر اس تکفیری مہم کو یہ کہہ کر روکنا چاہئے تھا کہ مولانا عامل بالحدیث ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کے دل میں عمل بالحدیث کا جو مفہوم عدمِ تقلید کے نام پر بیٹھا ہوا ہے، آپ خود سمجھتے تھے کہ یہ مولانا کا کبھی وصف نہیں رہا، بلکہ مولانا حنفی رہے، اسی لئے آپ نے سکوت کا التزام کیا۔

حقیقت یہی ہے کہ شہادت حق بہت پرخطر وادی ہے جہاں قدم رکھنے کیلئے ثبات واستقامت اور توفیق ربانی کی ضرورت پڑتی ہے اور اس راہ میں اکثر لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

ہمیں حیرت واستعجاب ہے کہ مولانا ابوسحبان ندوی کی یہ کتاب ندوۃ العلماء کے مؤقر ادارہ "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے طبع ہوئی ہے جس کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس ذہنی وفکری ارتداد کے مقابلہ اور روک تھام کیلئے قائم کیا تھا جس کے اثرات بد سے ایک عالم متاثر

ہو رہا تھا، اس ادارہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ باہمی نزاع کو ہوا دی جائے، نہ ہی اسلئے تھا کہ حق وصداقت سے دور کا واسطہ نہ رکھنے والے خیالات کی اشاعت کی جائے، مولانا ابوسحبان ندوی کی یہ کتاب مولانا علی میاں کا غلط تعارف پیش کرتی ہے، ہم بڑے ادب سے ذمہ دارانِ مجلس سے اس مسئلہ پر نظر ثانی کی درخواست کرتے ہیں اور مولانا ابوسحبان کو وہ دن یاد دلاتے ہیں جو بہت جلد آنیوالا ہے، جب ہر شخص اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگا اور اس وقت خوبصورت الفاظ اور حسین توجیہات کی دیواریں گر جائیں گی اور حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

حضرت مولانا علی میاں کی تصنیفات وخطبات میں ایمانی صلابت اور روحانی بلندی کیساتھ اعتدال وتوازن کا امتزاج ان کی ایک انفرادی خصوصیت ہے، اپنی زبان وقلم سے انھوں نے کبھی کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہونچائی، ان کی خلوت وجلوت میں کسی کی غیبت ان سے نہیں سنی گئی۔ ہاں! مگر حق کا برملا اعلان وہ پوری قوت وصراحت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر موقعہ پر کرتے رہے اور اس میں کسی مداہنت کا شائبہ تک ان کے دل میں نہ آیا یہی دراصل ایک بندۂ مومن کا امتیاز ہے اور یہی اس کے کمال کی دلیل ہے۔

بدو شعور کے بعد سے زندگی کے آخری لمحہ تک دعوتی سرگرمیوں میں اشتغال وانہماک، عربی زبان میں بے مثال مہارت وقدرت اور اس صلاحیت کا صرف دعوت کیلئے استعمال، اظہارِ حق میں بیباکی اور لومۃ لائم سے بالکل بے خوفی، صحیح عقیدہ وفکر، توحید خالص، ایمانِ راسخ اور قرآن وسنت پر مکمل اعتماد، تمام مشاہیر اہل کمال اور معاصرین کے نزدیک محبوبیت، اعتماد اور مقبولیت، پاکیزگیٔ باطن، عفتِ ضمیر وزبان، جود وزہد، استقامت واستغناء، اسلام اور مسلمانوں کے تمام مسائل پر قلق وکرب اور ان کے حل کی تڑپ وتمنا، فکر وعمل میں راستی، پوری انسانیت کو محبت واتحاد کا پیغام اور خیر خواہانہ جذبات، آزادانہ اعتراف حق، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی کوشش، اخلاص وفنائیت، اصول ومقاصد میں تصلّب اور فروع ووسائل میں توسّع، حقیقت پسندی ودور اندیشی بصارت وبصیرت، حکمت وفراست، ایمان کامل، یقینِ محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم اور ان جیسے

نہ جانے کتنے بلند پایہ اوصاف و امتیازات مولانا کی زندگی، سیرت و کردار اور سرگرمیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی غیرتِ ایمانی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ عقیدہ و مذہب میں کسی قسم کی توہین اور حرمت کی پامالی ان سے کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی، اسی لئے قادیانیوں اور شیعوں کے خلاف بھی مولانا نے لکھا (اس کیلئے "صورتان متضادتان" اور "القادیانی والقادیانیۃ" دیکھی جا سکتی ہے) فکر کو صحیح رخ دینے کیلئے "اضواء" (بصائر) اور "التفسیر السیاسی للاسلام" (عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح) لکھی اور عرب قومیت، ذہنی ارتداد، لسانی و تہذیبی تعصب اور تمام خطرناک چیزوں کے خلاف آواز اٹھائی، مگر اسلوب بیان اور طرزِ کلام ہر جگہ مثبت اور تعمیری رہا، ایران تشریف لے گئے تو وہاں اپنے ایک خطاب میں فرمایا:-

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا وہ خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا ہے

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل، ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا، فروغِ وادیِ سینا" (۵)

انسانیت کے احترام کی صدا بھی مولانا نے بڑے زور و شور سے لگائی اور "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔)

کو ہمیشہ مطمحِ نظر بنائے رکھا۔

محبین و معتقدین کے ہجوم بے پناہ اور ذاتی مقبولیت نے کبھی ان کے دل میں عجب و تکبر پیدا نہ ہونے دیا یہ ان کے اکابر خصوصاً ان کی مشفق ماں کی آہِ سحر گاہی اور حکیمانہ تربیت کا نتیجہ تھا، تواضع و بے نفسی اور حلم و کرم سے ان کی محبوبیت و مقبولیت روز افزوں ہوتی رہی۔

ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی اسلامی درخشاں تاریخ پوری تفصیل سے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ عرب کے سامنے رکھی اور انھیں واقف کرایا۔ اس سے پہلے عربی میں یہ کام اس انداز میں نہیں ہو سکا تھا۔

مولانا عالم اسلام میں تعلیمی و تربیتی نظام کو ترقی دینے، نیز جدید وسائل سے استفادہ و فروغ کی صدا ہمیشہ لگاتے رہے، انھوں نے نظام اسلامی کے قیام و نفاذ کی یہ دانشمندانہ تجویز رکھی کہ اسکا بہترین ذریعہ اور راستہ یہ ہے کہ ایمان اہلِ حکومت تک پہونچا دیا جائے، انھیں دین سے قریب کیا جائے، ذہن و دماغ اسلامی بنائے جائیں، یہ راستہ اس کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب اور مؤثر ہے کہ خود اہلِ ایمان کرسی تک پہونچیں اور حکومت کی ذمہ داریاں براہِ راست سنبھال کر ایمان سے دور حکمرانوں کو بے دخل اور برطرف کر دیں، کامیابی اسی میں ہے کہ غیر اسلامی حکام تک اسلام کی صدا اتنے مؤثر انداز میں پہونچائی جائے کہ وہ اسے سننے اور اس کے مطابق چلنے پر مجبور بلکہ راضی ہو جائیں۔

جدید علم کلام کو آگے بڑھانے میں اس صدی میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے جو گراں قدر خدمات اپنی تالیفات، دعوتی سرگرمیوں اور خطبات کے ذریعہ انجام دی ہیں، شاید ان میں ان کا کوئی ثانی نہ مل سکے، حضرت مولانا کا کام اس سلسلہ بہت وسیع، ہمہ گیر اور جامع نظر آتا ہے، ان کی سیکڑوں تالیفات عرب و عجم کو یکساں دعوت و تبلیغ، ملکی و بیرونی تبلیغی و دعوتی اسفار، کانفرنسوں و سمیناروں میں شرکت، متعدد و مختلف النوع تحریکات کی قیادت و رکنیت اور خطبات و مواعظ یہ سب مولاناؒ کی جامعیت اور ہمہ گیری کے

شاہد عدل ہیں۔

ہندوستان و مختلف ممالک کے سربراہان، وزراء و اعیان بارہا مولانا کے دربار میں حاضر ہوئے ان کی مقناطیسی شخصیت بارہا ملک کے ہر بااثر سیاستداں کو ان کی چوکھٹ پر کھینچ لائی اور ہر بار عربی کے اس طاقتور شعر کی تصدیق سامنے آئی

ے ان الملوك ليحكمون على الورى

وعلى الملوك لتحكم العلماء

"بادشاہوں کی حکومت خلق خدا پر ہوتی ہے اور بادشاہوں پر حکومت علماء ربانیین کی ہوتی ہے"۔

حضرت مولانا کے فکر و عمل کی اتنی جہتیں ہیں کہ انھیں الفاظ میں یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا اور ہر جہت ایسی حسین و دلربا ہے کہ ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست۔

عرب شاعر نے بھی اسی حقیقت کو بیان کیا ہے

ے من كثرة الأخبار من مكرماته

يمر به صنف ويأتي به صنف۔

"یعنی اس کے مکارم گوناگوں اور اس قدر کثیر ہیں کہ ایک کا ذکر چھڑتا ہے تو دوسرا چلا آتا ہے"۔

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کمالات و نقائص دونوں کے مشترکہ خمیر سے گندھا ہوا ہے، اس میں بشری خامیاں بہرحال موجود ہوتی ہیں، لیکن ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ایک بندۂ مومن کو جو اوصاف و کمالات فرشتوں کے مشابہ اور قریب کر دیتے ہیں، وہ سب حضرت مولانا علی میاں میں بدرجۂ اتم موجود تھے

ے فرشتوں سے مشکل ہے انسان بننا

کہ پڑتی ہے اس میں محنت زیادہ

مولانا ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے میر کارواں تھے اور ایک میر کارواں کے لئے جو خصوصیات درکار ہوتی ہیں، وہ مولانا میں بڑی خوش اسلوبی سے جمع ہو گئی تھیں۔

بقولِ اقبال :-

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

حواشی

۱۔ کاروان زندگی ہفتم ص۱۸۔
۲۔ مولانا علی میاں اور علم حدیث از :- مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی ص۳۶۔
۳۔ پرانے چراغ اوّل ص۱۹۳ و ص۱۹۴ مختصراً۔
۴۔ مولانا علی میاں اور علم حدیث ص۳۷۔
۵۔ کاروانِ زندگی دوم ص۱۵۶۔

دعوت اسلامی کے میدان میں

حضرت مولانا علی میاںؒ

کی سرگرمیاں اور طریقۂ کار

از مولانا محمد اسجد قاسمی، ندوی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

حضرت مولانا علی میاںؒ کی پوری زندگی دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے مسائل و مشاکل کے حل اور خاتمہ کی کوششوں میں صرف ہوئی ہے، اور ہر جگہ قرآن کریم کے اس بیان کردہ اصول و خطوط کو حرز جاں بنائے اور سینہ سے لگانے کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے، ادع إلى سبيل ربك بالحكمت والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن، (اے نبی ﷺ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے اور لوگوں سے ایسے طریقہ پر مباحثہ کریئے جو بہترین ہو) مولانا نے اپنی دعوتی سرگرمیوں کے لئے جو نہج اور طریقۂ کار اختیار فرمایا اور اس پر تا حیات قائم رہے وہ تشدد و شدت اور ٹکراؤ کا نہیں تھا، اسکا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اس میں تدریج و حکمت اور مصلحت کی پوری رعایت شامل تھی، اس میں تربیت، افراد سازی، ذہن سازی خیر خواہی اور اخلاص کے تمام عناصر ملتے ہیں۔

دعوت کا یہ منہج مولاناؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اُخذ کیا تھا جسے مولانا دعوت کے تمام مناہج میں افضل اور معتدل قرار دیا کرتے تھے اسکی توضیح مولاناؒ نے اپنے ایک رسالہ "منهج أفضل في الإصلاح للدعاة والعلماء" میں فرمائی ہے۔

اس تفصیلی مضمون کا خلاصہ یوں ہے کہ جب مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے اسلام کو مٹانے

بلکہ دفن کرنے کی ساری کوششیں شروع کردیں اور نئے دین کو رائج کردیا، خود نبوت کا دعویٰ کردیا، برہمنوں کے عقائد و عادات سے بیحد متاثر ہو کر ان کی نقل شروع کردی اور ان سے تعلق خاطر اتنا بڑھتا گیا کہ وہ تمام امور میں دخیل ہونے لگے اس وقت صورتحال یہ ہوگئی تھی کہ اسلام مظلوم ہوگیا تھا اور اسے یتیمی کا داغ سہنا پڑ رہا تھا، یہ ہندوستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور تھا جو اگر کچھ لمبے عرصہ تک باقی رہ جاتا تو اس ملک میں شاید کوئی اسلام کا نام لیوا باقی نہ بچتا اس سنگین فضا میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اٹھے اور کلمۂ حق بلند کیا امراء وزراء کو خطوط لکھے جن کے اسلوب کی بلاغت و حلاوت اور نرمی و سہولت سے مکمل افہام و تفہیم بیحد مؤثر ثابت ہوئی، ان خطوط میں شیرینی اور تلخی، نرمی و سختی اور شدت و لین کا امتزاج بلاشبہ مجدد صاحبؒ کی غیرت و حمیت اور رعایت حکمت و مصلحت کا بین ثبوت ہے، مجدد صاحبؒ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، اور بغاوت برپا کرنے کا کوئی خیال تک ان کے دل میں نہ آیا کہ یہ کفر کے لئے مزید راستہ ہموار کرنا ہو سکتا تھا، چنانچہ وہ اپنی اسی حکیمانہ روش کے مطابق اصلاح و تبدیلی کی کوششوں میں سرگرم رہے، رفتہ رفتہ اثرات بڑھے اور جہانگیر کے زمانہ میں یہ کوشش کامیاب ہوئی اور اکبر کا گمراہ کن نظام و عقیدہ دفن کردیا گیا۔

مجدد صاحبؒ کے اس طریقۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے مولاناؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ موجودہ انقلابی اور پر فتن دور میں اسے اختیار کرنے کی ضرورت و اہمیت سب سے زیادہ ہے، خاص طور پر اس طبقہ کو اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے جو سیاسی قوتوں، حکومتوں اور جماعتوں کو چیلنج کرنے، ان کے خلاف اعلان جنگ کرنے کی اپنی سرگرمیوں میں کسی قسم کی نرم روئی، حکمت و مصلحت پسندی، ذہن سازی، تیاری اور تدریجی مراحل کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا، اس طرح کی بیجا شدت پسندی بسا اوقات مثبت دعوتی اور عملی کاموں کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

مجدد صاحبؒ کا طریقۂ کار جو اصلاً قرآن سے ماخوذ ہے بڑی افادیت و اہمیت کا حامل ہے، اور آغاز ہی سے وہ دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں کامیاب، قابل اعتماد اور مؤثر ثابت ہوتا رہا ہے۔(۱)

مولاناؒ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جابجا اسکی تاکید فرمائی ہے کہ دعوت اسلامی کا کام

کرنے والے افراد اور جماعتوں کو جلد بازی اور سارے مرحلوں سے بیک وقت گذر جانے کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑے گا، یہ حقیقت ہے کہ حکیمانہ دعوت اور عوام کے دلوں میں ایمانیات واساسیات کو بٹھانے اور جمانے کا مرحلہ سیاست وحکومت اور انتظام کے مراحل سے بدرجہا مقدم اور بنیادی ہے، اور یہ پہلا مرحلہ اگر مستقل جاری رہے اور داعیان اس کے لئے بالکل سرگرم بلکہ فنا ہو جائیں تب کہیں جاکر دوسرے مراحل میں کامیابی ملتی ہے اور اچھا اور خاطر خواہ نتیجہ سامنے آتا ہے، لیکن دعوت اسلامی کے عاملین ہی اگر جلد بازی کا شکار ہو کر اس اساسی مرحلہ سے اچٹتے ہوئے گذر جائیں اور قوم کی تربیت، ذہن سازی اور کردار سازی کے بغیر سیاست وحکومت کے مراحل تک فوراً پہونچنا چاہیں تو نہ تو کامیابی کی ضمانت لی جاسکتی ہے اور نہ ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں(۲)

دعوت کا یہ طریقۂ کار قرآن کریم اور سیرت رسول سے مستفاد ہے جسکو مجددین اور مصلحین ہر دور میں اپناتے رہے ہیں، حضرت مولانا علی میاںؒ کی علمی اور دعوتی زندگی میں اس نہج قرآنی کا التزام ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ عرب ممالک اور دیگر اسلامی ممالک کے سربراہوں، ذمہ داروں، امراء واعیان سے مولانا کی گفتگو، طرز خطاب، خطوط ومکاتیب اور دعوت واصلاح کی کوششوں سے اسکا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بعینہ اسی طرح کا حکیمانہ طریقۂ کار ہے جو مجدد الف ثانیؒ نے اختیار فرمایا تھا اور جسکی تائید قرآن وسنت سے ہوتی ہے، اس میں انذار وآگاہی، خطرات کی نشاندھی اور اصلاح وتبدیلی کے جذبات کے ساتھ ساتھ حکمت ومصلحت کی رعایت، مسائل ومشاکل کے اسلامی معتدل حل، نرم خوئی اور خیر خواہی کے جذبات بھی ملتے ہیں، امراء وسربراہان اور لیڈران وقائدین کی رہنمائی اور خیر خواہانہ اصلاح کا یہ کام مولانا کی دعوتی سرگرمیوں کا ایک اہم باب ہے، مولاناؒ نے براہ راست گفتگو ملاقاتوں، خطوط ورسائل اور اپنی تصانیف کے ذریعہ یہ خدمت انجام دی، اصلاً یہ اُس حدیث پر عمل تھا جس میں "ائمہ مسلمین" کے ساتھ خیر خواہی ونصح کا ذکر آیا ہے۔ النصیحة للله ولرسوله ولکتابه ولائمة المسلمین وعامتهم۔ اس خدمت میں مولانا کا اخلاص قابل رشک ہے جس میں کسی قسم کے مادی فوائد اور معاوضوں کا تصور بھی نہیں ملتا۔ بہر حال مولانا کی اس بے لوث خدمت سے ان کی فکر کی

بلندی، دل کی پاکیزگی اور جذبات واحساسات کی سلامتی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، تحریک پیام انسانیت (جس کے قائد اور روح رواں مولاناہی تھے اور جو معترضین وناقدین کی فضول گوئیوں اور غیر معتدل تاثرات کے باوجود اپنی نوعیت کی پہلی، مؤثر اور وقت کی بیحد اہم اور ضروری تحریک ہے) کے پلیٹ فارم سے مولانا نے طبقاتی اور فرقہ وارانہ کشمکش ختم کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو قریب آنے کی دعوت دی، اجتماعی اور سماجی مشکلات کا جائزہ لیا اور ان کا اسلامی حل پیش کیا، مل جل کر قوم وطن کے مفاد میں تعمیری کام کرنے کا جذبہ ابھارا اور غیر مسلموں کے سلسلہ میں اسلام کی پاکیزہ اور بلند پایہ تعلیمات اور اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور پوری طرح مدارات، حسن اخلاق اور باہمی اتحاد کی دعوت دی، مولانا کی اس دعوت انسانی میں وہی حکمت و تدریج کار فرما معلوم ہوتی ہے جو اسلام کے پیغام انسانی و اجتماعی اور رسول ﷺ کے عمل سے مستفاد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہی دعوت کا حاصل اور مقتضائے مصلحت ہے، مولاناؒ نے اپنی دعوت میں تقریباً تمام مؤثر وسائل دعوت کو اختیار فرمایا ہے جن کی کچھ تفصیلات ملاحظ ہوں۔

۱- یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عمل میں وہ قوت و تاثیر ہے جو الفاظ میں نہیں، دعوت واصلاح کے ہزاروں مضامین، مقالوں اور تقریروں کے مقابلہ میں عملی مظاہرہ و نمونہ بے انتہا کامیاب ومؤثر ثابت ہوتا ہے، اور ایسا تو مشاہدہ میں آئے دن آتا رہتا ہے کہ خوش کلام مگر بد عمل افراد کی دعوت واصلاح کی کوششیں بالکل بے اثر اور بے فیض ہو جاتی ہیں، کامیاب وبامراد داعی وہی ہوتا ہے جو اپنے عملی نمونوں سے اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہو جائے اور اثر پیدا کر دے اگرچہ اسکی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو، مولاناؒ نے عملی نمونہ کے ذریعہ سے تربیت واصلاح اور دعوت کے کام کو سب سے اہم اور مؤثر دعوتی وسیلہ سمجھا اور داعیوں کیلئے اسکی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے (۳) خود مولاناؒ کی دعوتی سرگرمیوں میں اس اہم وسیلہ دعوت کا التزام ملتا ہے، مولانا کا زہد واستغناء، سادگی، متاع دنیا سے بے انتہا بعد و بیزاری اور مخلصانہ بے لوث و بے صلہ خدمت و دعوت اسکی واضح دلیل اور مولانا کا نمایاں امتیاز ہے، اسی کا اثر تھا کہ اصلاح ودعوت، بے لاگ تنقید و تبصرہ اور روک ٹوک، مداہنت اور باطل کو برداشت نہ کر سکنے اور

حقائق کو واشگاف کرنے میں مولانا کو کبھی کوئی باک نہ ہوا اور نہ ہی لومت لائم کا خوف کبھی دامن گیر ہو کر ان کوششوں سے دستکش بنا سکا، بلکہ مولانا نے جہاں جہاں جو کچھ کہا اسکا اثر قبول کیا گیا، ان کی تلخ نوائیوں کے زہر نے ہمیشہ تریاقی کا کام کیا اور ہر حال میں وہ عزیز اور مقبول و محبوب رہے، (۴)

۲- وسائل دعوت میں مولاناؒ نے تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دی، مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ نئی پود کی صالحیت، افراد سازی اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے تعلیم و تربیت ہی کا سب سے اہم رول ہوتا ہے، مولانا نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا ہے، (۵) خود برصغیر کی عظیم و بے مثال درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک طویل عرصہ تک مولانا نے تعلیمی و تربیتی کارواں کی قیادت او سفینہ کی ناخدائی فرمائی ہے۔

۳- وعظ و تذکیر بھی ایک اہم وسیلہ دعوت ہے جو مولاناؒ کی تمام تحریروں، تقریروں، لکچرس، اسفار اور مختلف اور ہر سطح کے لوگوں سے ملاقاتوں میں بیحد نمایاں ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے تذکیر و وعظ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور یہ ایک دن بھی موقف نہ ہوا۔

۴- مولاناؒ اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل خاک کی آغوش میں ہونے والی تسبیح و مناجات سے بدرجہا بہتر ہے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے علمی و دعوتی جہاد ہزاروں نوافل، اعتکافوں اور عزلت پسندیوں سے افضل ہے، اسی گہرے ایمان و یقین اور فکر بلند کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نے عرب و عجم کا دورہ کیا، مغرب و مشرق کے میخانے دیکھے اور گوشے چھان ڈالے، قرآن کریم یہ آیت ہر جگہ ان کی توجہ کا مرکز اور نقطۂ التفات رہی۔ کنتم خیر أمۃ أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللّٰہ۔ (اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) چنانچہ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اشاعت دین کے جذبہ بے پناہ کے ساتھ مولانا نے مشرق و مغرب ہر جگہ نہ جانے کتنے مدارس، مساجد، مراکز اور اداروں کا سنگ بنیاد رکھا، تاسیس میں شریک ہوئے، نہ جانے کتنی تحریکوں میں حصہ لیا، نہ جانے کتنی کانفرنسوں، سمیناروں اور جلسوں میں مولانا بلائے گئے اور ہر جگہ مولاناؒ نے برملا بے خوف و خطر دعوت و اصلاح کی

صدا لگائی، - تیری آواز مکہ اور مدینہ - متعدد علمی و اسلامی اکیڈمیوں، تحریکوں اور اداروں کے قیام و تاسیس اور شرکت و تعاون کے راستہ سے بھی مولاناؒ نے دعوتی سرگرمیاں بڑھائیں، جن میں رابطۂ عالم اسلامی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مجمع علمی دمشق اور رابطۂ ادب اسلامی وغیرہ کے پروگراموں میں شرکت اور یورپ و ہندستان میں مختلف اسلامی اداروں اور تنظیموں کی ذمہ داری و قیادت کرتے ہوئے مولانا نے تا دمِ مرگ فکری، مذہبی اور معاشرتی مسائل کے تجزیہ و حل اور اصلاح و دعوت کا کام انجام دیا اور دعوتی سرگرمیوں کا راہ میں حائل تمام موانع اور رکاوٹوں کا حل تجویز کیا اور آخر تک اپنی دعوتی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروفِ عمل رہے اور ان کا طائر بلند پرواز بیماری، بڑھاپے اور کمزوری کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ اڑتا رہا اور بلند ہمت رہا:-

ومن تکن العلیاء ھمّة نفسه فکل الذی یلقاء فیها محبّب۔

جس کا مطمح نظر بلندیوں اور رفعتوں کو پہونچنا ہو اسے اس راہ کی ساری زحمتیں اور پریشانیاں عزیز اور محبوب ہوتی ہیں۔

۵- تصنیف و تالیف کے راستہ سے حضرت مولاناؒ کی دعوتی سرگرمیاں "عیاں راچہ بیاں" کا مصداق ہیں، مولانا کی سیکڑوں تصنیفات اور مضامین و مقالات ہیں جو اپنے موضوعات کی اہمیت و نزاکت اور موجودہ اہم مسائل کے تجزیہ و حل کے لحاظ سے منفرد شان رکھتے ہیں، ان تصانیف کے ذریعہ جو فکری اور روحانی خلا پُر ہوا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ کی تالیفات دعوت اسلامی اور ثقافتِ اسلامی کے میدان میں بنیادی مراجع و مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں ایک مؤرخ کی جامع عقلیت، ایک عالم کی دقتِ نظر اور تحقیق، ایک ادیب کی بلاغت و ادبیت اور ایک مخلص داعی کا جذبہ و حرارت سب کچھ جمع معلوم ہوتا ہے۔

۶- صحافت بھی مولاناؒ کی دعوتی کوششوں کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے، ۱۹۳۲ء میں ندوۃ العلماء کے عربی پرچہ "الضیاء" اور ۱۹۴۰ء میں اردو مجلّہ "الندوۃ" کی ادارت میں مولانا شریک رہے، ۱۹۴۸ء میں انجمن تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پرچہ "تعمیر" نکالنا شروع کیا، ۱۹۶۳ء میں ندائے ملت نکلنا

شروع ہوا تو اس کی سرپرستی اور نگرانی فرمائی، ندوۃ العلماء سے ۱۹۵۵ء میں البعث الاسلامی، ۱۹۵۹ء میں الرائد اور ۱۹۶۳ء میں تعمیر حیات جاری ہوا تو مولانا تاحیات ان کے ذمہ دار و سرپرست رہے، ہند و بیرون ہند کا غالباً کوئی ایسا اسلامی مجلہ اور اخبار نہیں ہے جس میں مولاناؒ کے چشم کشا مضامین و مقالات، تاثرات، انٹرویوز، افکار اور آراء طبع نہ ہوئی ہوں۔

۷- حضرت مولاناؒ کی تحریروں اور افکار کا بغور جائزہ لینے سے مولانا کا ایک واضح اور معتدل دعوتی منہج سامنے آتا ہے، میں، اپنے مختصر اور محدود مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس منہج کی اساسیات میں مندرجہ ذیل عناصر شامل ہیں:

۱- کتاب و سنت پر پورا اعتماد و انحصار:- علوم قرآن و تفسیر مولاناؒ کا پسندیدہ مضمون تھا، اس پر مولانا نے بڑی محنت فرمائی، شیخ التفسیر، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے پاس جاکر تفسیر میں تخصص کیا اور بڑی گہرائی سے قرآن کا مطالعہ فرمایا تھا، حدیث نبوی سے بھی مولانا کو بڑا شغف تھا، ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ اور دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مولانا نے علم حدیث حاصل کیا تھا، مولانا کی تمام تصنیفات اور دعوتی سرگرمیوں میں قرآن و حدیث سے شغف، اعتماد اور اخذ و اقتباس بیحد نمایاں نظر آتا ہے، کتاب و سنت سے مولانا کو کمال ایمان، توانائی اور روحانیت و برکت جیسی اہم نعمتیں نصیب ہوئیں۔

۲- مصلحین و مجددین کے طریقۂ کار کی پابندی:- ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مجددین نے جو حکیمانہ، تدریجی اور متوازن طریقۂ دعوت اپنایا تھا خاص طور سے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو اسلوب اختیار فرمایا تھا مولانا اس کے بڑے مداح اور مؤید تھے، یہ اسلوب بھی اصلاً کتاب و سنت سے مستفاد ہے اور اس میں افراط و تفریط اور بدعت کے بجائے اعتدال اور سنت کا اہتمام ملتا ہے، مولانا نے اپنی زندگی میں اسی کو اپنائے رکھا اور اسکے فائدے ہر جگہ محسوس ہوئے۔

۳- زمانہ کے تمام تغیرات اور مسائل و مشاکل سے باخبری اور تجزیہ:- مولانا اپنے زمانہ کے مسائل و انقلابات اور ان کے اثرات و نتائج سے کبھی بے خبر نہ رہے، ہمیشہ مسلمانوں سے متعلق تمام

مسائل کا بڑا ناقدانہ جائزہ لیا اور ہر موقعہ پر ان کی معتدل آراء اور افکار سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔

۴- تاریخ اقوام و ملل سے گہری واقفیت اور احاطہ :- مولاناؒ کی بیشتر تحریروں میں تاریخی واقعات، ان سے عبرت و موعظت کے نتائج اخذ کرنے اور ماضی کے گمراہ کن اور تباہ کن امور سے دور رکھنے اور ڈرانے کے مضامین ملتے ہیں، یہ چیز ان کی مقبول ترین معرکۃ الآراء تصنیف "ماذا خسر العالم" میں بڑی نمایاں ہے، مولاناؒ کے بقول وہ شروع سے تاریخ کے طالب علم رہے ہیں، اور ان کی اکثر تحریریں تاریخی موضوعات سے متعلق رہیں، انھیں اسلام کی سیاسی، فکری، علمی اور روحانی تاریخ کے ساتھ ہی یورپ کے قدیم وجدید فلسفوں اور مذاہب وادیان واقوام کی تاریخ کا گہرا علم اور مطالعہ تھا،(۶) اسی لئے تاریخی استدلالات کا عنصر مولاناؒ کی تحریروں اور دعوتی سرگرمیوں میں خوب ملتا ہے جو ان کے وسیع و عمیق مطالعہ قرآن اور کتاب اللہ سے قوتِ اخذ واقتباس کا بین ثبوت ہے۔

۵:- مغربی تہذیب کے بارے میں مولانا کا معتدل موقف :- مولانا نے اپنی زندگی میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا اصول اپنائے رکھا، صاف ستھری چیزیں اخذ کرنے اور آلودہ و بیکار چیزوں کو چھوڑنے کی مولانا نے ہمیشہ دعوت دی، مغربی تہذیب کے مفاسد و مفاتن پر بڑی سخت تنقید فرمائی اور اسکی اچھی چیزوں کو اخذ کرنے کی دعوت دی، مولانا اعتدال کے داعی اور اس پر عامل تھے، انھوں نے مغربی تہذیب سے بالکلیہ اجتناب یا مکمل تقلید کی دعوت کبھی نہیں دی بلکہ اس افراط و تفریط سے ہمیشہ گریزاں اور مخالف رہے، انھوں اہل مغرب سے ہمیشہ جاہلیت سے اسلام کی طرف آنے کی بات کہی اور نئی پود کو مغربی تہذیب کے سحر آفریں شرور و مفاسد سے دور رہنے کی تلقین کی(۷)

۶- عربوں کی اصلاح کا اہتمام :- یوں تو مولاناؒ کے دعوتی کاموں کی جولان گاہ مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، عرب بھی ہے اور عجم بھی، لیکن مولاناؒ نے عربوں کی اصلاح و دعوت کا اہتمام زیادہ فرمایا، ان کے مسائل پر بارہا قلم اٹھایا، تقریریں کیں اور انھیں سلجھانے اور حل کرنیکی کوششیں فرماتے رہے، وہ عرب کو روئے زمین کی سب سے زیادہ مستحق اکرام و مودّت قوم سمجھتے تھے، لیکن ان کے نزدیک اسلام و ایمان کا درجہ ہر چیز سے فائق تھا، مولاناؒ نے بارہا فرمایا اور جگہ جگہ لکھا ہے کہ اسلام و ایمان کی صلابت کے

ساتھ عرب سب سے زیادہ مستحق قیادت ہیں، انھیں اپنا یہ مقام سمجھنا اور یہ منصب سنبھالنا چاہئے۔(۸)

۷- اسلوب بیان کی بلاغت وادبیت:- ادب مولاناؒ کے نزدیک سب سے اہم وسیلۂ دعوت ہے، دعوتی کاموں میں مولانا کا تقریری و تحریری اسلوب بڑا ادیبانہ اور سحر آفریں ہے جو ہر موقعہ پر دلوں میں گھر کرتا، اثر کرتا اور آمادۂ عمل کرتا رہا ہے، یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے، قرآن وحدیث سے والہانہ شغف، وسعت مطالعہ اور جہد مسلسل نے مولاناؒ کو یہ امتیاز عطا کر دیا تھا، ان کی کوئی بات یا تحریر اس امتیازی جوہر سے خالی نہیں ہے، ان میں بے پناہ تاثیر اور کشش ہے اور یہ مولانا کے مخلص و بے لوث ہونے کی دلیل ہے اس لئے کہ یہ ان کے اندرون کی صدا ہوتی ہے اور ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

حضرت مولاناؒ کی رائے میں دعوتی سرگرمیوں میں تین اہم نکتوں کو پیش نظر اور مطمح نگاہ بنانا ضروری ہے، ہم مختصراً ان کا ذکر کرتے ہیں:(۹)

۱- عام لوگوں میں ایمان کے مبادی اور اساسیات کی تخم ریزی اور استحکام، عقائد واعمال، معاملات و اخلاق کی تصحیح، تذکیۂ نفس اور دعوت کا مرحلہ تنظیم، حصول اقتدار اور انتظامی امور کے مراحل سے پہلے کا درجہ رکھتا ہے، سارے مراحل سے تدریجی گذرنا ہی مفید ہوتا ہے، تدریج واعتدال میں منافع پورے حاصل ہوتے ہیں اور مقصد میں اچھی طرح کامیابی ہوتی ہے، لیکن اگر داعیان جلد بازی سے کام لیکر عوام اور قوم کی تربیت، ذہن سازی اور انھیں ڈھالے بغیر بیک وقت سیاست و حکومت کے مرحلہ کو حاصل کرنے ہی میں منہمک ہو کر اپنا سارا زور بازو صرف کر ڈالیں تو یہ جلد بازی مقصد کے حصول میں مخل ثابت ہوگی، نہ تو سارے فوائد مل سکیں گے اور نہ ہی منزل مقصود نصیب ہو سکے گی، دعوت اسلامی کے آغاز کی تاریخ اس سلسلہ کا بڑا اہم نمونہ ہے جس میں دعوت کا مرحلہ مکہ مکرمہ میں ۱۳ سال اور مدینہ منورہ میں ۱۰ سال کے طویل عرصہ کو محیط نظر آتا ہے، عہد رسالت میں حکومت وسیاست کی مدت دعوت کی مدت سے بیحد مختصر ہے، اس لئے تدریج واعتدال ہی خیر کا وہ پہلو ہے جو دعوت اسلامی

کی کامیابی اور تاثیر کے لے ایک فعال عنصر کا کام کرتا ہے۔

۲- ایسے افراد پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے جو پیغام دعوت کے سچے معنوں میں امین وحامل اور وارث ہوں، جو ہر شگاف پاٹ سکتے اور ہر خلا پر کر سکتے ہوں اور تربیت وتزکیہ کی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا سکتے ہوں، کوئی بھی تحریک، ادارہ اور دعوت اپنی قوت، مالی استحکام اور مضبوطی کے باوجود اگر افراد سازی کے میدان میں روز بروز قدم نہ بڑھاتی رہے تو یہ اسکے لئے خطرہ کا الارم ہے، اگر رجال کار ہی تیار نہ ہوں تو پرانے باصلاحیت افراد یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ ختم ہو کر اس تحریک و دعوت کو قلاش اور مفلس وبے مایہ چھوڑ جائیں گے، اسلئے رجال سازی کا کام دعوت کے اہم ترین نقاط میں شامل ہے۔

۳- دعوت اسلامی کے افراد کو قلب و روح کی غذا سے شاد کام اور سیراب کیا جانا بھی نہایت ضروری ہے، ان کا جوش عمل، وفور جذبات، حرارت ولگن اور شوق ونشاط حوصلہ افزائی کے ساتھ ہی اس غذاءِ قلبی وروحانی کا بڑی حد تک رہین منت ہے، یہ ان کی خرچ کی ہوئی صلاحیتوں کا نعم البدل ہے، انسان تو ایک جلتا ہوا چراغ ہے جس میں اگر تیل نہ ڈالا جائے تو اسے گل ہونا ہے، دعوت اسلامی کے کام کو گل ہونے اور سرد پڑنے سے بچانے کے لئے اس کے افراد کے دلوں کی آنچ تیز اور جذبات گرم کرنے پڑیں گے، تاکہ وہ ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہیں اور کبھی ان کے پاس سے اضمحلال، دل شکستگی اور کسر ہمت کا گذر ہی نہ ہو سکے۔ ایسا بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے دعوت دینی اور تحریک سیاسی کے کارکنان شروع میں بڑے بلند حوصلہ عالی ہمت اور اولوالعزم رہے مگر جب سخت حالات آئے، قید وبند یا دار ورسن کا مرحلہ آیا، اذیتوں میں مبتلا ہوئے۔ فوراً ہی ان کا جوش کافور اور حرارت سرد پڑ گئی، جذبات مردہ ہو گئے، حوصلہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے سفر میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے بلکہ بہت پیچھے ہٹتے گئے، حتی کہ بسا اوقات وہ بازاری لوگوں سے بھی گئے گذرے ہو گئے، تو صرف جوش وجذبات اور وقتی قربانیوں ہی میں کمال نہیں، اصل کمال تو استقلال اور بقاء ودوام میں، ظاہر ہے یہ جوہر بغیر روحانی تربیت، تزکیۂ قلب اور دلوں کو ذکرِ ایمانی اور حلاوتِ دینی سے معمور کئے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔

مولاناؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمیں اپنے دل ودماغ اور عقل وخرد کو پاکیزہ کر کے صرف اور

صرف دعوت اسلامی، خدمت و قربانی، اور لوگوں کو جاہلیت کی تیرگی سے اسلام کی تابانی میں لانے کی کوششوں کے لئے مخلصانہ سرگرم عمل ہو جانا چاہیئے، یہ ہماری ذمہ داری اور فرض منصبی ہے جس کی انجام دہی ضروری ہے۔(۱۰)

مولاناؒ کی ان آراء سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ترتیب کا لحاظ، مرحلہ بہ مرحلہ دعوت اسلامی کے کارواں کو آگے بڑھانا، تدریج و اعتدال کی رعایت، جلد بازی سے پرہیز اور حکمت مندانہ اقدامات کسی بھی دعوتی تحریک کی پوری کامیابی اور حصول مقصد کی ضمانت ہوتے ہیں۔

چند معاصر تحریکات و افراد کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ بڑے شدومد سے پھیلایا جارہا ہے کہ مولاناؒ نے خلافتِ اسلامیہ کی بحالی کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا اور نہ ہی تحریک چلائی اور نہ اس سمت میں مولانا مودودیؒ، حسن البنا شہیدؒ، سید قطب شہیدؒ وغیرہ کی طرح مولانا کا کوئی عملی کام سامنے آسکا۔

حاشاوکلاّ! یہ ایک بے بنیاد خیال ہے جس کے پیچھے فی الواقع جماعتی اور فرقہ پرستانہ عصبیت و جہالت کارفرما ہے، مولاناؒ کا کہنا اور کرنا صرف یہ تھا کہ وسائل و مقاصد میں نمایاں فرق ہوتا ہے جس کا لحاظ ضروری ہے، حکومت اصلاً مطلوب و مقصود نہیں ہے، بلکہ وہ وسیلہ ہے، اصل مقصود غلبۂ اسلام ہے جس کے لئے پہلے زمین تیار کرنی پڑتی ہے، مرحلہ بہ مرحلہ ہوتا ہے، تدریج و اعتدال ملحوظ رکھنا پڑتا ہے پھر کہیں جاکر اصل مقصد میسر آتا ہے، اسی طریقۂ کار میں کامیابی ہے، ورنہ جلد بازی میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں جو ناقابل تدارک ثابت ہوتے ہیں، اسلئے پہلا کام تو عوام اور قوم کو راسخ الایمان، صائب العقیدہ اور صالح بنانا ہے، ان میں ایمان و مذہب پر یقین کامل اور اعتماد پیدا کرنا ہے، اور اس سلسلہ میں اس طریقہ کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو رسول ﷺ نے اختیار فرمایا تھا۔ ہم بھی خلافت اسلامی کی بحالی کی کوشش کرنے والوں کے دل سے قدرداں ہیں، ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ انھوں نے کیا طریقۂ کار اپنایا اور بالآخر کیوں ناکام رہے؟ لیکن اس حقیقت کا اعتراف بہر حال سب کو ہے کہ مولانا علی میاںؒ کا طریقۂ کار حکمت نبوت سے ہم آہنگ ہے اور اس کی تاثیر اور سلامتی سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی رائے میں دعوت اسلامی کے مختلف بنیادی شعبے اور میدان عمل ہیں، اسکی تفصیل ان کی تحریروں اور تقریروں میں جابجا ملتی ہے، ذیل میں ہم چند اہم اور بنیادی شعبوں کا ذکر کرتے ہیں۔(۱۱)

۱- مسلمانوں میں دینی و مذہبی شعور، ایمانی استقامت اور جذبۂ عمل ابھارنے کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے، اخلاص، تصحیح عقائد، غیر اسلامی عادات و رسوم سے نفرت و بعد اور اسلام و مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور اس کے حل کی کوشش دعوت اسلامی کا اہم ترین شعبہ ہے۔

۲- نبی اکرم ﷺ سے روحانی، عقلی اور جذباتی تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرنا اور جان مال، اہل و عیال، عزت و منال اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبت و شیفتگی کا عام جذبہ بیدار کرنا بھی دعوت اسلامی کا عظیم شعبہ ہے۔

۳- اسلام کے مفہوم اور حقیقت دین کو تحریف و انحراف سے بالکلیہ محفوظ رکھنا، اسلامی حقائق و مفاہم کو جدید مغربی تصورات یا سیاسی و اقتصادی تعبیرات و صطلاحات کے تابع نہ ہونے دینا اور اسلام کی خالص سیاسی توضیح اور تفہیم و تشریح سے احتیاط برتنا بھی دعوت اسلامی کے دائرہ کار میں آتا ہے۔

۴- مہذب اور تعلیم یافتہ (Educated) طبقات اور عالم اسلامی میں فکری و تربیتی قیادت کے ذمہ داران اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے کارکنان اور صحافیوں کا اسلام کی صلاحیت، حقانیت اور تاثیر و قوت پر اعتماد پر بحال کرنا بھی دعوت اسلامی کا نازک شعبہ ہے، نئی پود خصوصاً عصری دانشگاہوں کے نونہالان کو اس حقیقت کا ایقان بیحد ضروری ہے کہ اسلام زمانہ کی ترقیات و انقلابات سے مرعوب و متاثر اور ہم نوا نہیں ہے، بلکہ وہ پورے کاروان انسانی کی قیادت اور رہبری کے لئے وجود پذیر ہوا ہے، وہ ایک مکمل اور مستقل نظام حیات اور ضابطۂ زندگی ہے، وہ عالی ترین افکار و مقاصد کا حامل ہے، اس کا پیام نوع بہ نوع ہے، تر و تازہ ہے، جاری و ساری ہے اور پوری دنیائے انسانیت کے لئے ہے وہ زندگی کی منجدھاروں اور گردابوں میں پھنسی کشتی کو ساحل مراد پر پہونچانے کا کام کرتا ہے، وہ انسانی سماج کو مغرب کے کھوکھلے اور عریاں کلچر کی پستیوں اور گراوٹ اور محرومیوں سے نکال کر اسلام کے آغوش

عدل و رحمت میں پہونچانے کا مقدس فریضہ انجام دیتا ہے۔ وہ شروع سے جاہلیت و کفر کے ظالم و بے رحم پنجوں سے امتوں کو آزاد کراتا اور محمد عربی ﷺ کے اس نظام وحدت و مودت میں داخل کرتا آیا ہے۔ یہی راہ سعادت و سلامتی ہے اور اسی کا دامن تھامنے میں نجات و عافیت ہے، ان حقائق کی یقین دہانی اور ایمان پر اس درجہ اعتماد کی بحالی دعوت کا بنیادی شعبہ اور داعیوں کی اصل ذمہ داری ہے۔

۵- یورپی نظام تعلیم و تربیت کو (جو اسلامی ملکوں میں بڑی تیز رفتاری سے اپنایا اور پھیلایا جارہا ہے اور جس کے اثرات بد سے ایک عالم متاثر ہو رہا ہے) بدل کر اور ختم کر کے اسلامی اقوام کی شخصیت، عقائد پیغام اور قدر و منزلت سے بالکل ہم آہنگ اسلامی نظام و نصاب تعلیم و تربیت کی تنفیذ ایک نہایت عظیم ذمہ داری اور اہم دعوتی شعبہ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اقوام و ملل کی زندگی میں نظام تعلیم و تربیت کی تاثیر کا بارہا ذکر کیا ہے، مولانا کا کہنا تھا کہ موجودہ صورتحال کا بگاڑ اسی یورپی فاسد نصاب و نظام کی وجہ سے ہم میں گھس آیا ہے۔ نصاب و نظام تعلیم و تربیت میں وہ قوت ہوتی ہے جو حالات کا پورا نقشہ بدل ڈالتی ہے، نظامِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی نقطہ نظر سے تیار شدہ نصاب کی تنفیذ کے بغیر نہ تو عالم اسلام اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا ہے، نہ اس کی سلامت عقل و دماغ اور قوت فکر و عمل کا جوہر نمایاں ہو سکتا ہے، نہ ہی حکومتوں، انتظامی ذمہ داریوں اور اصلاحی سرگرمیوں کے لئے وہ رجال کار تیار ہو سکتے ہیں جو اسلامی تعلیم و تربیت کو حکومت و انتظام، معاشرہ و سماج اور ذرائع ابلاغ بلکہ ہر شعبہ میں نافذ و دخیل کر کے ایک اسلامی اور مؤمنانہ زندگی کے جمال و کمال کی دلآویزیوں اور خصوصیات کا نقشہ پیش کر دیں، اور نہ ہی ایک صالح معتدل اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، یہ اسلامی نصاب و نظام تعلیم و تربیت ہی کی برکت ہوتی ہے کہ پورا اسلامی معاشرہ تشکیل پاجاتا ہے اور قابل نمونہ ثابت ہوتا ہے۔

۶- عقیدہ و عبادات اور دینی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا، لوگوں کو ان کی خود ساختہ رسوم و عادات سے دور کرنا اور ان کے ماضی کی بے اعتدالیوں کو دور کر کے ان کے حال کو اسلامی قالب میں ڈھالنا بھی ایک اہم دعوتی کام ہے، اسلامی حکومتوں اور معاشروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی مستقل اسلامی تمدنی منصوبہ بندی کریں جو مغرب کی اندھی اور ہر جائز و ناجائز تقلید، عجلت پرستیوں، بے اعتدالیوں اور

نقائص سے کوسوں دور ہو، اور اپنے تمام خطوں، شہروں، علاقوں، گھروں، انفرادی واجتماعی مرحلوں، ہوٹلوں، پارکوں، دفاتر، سواریوں، جہازوں غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی ثقافت کی نمائندگی کریں، یہ صرف اسلامی حیات واقدار ہی کی نمائندگی ہوگی اس سے اسلام کی طرف ایک خاموش، جاذب اور مؤثر دعوت کا کام بھی انجام پائے گا۔

۷- تمام اسلامی ممالک میں ایک ایسی علمی اور منظم تحریک کا قیام بیحد ضروری ہے جس کے ذریعہ نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام کے علمی ذخائر اور اس کی روشن تاریخ سے بخوبی واقف ہو سکے، اور جس کے ذریعہ اسلامی علوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی جائے اور خونِ زندگی دوڑایا جائے، اور موجودہ متمدن دنیا کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ اسلام کا قانون واسکا تعلیمی وتربیتی نظام دنیا کا سب سے وسیع، جامع ترقی یافتہ اور مکمل نظام ہے، وہ بے انتہا پائیدار اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہے، اسکی صلاحیت و فوائد کے جاری چشمے اور بہتے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے، وہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ حیاتِ انسانی کی قیادت اور ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے الٰہی قانون کے سامنے دوسرے تمام خود ساختہ انسانی نظام ریت کی دیوار ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح کی علمی و عملی تحریک کے قیام کی کوشش بھی دعوت کے زمرہ میں شامل ہے۔

۸- مغربی تہذیب کے علوم وافکار اور ایجادات واختراعات ایک مادۂ خام کی طرح ہیں جن کی خوبیاں اور اچھے عناصر عالم اسلام کے قائدین اور ذمہ داران حکومت کو اُخذ کر کے ایسی مکمل اور جامع تہذیب وثقافت قائم کرنے اور عام کرنے کی تگ ودو میں لگ جانا چاہیئے جس میں ایک طرف ایمان، اخلاق حسنہ، تقویٰ، رحمت وانصاف کی بنیادیں کارفرما ہوں تو دوسری طرف قوت وایجاد، فراخی اور وسعت کے عناصر بھی موجود ہوں، اس طرح یہ کامل اور متوازن تہذیب وجود میں آکر عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

۹- جن اسلامی ممالک میں بدقسمتی سے نام نہاد مسلمانوں اور اسلام دشمنوں کی حکومتیں اسلامی عناصر کو ختم کرنے کا کام کر رہی ہیں اور اسلام کی ایسی تشریح کر رہی ہیں جو ان کی سیاسی مصلحتوں سے ہم

آہنگ اور ان کے اصل سرپرستوں، مربیوں اور ذمہ داروں کی خواہشات اور تمناؤں کے عین موافق ہوں، داعیوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے سامنے یہ حقیقت واشگاف کردیں کہ اس طرح کی سیاست بے فیض اور بے فائدہ ہے جو کسی اسلامی ملک میں (بالخصوص جسکا تاریخ دعوت و تہذیب اسلامی میں اہم رول اور روشن تاریخ رہی ہے) کبھی پنپ نہیں سکتی اور نہ ہی کامیاب ہو سکتی ہے، بلکہ انھیں اس طرف متوجہ کردیں کہ وہ اپنی ساری طاقتیں اور توانائیاں اسلامی ممالک کو قوت و امداد پہونچانے اور ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرنے میں صرف کریں، اسلامی شریعت کی تنفیذ کا راستہ ہموار اور فضا سازگار کرنے میں لگ جائیں، اپنی ذاتی و مادی نفع اندوزیوں سے بچیں اور اجتماعی مصالح کو ملحوظ رکھیں جن میں اسلام کا بھی نفع ہے اور دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کی ضمانت بھی ہے۔

۱۰- عالم اسلام میں ایسی مثبت اور دعوتی تحریک کا قیام عمل میں لانا چاہیئے جو ہر لحاظ سے مستحکم ہو اور اس کے کارکنان میں بلند ہمتی، عالی دماغی، روشن ضمیری، دقتِ نظر، رقتِ قلب، شجاعت و بلند حوصلگی، عزم و یقین، پاکیزگیٔ نفس، سلامتی فکر و دل کے ساتھ ہی موجودہ بڑی طاقتوں (جو آج انسانیت کی قیادت سنبھالے ہوئے ہیں اور اپنی قوت و ظلم کے بل بوتے پر بغیر کسی جواز و استحقاق کے متعدد مسلم و غیر مسلم ممالک اور اقوام کی قسمت کا فیصلہ کرتی رہتی ہیں) سے پنجہ آزمائی اور ہر موڑ پر ان کا مقابلہ کرنیکی صلاحیتیں بھی ہوں، ایسی جماعت کے قیام کی کوششیں عالم اسلام کے ذمہ داروں کا ایک اہم فریضہ ہے جسے مصلحتوں سے ٹالا نہیں جانا چاہیئے۔

۱۱- وہ ممالک جہاں بدقسمتی سے مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں داعیوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اعمال و اقوال، سیرت و کردار اور سلوک و معاملات میں ہر جگہ اسلام کی ایسی نمائندگی کرنے کی فضا پیدا کریں جو باعث کشش و تاثیر ہو، وہ روحانی اور اخلاقی قیادت کا کام انجام دینے کے ساتھ ہی وطن اور سماج کو اخلاقی گراوٹ، کرپشن، روحانی افلاس، معاشرتی پستی اور ادبار کے ان مفاسد سے بچائیں جو کسی بھی غیر مسلم جماعت و حکومت کا امتیاز ہوتے ہیں، اس طرح اشاعتِ اسلام کا راستہ ہموار ہوگا، زمین تیار ہوگی اور فضا سازگار ہوگی، اور رفتہ رفتہ یہ حقیقت ابھر کر بڑے زور و شور سے سامنے آئیگی کہ اسلام ہر لحاظ

سے معتدل اور مستحق قیادت ہے، ملک کو اس کی ضرورت ہے، چنانچہ مسلمانوں کو اپنی قیادت و تبلیغ کا زریں موقعہ ہاتھ آجائیگا، بس ضرورت توازن، حکمت، اعتدال اور جماؤ کے ساتھ متحد ہو کر کام کرنے کی ہے، آگے ساری منزلیں واہوتی جائیں گی اور ساری رکاوٹیں دور ہوتی نظر آئیں گی۔

مولاناؒ نے ہندوستان میں عملی طور یہی ذمہ داری انجام دی ہے، مسلمانوں کے تمام مسائل و مشاکل کے بارے میں مولاناؒ کا جو رول رہا ہے اور تحریک پیام انسانیت کے راستہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قریب کر کے اور اسلام کی جامعیت اور رواداری کا تصور دلوں میں بٹھا کر دعوتِ اسلام کی جو کوششیں مولاناؒ فرماتے رہے ہیں وہ اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں۔

مولاناؒ کے دعوتی نہج اور طریقۂ کار کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو قدرے تکرار اور تفصیل کے ساتھ آگئی ہیں۔ ان سے مولانا کی فکری و دعوتی جامعیت، داعیوں کو طریقۂ دعوت، دعوتی شعبوں اور ذمہ داریوں سے واقف کرانے کے ساتھ ہی مولاناؒ کے نہجِ دعوت کا توازن، اعتدال، رعایت حکمت و مصلحت اور تدریج جیسے عالی اوصاف بڑی وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں۔

۱۹۹۶ء میں حکومت ترکی نے مولاناؒ کی ادبی و دعوتی خدمات کے اعزاز و اعتراف میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی جس میں عرب و عجم کے درجنوں اہل علم وادب نے اپنے وقیع مقالات میں مولاناؒ کے علمی، ادبی اور دعوتی کارناموں کا بڑی وضاحت سے تجزیہ کیا تھا، اس موقعہ پر مشہور عرب مفکر و عالم ڈاکٹر یوسف قرضاوی ڈائرکٹر مرکز سیرت و سنت جامعہ قطر کا مقالہ قابل تعریف تھا، انھوں نے اپنے مقالہ "ركائز الفقة الدّعوِيى عند العلامة أبى الحسن الندوى" حضرت مولانا علی میاںؒ کی دعوتی فقہ کے عناصر و مبادی میں مولانا کی دعوتی فکر کو بیس اساسی عناصر پر مبنی قرار دیا ہے، یہاں ان کا مختصراً ذکر موضوع کی مناسبت سے اہمیت کا حامل ہوگا: (۱۲)

۱- مادیت کے مقابلہ میں ایمان راسخ جو مولاناؒ کی تین کتابوں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، اور معرکۂ ایمان و مادیت" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۲- عقل پر وحی کی برتری جس کی تشریح مولاناؒ نے اپنے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے خطبوں

کے مجموعے "النبوة والأنبياء في ضوء القرآن" اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اپنے لیکچر "مذہب و تہذیب (۱۹۴۲ء) میں کی ہے، جامعہ ملیہ میں مولاناؒ نے یہ لیکچر اس وقت دیا تھا جب ان کی عمر صرف تیس سال کی تھی۔

۳- قرآن کریم سے گہری وابستگی جو انؒ کے قرآنی مطالعوں "تأملات في سورة الكهف" اور قرآن کا مطالعہ کس طرح کریں (المدخل إلى الدراسات القرآنية) وغیرہ میں نظر آتی ہے۔

۴- سنتِ رسول ﷺ اور سیرت رسولؐ سے والہانہ شیفتگی جو مولاناؒ کی کتاب "نبی رحمتؐ اور سیرتِ رسولؐ (برائے اطفال) اور کاروان مدینہ" کے مطالعہ سے واضح ہے۔

۵- روحانیت کی چنگاریوں کو روشن کرنے کا جذبہ جو ان کی معرکۃ الآراء کتاب "ارکان اربعہ" میں اسلامی عبادتوں کے اسرار و مصالح کی تشریح و تفہیم سے ظاہر ہوتا ہے۔

۶- مولاناؒ کی دعوتی فکر کی چھٹی خصوصیت مثبت انداز فکر اور تعمیری کدوکاوش ہے جس کی وضاحت ان کی کتابوں "دو متضاد تصویریں" اور "اسلام کی سیاسی تفسیر" (عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح) کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

۷- ساتویں خصوصیت جہاد فی سبیل اللہ کا احیاء ہے جو ان کی تصانیف "جب ایمان کی بہار آئی، "سیرت سید احمد شہید" اور انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر کے مطالعہ سے اجاگر ہوتا ہے۔

۸- اسلامی تاریخ سے سبق آموزی اور عظمائے اسلام کے کارناموں سے عبرت اور جذبے کا حصول جو ان کی کتابوں "المد والجزر في تاريخ الإسلام" اور "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پانچوں جلدوں سے نمایاں ہے۔

۹- مغربی فکر اور مادہ پرستانہ تہذیب و تمدن پر تنقید بھی ان کی نمایاں خوبی ہے جو انکے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لیکچر "مغرب اور اسلام" اور "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں" اور دیگر کتب سے واضح ہے۔

۱۰- دسویں خصوصیت جاہلی تعصب اور قوم پرستی کی تردید ہے جس کی عکاسی مولاناؒ کی درجنوں کتابوں سے ہوتی ہے۔

۱۱- ردِ قادیانیت اور عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ جو ان کی کتاب "النبی الخاتم" اور القادیانی والقادیانیة" سے ظاہر ہے۔

۱۲- ذہنی ارتداد کا مقابلہ بھی جو ان کی کتاب "ردة ولا أبابكر لها" سے نمایاں ہے ان کا امتیاز ہے۔

۱۳- امت مسلمہ کے قائدانہ کردار کا تسلسل اور اس کی بازیابی کی جدوجہد جو "انسانی دینا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور "قيمة الاسلامية بين الأمم و دورها فى العالم" میں جھلکتی ہے۔

۱۴- صحابۂ کرام کی عظمت جو ان کی کتاب "متضاد تصویریں" اور "المرتضیٰ" وغیرہ سے ظاہر ہے۔

۱۵- مولاناؒ کے فکر کی پندرہویں بنیاد مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کی بازیابی پر توجہ سے عبارت ہے مثلاً دیکھئے ان کی کتاب "مسلمان اور مسئلہ فلسطین"۔

۱۶- آزاد اسلامی تعلیم وتربیت کی ضرورت پر زور بھی ان کے یہاں کم نہیں، مثال کے طور پر دیکھئے ان کی کتاب "التربية الإسلامية الحرة"۔

۱۷- بچوں کی تربیت تو ان کا خاص جوہر ہے مثلاً دیکھئے قصص النبیین اور قصص من التاریخ وغیرہ۔

۱۸- مبلغین اور مخلص کارکنوں کی تیاری کا جذبہ جو انکے عمومی کارناموں اور تبلیغی ودعوتی مواعظ سے نمایاں ہے۔

۱۹- اسلامی بیداری اور اسلامی تحریکات کی متوازن رہنمائی اور رفعِ نزاع باہمی جو خود ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں ہے۔

۲۰- بیسویں اور اہم بنیاد یہ ہے کہ مولاناؒ پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہیں، بائیس سال کی عمر میں مولانا بابا صاحب امبیڈکر سے ملنے بمبئی گئے اور ان کے سامنے دعوتِ اسلام رکھی۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے اپنے ایک مقالہ "فقه الدعوة عند العلامة أبى الحسنؒ" میں لکھا ہے (۱۳) کہ مولاناؒ کی سات خصوصیات قابل رشک ہیں اور وہ ہیں: داعی دین کی صفات سے ان کا متصف ہونا اور مواقع کا حصول واستعمال، عقل وحکمت سے سرفرازی وسعت مطالعہ اور کثرت

معلومات، ادبی صلاحیت و بصیرت اور جیتے جاگتے دل کے ساتھ مرد مؤمن کے اخلاق و کردار اور صحیح اسلامی عقیدہ سے مزین شخصیت۔

تعلیمی و تربیتی، صحافتی و معاشرتی، علمی و فکری، سیاسی و اقتصادی تمام میدانوں میں مولاناؒ کی دعوتی سرگرمیوں اور خدمات کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، دعوتِ اسلامی کے اسالیب، طریقہ کار اور انداز فکر پر بھی مولاناؒ نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے، مولاناؒ نے بجا فرمایا ہے کہ داعی کو وقت کی نزاکتوں، چیلنجوں، مسائل و مشاکل، دشمنانہ مسائل سرگرمیوں، معاشرہ و سماج کی ضروریات سے پوری باخبری کے ساتھ مخاطب کی نفسیات، ذہن مزاج اور مقام و موقعہ کی پوری رعایت بھی کرنی چاہیئے۔

مشہور عالم و ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں (۱۴) "مولاناؒ کا یہ تصریفی (دین کی دعوت مختلف اسالیب سے پیش کرنا) انداز بیان سمجھنے کے لیے اور ان کے مقالات کے اندر جو ایک بے چین روح اور دین کی سربلندی کی تڑپ ہے نیز جو معرفت و آگاہی کے خزانے ہیں ان کی قدر اگر کی تو عرب علماء اور دانشوروں نے کی، وہ ہم سے کہیں زیادہ فراخ دلی اور وسیع القلب ثابت ہوئے۔

حقیقت واقعہ یہی ہے کہ مولاناؒ کی دعوت و شخصیت سے جتنا استفادہ ممکن تھا وہ برصغیر میں نہ ہو سکا اور اس میں ہماری بے توفیقی اور بعض موقعوں پر فرقہ وارانہ عصبیت اور قدر ناشناسی کا بڑی حد تک دخل ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مولاناؒ نے جو طریقۂ دعوت اپنایا تھا وہی فطری طریق دعوت ہے جس میں مقصد کو بار بار مختلف زاویوں سے پیش کیا جائے، اور اس کے فطری ہونے کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے "ولقد صرّفنا فی هذا القرآن لیذکروا" ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہوش میں آئیں۔

مولاناؒ کے دعوتی اور فکری مدرسہ میں بے شمار تلامذہ اور داعیان کی ٹیم تیار ہوئی ہے، مولانا کا یہ دعوتی مدرسہ تحزب اور تعصب کے ان مفاسد سے کوسوں دور تھا جن سے بڑی مشکل سے انسان بچ پاتا ہے اور جن کا شکار بہت سی تحریکات ہو چکی ہیں، اس مدرسہ کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں اعتدال، سہولت

ونرمی اور حسن اخلاق کا جوہر گرانمایہ ملتا ہے اور تشدد تنگی، افراط و تفریط اور بے اعتدالیوں کا دور دور تک نام ونشان بھی نظر نہیں آتا۔

دعوت اسلامی وہ محور ہے جس کے گرد مولاناؒ کی ساری زندگی گھومتی رہی ہے، وہ سفر ہو یا حضر، صحت ہو یا مرض، فراخی ہو یا تنگی ہر مرحلہ اور موقعہ پر مولاناؒ اپنا داعیانہ کردار باقی رکھا اور زندگی اسی میں گذار دی، انھیں دینی ودعوتی مقاصد وجذبات کے ساتھ مولانا ایک عرصہ تک مولانا مودودیؒ کے ساتھ رہے، بعض اسباب (جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے) کی بنیاد پر ان سے الگ ہوئے اور پھر رئیس التبلیغ حضرت محمد الیاس کاندھلویؒ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام ایک مدت تک انجام دیتے رہے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں تا آخر باقی رہا۔

مولاناؒ کا تعلق اس خانوادۂ نبوت سے تھا جسکی فیض رسانیوں نے عالم کا نقشہ بدلا اور ذہن ودماغ تبدیل کئے تھے، اسی خانوادہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ جیسی شخصیت وجود میں آئی تھی جس نے شعائر اسلامیہ کو از سر نو اس ظلمت کدۂ ہند میں زندہ کیا تھا اور روحِ جہاد پھونکی تھی، باطل پرستوں سے دوبدو مقابلہ کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں اپنی جانِ عزیز کی قربانی پیش کی تھی، اسی خاندانِ عالی مقام سے مولاناؒ کا تعلق تھا، ان کی سیرت وکردار کو اسلامی سانچہ میں ڈھالا گیا تھا، دعوتی وفکری ماحول میں ان کی نشو ونما ہوئی تھی، مشفق ماں نے ان کے لئے رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں داعی بنانے کی جو دعا کی تھی وہ مقبول و مستجاب ہوئی تھی، تقویٰ وصلاح نے مولاناؒ کی زندگی قابل رشک اور بے مثال بنادی تھی، مولانا کی داعیانہ شخصیت کی تعمیر میں خاندان، ماحول، وسیع ومتنوع ثقافت اور معاصر علماء ومشائخ اور مفکرین و اصحابِ کمال سے ربط و تعلق کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں، مولانا اپنے آغاز ہی سے داعی و مصلح تھے، ان کا یہ مزاج وفکر ان کی تالیفات ومضامین اور خود عملی زندگی سے نمایاں ہے، وہ ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوتِ اسلام دینے بمبئی تشریف لے گئے تھے، اسوقت مولاناؒ کی عمر کل ۲۱ سال کی تھی، مولاناؒ نے ڈاکٹر امبیڈکر سے بڑی صفائی سے فرمایا "ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے اور انھوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اگر آپ

کو اپنی اور اپنی برادری کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں(۱۵)" اب یہ تقدیری بات تھی اور گویا آیتِ قرآنی إنك لاتهدی من احببت ولکن الله یهدی من یشاء (اے نبی! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) کی تفسیر تھی کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے اسلام کے بجائے اپنی پوری قوم کے ساتھ بدھ مت کا انتخاب کر لیا اور اس انتخاب کی غلطی کا احساس انھیں اپنی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ بہر حال مولاناؒ نے تا زندگی اپنا یہ داعیانہ منصب بحال رکھا اور زبان و قلم سے جہاد میں مشغول رہے، ان کی پوری زندگی دعوت إلی الاسلام کا دوسرا نام ہے، موت بھی قابل رشک پائی اور جیسا کہ بیان کرنے والوں نے بیان کیا کہ مولاناؒ نے آخری ہچکی سورۂ یٰسین کی آیت "إنما تنذر من اتبع الذکر و خشی الرحمٰن بالغیب فبشره بمغفرة و أجر کریم" آپ تو صرف اس شخص کو خبردار کر سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے، اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دیدیجئے۔ (سورۂ یٰسین) پڑھتے ہوئے لی، جو بجا طور پر آیتِ دعوت و انذار ہے۔

مشہور ادیب شیخ علی طنطاویؒ مرحوم نے مولاناؒ کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا--
"برادرم ابوالحسن! آپ اپنی جماعت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم و دائم رہئے، میری رائے میں اس وقت آپ کے سوا کسی اور داعی کا اسلوب اور طریقۂ کار اتنا متوازن اور معتدل نہیں ہے۔"(۱۶)

تاریخ دعوت و عزیمت (رجال الفکر والدعوة) مولاناؒ کی بلند پایہ اور مشہور ترین تصنیفات میں ایک ہے جس میں مولاناؒ نے مجددین و داعیان کا بڑی تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ بھی بلاشبہ انھیں مجددین و داعیان میں ایک ہیں، دعوت و عزیمت ان کا خصوصی مزاج و طبیعت بن گئی تھی اس لئے وہ بجا طور پر تاریخ دعوت و عزیمت میں جگہ پانے کے مستحق اور اہل ہیں۔

مولاناؒ کی دعوت کا بنیادی امتیاز اخلاص اور استغناء ہے، دعوتی سرگرمیوں میں کبھی مولاناؒ کو عجب و کبر اور حرص چھو کر بھی نہیں گذرا، استغناء اور مادی چیزوں سے مولاناؒ کا بعد و زہد ہی ان کی دعوت کی مقبولیت، محبوبیت اور تاثیر کا اصل سبب تھا، مولانا نے اپنی دعوتی سرگرمیوں بلکہ زندگی کے

تمام شعبوں میں اسی پیغمبرانہ اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اپنایا جسے قرآن نے بار بار دہرایا ہے۔ وماأسألكم عليه من أجر، إن أجري إلا على رب العالمين (میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے)۔

واقعہ یہ ہے کہ اخلاص واستغناء کی تفسیر اس سے زیادہ جامع اور مکمل تعبیر میں نہیں کی جاسکتی، اور اسی وصف نے مولانا کو نبی اکرم ﷺ کا خاندانی وارث ہونے کے ساتھ ہی روحانی وارث وامین بھی بنادیا تھا جس سے بڑا امتیاز میری نظر میں اس دنیائے آب وگل میں کوئی اور نہیں ہو سکتا ؎

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حواشی:-

(۱)-منہج افضل فی الإصلاح للدعاۃ والعلماء وربانیۃ لا رہبانیۃ، وتاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم (مختصراً الفاظ کے تغیر کے ساتھ)(۲)- تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم۔(۳)- فقہ الدعوۃ ملامح وآفاق (کتاب الامۃ) مضمون سید ریاض عاشور ص۲۹۔(۴)- علماء ومفکرون عرفتھم۔ شیخ محمد المجذوب ج۱ ص۱۴۳۔(۵)- ایضاً ص۱۵۱،(۶)- واقع العالم الاسلامی مصنفہ مولانا علی میاںؒ۔ (۷)- ماخوذ از مقدمہ "حدیث مع الغرب لسماحۃ الشیخ الندوی" بقلم مولانا محمد الحسنیؒ (۸)-کاروانِ زندگی و دیگر محاضرات (العرب و الاسلام ص۶۰) (۹)- ماخوذ از "مذکرات سائح فی الشرق العربی ص۹۵، ص۹۶۔(۱۰)-نحو بعث إسلامی جدید ص۱۶۔(۱۱)-ماخوذ از "الدعوۃ فی العصر الحاضر لسماحۃ الشیخ الندوی ص۹-۱۹۔ (۱۲)- ماخوذ از ماہنامہ افکار ملی مارچ ۲۰۰۰ء ص۲۴-۲۶۔ مضمون پروفیسر شفیق احمد ندوی، (۱۳)- ایضاً ص۲۶۔ (۱۴)- میر کارواں مولانا عبداللہ عباس ندوی ص۲۱۸۔(۱۵)-کاروانِ زندگی اول ص۱۵۹۔(۱۶)- مقدمات الشیخ علی طنطاوی۔(ص۱۱۱)۔

✡✡✡

حضرت مولانا علی میاںؒ کے

مدرسۂ فکر کے امتیازات

غطریف شہباز ندوی
(ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

انیسویں صدی کے اوائل سے عالم اسلام کا سیاسی اور عسکری زوال شروع ہوا۔ جب کہ علمی، فکری، ثقافتی اور تمدنی زوال سے وہ پہلے ہی سے دوچار ہو چکا تھا یہ زوال دبے پاؤں آیا اور مشرق و مغرب ہر طرف اس کی رفتار نہایت تیز تھی، ہندوستان میں اورنگ زیب عالم گیرؒ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے نااہل جانشینوں کی عیش کوشیوں کے باعث سلطنت مغلیہ کی شان و شوکت اب ایک دیوانے کا خواب معلوم ہوتی تھی اور بالآخر پورے ہندوستان پر سمندر پار سے آئے سفید فام انگریز مسلط ہو گئے، اس زوال کے ساتھ ہی مغربی استعمار نے اپنی مختلف شکلوں (ولندیزی، ڈچ، فرانسیسی انگریز اور اطالوی) میں عالم اسلام پر ہمہ جہت حملہ کر دیا، استشراق اور مشنری تحریک کی یلغار بھی اسی کے پہلو بہ پہلو ہو رہی رہی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی طور پر عالم اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اور علمی و فکری، اور تمدنی سطح پر بھی مغرب اس سے بازی لے گیا، رہی سہی کسر خلافت عثمانیہ کے سقوط (۱۹۲۴ء) نے پوری کر دی۔

اس صورت حال نے عالم اسلام میں ایک بے چینی پیدا کر دی، اور حالات میں تبدیلی کے لئے ایک عام جوش و خروش پیدا ہو گیا، شاندار ماضی کی بازیافت اور عظمت رفتہ کی بحالی کی تمنائیں پیدا ہوئیں، عالم اسلام کے ہر خطہ اور ہر گوشہ میں مختلف علماء، مفکرین اور شخصیات اٹھ کھڑی ہوئیں، اور انھوں نے احیاء اسلام کے لئے کوششیں شروع کر دیں، ان تحریکات و شخصیات کے میلانات و رجحانات مختلف تھے، میدان الگ تھے ترجیحات متنوع تھیں لیکن سب کے درمیان قدر مشترک جو چیز

تھی وہ یہ کہ اسلام کا از سر نو غلبہ ہو اور امت مسلمہ کا احیاء کیا جائے، اس مبارک قافلے کے ارکان میں قفقاز کے مجاہد امام شاملؒ، وادی برقہ کے مجاہد سنوسیؒ، اور "ریف" کے کمانڈر امیر عبد القادرؒ بھی تھے، اور جمال الدین افغانیؒ اور مفتی محمد عبدہؒ اور ان کا مدرسۂ فکر اور محمد عبد الوھابؒ وغیرھم تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یہ تحریکات عالم اسلام کے گوشہ گوشہ مین پھیل چکی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں افکار و نظریات کی شکست وریخت جاری تھی وہاں سائنسی اور صنعتی انقلاب نے حالات یکسر تبدیل کر کے رکھ دئے تھے۔ اب نیوٹن کا قانون تجاذب بھی اپنی کشش کھو رہا تھا اور اس کی جگہ آئن اسٹائن کے فلسفۂ اضافیت نے لی تھی، فلسفہ اور مذہب کی جگہ سائنسی اور ٹیکنولوجی نے حاصل کرلیں تھی سیاست میں پاپائیت اور شاہیت کا خاتمہ ہو کر اب نیشنلزم اور جمہوریت کی نئی قدریں پیدا ہو رہی تھیں، جاگیرداری ختم ہو کر اب شراکت جمہور کی بات ہو رہی تھی، سرمایہ دارانہ، اقتصادی نظام کی جگہ پرولتاریہ خیالات کی گونج سنائی دے رہی تھی، کارل مارکس، ڈارون اور فرائڈ کے نظریات یورپ کے پرانے نظریات کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ایک نئی فکری دنیا تعمیر کر رہے تھے چونکہ یورپ کا یہ احیاء جسے نشاۃ ثانیہ (Rènaissance) کہا جاتا ہے بالعموم یہودی دانشوروں کی منصوبہ بند کوششوں سے ہوا تھا۔ اور انہیں کے ذریعہ جان بوجھ کر اس کا رخ الحاد کی طرف موڑا گیا تھا اس وجہ سے اس نشاۃ ثانیہ کے بطن سے جو تہذیب بر آمد ہوئی، اس کا مایۂ خمیر الحاد، نا مذہبیت عقل کی بالادستی اور افادیت (Utility) کے نظریات تھے پرانی روحانی واخلاقی قدریں ایک ایک کر کے توڑ دی گئیں، کہا گیا کہ ہر چیز متغیر ہے، مادی ہو یا معنوی، خیر و شر کے پیمانے بدل گئے ہر وہ چیز جس سے انسان کو لذت ملے اور فائدہ پہنچے وہ خیر ٹھہری کائنات کی میکانیکل توجیہ کی گئی، جس کے مطابق یہ کائنات ایک مشین ہے ایک کل ہے جو اتفاقیہ طور پر (By chance) وجود میں آگئی ہے اور میکانیکل قوانین کے تحت چل رہی ہے، اور ایک دن انہیں قوانین کے تحت ختم بھی ہو جائی گی، یوں ہی بلا مقصد اور بغیر کسی پلاننگ کے سرمایہ دارنہ نظام کے خلاف دنیا بھر کے مزدوروں میں ایک رد عمل پیدا ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں کیمونزم بڑے زور و شور کے ساتھ نئے نعرے لیکر اٹھا، اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سیاست و معیشت

میں ایک انقلاب برپا کر دیا، حکومت وریاست کو فرد کے اوپر لا انتہا حقوق واختیارات حاصل ہو گئے، اور جمہوریت نیز وطن پرستی ہی روح عصر خیال کی جانے لگی۔

ان حالات میں تحریکات اسلامیہ نے کام شروع کیا، مختلف شخصیات سامنے آئیں جنھوں نے عصر حاضر کے چیلینز کا جواب دیا۔ اور بحیثیت مجموعی امت کی عظیم خدمات انجام دیں۔ انمیں زیادہ شہرت ابوالکلام آزادؒ، اقبالؒ، سید مودودیؒ اور سید قطبؒ کو ملی، کوئی بھی فرد اپنے معاشرہ سے متاثر ہوتا ہے، اور اپنے اردگرد کے افکار وخیالات کا اثر قبول کرتا ہے۔ اور یہ ایک فطری چیز ہے اس لئے ان عظیم شخصیات کے فکر ونظر میں بھی کہیں کہیں حالات کے دباؤ کے تحت اپنے ماحول اور موجودہ زمانے کے افکار سے منفعل ہونے کا تاثر صاف جھلکتا ہے۔ اسلام کی تشریح وتعبیر عصری زبان واسلوب میں کرنا عین مطلوب ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ بنیادی مفاہیم میں کوئی فرق نہ آئے۔ البتہ عصری تعبیر ایک دودھاری تلوار کی طرح ہے جس میں اگر ذرا سا بھی احتیاط کا ہاتھ چھوٹ جائے اور حد سے تجاوز ہو جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ عنایت اللہ مشرقی (ح ۱) جیسے عبقری اور ذہین انسان نے جب ٹھوکر کھائی تو خاکسار تحریک چلائی اور دین کی عصری تعبیر کے نام پر علماء کی شدید وبے جا مخالفت شروع کر دی، عبادات کے نظام اور قرآن کی ترتیب اور نظم کی تفہیم میں من مانی تاویلات کیں، نماز کو فوجی پریڈ بنادیا۔ علماء سے سائنس داں مراد لئے۔ اسی طرح غلام احمد پرویز (ح ۲) نے دین کی معاشی اور سوشلسٹ تعبیر کی اور زکوۃ کا پورا سسٹم انھیں ذاتی ملکیت کے خلاف نظر آیا۔ اسی طرح سید مودودیؒ اور سید قطبؒ شہید کی بعض تحریروں میں بھی دین کے سیاسی پہلو (ح ۳) پر غیر ضروری زور دیا گیا۔ اور ان کی تعبیر کی رو سے دین کی ایک سماجی واجتماعی نظام زندگی کی حیثیت زیادہ ابھر کر سامنے آئی، اور اس کا تعبدی پہلو کچھ کمزور پڑ گیا، ان تسامحات کے اثرات ان کی تحریکی حکمتِ عملی اور سیاسی اسٹریٹجی میں در آئے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایسے وقت میں آنکھیں کھولی تھیں۔ جب یہ تحریکیں اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھیں۔ ان کا خانوادہ خود ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کا علمبردار اور وارث

رہا ہے، دعوت دین، اصلاح ملت، جہاد و شہادت اور احیاء خلافت کی جد و جہد اس گھرانہ کی تاریخ کے شاندار ابواب ہیں نوجوانی ہی میں سیرت سید احمد شہیدؒ لکھ کر، اردو عربی دنیا میں اس تحریک کا تعارف کرلیا تھا، اسی موروثی جذبہ سے تحریک پاکر وہ جماعت اسلامی کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس کے مثالی نمونہ کی تلاش انہیں نظام الدین کی بستی کی طرف لے گئی۔ اور انہوں نے فکر و جذبہ کا رشتہ مولانا الیاسؒ سے استوار کیا۔ اسی کا جلال و جمال انھیں حسنؒ البناء شہید کی تحریک اخوان المسلمون میں نظر آیا، انھوں نے استفادہ سب سے کیا لیکن وہ کسی ایک مقام پر رکے نہیں۔ بلکہ ان کے شعور و آگہی اور فکری سفر کا قافلہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا، حتیٰ کہ وہ خود ایک میر میداں اور میر لشکر کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اور ان کی ذات میں تحریک سید احمد شہیدؒ کا نقش پھر تازہ ہوا تحریکی اور انقلابی تصور دین کی حامل جماعتوں اور تحریکوں نے اس صدی میں اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے عصری اسلوب و آہنگ میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا۔ دوسری طرف مستشرقین۔ مستغربین اور معاندین کے فکری حملوں کا جواب بھی دیا نئی نسل کا دین پر اعتماد بحال کیا۔ تاہیں ھمہ چونکہ یہ تحریکیں پیشتر حالات کے رد عمل کا نتیجہ تھیں اس وجہ سے بعض اوقات ان کے یہاں حد اعتدال سے بڑھے جوش و جذبہ نے فکری تعبیر و تشریح میں غلطیاں پیدا کر دی۔ اور ان کی یہ نئی تشریحات معاشرہ میں اور بطور خاص روایتی علماء میں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ اس کے برعکس ان کی وجہ سے شدید رد عمل پیدا ہوا اور پورے معاشرہ میں ایک قسم کا انتشار اور کھینچا تانی پیدا ہو گئی جس سے اسلام کے کام کو نقصان پہونچا اور خود ان کے اثرات بھی کافی سمٹ کر رہ گئے۔

مولانا علی میاںؒ نے ان تحریکوں اور ان کے بانیوں کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا، ان کے وسیع تاریخی مطالعہ، مخصوص دینی مزاج اور تربیت نے ان کے اندر ایک اعتدال و توازن کم عمری ہی سے پیدا کر دیا تھا چنانچہ دین کی نئی تشریح کے سلسلہ میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا انھوں نے بروقت نوٹس لیا۔ اور عصر حاضر میں دین کی تفہیم تشریح لکھی جس میں انھوں نے سید قطبؒ اور سید مودودیؒ کے بعض تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے اخوان کے ایک بڑے رہنما استاذ حسن الھضیبی نے

"دعاة لا قضاة" لکھ کر مولاناؒ کے خیالات کی تائید کی ان کی کتاب ارکان اربعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک ایجابی کڑی ہے اسی طرح ترشید الصحوة الاسلامية ،اور البصائر میں بھی مولانا نے داعیان حق کی رہنمائی فرمائی۔

"ماذا خسر العالم با نحطاط المسلمين" (مسلمانوں کے عروج زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا) مولانا کی شاہ کار تصنیف ہے۔اس میں انھوں نے ایک نئی فکر پیش کی کہ مسلمانوں کا عروج انسانیت کا عروج تھا۔اور ان کا زوال انسانیت کا زوال،اس کے ساتھ ہی انھوں نے پوری اسلامی تاریخ کا تجزیہ قرآن وسنت کی روشنی میں کیا ہے تاریخ اسلام میں یہ واحد کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گی ہے مولاناؒ کے بعد عالم عرب میں استاذ انور الجندی کی کتاب "فی التاریخ فکرة ومنهاج" کو اس سلسلہ میں ایک مزید پیش رفت قرار دیا جاسکتا ہے "الصراع بين الفكرة الاسلامية" میں مولاناؒ نے عالم اسلام کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے ماضی اور اس صورت حال کے عوامل اور مضمرات وعواقب کا جائزہ لیا ہے۔مغربی تہذیب کے سلسلہ میں عالم اسلام میں پائے جانے والے تین عمومی رویوں کی طرف اشارہ کر کے صحیح راستہ کی رہنمائی کی ہے اس موضوع پر یہ کتاب بھی مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

حکیم امت اقبالؒ نے کہا تھا ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اپنی اسی خصوصیت کی بنیاد پر امت مسلمہ ہمیشہ عروج وارتقاء کے ساتھ ہی زوال وادبار کے تیروں کا نشانہ بنی رہی، لیکن وہ کبھی مری نہیں اس کا امتیاز رہا کہ ۱۴۰۰ سال کی طویل تاریخ میں دین کے اصل مفاہیم نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے۔اور بدعات وخرافات غلط عقائد اور رسوم ورواج کثرت سے پھیل جانے کے باوجود اسکی پوری تاریخ تجدید واصلاح کی جدوجہد سے بھی معمور ہے موجودہ زمانہ میں ایک مخصوص جماعت نے (ح ۴) بڑے زور شور کے ساتھ یہ دعوی کیا کہ صدیوں سے دین کے اصل مفاہیم امت میں معدوم ہو چکے ہیں، مولانا نے اس خیال کی پرزور تردید کی اور ایجابی انداز میں

اس موضوع پر اکیڈمک کام کیا، اور تاریخ دعوت و عزیمت کا پورا سیٹ تیار کر دیا۔ جو ان کے دعوی پر کہ امت میں تجدید و اصلاح کا ایک تسلسل ہمیشہ قائم رہا ہے۔ اور کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جب دین کی اصل حقیقت کم ہو گئی ہو۔ ایک عظیم مثبت اور علمی ثبوت ہے۔

اصلاح و دعوت و تجدید کی تاریخ کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ امت کے مصلحین نے تحزب اور پارٹی لائن پر کام نہیں کیا وہ بیک وقت پوری امت کو اپنا مخاطب تصور کرتے تھے، اور سارے مسلمان یکساں ان کے مخاطب تھے یہی وجہ ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ سے لے کر حسن بصریؒ، ائمہ اربع، محدثین، عبد القادر جیلانیؒ، رومیؒ غزالیؒ اور اشعریؒ، ابن تیمیہؒ، ابن حزمؒ، ابن خلدونؒ، مجدد الف ثانیؒ، اور امام ولی اللہ دہلویؒ تک سب پوری امت کا یکساں اور مشترکہ سرمایہ بن گئے اور آنے والی نسلوں نے بلا امتیاز ان سب سے اور ان کے علوم و افکار سے استفادہ کیا، بیسویں صدی کے ان خارجی اثرات کے تحت اور حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک نئی روایت قائم ہوئی کہ الگ الگ تحریکیں وجود میں آنے لگیں، اور ان کے مخصوص حلقے بن گئے، بسا اوقات انھوں نے حق کو اپنے دائرہ میں منحصر سمجھا، اور نتیجۃً ان کے اثرات محدود ہو گئے، مولانا علی میاںؒ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اس لائن پر نہیں سوچا، وہ طبعی طور پر تحزب سے نفور رہے انھوں نے اپنی شخصیت کو کسی فکری چوکھٹے میں بند نہیں کیا اور فکر اسلامی کے وسیع اور آفاقی تصور کو سامنے رکھا، حتی کہ وہ خود ایک مدرسۂ فکر اور ایک کارواں بن گئے، مولاناؒ کا ایک بڑا وصف ان کی جامعیت ہے۔ وہ عشق رسول اتباع سنت احترام سلف تربیت باطن اور تزکیہ و احسان سب کو یکساں طور پر مطلوب شرعی قرار دیتے ہیں وہ ہر مسلمان کو اپنا مخاطب سمجھتے ہیں۔ انھیں جماعت دیوبند سے بھی ویسی ہی محبت ہے جیسی تحریک ندوہ سے، محدثین کے مسلک سے بھی عقیدت ہے اور متبع سنت صوفیاء اور سلاسل تصوف کے بھی وہ ویسے ہی قدرداں ہیں۔ امت کے ہر طبقے کے علماء و عمائد اور تمام مکاتب فکر کے نمائندوں کا وہ یکساں احترام کرتے ہیں۔ ان کے قلب میں وسعت ہے فکر میں آفاقیت اور نظر میں بلندی ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس نے انھیں فرقہ بندی اور تحزب سے اونچا اٹھا دیا ہے اور پوری امت میں یکساں محبوب ہر دل عزیز بنا دیا ہے انھوں نے

"ربانیہ لا رھبانیہ" لکھی اور یہ واضح کیا کہ شریعت و طریقت کی تقسیم صحیح نہیں ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں لازمی اور ضروری ہیں، اور گمراہ کن تصوف سے اہل تزکیہ و سلوک و احسان کا کوئی تعلق نہیں، انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ حقیقی اور مطلوب احسان کا نمونہ بھی پیش کیا ہے، اور تصوف کی تجدید و تطہیر بھی کی ہے

موجودہ دور عقلیت اور سائنٹیفک ریسرچ و تحقیق کا دور ہے، اور اس روشن خیالی اور تحقیق کی آڑ میں ہی الحادی تہذیب پھل پھول رہی ہے، شکوک و شبہات کی فضا عام ہے، اس حالت میں دینی مفاہیم کی عصری اور عقلی تشریح کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے، اس صدی کے کئی بہترین دماغوں نے انھیں عقلی اور استدلالی اسلحوں سے لیس ہو کر اسلام کی نصرت و دفاع کا کام کیا ہے، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا علی میاںؒ بھی عصری اسلوب میں کام کی اہمیت کو سمجھتے تھے، اور انھوں نے خود اس سلسلہ میں کام کیا۔ تاہم یہ ایک تاریخی و نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان محض عقل و دماغ کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا، عقل و سائنس انسان کے دل میں شکوک کے بیج بو سکتے ہیں اسے ایمان و یقین کی حرارت اور طمانیت قلب کی دولت نہیں دے سکتے یہ چیز اسے قلب و روح کی تسکین اور جذبہ و ضمیر کے اطمینان کے راستہ سے مل سکتی، مولانا کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ عقل سے زیادہ جذبہ کی تطہیر اور فکر سے زیادہ عمل کی دعوت دیتے ہیں اور یہی انبیاء کی دعوتوں کا مزاج بھی رہا ہے اور قرآن و حدیث نیز تاریخ اسلام سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، (ح ۵) اسلام دین رحمت ہے۔ اور اس کی رحمت انسان ہی نہیں بلکہ ہر ذی روح کو عام ہے، فطری طور پر ہر مسلمان کو رحم دل اور دوسروں کے لیے نفع بخش ہونا ہی چاہئے۔ یہ دین کا بھی تقاضا بھی اور فطرت کا اٹل قانون بھی کہ نفع بخشی ہی کسی قوم کے دنیا میں عروج پانے کا ذریعہ بھی ہے۔ مولانا علی میاںؒ جہاں امت مسلمہ کے مسائل سے دلچسپی لیتے تھے۔ اس کے ضیاع پر تڑپتے تھے اور اس کے حکمرانوں، امراء، اور ارباب حل و عقد کی رہنمائی اور نصح و خیر خواہی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ وہیں وہ تمام انسانوں کے لیے بھی جذبات رکھتے تھے ان کی "تحریک پیام انسانیت" دراصل ان کے اسی جذبہ کا مظہر تھی۔

آج کے مادی دور میں جب کہ پیسہ اور جاہ و حشم ہی ہر چیز کا پیمانہ ہے ان کا سب سے بڑا وصف زہد واستغناء ہے، جو اس زمانہ میں بالکل عنقاء ہے، انھیں عالم اسلام کے جلیل القدر مناصب ملے، کئی بین الاقوامی ایوارڈ حاصل ہوئے، لیکن انھوں نے حاصل شدہ رقموں، عطیات ہدایا اور اپنی وجاہت کو خیر کے کاموں اور دعوت وجہاد کی سرگرمیوں میں تعاون کے لئے استعمال کیا اور اپنی ذات پر کچھ خرچ نہیں کیا۔ خلیج کے ملکوں میں سب لوگ لینے کے لئے جاتے ہیں لیکن مولانا نے خلیج سے کچھ بھی لینے کی کوشش نہیں کی، ہمیشہ ان کو دیا انھیں ان کا مقام اور بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور اسی چیز نے عربوں کو ان کا حد درجہ احترام واکرام کرنے پر مجبور کر دیا۔

ادب انسانی زندگی میں ہمیشہ ہی ایک عظیم رول ادا کرتا رہا ہے۔ خصوصا آج کے زمانے میں، جبکہ اس کے وسائل بہت مؤثر اور بے حد متنوع ہو گئے ہیں، اور اب وہ ابلاغ فکر کا سب سے طاقتور ذریعہ مانا جاتا ہے ماضی میں ہمارے ادب (عربی، فارسی، اردو اور ترکی) کی اصل چھاپ اخلاق وروحانیت کی رہی ہے، لیکن گزشتہ ۱۰۰ سالوں میں مغربی استعمار کے جبر اور معاند قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی بنیاد پر ادب سے خدا رسولؐ اور مذہب واخلاق کے تصورات نکال ڈالے گئے، اور ہمارا ادب حالی کے الفاظ میں "سنڈاس" سے بدتر ہو گیا جس میں صرف مغرب کے در آمد شدہ افکار پیش کیے جا رہے ہیں، اور جو صنفی انارکی، جنسیت، اباحیت، بے قیدی اور بے راہ روی پھیلانے کا ذریعہ بن گیا ہے، مولاناؒ نے معاشرہ پر ادب کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اسلامی ادب کی تخلیق کی طرف توجہ دی۔ اور ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے رویہ کو پروان چڑھایا۔ ان کی قیادت میں اسلام پسندوں کا ایک طبقہ ادب کے میدان میں اترا ہے، اور اس نے مؤثر جاندار تعمیری اور صالح اقدار پر مبنی ادب کی تخلیق شروع کی ہے جو آہستہ آہستہ معاشرہ میں اپنی جگہ بناتا جا رہا ہے۔

مولاناؒ مفکر بھی ہیں، مصلح بھی، مؤرخ بھی اور اردو عربی کے صاحب طرز ادیب بھی لیکن اصلاً وہ ایک دردمند داعی ہیں وہ حسن گفتار پر قادر اور قلم کے سپاہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ کردار کے غازی ہیں، اس طرح ان کی شخصیت ایک جامع، کمالات شخصیت بن گئی اور یہی وہ چیز ہے جو اس صدی میں راقم کے علم کی حد تک کسی دوسری شخصیت کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ خصوصیت کسبی نہیں وہبی ہے بلکہ اللہ کے جناب میں ان کے مقبول بندہ ہونے کی نشانی ہے۔

مولانا اسلامی اخلاق اور حاشمی حلم و مروت اور اودھ کی تہذیبی وضع داری کا ایک مجسم نمونہ تھے انھوں نے منفی طریق کار کو کبھی اختیار نہیں کیا۔ اور ہمیشہ مثبت انداز میں اپنی بات رکھی۔ انھوں نے دوسروں پر تنقید بھی کی، لیکن اس میں بھی علمی تنقید کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اور علمی نقد و تمحیص کے ضمن میں کہیں بھی ذاتیات کو نشانہ نہیں بنایا(ح ٦)۔ آج پورا عالم عرب، عالم اسلام اور بطور خاص ہندوستان کے مسلمان جن شدید قسم کے حالات سے دوچار ہیں ان میں انھیں علی میاںؒ جیسی باشعور اور باکردار قیادت کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے ان کے مدرسۂ فکر کے خوشہ چینیوں اور وارثوں کی طرف ہی عالم اسلام امید کی نظروں سے دیکھ رہا ہے کہ اسے اسی مدرسۂ فکر سے وہ قیادت مل سکتی ہے۔ جس کا شعار تقوی، عدل، راستی اور استقامت ہوں جس کا سلاح علم حزم اور حلم ہو، صبر و عزیمت اور زہد و استغناء اور توکل جس کا زادراہ ہو، وسعت فکر و نظر، احترام آدمیت اس کا سہارا ہو۔ اور ایمان و یقین کا قلعہ اس کی پناہ گاہ، فکر کی گہرائی اس سے وفاداری احساس امانت اور اخلاص و للّٰہیت اس کا امتیاز ہو۔

حواشی اور حوالہ جات:

١- مشرقی صاحب کی یہ نئی تاویلات ان کی کتاب تذکرہ میں خاص طور پر نمایاں ہیں اس کتاب اور اس کے تکملہ میں انھوں نے قرآن کی نزولی ترتیب وضع کی ہے اور اسی کو اصل قرار دیا ہے۔ نیز علماء کی مخالفت میں انھوں نے ملا کا نیا دین ١-٢-٣- نہایت استہزائیہ انداز میں لکھی۔

٢- پرویز نے اپنی کتاب لغات القرآن اور "نظام ربوبیت" میں اسی فکر کی ترجمانی کی ہے۔

٣- مولانا مودودیؒ کا یہ فکر تفہیم القرآن اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر اور خطبات میں نظر آتا ہے اس کو خاص منضبط انداز میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں میں پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے الٰہ، رب، عبادت دین کے معانی و مفاہیم لغت عرب کے حوالہ سے متعین کئے ہیں۔ ان کے مطابق صفات الٰہیہ میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ ہی اصل اور بنیادی صفت ہے، سید قطبؒ نے بھی معالم فی الطریق اور فی ظلال القرآن میں متعدد مقامات پر اس فکر کی ہم نوائی کی ہے۔

٤- مولانا مودودیؒ: ملاحظہ ہو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں مقدمہ کتاب۔ (ص ٤ تا ٦)

٥- مشہور حدیث نبوی ہے الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلح صلح الجسد کله واذا فسد فسد الجسد کله آلا وهی القلب "اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اصل نشانہ دل کی تبدیلی کو بنانا چاہئے

٦- نقد و نظر کے سلسلہ میں مولانا کی چند ہی تحریریں ہیں فکر مودودی پر نقد "عصر حاضر میں دین کی تفسیر و تشریح" میں کیا گیا ہے۔ اور "دو متضاد تصویریں" شیعیت پر ایک سرسری سا نقد ہے البتہ قادیانیت پر مولانا کا بھرپور اور مبسوط نقد ہے ان کی کتاب قادیانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا تھا کہ "مؤلف ہر غصہ کی جگہ ان کا حلم غالب ہے اور انھیں وہاں بھی غصہ نہیں آتا ہے جہاں سب سے زیادہ آنا چاہیئے"

☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ایک مایۂ ناز ادیب، ایک قابل فخر داعی

ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجت (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملیشیا)

ترجمہ و تلخیص: عبدالجلیل ندوی (ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے میری پہلی ملاقات اور تعارف تیس سال قبل اس وقت ہوا جب میں نے ان کی شہرۂ آفاق کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا مطالعہ کیا، میں نے ان کے افکار و خیالات کو بڑے اشتیاق سے پڑھا اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر پیدا ہوئی اسکے معنی و مفاہیم آج بھی میرے دل و دماغ میں مستحضر و محفوظ ہیں، جنہیں کتاب کا خلاصہ اور مغز کہا جا سکتا ہے، صاحب کتاب نے اپنے ادبی اور بلیغ اسلوب میں مسائل کا حل یہ پیش کیا ہے کہ "عالم اسلام کا احیاء صرف اسی پیغام کے ذریعہ ہو سکتا ہے جسے عالم اسلام کے بانی اور معمار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے۔ اس کے لئے ایمان راسخ، یقین کامل اور دین کی راہ میں مرمٹنے اور جان نچھاور کر دینے کا جذبہ بے پناہ ہر دم دل میں موجزن رہنا چاہئے یہ پیغام محمدی بے انتہا واضح اور صاف شفاف پیغام ہے، جس سے زیادہ متوازن اور بہتر پیغام پوری دنیائے انسانیت کو آج تک میسر نہ آسکا، قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وہ عظیم قوتیں ہیں جن کے ذریعہ عالم اسلام میں ایمان اور جوش و جذبہ کی چنگاریاں اور شرارے مشتعل ہو سکتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک عظیم انقلاب برپا کر سکتے ہیں"۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے میری پہلی براہ راست اور بالمشافہ ملاقات رابطۂ ادب اسلامی کے زیر اہتمام استنبول (ترکی) میں (۲۴ تا ۲۶/ ۳/ ۱۴۱۷ھ بمطابق ۸ تا ۱۰/ ۸/ ۱۹۹۶ء) میں منعقد ہونی والی سہ روزہ کانفرنس کے دوران ہوئی۔ جلسہ کا افتتاح حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے مختصر خطاب سے ہوا، خطاب کے اخیر میں مولاناؒ نے پوری قوت و صراحت کے ساتھ یہ بات رکھی "کہ

اسلام صرف عقائد اور خاص قسم کی کچھ بندھی عبادات پر منحصر نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ اگر عالم اسلام کے تمام ادباء و مفکرین جمع ہو جائیں اور انکا مقصد انسانیت کو اس سلامتی اور عزت و شرف کے راستہ پر گامزن ہونے کی دعوت دینا ہو جو اس کا طرۂ امتیاز اور مایہ افتخار رہا ہے تو اس کے لئے انہیں ان قرآنی کلمات سے زیادہ مؤثر، دلآویز اور بلیغ الفاظ ہرگز نہیں مل سکتے مثلاً:

"كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت و فرعها فى السماء، تؤتى أكلها كل حين بأذن ربها"

(اسکی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جسکی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہونچی ہوئی ہیں ہر آن اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے)۔

یہ احساس میں کسی بھی طرح اپنے دل میں چھپا نہیں سکتا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو میں پہلی بار براہ راست سن رہا تھا اور ان کے خطاب کی تاثیر سے گویا میں سحر زدہ سا ہو گیا تھا، اس کے بعد میں نے دوسرے اصحاب علم و فکر ادباء کے خطبات بھی بغور سنے لیکن میرا یہی تاثر تھا کہ مولانا علی میاں ندویؒ کی زبان سے جو الفاظ نکلے ہیں وہ کسی ایسے چشمۂ صافی کا فیض ہیں جسکے سامنے دوسرے چشمے گدلے نظر آتے ہیں، یہ وہ روشنی ہے جو مشکواۃ نبوت سے مستنیر ہے، زبان و بیان کی یہ سلاست اور وہ بھی ایک عجمی نژاد کی زبان سے واقعہ یہ ہے کہ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس موقع پر مجھے مولانا کی عربی دانی، رسوخ علمی، اعتماد و ایمان کامل، فضل و کمال اور عمل و تقویٰ کا بخوبی اندازہ ہوا، میری بصارت نے میری سماعت کی تائید کی اور مشاہدہ نے مطالعہ کو حرف بحرف صادق قرار دیا۔

تیسری ملاقات اسوقت ہوئی جب میں نے ملیشیا کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں "جهود الشيخ ابى الحسن الندوى فى التأصيل الاسلامى للغة العربية و آدابها

عرض و نقد" (عربی زبان وادب کو اسلامی بنیادوں اور مبادی پر استوار کرنے کے سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی خدمات و سرگرمیاں ایک جائزہ اور مطالعہ) کے عنوان سے ایک طالب علم محمد عبدالسلام آزادی کے ایم، اے، کے مقالہ کی سرپرستی قبول کی، یہ مقالہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں پاس ہوا، اس وقت مجھے مولانا ندویؒ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا اتفاق ہوا، یہاں مزید تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں لیکن میں ریسرچ اسکالرس اور علماء کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہوں کہ شیخ ندویؒ کو مقالات اور تحقیقات کے ذریعہ ہمیشہ یاد اور زندہ رکھیں، لوگوں کو ان سے بہت زیادہ تعلق تھا، ان کی باتیں ہر مجلس کی رونق اور زینت ہوتی تھیں، اللہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی آج ہمارے نوجوانوں کو بہت زیادہ ضرورت ہے، میری گذارش تمام یونیورسٹیز اور تحقیقی اداروں سے ہے اور خاص طور سے رابطہ ادب اسلامی سے جس کے وہ خود صدر نشیں تھے، رابطہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائے اور علامہ ندویؒ کی متنوع وہمہ گیر خدمات، دعوتی سرگرمیوں اور ان کے طریقہ کار وافکار اور مخلصانہ کوششوں کو زیادہ سے زیادہ عام کرے۔

پیدائش:- حضرت مولاناؒ خود اپنے بارے میں رقمطراز ہیں، کہ میں ۶/ محرم ۱۳۳۳ھ بمطابق ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا، گھر والوں نے بچپن ہی سے عربی کی طرف توجہ مرکوز کردی تھی، جو بھی ان کے خاندان کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے محسوس ہوگا کہ اس خاندان کا عربی واسلامی علوم کتنا سے گہرا تعلق رہا ہے، جیسا کہ ان کے والدؒ صاحب نزہۃ الخواطر (جنہیں بجا طور پر ہندوستان کا ابن خلکان کہا جاسکتا ہے) علامہ سید عبدالحیٔ حسنیؒ ہیں، جنہوں نے ہندوستان کے علماء کے تراجم سے متعلق ۸/ جلدیں بڑی دیدہ ریزی کے بعد مرتب فرمائیں، ۹/ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا، تو انکی تربیت والدہ سیدہ خیر النساء (م ۱۹۶۸ء) نے کی جو ایک حافظۂ قرآن زاہدہ اور شاعرہ تھیں ان کی کئی کتابیں بھی ہیں۔

ان کی ابتدائی ادبی کاوش یہ تھی کہ تیرھویں صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہیدؒ کے تعلق سے "ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان الشہید" کے عنوان پر ایک مقالہ قاہرہ سے شائع ہونے والے مجلہ "المنار" میں ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا، اس وقت ان کی عمر بمشکل ۱۶/ سال تھی، بعد میں اس

کو علامہ سید رشید رضا نے ایک کتابچہ کی شکل میں ۱۹۳۴ء میں شائع کیا، اس طرح انہوں نے اپنی تحریری اور علمی سرگرمیوں کا آغاز کیا، شیخ نے ۱۹۴۷ء سے اپنے اسفار کا آغاز کیا، جس میں عالم اسلام کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں لکچرس دیئے اکثر جگہوں سے انعامات اور اعزازی ڈگریوں سے بھی نوازے گئے، چونکہ ان کے دل میں ڈگریوں، انعامات، اعزازات کی حرص چھو کر بھی نہ گزری تھی اس وجہ سے بسا اوقات انہوں نے ڈگریوں کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا۔

ایک یونیورسٹی میں دو ہفتہ تک محاضرہ دینے کا معاوضہ قبول کرنے سے انکار کیا (جو تقریباً چھ ہزار امریکی ڈالر کے مساوی ہوتا تھا) اور اسکے جواب میں انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "دعوت اسلامی کی راہ میں اجرت و معاوضہ کا تصور بھی انکے دل و دماغ میں نہیں آتا تھا" یہی وجہ ہے کہ عالمی پیمانے پر اللہ نے انہیں بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ان کے نام مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس کو ان کے جانشین اور خواہر زادۂ عزیز حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے ترتیب دیا ہے ور کتابی شکل میں اسے "رسائل الاعلام" کے نام سے شائع کیا ہے، اس مجموعہ میں تقریباً پچاس مشاہیر علماء ادباء اور اہل قلم کمال و سربراہان ممالک کے ستر ۷۰ خطوط تین سو سے زائد خطوط کے ذخیرہ سے منتخب کر کے شامل کیئے گئے ہیں، بطور خاص یہاں ہم دو نامور اور بلند پایہ مفکر و ادباء شیخ محمد المجذوب اور شیخ علی طنطاویؒ کے تاثرات نقل کرتے ہیں، شیخ محمد المجذوب نے لکھا ہے کہ:

"علامہ ندویؒ کی تحریر کو پڑھنے والا محسوس کریگا کہ انکی عبارت میں ایک غیر معمولی اثر ہے، جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، انکی تحریروں کو پڑھنے والا مسحور سا ہو جاتا ہے، وہ ان خاص اہل دل افراد میں سر فہرست ہیں جو اپنے جذبات کی شدت و فور اور جولانی و روانی کو قرطاس تک منتقل کر دیتے ہیں یہ وہ جوہر گرانمایہ ہے جو خاص روحانی ذوق رکھنے والے ادباء کے یہاں ملتا ہے، جو قرآنی ادب کے رمز شناس ہوتے ہیں، شیخ علی طنطاویؒ مولاناؒ کے طرز دعوت اور اسلوب تعلیم و تزکیہ کو سراہاتے ہوئے بار بار کہتے ہیں: "برادرم ابوالحسن آپ اور آپ کی جماعت اپنے طریقہ پر قائم اور دائم رہئے، تمام داعیان دین کے اسالیب میں آپ کے اسلوب سے بہتر کوئی اسلوب میرے علم میں نہیں ہے جب مضبوط اور مستحکم قلعہ

کا معمار عظیم شمار کیا جا سکتا ہے تو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تو اپنے شاگردوں کی شکل میں اسلام کے بہت سے قلعے تیار کر دیے ہیں، اور علماء صالحین اور مخلص داعیوں کی ایک امت تیار کر دی ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "موجودہ دور کے جتنے بڑے داعیان ہیں ان میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا شمار اکابر میں ہوتا ہے، مزید یہ کہتے ہیں کہ علامہ ندوی علم وادب اور حسب و نسب دونوں کے جامع ہیں، اور یہ ایسی خصوصیت ہے جس کے بعد کسی اور خصوصیت کی حاجت نہیں رہ جاتی"۔

علامہ ندویؒ کی نمایاں خصوصیات میں دعوت اسلامی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر شرکت اور ادب کو ایک طاقتور ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر اپنانا ہے، اور پوری قوت و طاقت سے اسلامی پیغام کو عام کرنے کی کوشش بے حد اہم ہے، اس ادبی قافلہ کے سربرآوردہ ارکان میں امام حسن البناء، سید قطب شہید، شیخ محمد الغزالی وغیرہ ہیں، جنہوں نے موجودہ اسلامی دعوت کو نقطہ عروج تک پہونچا دیا ہے، فکر کو ادب سے الگ کر کے آگے بڑھانا ممکن نہیں، اس طرح اسلام کی دعوت عربوں اور غیر عربوں کو عربی اسالیب کی رعایت اور حکمت کے لحاظ کے بغیر مشکل ہے، کیونکہ عربی زبان کو اسلامی فکر سے نکالنا گویا روح کو جسم سے نکالنے کے مرادف ہے، بقول علامہ طنطاویؒ:

"برادرم ابوالحسن! ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چونکہ ادبیوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا جسکی لے میں شریف رضی کے وقت سے لیکر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپکی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر سے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے، لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپکا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔"

(کاروان مدینہ ص ۱۱)

شیخ یوسف القرضاوی نے مولاناؒ کی دعوتی فقہ پر قلم اٹھایا تو ان کی چھ خصلتوں کو نمایاں کر کے پیش کیا ان میں ایک ممتاز خصلت، ادبی ملکہ اور دوسری خصلت دل زندہ و تابندہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ ملکۂ ادبی اگر دل زندہ سے ہم آہنگ ہو کر کوئی تخلیق منظر عام پر لاتا ہے تو اسکی تاثیر و تسخیر عجیب و غریب بلکہ فاتح عالم ہوتی ہے۔

ادب اور زبان کے تین اصول! میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ ندویؒ نے عربی زبان وادب میں دو اصول پیش کئے ہیں پھر ایک تیسرا اصول ان دونوں کی تعلیم سے متعلق پیش کیا، کیونکہ علامہ نے ایسے عمومی قواعد وضوابط وضع کئے ہیں، جن سے عمومی طور پر ادب کے اثر اور دائرہ کار پر اچھی روشنی پڑتی ہے، اکثر مصنفین اور ناقدین نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ادبی نظریات سب کے سب مغرب کی دین ہیں لیکن علامہ کے ادبی نظریات کی بنا پر ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ادب اسلام کی قائدانہ صلاحیت واہمیت کو ادب ونقد دونوں میدانوں میں پیش کیا ہے، اور عربی زبان کی شان کو دوبالا کیا ہے، اور ایسے وقت میں کیا جب ہمارے درمیان عربی زبان کی شان کو اسلامی وقار کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔

شیخ نے ترکیبات، اسالیب، اصطلاحات اور مفردات کے بارے میں بھی اچھی گفتگو کی ہے، اور عربی زبان کے ارتقائی عناصر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، ضرورت، عاطفہ، جذبہ اور لگن، نفع وافادہ، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اور طریقہ تدریس پر بھی توجہ فرمائی انھوں نے محسوس کیا کہ تعلیم سے اعراض اور بے توجہی نسل کشی کا سب سے مؤثر طریقہ ہوتا ہے۔ بقول اکبر:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

حضرت مولاناؒ کے نزدیک تعلیم مقصد بھی ہے، اور وسیلہ بھی، انہوں نے ان نظریات پر تکیہ کرنے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کیا، جو مشرق ومغرب میں ظاہر ہوئے انہوں نے ان نظریات کو انسانی تجربات قرار دیا جو صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی اسی طرح انہوں نے اس سے بھی خبردار کیا کہ امت اپنے روشن اقدار اور قابل فخر تاریخ سے دست بردار اور غافل ہوتی جارہی ہے، اور یہ واضح کیا کہ زندگی کے معرکہ میں دوبدو حصہ لیکر مفاسد پر تیشے چلانے اور منافع اسلامی کے حصول وتنفیذ کے لئے ادب کو ایک طاقتور اور مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کرنا اور کام لینا ازبس ضروری اور حالات زمانہ کا مقتضی ہے، نیز جدید تربیتی طریقوں سے فائدہ اٹھانا اور حالات کے مطابق نتائج اخذ کرنا اور معتدل اور متوازن

تبدیلیوں اور اضافوں کیلئے ذہن و دماغ کو کشادہ اور تیار رکھنا نیز فراخدل ہونا بھی لازمی ہے۔

مولاناؒ نے ادب کے میدان میں اسلامی ادب کے مفہوم کو واضح کیا، اس میں جغرافیائی حدود کے وجود سے انکار کیا، اسلامی ادب اور اس کے بنیادی عناصر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، عقیدہ، جذبہ، اخلاص، صدق، یہ وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کو فنی شرائط سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا کا ادبی نظریہ و موقف مکمل طور سے اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اصناف ادب کی اہمیت واضح کی، مثلاً شعر، ادب اطفال۔ سفرنامے۔ ادب سوانح، مقدمہ نگاری وغیرہ۔

حضرت مولانا نے ادب کے سلسلہ میں نظریہ سازی کے ساتھ ہی ساتھ عملی طور پر ادب کی تطبیق و تنفیذ میں خود بھی حصہ لیا ہے اور مختلف مذکورہ اصناف ادب میں اپنا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے۔

قصوں کے ادب کے متعلق سید قطب حضرت مولاناؒ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ "بلا تکلف یہ بات کہتا ہوں کہ علامہ ندوی کی کوششوں میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اپنی ادبیت کے لحاظ سے واضح تر اور فائق تر ہے، جس میں قصہ کے ساتھ اسکے متعلقات کی طرف اشارات، متوازن تشریحات و توضیحات شامل ہیں، مزید انہوں نے "قصص النبیین" سے متاثر ہو کر کہا کہ اس کتاب کے ذریعہ میں نے علامہ ندویؒ کو پہچانا جس میں اُن کی شخصیت کی سلامتی اور قلم کی جولانی دونوں گھل مل گئی ہیں، میں نے ان میں اسلامی جذبات سے معمور اور ایمانی افکار سے مخمور قلب و دماغ اور عقل و خرد پائی ہے، میں نے محسوس کیا کہ ان زندگی کا سارا تانا بانا اسلام ہی سے بنا ہوا ہے، یہ حق کی شہادت ہے جو میں دے رہا ہوں، اس مختصر سے مقالہ میں ادب و لغت کے میدان میں علامہ ندویؒ کی کوششوں کا احاطہ خارج از استطاعت ہے، اس پر قلم اٹھایا جائے تو تفصیلی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

(واللہ ولی التوفیق)

✪✪✪✪

(۳)

علمی و دینی کمالات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اور

علم تفسیر

پروفیسر بدرالدین الحافظ ٭ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

میرے خیال میں علم تفسیر یا قرآن فہمی ایک ایسا خداداد ملکہ ہے جسے باری تعالیٰ اپنے منتخب اور مخصوص بندوں میں ودیعت فرماتا ہے، اور پھر اس عظیم خدمت کیلئے ایسے ہی حالات بن جاتے ہیں، ماحول فراہم ہو جاتا ہے، ایسے ہی اشخاص کے گہوارے اور ربانیین کی آغوش میں کلام الٰہی کا فہم پیدا کرنیوالوں کی نشو ونما اور تربیت کے مراحل طے ہوتے ہیں، جس طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو ابتدا سے یہ خصوصی ماحول ملا اور آپ کی شخصیت دین و دانش کے خوشنما سانچے میں ڈھلتی چلی گئی آپ فرماتے ہیں :۔

"میری زندگی قرآن مجید کے مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاذ عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوق قرآنی ملا تھا (یعنی شیخ خلیل بن محمد یمانی) وہ قرآن مجید پڑھتے تھے اور روتے تھے، بس پہلا نقش جو مجھ پر پڑا وہ انکی آواز کا جو درد میں ڈوبی ہوئی تھی، یہ میری خوش نصیبی تھی اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے، اس کے بعد جب میری تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا،

مدارس میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں، پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علی لاہوریؒ سے پورا قرآن مجید پڑھا اور یہاں بھی جس چیز نے متأثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی، جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنہ کا وہ اثر مجھ پر پڑا جس کو "برکت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا، میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے یا جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا، مولانا مدنی اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں سے تھے اور علوم وفنون وحدیث کے علاوہ (جن کے وہ مانے ہوئے استاذ اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا، اس کا رنگ انکی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا، انہوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں، مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے، اور وہ تحریک کا زمانہ تھا، لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا، اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، اور میرا تأثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا ان کا تھا، پھر مولانا حمید الدین فراہیؒ (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہکر ان کی گفتگو، ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعۂ قرآن سے پورا استفادہ کیا۔" (۱)۔

مندرجہ بالا مختصر تذکرہ میں حضرت مولانا مرحوم کے تعلیمی حالات تو آگئے اب آپکی تدریسی زندگی کا آغاز ملاحظہ فرمائیں:۔

"۱۹۳۴ء میں اس ہیچمدان کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ تفسیر وادب کی حیثیت سے ہوا، اور انہی دونوں مضامین کے اسباق اس کے سپرد ہوئے، دارالعلوم

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ قرآنی افادات ص ۲۸ تا ۳۰ ایم حسنی ٹرسٹ تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

ندوۃ العلماء میں استاذ کی قدیم کتابیں جلالین، بیضاوی اور کشاف داخلِ نصاب تھیں لیکن اس کا شروع سے اہتمام کیا گیا تھا، کہ قرآن مجید کا مکمل متن درجوں کے معیار اور طلباء کی استعداد کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف درجوں میں پڑھا دیا جائے اور قرآن مجید کا کوئی حصہ چھوٹنے نہ پائے، میرے سپرد بھی مختلف درجوں میں قرآنی اسباق ہوئے جن میں درجہ ششم میں ابتداء کے دس پارے بھی تھے، مجھے اس خدمت اور مشغولیت کے دوران یہ محسوس ہوا کہ طلباء کو قرآن مجید سے متعارف کرانے اس کے اصل مقاصد اور مرکزی مضامین سے آشنا بنانے اس سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور ان غلطیوں کمزوریوں اور ان بیماریوں سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے جو قرآن سے استفادہ کی راہ میں حجاب بنتی ہیں اور اس کے اثرات و برکات سے محروم رکھتی ہیں"۔ (۱)

مندرجہ بالا احساسات اور ضروریات کے تحت مولانا مرحوم نے اپنے درجات میں مختلف عنوانات پر مضامین لکھوانے شروع کئے اور یہ سلسلہ ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۷ء سے شروع ہو کر کئی سال تک چلتا رہا، طلبہ نے اس سلسلہ سے بہت دلچسپی لی اور پھر یہ مضامین مختلف مجلات میں شائع ہوئے، یہاں تک کہ ۱۹۸۲ء میں پہلی بار یہ کتاب "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" کے عنوان سے ۱۹۶ صفحات پر شائع ہوئی، اسمیں ۱۴ بڑے موضوعات اور ذیلی عنوانات ہیں، ہر مضمون مولانا مرحوم کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور کلام الٰہی کا تعارف معلوم ہوتا ہے۔

پھر چونکہ مولانا مرحوم کا تاریخ اسلام اور اقوام عالم سے متعلق عمیق مطالعہ تھا، اس روشنی میں دیکھا جائے تو آپ نے قرآن پاک کو اسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، نیز دیگر کتب سماویہ سے موازنہ کر کے قرآن پاک کے ترجیحی دلائل پیش کئے ہیں، اس سلسلہ میں آپکا مضمون "قرآن مجید اور انبیاء کی سیرت تورات و قرآن کے مرقع میں"، مہتم بالشان مضمون ہے اسکی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

---

(۱) حضرت مولانا علی میاں "مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی" ص۱۔ مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔ ۱۹۸۲ء

"قرآن مجید اور تورات کے درمیان ایک بڑا عظیم الشان فرق یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی سیرت بالکل بے داغ اور ایسی پاکیزہ پیش کی ہے جو ان کے منصب و مقام کے بالکل مطابق ہے، بلکہ اس نے ان تمام الزامات اور تہمتوں کی تردید کی ہے جو ان کے دشمنوں یا نادان دوستوں میں مشہور تھیں، لیکن عہد عتیق کے صحیفوں میں ان انبیاء کے متعلق ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن کو پڑھ کر تہذیب کی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، ان پر کہیں کفر کے الزامات لگائے گئے اور کہیں فسق کے، کتاب پیدائش کے باب ۹ میں حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق، کتاب پیدائش کے باب ۱۹ میں حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق، کتاب خروج کے باب ۳۲ میں حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق کتاب سلاطین کے باب ۱۱ میں صاف صاف کفر و شرک اور فسق و فجور کی شہادتیں موجود ہیں، لیکن قرآن مجید میں حضرت نوح کو رسول امین کہا گیا ہے (سورۂ شعراء) اور ان پر سلامتی و برکات بھیجے گئے ہیں (ہود ع ۴) حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق کہا گیا " اور لوط کا قصہ یاد کرو جب ان کو ہم نے حکم (حکمت و نبوت) اور علم بخشا اور اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کیا کرتے تھے بچا نکالا، بے شک وہ برے اور بدکردار لوگ تھے۔ (الانبیاء ع ۵)

توراۃ میں حضرت ہارون علیہ السلام پر گوسالہ پرستی کا جو صاف صاف الزام لگایا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"بنی اسرائیل کے کہنے سے موسیٰ کی غیبت میں ہارون نے زیور کا ایک بت بنایا اور تمام بنی اسرائیل سے اس کو پجوایا اور اس کیلئے قربانیاں گزارنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کی زمین سے نکال لایا ہے"۔ (کتاب الخروج باب ۳۲)

قرآن اس کے برعکس ان کی دعوت توحید کا ذکر کرتا ہے۔

" اور ہارون نے ان سے پہلے کہہ دیا تھا کہ لوگو! اس سے صرف تمہاری آزمائش

کی گئی ہے اور تمہارا پروردگار تو خدا ہے تو میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو۔" (طٰہٰ ع ۵)

حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق توراۃ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا، جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا، کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عشتارات اور عمونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی جیسی اس کے باپ داؤد نے کی تھی"۔

آگے چل کر کہا گیا ہے :۔

"اور خداوند سلیمان سے ناراض ہوا، کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل سے پھر گیا تھا جس نے اسے دوبارہ دکھائی دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے، اس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا" (۱)

سورۂ ص میں ان کے اخلاص اور عبدیت کاملہ اور ان کے قرب و وجاہت کو بیان کیا گیا ہے :۔

"اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، بہت خوب بندہ تھے اور رجوع کرنے والے تھے"۔ (ص۔ع ۳)

آگے چل کر فرماتا ہے :۔

"اور بے شک ان کیلئے ہمارے یہاں قرب اور عمدہ مقام ہے"۔ (ص۔ع ۳)

اسی طرح حضرت مسیحؑ اور انکی والدہ پر یہودیوں نے جو کچھ الزامات لگائے تھے اور انکی طرف جن باتوں کی نسبت کرتے تھے، قرآن مجید نے ان کی صاف صاف تردید کی ہے

---

(۱) کتاب مقدس سلاطین باب ۱۱ آیت ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱ — شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور پاکستان ۱۲

اور حضرت مسیح کو خدا کے ایک مکرم اور وجیہ اور مبارک پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ، سورۂ مریم اور سورۂ زخرف)۔

ان مضامین میں جو قرآن اور صحف سابقہ کے درمیان مشترک ہیں، قرآن مجید اور ان صحیفوں کے درمیان جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور جن کے متعلق ان کے ماننے والے کہتے ہیں کہ وہ محفوظ ہیں، یہ اصولی فرق ہے۔ باقی وہ مضامین اور تعلیمات جن میں قرآن منفرد ہے اس کے علاوہ ہیں، اس کے بعد یہ کہنا کہ قرآن مجید ان قدیم معلومات میں صحف سابقہ کا خوشہ چیں ہے، قرآن مجید نیز اپنی کتابوں سے ناواقفیت کی کھلی ہوئی دلیل ہے، قرآن مجید کے مضامین براہ راست علم الٰہی سے ماخوذ ہیں اور ان کی اطلاع کا سرچشمہ وحی آسمانی ہے، اسی لئے وہ حقیقت کے بالکل مطابق، بے داغ، بے عیب ہر قسم کے شک واشتباہ سے پاک ہے، وہ صحف سابقہ کی انسانی تحریفات اور یہود کے انبیاء مقدسین کے متعلق ہر قسم کی غلط بیانیوں اور بہتان تراشیوں کی تردید کرنیوالا اور ان کتابوں کا مصدق اور مہیمن ہے" (۱)

ایک موازنہ: یہاں ہم تھوڑا سا موازنہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کلام اللہ کی خدمت کیلئے ہر ایک کی راہ جدا کردی گئی ہے، ایک طرف مولانا علی میاں نے کتب سماویہ سے موازنہ کرتے ہوئے قرآن مجید کی حقانیت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور قرآنی آیات سے عظمت انبیاء علیہم السلام کے شواہد پیش کئے ہیں تو دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے انبیاء کرام اور عاد وثمود وغیرہ کے محل وقوع کی نشاندہی کی ہے، تاکہ محققین اس سے علمی غذا حاصل کرسکیں، مثلاً سورۂ ہود میں حضرت نوح ؑ کے جودی پہاڑ کا تذکرہ وغیرہ۔

مولانا علی میاںؒ کی تفسیری خصوصیات: آیات کی تشریح آج کے تغیر پذیر دور میں اس

(۱) مولانا ابوالحسن علی ندویؒ "مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی" ص۷۳ تا ص۷۸

طرح فرماتے ہیں کہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے اس کا مصداق دیکھ لے اور قرآن کریم کی عصری معنویت سمجھ لے، مثلاً: "تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا"۔

"آج آپ اپنی آنکھوں سے اس آیت کا تحقق دیکھ رہے ہیں کہ وہ شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا اور جس کی جڑ زمین میں تھی، کہاں تھی؟ جزیرۃ العرب میں تھی، جو سیاسی حیثیت سے، فکری حیثیت سے، علمی حیثیت سے اور مالی حیثیت سے، ہر حیثیت سے دنیا کا پسماندہ ترین علاقہ تھا اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ" (سورۂ ابراہیم ۲۴) اس کی شاخیں کہاں تک گئیں، اس کی شاخیں آسمان تک گئیں، آپ دیکھیں کہ اس کی اشاعت اور فتوحات کے نتیجہ میں کتنی سلطنتیں پیدا ہوئیں اس کے نتیجہ میں کتنی دانش گاہیں، کتنی جامعات وجود میں آئیں، کتنے مراکز ہدایت و تربیت قائم ہوئے، کتنے محقق پیدا ہوئے، کتنے ادیب پیدا ہوئے، کتنے مفکر پیدا ہوئے اور کتنا بڑا لٹریچر تیار ہوا، کسی ایک زبان میں بھی اگر آپ اس کا احاطہ کرنا چاہیں تو مشکل ہے، جو کلمہ کہا گیا تھا جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر وہ آج ساری دنیا میں پھیل رہا ہے اور وہ اپنے پھل دے رہا ہے، شجرۂ طیبہ کی طرح پھل پھول رہا ہے" (۱)

مولاناؒ کی تفسیر میں رحمت کا عالمگیر مفہوم:

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ" بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کے راستہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور اللہ کے راستہ میں انتہائی کوششیں کیں وہی لوگ کچھ امید کر سکتے ہیں، اللہ کی رحمت کی۔

"رحمت کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے کہ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف کیجائے تو اس سے ایک ایسی رحمت مطلق مراد ہوتی ہے جو غیر معین اور غیر محدود، زمان و مکان کی تمام پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے، اس میں علم ہے اس میں معرفت ہے، اسمیں یقین ہے،

(۱) مولانا علی میاںؒ۔ قرآنی افادات ص۷۸۔ محمد الحسنی ٹرسٹ تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

اسمیں تقویٰ ہے، اسمیں احسان ہے، اسمیں مقبولیت ہے، اسمیں محبوبیت ہے، اسمیں کرامت ہے، اسمیں خوارق ہیں، اسمیں نصرت ہے، اسمیں تائید ہے، اسمیں غلبہ ہے اسمیں عزت ہے، سب کچھ اس میں آتا ہے، یہاں پر اللہ نے رحمت کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے ورنہ ہو سکتا تھا اُولٰئِكَ يَرْجُوْنَ الرَّحْمَةَ فرما دیتا تاکہ معلوم ہو کہ یہ رحمت کیسی ہوگی، وہ کوئی ایسی ویسی رحمت نہ ہوگی، ایک عام آدمی کی مہربانی بھی مہربانی ہے ایک امیر آدمی کی مہربانی اس سے زیادہ ہوتی ہے، ایک بادشاہ کی مہربانی اس سے بڑھ کر ہوتی ہے، لیکن اللہ کی مہربانی کا کیا کہنا "مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ" کوئی قیاس وہاں تک نہیں پہونچ سکتا اور اس میں کوئی حدود قائم نہیں ہو سکتے کہ اتنی اور اتنی دور، یہاں سے وہاں تک کوئی اس کا رقبہ نہیں، کوئی اسکی پیمائش نہیں، کوئی اس کا عمق نہیں، کوئی اس کا عرض وطول نہیں، یہاں تک کہ کوئی اس کا نام نہیں، بس وہ اللہ جس طرح چاہے"۔ (۱)

صَابِرُوْا کا ہندوستانی مفہوم :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے وہ لوگو جو ایمان لائے اِصْبِرُوْا صبر اور قوت برداشت سے کام لو اور پھر قرآن کا معجزہ ہے، جو عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ باب مفاعلہ لازم چیزوں کے لئے اور جو ذاتی چیزیں ہیں ان کے ساتھ یہ باب بہت کم آتا ہے وہ متعدی چیزوں کے ساتھ آتا ہے جیسے "مقاتلہ" ایک دوسرے سے لڑنا "محاربہ" ایک دوسرے سے جنگ کرنا "مناصرہ" ایک دوسرے کی مدد کرنا، لیکن صبر جو ایک ذاتی فعل اور ایک ذاتی اقدام اور ایک ذاتی طرز عمل ہے اس کے لئے مفاعلہ کا صیغہ ہے "وَصَابِرُوْا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کی تلقین کرو، قوت برداشت کا مظاہرہ کرو مردانہ وار، بہادرانہ اور صابرانہ طریقے پر تم نے اسے برداشت

(۱) حوالۂ سابقہ ص۱۱۹۔

کیا ہے، لیکن اسکو جائز قرار نہیں دیا، ایک برداشت کرنے کے معنیٰ ہماری اُردو میں یہ بھی ہوتے ہیں "اچھا بھائی ہو گیا، کیا کیا جائے مجبوری ہے" یہ نہیں، تم نے برداشت کر لیا، سہ لیا اور اس کے بعد تم وہی کے وہی رہے، تمہاری قوتِ ایمانی وہی ہے، تمہارے اعتقادات وہی ہیں، تمہارے توکل علی اللہ کی کیفیت وہی ہے اور اللہ کو قادر مطلق ماننے کی تمہاری صفت وہی ہے، تو ارشاد ہے "وَصَابِرُوا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، یعنی صبر کا شامیانہ تمہارے سروں پر چھایا نظر آئے، صبر کے بادل کا سایہ تمہارے سروں پر رہے اور جو دیکھے وہ کہے کہ یہ امت بڑی قوت برداشت والی ہے، اسمیں بڑی قوتِ مقابلہ ہے، لیکن اسے کسی حکمت کی بناء پر اور اللہ کی مدد کے انتظار میں، اور انسانی محبت و برادری کا اور ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کیلئے اور حدود سے تجاوز نہ ہو اسکے لئے اسے ایک مناسب وقت کا انتظار ہے، یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ہماری مان لی گر گئے پاؤں کے نیچے پڑ گئے نہیں "وَصَابِرُوا" صبر کی فضا چھائی ہو اور معلوم ہو کہ اس کے اندر بڑی قوتِ مقابلہ ہے، یہ قوت مقابلہ بیرونی حملوں کیلئے نہیں بلکہ اندرونی حملوں کیلئے بھی ہے، جی اس وقت بھی چاہتا ہے کہ ماریں اور مر جائیں لیکن انھوں نے اپنے کو قابو میں رکھا ہے، مفاد عامہ ان کے سامنے ہے، ان کے سامنے ملک کی مصلحت ہے ان کے سامنے پڑوسیوں کے حقوق ہیں، ان کے سامنے ظلم و سفاکی اور خونریزی کی قباحت ہے ان کو ایمانی طاقت روک رہی ہے، ان کے سامنے جو اسوۂ رسول ہے، جو صحابہ کا نمونہ ہے وہ ان کو روک رہا ہے، ورنہ یہ میدان میں آجائیں تو یہ بھی بتا دیں کہ یہ کیا کر سکتے ہیں اور دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک قلیل گروہ نے کیا کیا۔

یہ قرآنی اعجاز ہے کہ آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کیلئے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو صبر سے کام لو وَصَابِرُوا جمے رہو، دیوار بنے رہو ان فسادات، ان نازک حالات، ان حملوں، ان تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں

اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلہ میں چھاؤنی بنے رہو" (۱)

تقویٰ کا خصوصی مفہوم :

جب کسی زبان کا لفظ کسی زبان میں آتا ہے تو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے معنیٰ کھو دیتا ہے اور اس کے ساتھ ذہن کے سوچنے کے بہت سے طریقے لگ جاتے ہیں، ان ہی میں سے ایک لفظ تقویٰ اور متقی کا ہے، ہمارے یہاں متقی کے معنیٰ ہیں بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے اور نہ کھاتا ہو اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو تو اور بڑا متقی ہے اور ذرا ذرا سی چیز میں شبہ سے بچتا ہو متقی ہے، لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے، اسمیں یہ ایک مستقل صفت کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں، تقویٰ خوف کا نام ہے، تقویٰ تلاوت یا تسبیح کا نام نہیں، تقویٰ ایک مستقل صفت ہے، تقویٰ ایک مزاج ہے، تقویٰ ایک ملکہ ہے، تقویٰ ایک طبیعت ہے، رمضان تو اسلئے آتا ہے کہ ہمکو متقی بنائے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" دیکھنے میں یہ چھوٹا سا کلمہ ہے، ورنہ تو قرآن کا ایک چھوٹا سا کلمہ بھی معجزہ ہے تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رمضان ہے تو تقویٰ ہے اور رمضان گیا تو اب وہ تقویٰ نہیں ہے، اس کا نام تقویٰ نہیں ہے۔

حضرت مولانا کی تفسیر میں انسانی برتری کا تصوّر :

بعثتِ محمدی کے وقت نوعِ انسانی کے اکثر افراد پر فطرتِ انسانی سے بدگمانی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی، اس ذہنی کیفیت کے پیدا کرنے میں ایشیاء کے بعض قدیم مذاہب اور مشرق وسطیٰ اور یورپ کے تبدیل شدہ عیسائیت نے یکساں کردار ادا کیا تھا، ہندوستان کے قدیم مذاہب نے تناسخ آواگون کے فلسفہ کے ذریعہ جسمیں انسان کے ارادہ واختیار کو مطلق دخل نہیں ہے اور جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پہلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کی سزا بھگتنی ضروری

(۱) حوالۂ سابقہ ص ۱۲۴، ۱۲۵۔

ہے، اور عیسائیت نے انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے اور اس کیلئے حضرت مسیح کے کفارہ بننے کی ضرورت کے عقیدہ کے نتیجے میں اس وقت کے متمدن دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کو جو ان مذاہب کے پیرو تھے اپنی ذات سے بدگمانی اور اپنے مستقبل اور خدا کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

(اس سلسلہ میں) قرآن مجید نے اعلان کیا کہ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا، اور اس کے حصہ میں اسی کی کوشش اور اس کے نتائج آنے والے ہیں، انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوگا اور اس کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

سورۂ النجم میں کہا گیا ہے :-

"یہ کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اسکا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔" (النجم ۳۸ - ۴۱)

اس اعلان نے انسان کا اپنی فطرت اور اپنی فطری صلاحیتوں پر وہ اعتماد بحال ہوگیا جو بالکل متزلزل ہوگیا تھا، وہ نئے عزم و یقین اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی اور انسانیت کی تقدیر چمکانے اور اپنی قسمت اور قوت آزمانے کیلئے سرگرم سفر ہوگیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں، لغزشوں اور غلطیوں کو ایک عارضی حالت قرار دیا جس میں انسان کبھی کبھی اپنی نادانی، کوتاہ نظری اور نفس و شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا ہے، صلاحیت، خیر پسندی اور اعترافِ قصور و ندامت اسکی فطرت کا اصل تقاضا اور انسانیت کا جوہر ہے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنا، اس پر نادم ہونا خدا کے سامنے رو دھو کر اپنے اس قصور کو معاف کرالینا اور آئندہ ایسی غلطی کے نہ کرنے کا عزم کرنا انسان کی شرافت اور آدم کی میراث ہے۔ (۱)

---

(۱) مولانا علی میاں - نبی رحمت ص ۶۲۲، ۶۳۴ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ کی دلنشیں تشریح :

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اس خدا سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، قرآن مجید میں انقلابی طور پر یہ تصور پہلی بار پیش کیا گیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ہر فرد ایک دوسرے کا محتاج ہے، ہر ایک سائل ہے اور ہر ایک مسئول ہے، پھر تقسیم اس طرح نہیں کہ سائلین ایک طرف ہیں اور مسئولین دوسری طرف، بلکہ جو سائل ہے وہ مسئول بھی ہے اور جو مسئول ہے وہ سائل بھی ہے، تساؤل (مشترک سوال وجواب) ایک ایسی زنجیر ہے جس میں ہر ایک بندھا ہوا ہے، ہمارا تمدنی زندگی ایک جال ہے جس میں ہر ایک دوسرے کا ضرورت مند ہے، مرد، عورت کے بغیر اپنا قدرتی اور فطری سفر خوشگوار طریقہ سے طے نہیں کر سکتا اور کوئی شریف خاتون رفیقِ حیات کے بغیر خوشگوار طریقہ سے زندگی نہیں گزار سکتی، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو دوسرے کا ایسا سائل اور محتاج بنا دیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی۔

"وَالْأَرْحَامَ" اور رشتہ داریوں کا بھی خیال کرو، آج نیا رشتہ قائم ہو رہا ہے، تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا رشتہ قائم ہوتا ہے تو پرانے رشتوں کو بھلا دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، بعض بعض معاشرتوں میں اور بعض تہذیبوں میں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نہیں، یہ رشتہ مبارک، لیکن اس سے پہلے کے جو رشتے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں، جو حقوق و فرائض ہیں ان کی ذمہ داریاں اپنی جگہ پر ہیں، ماں اپنی جگہ پر ہے، باپ اپنی جگہ پر ہے، بہنیں اپنی جگہ پر ہیں، بھائی اپنی جگہ پر ہے، ایک نئے رشتے سے وہ رشتے ختم نہیں ہوں گے، فرمایا وَالْأَرْحَامَ رشتہ داریوں کا خیال رکھو، جس کا جو حق ہے اسے ادا کرو، لڑکے کو بھی نصیحت ہے، لڑکی کو بھی یہ نصیحت ہے ان کے گھر والوں کو بھی یہ نصیحت ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تو وقت کی بات ہے کون دیکھتا ہے، کون جانتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ط

بے شک اللہ دیکھنے والا ہے، وہ ہر ایک کے ساتھ ہے اور ہر وقت ہے۔ (۱)

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں، ان سے حضرت مولانا علی میاں مرحوم کی تفسیر و تشریح آیات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور چونکہ مولانا مرحوم کی تفسیر پر تو کوئی خاص کتاب نہیں ہے، اس لئے ان تقریروں اور تحریروں سے ہی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں، جن کا مجموعہ چند سال قبل مولانا کی حیات میں "قرآنی افادات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

میں جہاں تک سمجھا ہوں مولانا مرحوم نے آیات کی تشریح و تفسیر میں جو نقطۂ نظر اختیار فرمایا وہ سابقہ تراجم اور اردو تفاسیر سے بالکل ممتاز نظر آتا ہے، آپ نے ہر تقریر و تحریر میں ہر مکتب فکر کے قاری اور سامع، ہر سطح کے ذہن کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیات قرآنی کی ایسی تشریح کی ہے جو موجودہ زمانہ کے حالات میں قابل فہم ہو، ہر سننے والا محسوس کرے کہ ہمارے گرد و پیش اور بین الاقوامی مسائل حالات، مشکلات اور دشواریوں میں قرآن کریم آج بھی کس طرح ہماری رہنمائی کر سکتا ہے، اس کے علاوہ حضرت مولانا نے دور از کار تعبیرات، مختلف فیہ آرا یا کسی مخصوص عقیدہ سے متأثر تراجم سے اجتناب کرتے ہوئے صرف لغوی تراجم اور آسان مفہوم اختیار کیا ہے اسی لئے آپ کی تقریریں اور تحریریں ہر حلقہ میں پسند کی جاتی ہیں، مولانا مرحوم چونکہ عربی زبان و ادب اور تاریخ عالم کی مہارت رکھتے تھے، عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے خصوصی واقفیت تھی، اسی لئے آپ نے آیات کی تشریح کرنے میں اپنے علمی ذخیرہ کے ہر گوشہ کو استعمال کیا اور جہاں مترادفات ضروری سمجھتے ہیں وہاں قاری کی ذہنی تشنگی کو دور کرنے کیلئے انھیں استعمال کرتے ہیں، اس لحاظ سے آپ کا طریقۂ تفسیر استفادہ کے زیادہ مواقع فراہم کرتا ہے۔

**

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ قرآنی افادات ص ۲۰۵-۲۲۵ محمد الحسنی ٹرسٹ تکیہ کلاں رائے بریلی۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی

قرآن فہمی کے دو نمونے

از:- (مولانا) محمد باقر حسین ——— بانی و صدر دار العلوم الاسلامیہ بستی یوپی

عصر حاضر میں تفسیر قرآن کریم کی خدمت کی سعادت متعدد علماء و فضلاء نے حاصل کی ہے، جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا فراہیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا آزادؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا دریابادیؒ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے علماء بھی ہیں جنھوں نے کوئی مستقل تفسیر تو نہیں لکھی، لیکن قرآن فہمی کے سلسلے میں ان کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں اور جنھوں نے قرآن میں غور و فکر تدبر و تامل اور گہرے مطالعہ و تحقیق سے کام لیا اور باقاعدہ تفسیر کے بجائے تفسیر آیات و سُوَر کے ذریعے حالات کے تقاضے، عصری ذہن و فکر اور جدید سوالات کے حل و تفہیم کیلئے قرآن فہمی کی نئی روایتیں اور جہتیں قائم کیں اور ان کی مجموعی قرآنی خدمات کسی مفسر سے کم نہیں، ایسے علماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام بہت ممتاز ہے، انہوں نے لاہور میں چند برس قیام کرکے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (صدر انجمن خدام الدین لاہور) سے تفسیر قرآن کا باقاعدہ درس لیا، پھر فراغتِ علمی کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں کئی برس تک

تفسیر قرآن کے اسباق پڑھائے اور ادارۂ تعلیمات اسلام کے تحت بھی برسوں تک درسِ قرآن دیتے رہے، اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ ان کے فکر و نظر کا محور و مصدر بنا رہا، اور انہوں نے نئے حالات میں ملت کی رہنمائی کیلئے قرآن میں غواصی کی اور اس سے حسبِ طلب و ضرورت درّ ہائے آبدار برآمد کئے، چنانچہ ان کی تصانیف اور تقریروں میں جابجا آیاتِ قرآنی سے استدلال و استشہاد کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں، جن سے بہت سی آیاتِ قرآنی پر ایک نئی روشنی پڑتی نظر آتی اور مفاہیم و مطالب کے نئے دروازے کھلتے نظر آتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ اپنے مطالعۂ قرآن کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اس کے بعد جب میری تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان سے زیادہ پڑھیں، پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علیؒ سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی جسکو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولاناؒ کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنّت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جسکو برکت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا، میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے، جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں، وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا، مولانا مدنیؒ اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے اور علوم و فنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاذ اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا، اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا، انھوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں، مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے، اور وہ تحریک کا زمانہ تھا، لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔" (۱)

---

(۱) قرآنی افادات - از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ص ۳۰

اس کے بعد انہوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بھی اپنے استفادے کا ذکر کیا ہے (۱)

پھر آگے چل کر بیان کیا ہے کہ: "میں نے اپنا تعارف اسلئے کرا دیا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنی طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے، ع انچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم۔

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے، میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے اور میں تاریخ کو قرآن مجید ہی کی تفسیر سمجھتا ہوں" (۲)

انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے بھی قرآنی استفادہ کیا تھا، وہ علامہ ابن تیمیہؒ ابن قیمؒ اور حافظ ابن کثیرؒ کی قرآنی تحقیقات پر خاص طور سے اعتماد کرتے تھے، قرآن سے متعلق ان کی کتابوں میں "افادات قرآنی" "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" "منصب نبوت" اور "قصص النبیین" وغیرہ ہیں، جن میں مولاناؒ کے قرآن مجید سے استفادہ کے بلند پایہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ کے ذوق و قرآنی بصیرت کا یہ خاص پہلو بہت اہم ہے کہ وہ ذاتی و جماعتی سیاسی و فکری اور دیگر رجحانات سے الگ رہ کر قرآن مجید کے خالص مطالعہ پر زور دیتے تھے اور سلف صالحین اور معتبر و قدیم مفسرین و آثارِ صحابہؓ کو ترجیح دیتے تھے اور لغت و شعر عرب پر زیادہ اعتماد کو پسند نہیں فرماتے تھے، اسی طرح مذہبی و کلامی فرقوں اور بعض دینی و سیاسی جماعتوں کی مخصوص تفسیروں سے مطمئن نہ تھے، اور قرآنِ مجید کے سلسلے میں تحزب و تعصب سے بیزار تھے۔ وہ قرآن میں فکر و تدبر کے ساتھ تقویٰ و طہارت، اخلاص نیت، انابت و رجوع الی اللہ، توکل و اعتماد علی اللہ، دعا اور تضرع و ابتہال کو قرآن فہمی کے راستے کا زادِ راہ اور سامانِ سفر سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ خدا طلبی کا راستہ اپناتے ہیں تو اللہ انکی رہنمائی بھی کرتا ہے،

---

(۱) قرآنی افادات ص ۳۱ (۲) ایضاً ص ۳۲

(والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا)

مولاناؒ کی اکثر تقریروں اور تحریروں میں آیات قرآنیہ سے نادر استدلال و استنباط کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، انہوں نے خود لکھا ہے کہ :-

"بسا اوقات کسی تقریر کے وقت موضوع معلوم نہیں ہوتا تھا اور بر وقت قاری کی تلاوت سے کوئی مضمون و مفہوم سامنے آجاتا تھا اور اس کے متعلق کوئی آیتِ قرآنی رہنمائی کر دیتی تھی"۔

مولاناؒ روایتی طور پر قرآن کو وعظ و نصیحت کیلئے استعمال کا طریقہ نہیں اپناتے تھے، بلکہ حالات و زمانہ کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن سے رہنمائی کے طالب ہوتے تھے، اور ان آیات میں پوشیدہ مفاہیم و معانی کی پردہ کشائی فرماتے تھے جو عام طور سے نظروں سے اوجھل رہتی ہیں، اس طرح قرآن فہمی کے نئے نئے اور نادر نمونے سامنے آتے رہتے تھے، جو ان کی خود رائی پر نہیں، بلکہ قرآن کے عمیق و طویل مطالعے اور سلف صالحین کے قرآنی آراء پر وسیع نظر کا نتیجہ ہوتے تھے ـــــ اختصار کے خیال سے حضرت مولاناؒ کے قرآنی طریقۂ استدلال کے صرف دو نمونوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، جن سے ان کی نکتہ رسی، اور قرآن فہمی کی گیرائی و گہرائی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب کا استنباط مولاناؒ نے اس آیت سے کیا ہے اور لکھا ہے :-

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (شوریٰ ۱۳)	اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کرلیتا ہے، اور وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرتے ہیں۔

.....

"اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقام اجتباء اور دوسرے ہدایت اجتباء کیلئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے : اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جسکو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت

واجتباء کا درجہ عطا کرے لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے، یھدی الیہ من ینیب۔ وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور جن میں انابت کی، تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستے پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں انابت کی صفت پائی جائے" (۱)

اس آیت کی شرح کرتے ہوتے مولاناؒ نے قرآن فہمی کے کئی اصول و آداب بیان کر دئے ہیں وہ فرماتے ہیں :۔

"پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ افادہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت سے اور کلامِ ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرآن مجید کو نوافل میں پڑھے اور یہ تصور کرے کہ جیسے قلب پر اسی وقت نزول ہو رہا ہے اور اس کا لطف لے اور اس میں گم ہو جانے کی کوشش کرے، قرآن مجید دماغی زور آزمائی کی چیز نہیں ہے کہ اپنا پسندیدہ مطلب قرآن مجید سے زور آزمائی کر کے نکالا جائے۔

تیسری بات یہ کہ دورانِ مطالعہ جو مطلب و معانی سمجھ میں آئیں تو یہ کہے کہ میری ناقص سمجھ میں یہ بات آئی ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے اور یہ دعوی ہرگز نہ کرے کہ آج تک قرآن کو کسی نے سمجھا نہیں، میں نے ہی سمجھا ہے، یہ بالکل صحیح نہیں، میں نے بارہا کہا اور لکھا بھی ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برسوں میں نہیں سمجھا سکا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے، وہ تو کہتا ہے :۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" اور آپ کہتے ہیں کہ :۔

---

(۱) قرآنی افادات ص ۳۵۔

ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا"۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمنار میں اس کی اختتامی تقریر میں میں نے کہا تھا کہ اہل علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا اس کے نتیجے میں ہمارا خیال یہ ہے ..... میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں .....

لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائج فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں، قرآن مجید کے سلسلے میں آتا ہے کہ اس کا نیا پن، تازگی، پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہا نہیں، تو اگر آپکو عمر نوحؑ بھی ملے، اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو ہر روز نئے نئے معانی کھلنے لگیں، ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور اس کے بعد ہمارا دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو اپنی کتاب سمجھا جائے، یہ کتاب ہدایت ہے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے، قرآن مجید میں ہر شخص اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہوگا جبکہ آپ اسکو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد کو ہوگی، پہلے اپنی اصلاح ہو جائے، انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے، پھر میں دوسروں سے کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت بنے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے، حالانکہ صحابۂ کرامؓ قرآن پڑھتے تھے اپنی اصلاح کیلئے، ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا، سورۂ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی .....

"یھدی الیہ من ینیب" کے میدان میں جہانتک ہم کوشش کرسکتے ہیں کریں، اللہ جسکو چاہے مقام اجتبا تک پہونچائے ہم اس کے مکلف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں، اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے، جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزلِ مقصود پر بھی پہنچائے گا، ہم میں ہدایت کی طلب، اپنی احتیاج کا احساس، اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہیے، اسی کے مجموعہ کا نام "انابت" ہے۔" (۱)

حضرت مولاناؒ کی نگاہِ دوررس نے آیت قرآنی "ومن الناس من یشتری لھوالحدیث الآیۃ" میں ٹیلی ویژن اور ویڈیو جیسی عصر حاضر کی تمام تفریحی خرافات کی جھلک دیکھ لی تھی، یہ انکی توجہ، ذہانت، حاضر دماغی اور جدت طرازی کا کمال تھا، ایک مرتبہ دورانِ گفتگو ٹیلی ویژن وغیرہ کا ذکر آنے پر قرآنی موضوعات کی وسعت کے سلسلے میں فرمایا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسی تمام تفریحی چیزوں کیلئے "لھوالحدیث" کی اصطلاح وضع کرکے اپنی منشاء واضح کردی ہے"۔

چنانچہ حضرت مولاناؒ اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ومن الناس من یشتری لھوالحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم" (اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو بیہودہ حکایتیں خریدتے ہیں، تاکہ لوگوں کو بے سمجھے خدا کے راستے سے گمراہ کریں) (سورۂ لقمان ۶)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صرف نام لینا رہ گیا ویڈیو اور ٹی وی کا، قرآن تو عربی زبان میں ہے اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا؟ عقل کی بات نہیں تھی، لیکن قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے جو کتاب نکلی، اگر میں مسجد میں بیٹھ کر کہوں کہ اس میں ٹی وی اور ویڈیو کا ذکر ہے تو میں غلط نہیں کہوں گا، اس لئے کہ قرآن میں کہا

---

(۱) قرآنی افادات ص ۳۹-۴۱

گیا "من یشتری لھو الحدیث" جو لوگ عربی کی بلاغت سے واقف ہیں، اور اسکی زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں، اہل زبان کی طرح، اور محض اللہ کا شکر و انعام ہے کہ ہمیں اسی حجاز و یمن کا فیض پہونچا ہے کہ ہم اس قابل ہوئے، ہمارے استاذ عرب تھے، ہم نے ساری عربی عربوں سے پڑھی، الحمدللہ! تو ہم "لھو الحدیث" کا لطف لے رہے ہیں، ہمارا عربی کا ذوق "لھو الحدیث" کے دائرے کی وسعت کو دیکھ رہا ہے، میں اس لفظ کا ترجمہ نہیں کر سکتا، حالانکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں "لھو الحدیث" کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کر سکتا..... اس کے معنی ہیں باتوں کا کھیل، اب بتائیے..... ریڈیو اور ویڈیو وغیرہ میں کیا ہے؟ اگر یہ ہوتا کہ بہت سے لوگ ہیں جو کھیل کو پسند کرتے ہیں، کھیل خریدتے ہیں تو اس میں ویڈیو اور ٹی وی نہ آتا، مگر باتوں کا کھیل کہا گیا، یہ وہ ہے جو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قرن اول قرن ثانی، قرن ثالث، قرن رابع اور پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں صدی، یہاں تک کہ میں کہوں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ذہن بھی یہاں تک نہیں گیا ہوگا (یعنی ویڈیو اور ٹی وی کی طرف) یہ قرآن کا معجزہ ہے، حدیث کا لہو، باتوں کا کھیل اور وہ کیا ہے؟ یہ ویڈیو کا پروگرام، ٹی وی کی بولتی تصویریں، یہ ویڈیو، یہ ریکارڈ جو سنے جاتے ہیں سب "لھو الحدیث" ہیں، آج سے چودہ سو برس پہلے جب یہ سب چیزیں ایجاد ہونا تو درکنار کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اسوقت اللہ کی کتاب نے کہہ دیا، بہت سے لوگ ہیں جو "لھو الحدیث" خریدتے ہیں۔"[1]

★★★

(۱) خطبات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۵۳ - ۵۴

مولانا علی میاںؒ اور علمِ حدیث

ابو سحبان روح القدس ندوی :- استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا علی میاں کے خانوادہ کی علمی خصوصیات میں حدیث شریف سے شغف اور مدرسۂ ولی اللّٰہی سے وابستگی بھی ہے، صاحب نزہۃ الخواطر کے بیان کے مطابق سید ابو سعید محمد ضیاء بن آیت اللہ بن علم اللہ الحسنی (ت ۱۱۹۳ھ) نے شاہ ولی اللہ سے اکتسابِ فیض کیا، شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد محمد عاشق بن عبداللہ البھلتی (ت ۱۱۸۷ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، مدینہ طیبہ میں ابو الحسن السندی (ت ۱۱۸۷ھ) سے امام بغوی کی المصابیح کا درس لیا۔(۱)

تیرہویں صدی ہجری کے نابغۂ روزگار میں سید قطب الہدیٰ بن محمد واضح (ت ۱۲۲۲ھ) نے شاہ عبدالعزیز سے فقہ و حدیث کا علم حاصل کیا اور ان کے ذخیرۂ کتب سے اہم کتابیں نقل کیں صحیح بخاری اور جامع ترمذی پر ان کے حواشی ہیں۔ (۲)

اس عصر کے فضلاء میں اسحاق بن محمد عرفان (ت ۱۲۳۴ھ) شاہ عبدالقادر کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے اور شاہ عبدالعزیز سے سندِ حدیث لی۔ (۳)

اس عہد کے علماء میں ایک اور فاضل مولانا علی میاں کے پردادا سید عبدالعلی بن علی محمد

النصیر آبادی (ت ۱۲۶۹ھ) محمد علی رامپوری المحدث (ت ۱۲۵۸ھ) سے حدیث پڑھی۔ (۴)

چودھویں صدی کے مشاہیر میں مولانا علی میاں کے دادا "مہر جہاں تاب" کے مؤلف علامہ سید فخر الدین بن عبد العلی (ت ۱۳۲۶ھ) مولانا محمد نعیم ابن عبد الحکیم الانصاری (ت ۱۳۱۸ھ) کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور مشکاۃ المصابیح، تفسیر جلالین ان سے پڑھی، سید خواجہ احمد بن محمد یٰسین النصیر آبادی (ت ۱۲۸۹ھ) نے اپنی تمام مرویات و مقروءات کی سند دی، شاہ یعقوب بن محمد افضل دہلوی (ت ۱۲۸۲ھ) نواسۂ شاہ عبد العزیز اور مولانا سخاوت علی جونپوری (ت ۱۲۷۴ھ) نے انھیں اجازتِ حدیث عطا فرمائی۔ (۵)

مولانا علی میاں کے والد علامہ سید عبد الحیٔ بن فخر الدین حسنی (ت ۱۳۴۱ھ) نے حدیث کی بیشتر کتابیں شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی (ت ۱۳۲۷ھ) سے پڑھیں، علاوہ ازیں مولانا عبد الحیٔ کو مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (ت ۱۳۱۳ھ) قاضی محمد بن عبد العزیز مچھلی شہری (ت ۱۳۲۰ھ) میاں سید نذیر حسین (ت ۱۳۲۰ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (ت ۱۳۲۳ھ) قاری عبد الرحمٰن پانی پتی (ت ۱۳۱۴ھ) سے اجازت حاصل ہے۔ (۶)

مولانا علی میاں کے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی (ت ۱۳۸۰ھ) نے مولانا انور شاہ کشمیری (ت ۱۳۵۲ھ) اور مولانا محمود حسن دیوبندی (ت ۱۳۳۹ھ) سے کتب صحاح و سنن پڑھی اور شیخ حسین یمانی سے لکھنؤ میں "کتاب الأولیات" للشیخ سعد سنبل پڑھی اور ان سے سندِ حدیث بھی لی۔ (۷)

مولانا علی میاں کی بہن امۃ اللہ تسنیم (ت ۱۳۹۶ھ) نے امام نووی کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاض الصالحین" کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا جو "زادِ سفر" کے نام سے مشہور و متداول ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی کے مقدمہ اور مولانا محمد منظور نعمانی کے تعارف سے آراستہ ہے۔

اس خانوادہ کے گوہر نایاب مولانا سید ابو الخیر برق حسنی (ت ۱۳۹۰ھ) مولانا علی میاں کے ماموں زاد بھائی۔ کو حفظ حدیث سے بڑا شغف تھا، صحیح مسلم اور مؤطا کی ہزاروں حدیثیں

مع سند انھیں یاد تھیں، شرح و تطبیق احادیث سے بھی ذوق رکھتے تھے، مشکلات الحدیث کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی، وہ حدیث میں مولانا عبدالرحمٰن بن محمد یعقوب بستوی کے شاگرد ہیں اور ان کے اثرات سے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا۔ (۸)

اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی سادات حسنی اور خانوادۂ شاہ علم اللہ کے وارث و امین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۳۳۳-۱۴۲۰ھ) کی ذاتِ گرامی ہے۔

مولانا کی تعلیمی سرگزشت خود ان ہی کی زبان ملاحظہ فرمائیں:-

"میں نے ایک ایک فن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ تحصیل کی اور مخلوط نصاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہمارے صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق استاد خلیل عرب صاحب نے سب سے پہلے عربی ادب کی تکمیل کرائی، چنانچہ عربی زبان کی ابتدائی ریڈر المطالعۃ العربیۃ سے نہج البلاغۃ، حماسہ اور دلائل الاعجاز تک تین سال کا ملا عربی ادب اور اس کے متعلقات ہی پڑھتا رہا۔

ادب کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو شیخ خلیل عرب کا طبع زاد اور خود ایجاد تھا مجھے خوش قسمتی سے علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی صحبت میسر آئی جو عربیت اور نحو و صرف میں عصر حاضر کے یگانہ اشخاص میں سے تھے، ان کو امام فن کہنا بجا ہوگا، ادب کے بعد میں نے کچھ فقہ کی تعلیم حاصل کی اور دو سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے درس میں حدیث کی تکمیل کی، اس زمانہ میں کچھ تفسیر بیضاوی کا حصہ مولانا سے پڑھا، کچھ عرصہ کیلئے میں نے لاہور جا کر مولانا احمد علی صاحب کے تفسیر کے درس میں شرکت کی، اس درس پر قرآن مجید سے سیاسی نکات کے استنباط کا ذوق غالب تھا اس طرز سے مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں ہوئی" (۹)

مولانا اپنے مطالعہ حدیث کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"میں جب اپنے استاذ شیخ خلیل عرب سے ادب کی کتابیں پڑھتا تھا اس وقت انھوں نے

ادب کے نصاب کے علاوہ دو اور سبق شروع کرا رکھے تھے، ایک قرآن مجید کی چند سورتیں جن میں سورۂ زمر خاص اہمیت رکھتی تھی، دوسرے مسلم کی کتاب الجہاد، یہ میرا حدیث سے پہلا تعارف ہے" (۱۰)

مولانا کی کتب حدیث سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، لکھتے ہیں :۔

"اپنے گاؤں میں اصلاح و وعظ کے سلسلہ میں حافظ منذری کی کتاب "الترغیب والترہیب" کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، اس کو بار بار پڑھ کر سنایا، اسی زمانہ میں محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل" دیکھنے کا اتفاق ہوا" (۱۱)

"اسی زمانہ میں اپنے ضلع کے مشہور مردم خیز قصبہ سلون جانا ہوا، جہاں شاہ حلیم عطا صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا اس کتب خانہ سے بعض علماء و محدثین کی تصنیفات کا شوق پیدا ہوا جس میں علامہ ابن جوزی اور حافظ ابن رجب حنبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں"۔ (۱۲)

مولانا کی حدیث کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شروع ہوا، فرماتے ہیں :۔

"میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاذ نصیب ہوا جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مجاز تھے"۔ (۱۳)

"اور حدیث براہ راست میاں نذیر حسین سے پڑھی تھی"۔ (۱۴)

مولانا علی میاں نے ایک ایک فن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ حاصل کی، فرماتے ہیں :۔

"یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا صرف حدیث کے اسباق تھے"۔ (۱۵)

"میرا قیام اکثر مولانا کے ساتھ رہتا اور میں ان کے کتب خانہ کا مہتمم اور ان کے مسودات کا ناقل اور مرتب بھی تھا اور ان کے حکم سے رجال کی کتابوں سے مواد بھی فراہم کرتا اس سے مجھے بڑا علمی فائدہ پہونچا اور مجھے علمی ترقی کا میدان ہاتھ آگیا"۔ (۱۶)

"میں نے مولانا سے دارالعلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، میری حدیث کی تعلیم سرتاپا ان کی شفقت اور مہارتِ فن کی رہین منت ہے"۔ (۱۷)

مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے طرز تدریس پر مولانا علی میاں روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"تدریس حدیث کا طرز خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین کے درس کا عکس"۔ (۱۸)

"یمنی علماء کی کتابوں سے استفادہ بھی پورا تھا، خاص طور پر الامیر محمد بن اسماعیل الصنعانی اور سید محمد بن ابراہیم بن الوزیر، علامہ مقبلی اور علامہ شوکانی کی کتابیں برابر مطالعہ میں رہتیں اور ان کا حوالہ دیتے، علماء احناف میں سے بھی ان کتابوں کا حوالہ دیتے جن کا پایہ حدیث میں مسلّم ہے اور جنھوں نے مذہب حنفی کے اثبات میں احادیث ہی سے زیادہ تر کام لیا ہے، مثلاً امام طحاوی، علامہ زیلعی اور ابن الترکمانی اور ابن الہمام"۔ (۱۹)

"اصولِ حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص ماخذ تھے جن میں "تنقیح الأنظار" اور "توضیح الافکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں"۔ (۲۰)

"صرف شروح پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اونچے اونچے ماخذ طلبہ کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں اگر کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا تو صرف فتح الباری اور عینی ہی پر بس نہیں ہوتی، بلکہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کیلئے ان کی "کتاب الام" پڑھاتے، امام مالک کے دلائل کیلئے "مدونہ" اور اس کی شروح پیش کرتے"۔ (۲۱)

"نکات اور توجہات کی طرف زیادہ میلان نہیں تھا، بلکہ انداز بحث محدثانہ ہوتا تھا"۔ (۲۲)

"اسماء الرجال کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، یہاں بھی متقدمین کی تصانیف کی فکر میں رہتے تھے، میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ اور لسان المیزان کے اقوال تنقیدی نظر سے پڑھتے تھے اور متقدمین کی کتابوں میں ان کی سند تلاش کرتے تھے"۔ (۲۳)

"حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، ان کا درس عملی تھا جس میں طالب علم استاذ کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے، اور کبھی کبھی مرتب کراتے تھے اور بعض مرتبہ بعض کتابوں کی شرح کا کام شروع کراتے تھے، اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے"۔ (۲۴)

"بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہل زبان مختلف الخیال ہیں، ایسے مواقع پر علمائے معانی و بیان اور ائمہ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلام عرب سے استشہاد ہوتا اور الفاظ کی حیثیت اور مختلف زبانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی، اور بڑی کدوکاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی"۔ (۲۵)

"مولانا کے درس کی ایک برکت یہ تھی کہ فن حدیث سے مناسبت اور اس کی بنیادی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی"۔ (۲۶)

"میں نے یہ طریقۂ درس کہیں اور نہیں دیکھا، اور میرے خیال میں علمی حیثیت سے اس سے زیادہ مفید اور ترقی یافتہ طریقۂ درس نہیں ہے"۔ (۲۷)

مولانا علی میاں کے علم حدیث میں استفادہ کے سلسلہ میں ان کے قیام دیوبند اور مولانا حسین احمد مدنی کے حلقۂ درس میں شرکت کا تذکرہ اگر نہ کیا جائے تو علمی امانت کا حق ادا نہ ہوگا بلکہ یہاں تو

اس کا ذکر یوں بھی ضروری ہوگیا کہ مولانا حسین احمد اور مولانا حیدر حسن دونوں کے طریقۂ درس کا کیا انداز تھا؟ اور مولانا علی میاں نے ان میں سے کس کا اثر قبول کیا؟ اور انکے نزدیک کس کا طریقۂ درس مفید اور ترقی یافتہ ہے؟ یہاں بغیر کسی کم و کاست مولانا علی میاں کے دیوبند میں قیام اور مولانا حسین احمد کے درس میں شرکت کا حال انھیں کی زبانی پیش خدمت ہے، مولانا فرماتے ہیں :-

"۱۹۳۲ء میں مولانا مدنی کی کسی تشریف آوری کے موقع پر بھائی صاحب نے مجھے مولانا مدنی کی خدمت میں پیش کیا، میں نے اپنے کچھ حالات عرض کئے، مولانا نے بھائی صاحب کو مشورہ دیا کہ مجھے ان کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے، تعلیمی سال جو تمام مدارسِ عربیہ میں شوال سے شروع ہوتا ہے، نصف سے زیادہ ہو چکا تھا، اور میرے بارے میں مولانا کا منشاء باقاعدہ طالب علم بننے کا تھا بھی نہیں، صرف کچھ دن ساتھ رہنے کا تھا، میں ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ (جولائی، اگست ۱۹۳۲ء) کو دیوبند حاضر ہوا، اس وقت تعلیم اور درسِ حدیث اپنے نقطۂ عروج پر تھا، مولانا کے یہاں بخاری اور ترمذی ہوتی تھی، میں نے اس میں باقاعدہ شرکت شروع کر دی"۔ (۲۸)

مولانا مدنی کے طریقۂ درس کا حال خود مولانا علی میاں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں :-

"ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی، اور مسئلہ کا مالہٗ و ماعلیہ ائمہ کے اختلاف و مذاہب، اور ان کے دلائل و ماخذ، متن و اسناد و رجال کی بحثیں برجستہ، اس سب پر مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی روحانی و پر سکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے اور گویا اسوقت بھی "بالسند المتصل إلی امیر المؤمنین فی الحدیث ....." کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے) تحمل کیساتھ جواب دیتے آخری سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد بھی دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد بھی درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں

کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا" (۲۹)

مولانا علی میاں نے مولانا حسین احمد کے درسِ حدیث میں شرکت کے علاوہ قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے میں بھی استفادہ کیا، مولانا فرماتے ہیں :۔

" درس حدیث کے علاوہ جس سے مولانا کی قوت تدریس اور شانِ محدثیت کا اظہار ہوتا تھا اور پوری فضا پر نورانیت اور سکینت کا سایہ معلوم ہوتا تھا، میں نے مولانا سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کے سمجھنے کیلئے خصوصی وقت مانگا، مولانا نے مجھے جمعہ جمعہ کا وقت دیا، جس پر مولانا کے اس وقت کے سیاسی دوروں کی وجہ سے اکثر ناغے ہو جاتے تھے، پھر بھی استفادہ کا موقع ملا اور مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا" (۳۰)

تعلیمی سال کے اختتام پر مولانا علی میاں دیوبند سے واپس آجاتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"جب دارالعلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی اور کتابیں ختم کے قریب پہونچیں تو میں دیوبند سے واپس آگیا" (۳۱)

اب میں اس سلسلہ کو مولانا علی میاں کی ایک عبارت پر جس میں دیوبند کے طریقۂ درس پر مولانا کا زبردست ریمارک ہے ختم کرتا ہوں اور نتیجۂ بحث قاری کے ذمہ چھوڑتا ہوں، مولانا تحریر فرماتے ہیں :۔ " دیوبند کے قیام میں میرے لئے دل بستگی کا واحد ذریعہ مولانا (مدنی) کی ذاتِ گرامی تھی، میری ذہنی و تعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کی درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہِ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا" (۳۲)

یہاں مولانا علی میاں نے اپنی جس ذہنی و تعلیمی انداز تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس اجمال کی تفصیل خود مولانا کے مطالعہ ادب و حدیث کی سرگزشت اور ان کے اساتذۂ ادب و حدیث کے طریقۂ درس سے روشن و عیاں ہے، مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں کے طریقۂ درس و طرز تحدیث نے جو خالص

محدثانہ و محققانہ اور جو محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین یمانی کے درس کا عکس تھا مولانا علی میاں کے فکر و خیالات میں وسعت پیدا کی اور عمل بالحدیث کی راہ آسان کر دی، چنانچہ قراءۃ خلف الامام ہو یا سفر میں جمع بین الصلاتین، تعدیل ارکان فی الصلوٰۃ ہو یا صفتِ نماز کی ادائیگی کی کیفیت مولانا علی میاں مسلکِ احناف سے بالکل الگ عاملین بالحدیث کی صف میں نظر آتے ہیں[عہ] غالباً مولانا علی میاں اپنی اسی توسع کی وجہ سے ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی (ت ۱۳۸۶ھ) کی مشہور کتاب "تراجم علمائے اہلحدیث ہند" میں جگہ پانے کے مستحق ہوئے۔

مطالعۂ حدیث مولانا علی میاں کا پسندیدہ موضوع و مشغلہ رہا ہے، ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ابواب بخاری (کتاب الایمان، کتاب العلم) کا درس دینے کا معمول رہا ہے، اِدھر چند سالوں سے عالمیت کے طلبہ کو ترمذی اور فضیلت کے طلبہ کو صحاحِ ستہ بشمول مؤطا امام مالک اور مسند احمد کی سند عطا فرماتے، نیز حجاز و شام اور ہندوستان کے متعدد علماء و مشائخ کو اجازت حدیث عنایت فرمائی۔

مولانا کی سند حدیث کا ذکر آگیا ہے تو یہ عرض کرتا چلوں کہ مولانا کو سند حدیث دو جلیل القدر محدثین سے حاصل ہے، ان میں ایک مولانا حیدر حسن خاں (ت ۱۳۶۱ھ) اور دوسرے صاحبِ "تحفۃ الاحوذی" مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (ت ۱۳۵۳ھ) اور ان دونوں کی سندِ حدیث شیخ حسین بن محسن یمانی کے طریق سے علامہ شوکانی صاحبِ "نیل الاوطار" اور شیخ الاسلام عبدالرحمٰن بن سلیمان الأھدل کے واسطہ سے علمائے حرمین تک پہونچتی ہے، اور میاں سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (ت ۱۳۲۰ھ) کے طریق سے مولانا ٹونکی اور مولانا مبارکپوری کی سند شاہ ولی اللہ عن ابی طاہر محمد بن ابراہیم الکردی ائمۂ حرمین سے مل جاتی ہے، اسطرح مولانا علی میاں یمنی اور حجازی دونوں طرز تحدیث کے تلمیذ و خریج ہیں۔ (۳۳)

یہاں یہ بھی واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گو مولانا علی میاں نے مولانا حسین احمد

عہ محترم مقالہ نگار کا یہ بیان محلِ نظر ہے اور اس سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ)

کے درس بخاری و ترمذی میں چار ماہ ضرور شرکت کی، لیکن ان سے اجازت حدیث کا ثبوت مولانا علی میاں کی کسی تحریر و بیان اور ان کی سند حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

اخیر عمر میں صحیح بخاری سے مولانا کا شغف بہت بڑھ گیا تھا، اپنے کسی عزیز سے متن بخاری کا کچھ حصہ روزانہ سماعت فرماتے اور اپنے والد کی حدیث میں تصنیف لطیف "تہذیب الاخلاق" زیر مطالعہ رہتی، ادھر کئی سالوں سے ندوۃ العلماء میں ختم بخاری کے موقع پر بخاری کی آخری حدیث کی روشنی میں پُر از معلومات اور ایمان افروز تقریر فرماتے۔

مولانا موصوف نے اپنے تین قیمتی رسالوں میں حدیث کے موضوع پر مختلف زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے، وہ تینوں رسالے جو کہ عربی میں ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) المدخل الی دراسات الحدیث النبوی الشریف۔

(۲) دور الحدیث فی تکوین المجتمع الاسلامی۔

(۳) محمد بن اسماعیل البخاری وکتابہ الجامع الصحیح۔

اوّل الذکر رسالہ میں حدیث سے متعلق نہایت قیمتی اور اچھوتی بحث ہے، ساتھ ہی صحاح ستہ کی خصوصیات، اصول حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، تدوین حدیث جیسے موضوعات پر ایک نیا زاویۂ فکر پیش کیا ہے، طالبان علوم حدیث کیلئے یہ رسالہ بہت مفید ہے۔

ثانی الذکر رسالہ جو خود صاحب مضمون کے بیان کے مطابق "اس مقالہ میں ایک نئے زاویہ نگاہ اور ایک نئے اسلوب سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حدیث مسلمانوں کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے؟ امت کو سنت کی کس قدر ضرورت ہے؟ اور اس امت کے سنت مطہرہ سے رشتہ منقطع ہو جانے اور حدیث نبوی کے سرمایہ سے محروم ہو جانے میں امت کا کتنا بڑا خسارہ ہے؟ اور وجود اسلامی کیلئے کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے؟ حدیث کے سند و حجت ہونے کے بارے میں شک و شبہ و بے اعتمادی پیدا کرنے کی عالم اسلام کے بعض گوشوں میں جو تحریک چل رہی ہے وہ اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سے مقاصد

ومحرکات سرگرم عمل ہیں"۔ (۳۴)

دراصل یہ رسالہ جس کا اردو ترجمہ "اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" اور انگریزی ایڈیشن (Role of Hadith In the Promotion of Islamic Climate and attitudes) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوچکا ہے، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے توسیع خطبات کے موقع پر عالم اسلام کی اہم شخصیات کے سامنے پڑھا گیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

آخر الذکر مولانا کا وہ مقالہ ہے جسے اکتوبر ۱۹۹۳ء میں سمرقند میں امام بخاری پر منعقد دو روزہ سیمینار میں عالم اسلام کے مشاہیر اور فضلائے حدیث کی موجودگی میں پیش کیا گیا، جس میں امام بخاری اور انکی کتاب "الجامع الصحیح" سے متعلق قیمتی نکات ومباحث آگئے ہیں۔

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول میں تدوینِ حدیث، محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی، فنِ اسماء الرجال، محدثین کی احتیاط وامانت، ان کا قوت حافظہ اور استحضار، مجالسِ درس میں سامعین کے ہجوم پر خاصہ مواد جمع ہوگیا ہے جو دراصل تاریخ تدوین حدیث کا خلاصہ ونچوڑ ہے۔

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ پنجم باب ششم میں حدیث کی اہمیت اور ہر ملک اور ہر دور میں اس کی ضرورت، حدیث امت کیلئے صحیح میزان ومعیار ہے، تاریخ اسلام میں اصلاح وتجدید کی تحریکیں علم حدیث سے وابستہ ہیں، پھر ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ پر بڑی سیر حاصل بحث آگئی ہے۔

مولانا کی تصانیف بالخصوص "ارکان اربعہ" میں حدیث سے بھرپور استفادہ ملتا ہے، ضعیف اور موضوع حدیث پر عمل کے سلسلہ میں مولانا علی میاں متشددین گروپ میں نظر آتے ہیں، یعنی یحییٰ بن معین، امام بخاری ومسلم، ابن حزم اور شیخ البانی وغیرہ کی فکر کے قریب دکھائی دیتے ہیں، اس بارے میں مولانا کا موقف ملاحظہ فرمائیں:

"اسلام میں اکثر فتنے، شکوک وشبہات اور اختلافات ان حدیثوں سے پیدا ہوئے

ہیں جو موضوع اور ضعیف ہیں، درحقیقت موضوع اور ضعیف حدیثوں میں نورِ نبوت، اصلاح وتربیت کی حقیقی طاقت اور اللہ کی طرف سے وہ تائید وحفاظت نہیں ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ کے ساتھ موعود ہے، پھر اس کے اندر بکثرت وہ عنصر ہے جس کو عقلیں آسانی سے ہضم نہیں کرسکتیں اور مختلف شبہات کی تخم ریزی ہوتی ہے، میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ فضائلِ اعمال تک میں صرف احادیثِ صحیحہ پر اکتفا کی جائے اور ان احادیث کو پیش کیا جائے جن پر محدثین نے بالاتفاق کلام کیا یا جو ان مجموعوں میں بند ہیں جن کو عام شہرت اور تلقیِ امت کا درجہ حاصل ہے، بڑے تجربوں کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں اور آخر میں یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ صحیحین کو خصوصیت کے ساتھ اور پھر باقی صحاح کو بالعموم حدیث کے پورے ذخیرہ میں امتیاز حاصل ہے اور وہ کتابیں جن کے ساتھ امت نے اس درجہ کا اعتنا نہیں کیا ان کے ہم پلہ نہیں ہوسکتیں خصوصیت کے ساتھ اس دورِ فتن میں جس میں طبیعتوں میں بکثرت زیغ وضلال پایا جاتا ہے، احادیث و روایات کے بارے میں اس احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے"۔ (۳۵)

حدیث شریف کی بعض اہم کتابوں اور شروح کے بارے میں مولانا علی میاں کے خیالات وتأثرات ملاحظہ فرمائیں۔

ابوزکریا یحیی بن شرف النووی (ت ۶۷۶ھ) کی شرح مسلم کے بارے میں مولانا کی رائے ہے:۔

"درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ نووی کی شرح مسلم سے ہوا جو ایک مبتدی طالب علم کیلئے بڑا اچھا استاد ہے، شروح حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور دینے کا ملکہ اس سے پیدا ہوا"۔ (۳۶)

حافظ ابن حجر عسقلانی (ت ۸۵۲ھ) کی "فتح الباری شرح صحیح البخاری" پر مولانا کا ریمارک ہے:۔

"فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اسوقت حافظ ابن حجر

کی وسعتِ نظر، فنِ حدیث میں انکی قدرت اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احترام دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں کہیں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے" (۲۷)

محمد بن نصر المروزی (ت ۲۹۴ھ) کی کتاب "قیام اللیل" سے مولانا بہت متأثر ہیں، فرماتے ہیں :۔

"ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل" ہے، اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رُخ بدل دیتی ہے اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے مؤثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پُر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کئے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغازِ شباب میں مل جائیں اور اپنا اثر کر جائیں، تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں" (۲۸)

حافظ ابن قیم الجوزیہ (ت ۷۵۱ھ) کی "زاد المعاد" جو دراصل فقہ السنۃ کی بے مثال شاہکار ہے، مولانا علی میاں اس کتاب کے بڑے قدر داں ہیں، فرماتے ہیں :۔

"میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی "زاد المعاد" میرا کتب خانہ، میری رفیقِ سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی، دینیات کے کتب خانہ کی اس سے بہتر نمائندگی اس کتاب میں ملنی مشکل ہے، اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے

اور سنّت کا ضروری علم بخشا۔" (۳۹)

دوسری جگہ طلبۂ حدیث اور دعوتی و تربیتی کام کرنے والوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں :۔

"حدیث کے طالب علم اور اصلاح و تربیت کے شائقین سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتا ہوں، میں نے مدینہ طیبہ کے قیام میں اس کی تجرید کا بھی کام شروع کیا تھا۔" (۴۰)

مولانا کے مطالعہ حدیث کے دو سالہ مدت تعلیم کے زمانہ میں قلبی اور اخلاقی حیثیت سے حدیث کے جس حصّہ کا سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ترمذی کی "کتاب الزہد والرقاق" اور ابو داؤد کی "کتاب الأدعیۃ" ہے، ان ابواب سے بے اعتنائی کا شکوہ و جواب شکوہ مولانا ہی کی زبانی سنئے :۔

"افسوس ہے کہ یہ ابواب ہمارے مدارس میں بہت رواروی اور سرسری طور پر پڑھائے جاتے ہیں، حالانکہ یہی ابواب باضافہ کتاب الایمان و کتاب العلم سیرت کی تعمیر میں سب سے بڑا ذریعہ اور تربیت و اصلاح کا سب سے مؤثر سامان ہے۔" (۴۱)

محدّثِ جلیل مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (ت ۱۴۰۲ھ) کے حدیث شریف سے شغف کا تذکرہ اور ان کی شروح و تعلیقات پر مولانا علی میاں کا تبصرہ ہے :۔

"حدیث و علوم حدیث شیخ کا اصل ذوق، موضوع اور محنت و تحقیق کا میدان تھا، اور اس کو وہ تقرب الی اللہ و تقرب الی الرسول کا ذریعہ سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسکو انہوں نے اپنا شعار و دثار بنا لیا تھا، یہاں تک کہ "شیخ الحدیث" کا لقب ان کے نام کا قائم مقام اور اس سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔" (۴۲)

شیخ کے رسالہ "حجۃ الوداع" کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں :۔

"علمی، معنوی اور اپنے مواد و معلومات کے لحاظ سے "بقامت کہتر و بقیمت بہتر"

کا بہتر مصداق ہے اور اس کے اندر اس موضوع پر اتنا محدثانہ و محققانہ مواد آگیا ہے جسکو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں گزر سکتا کہ یہ ایک دن ڈیڑھ رات میں پورا ہوا ہے، اس موقع پر عمرات نبوی کی بحث، ان کی تعداد اور تحدید کی تحقیق اور ان سے فقہی احکام کا استخراج بھی فرمایا، اس طرح یہ رسالہ اس موضوع پر کافی وشافی بن گیا، اور اس کو اس موضوع پر ایک چھوٹا سا دائرۃ المعارف بھی کہا جا سکتا ہے۔" (۴۳)

شیخ کی مہتم بالشان کتاب "اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالکؒ" کا تعارف کراتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں :-

"اوجز کے شروع میں نوے صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں فن حدیث کے تعارف و تاریخ اور تدوین حدیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، پھر کتاب اور صاحب کتاب امام مالک کا مفصل تعارف اور ان دونوں کی خصوصیات و امتیازات کا مفصل تذکرہ ہے نیز اس کے شروح اور عہد بعہد خدمات اس کے ساتھ امت کے اعتناء کا ذکر ہے، پھر اپنے مشائخ اور سلسلۂ ولی اللہی کے اسانید کی تفصیل، پھر اس سب کے بعد امام ابو حنیفہؒ کا تذکرہ اور ان کی محدثانہ حیثیت و درجہ، اور ان کے اصول و مسلک کا تذکرہ ہے پھر متفرق فوائد و قواعد اور ہدایات و توجیہات ہیں۔" (۴۴)

"لامع الدراری" جو اصلاً مولانا گنگوہی کی تقریرات بخاری اور مولانا محمد یحییٰ کے حواشی کا مجموعہ ہے، شیخ کے اضافوں و حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، مولانا علی میاں کی نگاہ میں :-

"حدیث کے طالب علموں اور مدرسین کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا ہے، اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کر سکتے ہیں، کتاب کے شروع میں ایک سو باون صفحے کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں نہ صرف امام بخاری اور ان کی نادرۂ روزگار الجامع الصحیح کے مختلف گوشوں، مباحث و مسائل پر مبسوط کلام ہے، اور اس میں وہ معلومات، فوائد و نکات جمع کر دیئے گئے ہیں جو

اصول و رجال اور تذکروں کے ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں، بلکہ مراتب کتب حدیث ابواب حدیث، تقلید و اجتہاد اور احناف کے دفاع کے سلسلہ کی وہ تحقیقات بھی جمع کر دی گئی ہیں جن سے یہ مقدمہ طالبین حدیث بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض بن گیا ہے"۔ (۴۵)

اسی طرح شیخ کے رسالہ "الأبواب والتراجم للبخاری" کو مولانا علی میاں ان کے تحقیقی ذوق اپنے مشائخ سے محبت اور ان کے علوم کی حفاظت کا نمونہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"یہ رسالہ شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن دیوبندی کے رسائل و تحقیقات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ ابواب و تراجم کے سلسلہ میں ان اصول و قواعد پر حاوی ہے، جو حافظ ابن حجر قسطلانی، حافظ عینی کے شروح میں آئے ہیں، پھر ان میں ان اصول و قواعد کا اضافہ کیا ہے جو ان کے ذوق و تحقیق اور طویل اشتغال و غور و تامل کا نتیجہ ہیں، اس طرح ان اصول و قواعد کلیہ کی تعداد ستر تک پہونچ گئی ہے، ہمارے علم میں اتنا احتواء کسی کتاب میں نہیں کیا گیا، جو لوگ جانتے ہیں کہ بخاری کے ابواب و تراجم میں کتنے لطائف و نکات اور دقائق شامل ہیں اور اساتذہ و مدرسین کو اس سلسلہ میں کیا کیا ہفتہ خواں سر کرنا پڑتا ہے وہ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کو سمجھ سکتے ہیں"۔ (۴۶)

شیخ کی ان چار کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد مولانا علی میاں اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں :۔

"یہ چار کتابیں جو سب فن حدیث اور اس کے امہات کتب سے تعلق رکھتی ہیں، شیخ کو اپنے عہد کا (کم از کم علوم حدیث میں) ـــ عظیم مصنف بنانے اور اس کے محققین میں شامل کرنے کے لئے کافی ہیں"۔ (۴۷)

شیخ کی ان کتابوں پر مولانا علی میاں کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں ان کتابوں کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

محدثِ کبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوری (ت ۱۳۴۶ھ) کی ابوداؤد کی شرح "بذل المجہود" پر مولانا علی میاں کا بڑا قیمتی مقدمہ ہے، جس میں مولانا نے ابوداؤد کی اہمیت اور خطابی (ت ۳۸۸ھ) کی "معالم السنن" سے لیکر "بذل المجہود" تک عہد بعہد اسکی شروح کا جائزہ لیا ہے، بذل المجہود کی خصوصیات اور اس کی تالیف کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کی ہے، ابوداؤد پر کام کرنے والوں کیلئے کافی مواد جمع ہوگیا ہے۔

"الکوکب الدری علیٰ جامع الترمذی" جو دراصل مولانا رشید احمد گنگوہی کی تقریر ترمذی کا مجموعہ ہے جسے ان کے ایک لائق شاگرد مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی (ت ۱۳۲۴ھ) نے قلمبند کیا ہے مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے تحقیق و تعلیق کے بعد مولانا علی میاں کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں ندوہ پریس لکھنؤ سے ٹائپ پر چار جلدوں میں شائع کیا۔

مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں ابن صلاح، ابن اثیر اور شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ترمذی کی فنی اور تصنیفی خصوصیات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، جس میں مولانا نے کتبِ حدیث سے گہری واقفیت اور مراتبِ کتب پر دقت نظر کا ثبوت دیا ہے، ترمذی کے سلسلہ میں مولانا نے محدثین کے سرمایہ کا "کشف الظنون" اور "مقدمہ تحفۃ الاحوذی" کے اقتناء کی طرف ریفر کرنے کے بعد گو اس بارے میں علمائے احناف کی تعلیقات و حواشی، افادات و تقریرات کی مختصر فہرست درج کی ہے تاہم محدثین احناف کی ترمذی سے بے اعتنائی (باستثناء مولانا یوسف بنوری کی معارف السنن) کا گلہ کیا ہے، حیرت کی بات ہے کہ اس مقدمہ میں مولانا مبارکپوری کی شہرۂ آفاق شرح ترمذی "تحفۃ الاحوذی" کا ذکر کیسے رہ گیا؟ جبکہ مولانا نے اپنی کتاب "المسلمون فی الہند" میں ہندوستانی شروحِ حدیث کے ضمن میں "تحفہ" کا ذکر کیا ہے (۴۸) "المدخل الی دراسات الحدیث النبوی" میں "تحفہ" کی اہمیت اور زمانۂ تدریس میں اس سے استفادہ کا اعتراف بھی ہے (۴۹) اسے الانسان مرکب من الخطأ والنسیان اور قلمی فروگذاشت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

"کوکب" پر مولانا زکریا کی تحقیق و تعلیق کا ذکر کرتے ہوئے مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس طرح حضرت گنگوہی کی ترمذی کی تقریرات پر ان مزید فوائد کا اضافہ کیا، جو دوسری شروحِ حدیث میں پائے جاتے تھے اور کتاب پر مفید حواشی چڑھائے جن میں بہت سی نادر علمی تحقیقات و تنقیحات آگئی ہیں جو طویل عرصہ تک درس حدیث اور اشتغال بکتب الحدیث سے ان کے ذہن میں آئے۔" (۵۰)

"معارف الحدیث" حدیث کے اردو لٹریچر میں مولانا محمد منظور نعمانی (ت ۱۴۱۷ھ) کا زبردست کارنامہ اور ان کا علمی و دینی شاہکار ہے، حصہ دوم مولانا علی میاں کے بیش بہا مقدمہ سے آراستہ ہے، مولانا نعمانی کے قلم سے اس مقدمہ کی اہمیت پڑھئے :۔

"اس دوسری جلد پر مقدمہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے، جس میں انہوں نے حدیث و سنت کی اہمیت پر ایک بالکل نئے انداز میں گفتگو کی ہے اور اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے ایک نئی راہ کھولی ہے، ان چند صفحات کے مطالعہ سے یہ یقین انشاء اللہ ضرور ہو جائے گا کہ حدیث کی محفوظیت کا انکار اور اس کے بارے میں بے اعتمادی پھیلانے کی کوشش اسلام کے ساتھ بدترین دشمنی ہے۔" (۵۱)

مولانا علی میاں اپنے مقدمہ کے آغاز میں بعثتِ نبوی کے مقاصد: (۱) تلاوت (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیۂ نفس کے تذکرہ کے بعد نئے معاشرہ اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر و ارکان ان تین چیزوں کو قرار دیتے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، آپ کی زندگی، سیرت و اخلاق
(۲) قرآن مجید (۳) آپ کے ارشادات و ہدایات، مواعظ و نصائح اور تعلیم و تلقین۔

نیز معاشرت و اخلاق کی تعمیر اور سیرت سازی میں حدیث کے بنیادی کردار پر حدیث ہی سے مثالیں پیش کر کے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

"حدیث زندگی کے مختلف شعبوں میں کیسی رہنمائی کرتی ہے؟ اور کیسا علم عطا کرتی ہے؟ اور انسانیت کے لئے کیسا بیش بہا خزانہ ہے۔" (۵۲)

پھر حدیث و سنت کے تعارف اور اس کی ہمہ گیریت پر مولانا نے ایک نیا زاویۂ فکر پیش کرتے ہیں۔

"درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور ارشادات و ہدایات (جنکے مجموعہ کا معروف نام حدیث و سنت ہے) دین کیلئے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں دین کا پودا سرسبز و بارآور ہوتا ہے، دین کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں ہے، وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ان جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ وہ ہے جو خود پیغمبر کی ذات سے متعلق اور اس کے حالات زندگی سے ماخوذ ہو، یہودی اور عیسائی نیز ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لئے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان آفرین کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں تھا، اور ان مذاہب کو وہ ذہنی ماحول اور فضا میسر نہیں تھی جس میں پیروانِ مذاہب دینی نشو و نما و ترقی حاصل کرتے اور مادیت و الحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے، انہوں نے بالآخر اس کی ضرورت تسلیم کر کے اس خلاء کو پیروانِ مذاہب "پیران طریقت" کے واقعات و ملفوظات سے پر کیا، مگر اس خانہ پُری نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات و رسوم اور نئی تفسیروں کا ایسا مجموعہ بنا دیا جس میں اصل مذہب کی تعلیم گم ہو کر رہ گئی، ان مذاہب و اقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعات زندگی کے بارے میں بے بضاعتی و تہی دامنی ایک مسلّمہ حقیقت بن گئی ہے"۔ (۵۳)

حدیث کی آفاقیت اور اس کے ذریعہ اس امت کی بقاء و ہدایت پر مولانا روشنی ڈالتے ہیں:۔

"قرآن مجید کے ساتھ عہد نبوی کی اس تصویر کا باقی رہنا اور نبوت کے کلام اور ماحول کا محفوظ رہنا اسلام کا اعجاز اور اس کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کی شریک و سہیم نہیں، ایک ایسا مذہب جس کو قیامت تک باقی رہنا اور تمام آنے والی نسلوں کو عملی نمونہ اور عمل کے جذبات و محرکات اور قلب و دماغ کی غذا فراہم کرنا ہے ماحول کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ماحول حدیث کے ذریعہ محفوظ ہے"۔ (۵۴)

تاریخ تدوین حدیث کے مطالعہ سے مولانا ایک خاص نتیجہ پر پہونچتے ہیں :۔

"تدوین حدیث کی تاریخ پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاقی امر اور دور متأخر کی کوئی جدت نہیں ہے، صحابۂ کرام کا عہد نبوی ہی میں کتابت حدیث کی طرف متوجہ ہونا اور بہت بڑی تعداد میں احادیث کا محفوظ کر لینا، پھر انہی کے آخر دور میں تابعین کا تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کرنا، پھر ایران و خراسان و ترکستان کے طالبین علم کے سمندر کا امنڈ آنا، اسکا جمع حفظ حدیث سے عشق و شغف، ان کا غیر معمولی حافظہ، ان کا عزم و عالی ہمتی، پھر اسماءِ رجال و فن روایت مجتہدین کا پیدا ہونا جن کو اسکا ملکۂ راسخہ اور بصیرت کاملہ حاصل تھی، پھر ان کا انہماک و خود فراموشی، پھر امت کی حدیث کی طرف توجہ اور اس کی عالمِ اسلام میں مقبولیت اور اشاعت یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمع قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو اس "صحیفۂ زندگی" کو محفوظ کرنا مقصود تھا، اسی کی بدولت حیات طیبہ کا امتداد و تسلسل باقی رہا اور امت کو اپنے ہر دور میں وہ روحانی ذوقی، علمی و ایمانی میراث ملتی رہی جو صحابۂ کرام کو براہِ راست حاصل ہوئی تھی، اسطرح صرف عقائد و احکام ہی میں "توارث" کا سلسلہ جاری رہا، حدیث کے اثر سے عہدِ صحابہ کا مزاج و مذاق ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک منتقل ہوتا رہا، اور امت کو طویل تاریخ میں کوئی مختصر سے مختصر عہد ایسا نہیں آنے پایا، جب وہ مزاج و مذاق یکسر ناپید اور معدوم ہو گیا ہو، ہر دور میں ایسے افراد رہے جو صحابۂ کرام کے مزاج و مذاق کے حامل کہے جا سکتے ہیں"۔ (۵۵)

اس بحث کو مولانا فتنۂ انکارِ حدیث سے پیدا شدہ عظیم نقصان کی طرف نشاندھی فرماتے ہوئے ختم کرتے ہیں :۔

"جو لوگ امت کو زندگی اور قوت کے اس سرچشمہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں اس ذخیرہ کی طرف بے اعتمادی اور شک و ارتیاب پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں

جانتے کہ وہ امت کو کیا نقصان پہونچا رہے ہیں؟ اور اس کو کس عظیم سرمایہ اور کتنی بڑی دولت سے محروم کر رہے ہیں؟ وہ نہیں جانتے کہ وہ اس امت کو اس طرح "محروم الارث" منقطع الأصل اور آوارہ کر دینا چاہتے ہیں، جس طرح یہودیت اور عیسائیت کے دشمنوں یا حوادثِ روزگار نے ان عظیم مذاہب کو کر دیا، اگر وہ سوچ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں تو ان سے بڑھ کر اس امت اور اس دین کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ پھر اس "مزاج و مذاق" کو دوبارہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں جو صحابۂ کرام کا امتیاز تھا اور جو یا تو کامل طور پر براہِ راست صحبت نبوی سے پیدا ہو سکتا ہے یا بالواسطہ حدیث کے ذریعہ جو اس عہد کا جیتا جاگتا مرقع اور حیات نبوی کا بولتا چالتا روزنامچہ ہے اور جس میں عہد نبوی کی کیفیات بسی ہوئی ہیں"۔ (۵۶)

آخر میں ہندوستان میں اردو فارسی لٹریچر میں ذخیرۂ حدیث کے ترجمہ و تشریح اور نشر و اشاعت کی مختصر تاریخ پر مولانا اپنا مقدمہ ختم کرتے ہیں، اگرچہ اس جائزہ میں مزید اضافہ و استدراک کی گنجائش ہے۔

مولانا کی تحقیق کے مطابق شیخ عبدالحق (ت ۱۰۵۲ھ) نے سب سے پہلے "مشکاۃ المصابیح" کا فارسی میں ترجمہ و تشریح کی جو "اشعۃ اللمعات" کے نام سے شائع ہوا، پھر فارسی کا دور ختم ہو جانے کے بعد مولانا خرم علی بلہوری (ت ۱۲۷۱ھ) نے امام صغانی (ت ۶۵۰ھ) کی "مشارق الانوار" کا ترجمہ مع تشریح اردو میں "تحفۃ الاخیار" کے نام سے کیا اسکے بعد نواب قطب الدین خاں (ت ۱۲۸۹ھ) نے مشکاۃ کا اردو ترجمہ "مظاہر حق" کے نام سے کیا، اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد حدیث کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں مولانا ابراہیم آروی (ت ۱۳۱۹ھ) کا مجموعہ "طریق النجاۃ فی ترجمۃ الصحاح من المشکاۃ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، پھر اردو میں حدیث کی خدمت کا کام اعلیٰ معیار اور وسیع پیمانہ پر مولانا بدر عالم میرٹھی (ت ۱۲۸۵ھ) کا ہے جو "ترجمان السنۃ" کے نام سے معروف و متداول ہے، اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی "معارف الحدیث" ہے۔

اس کی پانچویں جلد مشتمل بر "کتاب الاذکار والدعوات" بھی مولانا علی میاں کے وقیع مقدمہ سے آراستہ ہے جس میں مولانا نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اعجاز اور کارنامے کو دو شعبوں میں تقسیم کیا ہے (۱) عبد و معبود کے رشتہ کی تصحیح و تنظیم (۲) عبد و معبود کے رشتہ کا استحکام و دوام۔

اور ان دونوں شعبوں کی مولانا نے بڑی دلنشین اور ایمان افروز تشریح فرمائی ہے، انداز بیان اچھوتا اختیار کیا ہے، جس سے علوم نبوت اور اس کے اسرار و حکم پر ان کا احتواء اور اس کی ترجمانی و تشریح پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر مولانا نعمانی کی دعا کے باب میں شغف کا اعتراف کرتے ہوئے اس کتاب کے محاسن ان الفاظ میں اجاگر فرماتے ہیں :۔

"اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ کی تحقیقات کو قول فیصل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اکثر مقامات پر ان سے استفادہ کیا گیا ہے شاہ صاحب کے ماسوا انھوں نے حافظ ابن قیم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر بالخصوص ان کی بے نظیر کتاب "فتح الباری" سے پورا استفادہ کیا، اس طرح یہ کتاب ان لوگوں کو جن کا مطالعہ اردو تک محدود ہے ائمۂ سلف اور محققینِ امت کے نتائج تحقیق سے متعارف کراتی ہے، اور اس نسل اور علمائے متقدمین کے درمیان علمی رابطہ کا کام دیتی ہے"۔ (۵۷)

"محدثینِ عظام اور ان کے علمی کارنامے" تالیف ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری پر مولانا علی میاں کے مقدمہ میں "مستشرقین اور علم حدیث" کے موضوع پر بڑی اہم اور کام کی باتیں آگئی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ استشراق کی تاریخ اور مستشرقین کی چابکدستی پر مولانا کی گہری نظر ہے، اس سلسلہ میں آپ مولانا ہی کے قلم سے پڑھئے :۔

"یورپ کے مستشرقین اور ان کے مشرقی تلامذہ و مقلدین کی ذہانت اور حسنِ انتخاب

کی داد نہ دینا ظلم ہے کہ انہوں نے عالم اسلام میں ذہنی انتشار، تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے عملی، تعطل، اخلاقی انارکی اور شک وارتیاب پیدا کرنے کیلئے حدیث وسنت کا انتخاب کیا اور اس کی حجیت، حفاظت تاریخیت پر ایک منظم حملہ کیا اور اس پورے شعبہ اور جدید اصطلاح کے مطابق پورے ادارہ (Institution) کو علمی وتاریخی حیثیت سے نہایت مشکوک ومشتبہ اور کمزور وبے بنیاد عمارت کی حیثیت سے پیش کیا۔" (۵۸)

اس سلسلہ کو مولانا آگے بڑھاتے ہیں اور استشراق کی تحریک کو بے نقاب کرتے ہیں:۔

"انہوں نے کبھی روایات کی اس تعداد پر جو محدثین کے حالات اور تذکروں میں لکھی جاتی ہیں، اپنی سخت حیرت واستعجاب کا اظہار کیا اور اس کو خلافِ فطرت بتایا کبھی محدثین کے حافظہ کے واقعات کو خلافِ عقل وقیاس ٹھہرایا، کبھی فاروقِ اعظمؓ اور بعض دوسرے صحابہ کے استفسارات اور انتظامات کی روایات کا سہارا لیکر مکثرین صحابہ حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ۔ کی کثرت روایات میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی کبھی حدیث کی تدوین وترتیب کو پچھلے دور اور تیسری، چوتھی صدی کی کوشش بتا کر روایتِ حدیث کے تسلسل اور اس کی تاریخیت کو مجروح قرار دیا، کبھی سیاسی واعتقادی محرکات وعوامل کو نمایاں کرکے حدیث کے ایک بڑے ذخیرہ کو سیاسی وکلامی مصالح کی بناء پر موضوع قرار دینے کی سعی کی، کبھی تدوین حدیث کو مذاہبِ اربعہ کے اثبات واحقاق کا تابع وخادم ثابت کرکے احادیث کی نقل وروایت کو فقہی گروہوں اور مکاتبِ خیال کے تقابل وکشمکش کا نتیجہ ثابت کرنا چاہا۔" (۵۹)

پھر اساتذۂ حدیث کی مستشرقین کے حدیث کے بارے میں اعتراضات، شبہات سے بے خبری کا مولانا شکوہ کرتے ہیں اور عالمِ عربی اور برصغیر ہند وپاک میں علماء کے طبقے میں جو بیداری کی لہر آئی ہے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے قدیم اساتذہ ومدرسین حدیث کو ان مستشرقانہ اعتراضات وتشکیکات کی

بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات اور فنی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصر و شام اور ہندوستان و پاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام، محدثین کے کارناموں کو علمی و تحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے"۔ (۶۰)

اس زریں سلسلۂ تصنیف میں مولانا نے دو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، ان میں ایک شام کے مشہور عالم ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" اور دوسری تصنیف مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی "تدوینِ حدیث"، اس سلسلۂ بحث کو مولانا جاری رکھتے ہوئے مقدمہ "لامع الداری" اور مقدمہ "تحفۃ الاحوذی" کے اندر حجیتِ حدیث اور اس پر جدید اعتراضات اور ان کے تشفی بخش جوابات اور قیمتی مواد جمع ہو جانے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اور ڈاکٹر تقی الدین کے کام کی قدر دانی کے ساتھ اپنے مقدمہ کو اختتام کی منزل تک پہونچا دیتے ہیں۔

"فن اسماء الرجال ائمۂ حدیث کا عظیم الشان کارنامہ" تالیف ڈاکٹر تقی الدین ندوی کے مقدمہ میں مولانا علی میاں علم حدیث کو علمائے اسلام کا عظیم کارنامہ قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"یوں تو تمام علوم علمائے اسلام کی بلند ہمتی اور ذوق جستجو کے شاہد ہیں، لیکن بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ علمائے اسلام نے اپنی سب سے بڑی ذہانت اور محنت جس علم پر صرف کی اور جس میں انھوں نے اپنی ذہنی کاوش اور علمی موشگافیوں کا سب سے بڑا ثبوت دیا وہ فن حدیث ہے، کسی صاحبِ نظر کا مقولہ ہے کہ: اسلامی علوم کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم جو نیم پختہ رہی، ایک قسم جو پختگی کے کمال کو پہونچ گئی، اور ایک قسم جو اس سے بھی آگے بڑھ گئی، اور گویا پختہ ہو کر بالکل کھری ہو گئی، اور ان کے الفاظ میں "طُبِخَ وَاحْتَرَقَ"، اس تیسری قسم میں انھوں نے علم حدیث کو شمار کیا ہے جو اپنے کمال و ارتقاء کے آخری منازل تک پہنچ کر نشانہ کو پار کر گیا اور اس میں اب کسی آدمی کے لئے کوئی بات پیدا

کرنا اور عامیانہ الفاظ میں کوئی کوڑی لانا تقریباً ناممکن ہوگیا، نہ صرف فن روایت اور متن حدیث بلکہ متعلقات علم حدیث، اسماء الرجال، فن جرح و تعدیل، اصولِ حدیث اور عِلل حدیث میں محدثین اور نقاد حدیث نے جو باریکیاں پیدا کی ہیں، جن موشگافیوں سے کام لیا ہے، جس ذہانت، نکتہ دری اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے، اس کا کچھ اندازہ ان فنون کے محققین کی ضخیم تصنیفات اور دقیق بحثوں پر نظر ڈالنے ہی سے ہو سکتا ہے، جن میں اکثر مشہور اور مستند مصنفین کا نام پیش نظر کتاب میں آگیا ہے اور جا بجا ان کے اقتباسات اور تحقیقات پیش کی گئی ہیں"۔ (۶۱)

مذکورہ بالا کتب حدیث کے علاوہ اور بھی حدیث کی متعدد کتابیں مولانا علی میاں کے مقدمہ سے آراستہ ہیں، گو ان میں مولانا کے قلم کی جولانی، مواد کی فراہمی اور جس موضوع سے ان مقدموں کا تعلق ہے، اس کے مالہ وما علیہ کے احاطہ اور تحلیل و تجزیہ کی کمی دکھائی دیتی ہے تاہم اس احساس کے باوجود ان مقدموں میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں آگئی ہیں جو یکسر فائدہ سے خالی نہیں۔

"روائع الأعلاق شرح تہذیب الاخلاق" تالیف ابو سحبان روح القدس ندوی جو فی الواقع استاذ گرامی علامہ ابو محفوظ الکریم معصومی کی نگرانی و رہنمائی کی رہینِ منت ہے، مولانا علی میاں نے اپنے حوصلہ افزا مقدمہ میں مسلم کی مرفوع حدیث "ان من ابر البر صلۃ الرجل اھل ود ابیہ بعد ان یولی"۔ (لڑکے کا باپ کے ساتھ حسنِ سلوک و وفاداری کا بہترین درجہ یہ ہے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور اہلِ محبت کے ساتھ سلوک کرنے) سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ لڑکے کا اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک والد کیساتھ سلوک کے مرادف ہے تو لڑکے کا والد کے علمی آثار اور ان کے میدان عمل سے تعلق و وابستگی والد کے ساتھ سلوک میں بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔

"الروائع والبدائع فی البیان النبوی" تالیف محمد نعمان الدین ندوی پر مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں علمائے معانی و بیان کی حدیث کے "جمالِ ادبی" سے بے اعتنائی کا شکوہ

کیا ہے اور فاضل ندوی نوجوان کے کام کی قدر کی ہے۔

"التعلیق الممجد علی موطا الامام محمد" تالیف عبدالحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین ندوی پر اپنے مقدمہ میں مولانا نے اپنے زمانۂ تعلیم حدیث میں اس کتاب سے اپنی واقفیت اور ایام تدریس میں اس کی سلامتی فکر اور وسعت قلبی سے اپنی وارفتگی کا اظہار کیا ہے۔

"ظفر الامانی شرح مختصر الجرجانی" تالیف عبدالحی فرنگی محلی، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین: پر مولانا نے اپنے مقدمے میں اس بات کو پوری قوت کے ساتھ اٹھایا ہے کہ حدیث کی بقا اور اس کی حفاظت اور علماء و باحثین کا اس سے شغف دراصل یہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ہے جس سے سابقہ شریعتوں کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

نتیجۂ بحث: مذکورہ بالا معروضات مولانا علی میاں کی حدیث فہمی، رسوخ فی الحدیث اور معرفت حدیث میں ان کی علو مرتبت اور صناعت حدیث میں کامل مہارت کی غمازی کے ساتھ ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مولانا علی میاں عصر حاضر کے محدثین کی صف میں بلند مقام رکھتے ہیں، اگرچہ ان کی شہرت اس حیثیت سے نہیں ہوئی، حالانکہ حضرت مولانا کی بیشتر تصانیف حدیث کی شرح و ترجمان اور ان کی پوری زندگی حدیث کی عملی اور جیتی جاگتی درخشاں تصویر تھی۔

نیز مولانا کے معاصر فضلائے حدیث کا اپنی حدیث کی کتابوں پر ان سے باصرار مقدمہ لکھوانا درحقیقت انکی طرف سے سند و شہادت کے مرادف اور ان محدثین و فضلائے حدیث کے اخلاص اور علمی تواضع اور عالی ظرفی کی روشن دلیل ہے۔

وما توفیقی الا باللہ وصلی اللہ وسلم علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ▲▲▲

حواشی و حوالہ جات

(۱) الإعلام بمن فی تاریخ الہند من الأعلام ۶ : ۱۳ (نزھۃ الخواطر) ندوہ پریس ۱۹۹۲ء

(۲) نفس مصدر ۷ : ۴۲۷

(۳) ایضاً ۷ : ۶۰، ۶۱

(۴) ایضاً ۷ : ۳۱۲

(۵) ایضاً ۸ : ۲۷۶، ۳۸۰

(۶) دیکھئے "روائع الأخلاق" ص ۴۴، ۵۳

(۷) الإعلام ۸ : ۴۷۰

(۸) دیکھئے "پرانے چراغ" ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنؤ۔ باردوم ۱۹۸۹ء ۲ : ۳۲۱، ۳۲۹

(۹) ماہنامہ "صبح صادق" (قرآن نمبر) لکھنؤ جنوری ۱۹۵۶ء

(۱۰) صبح صادق (حدیث نمبر) نومبر ۱۹۵۶ء

(۱۱) نفس مصدر

(۱۲) نفس مصدر

(۱۳) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں : مرتب محمد عمران خاں ندوی۔ معارف پریس اعظم گڑھ ص : ۱۷۶

(۱۴) مولانا حیدر حسن خاں : از عبدالسلام قدوائی ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۷۵ء ص : ۷

(۱۵) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص : ۱۷۶

(۱۶) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۱۷) کاروانِ زندگی۔ ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام لکھنؤ ۱۹۸۳ء ۱ : ۱۱۱

(۱۸) نفسِ مصدر ۱: ۱۱۱

(۱۹) پُرانے چراغ : ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنؤ بار سوم ۱۹۸۶ء ۱: ۱۹۲۔

(۲۰) مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں ص ۱۶۷

(۲۱) مولانا حیدر حسن خاں ص: ۳۳

(۲۲) نفس مصدر ص: ۳۲

(۲۳) نفس مصدر ص: ۳۵

(۲۴) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۶۷

(۲۵) مولانا حیدر حسن خاں ص: ۴۱

(۲۶) پُرانے چراغ ۱: ۱۹۳

(۲۷) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۲۸) کاروان زندگی ۱: ۱۲۸

(۲۹) پُرانے چراغ ۱: ۱۹۳

(۳۰) کاروان زندگی ۱: ۱۲۹

(۳۱) نفس مصدر ۱: ۱۳۲

(۳۲) پرانے چراغ ۱: ۱۰۲

(۳۳) دیکھئے نفحات الہند والیمن باسانید الشیخ ابی الحسن۔ محمد اکرم ندوی، مکتبہ الامام الشافعی ریاض ۱۹۹۸ء

(۳۴) اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار (مقدمہ)

(۳۵) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۳۶) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۶۸

(۳۷) ایضاً مع اضافہ بر حاشیہ بقلم صاحبِ مضمون (مولانا علی میاں) ص: ۱۶۸۔

(۳۸) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۷۲

(۳۹) نفس مصدر ص ۱۷۲، ۱۷۳

(۴۰) صبح صادق نومبر ۱۹۵۶ء

(۴۱) نفس مصدر

(۴۲) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب: ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام لکھنؤ ۱۹۸۲ء بار اول ص ۲۴۶، ۲۴۷

(۴۳) نفس مصدر ص: ۲۴۱، ۲۴۲

(۴۴) ایضاً ص: ۲۴۳

(۴۵) ایضاً ص: ۲۴۴

(۴۶) ایضاً ص: ۲۴۴، ۲۴۵

(۴۷) ایضاً ص: ۲۴۵

(۴۸) ص: ۴۰

(۴۹) ص: ۵۰

(۵۰) ایضاً ۲۴۵

(۵۱) دیباچہ معارف الحدیث: محمد منظور نعمانی۔ الفرقان بکڈپو لکھنؤ ۱۹۹۵ء ۲: ۱۰

(۵۲) نفس مصدر ص: ۱۶

(۵۳) ایضاً ص: ۱۷، ۱۸

(۵۴) ایضاً ص: ۱۹

(۵۵) ایضاً ص: ۱۹، ۲۰

(۵۶) ایضاً ص ۲۰، ۲۱

(۵۷) مقدمہ معارف الحدیث (مع تلخیص) الفرقان بکڈپو لکھنؤ ۱۹۹۹ء ۵: ۱۰

(۵۸) محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے، ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظم گڑھ ۱۹۹۵ء (مقدمہ) ص: ۴، ۳

(۵۹) نفس مصدر ص: ۴

(۶۰) ایضاً ص: ۵ (۶۱) فن اسماء الرجال ائمۂ حدیث کا عظیم الشان کارنامہ: ڈاکٹر تقی الدین ندوی، اعظم گڑھ ۱۹۹۶ء ص: ۸

ع۵ نیز مولانا محمد نعیم بن عبدالحکیم الأنصاری (ت ۱۳۱۸ھ) سے موصوف کو اجازت حاصل ہے، اور سید قطب الہدیٰ کے ترمذی کے قلمی نسخہ پر مولانا عبدالحی کے قیمتی حواشی ہیں، نیز "تلخیص الاخبار" المعروف بہ "تہذیب الاخلاق" مولانا کا انتخاب کردہ احادیث کا مجموعہ ہے، ابواب عبادات میں خاص طور پر مولانا نے حسن انتخاب، سلامتی فکر اور وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے، انداز انتخاب خالص محدثانہ، مجتہدانہ اختیار کیا ہے، جس میں شیخ حسین یمانی کے درس کا عکس جلوہ گر ہے "منتہی الافکار" کے نام سے دو کاپی میں اس کی شرح بھی فرمائی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اور

فقہ اسلامی

مولانا عتیق احمد قاسمی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہشت پہل ہے، بیسویں صدی کے نصف آخر کی اسلامی تاریخ پر ان کے اثرات اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ہر تاریخ ادھوری رہے گی خواہ فکر اسلامی کی تاریخ ہو یا ادب اسلامی کی، یا علوم اسلامی کی یا تحریکات اسلامی کی، عالم اسلام کے ہر خطہ کو اور زندگی کے ہر میدان کو انھوں نے کم وبیش متاثر کیا۔ بر صغیر ہندوپاک تو ان کا وطن تھا، وہ اسلاً میان ہند کی آبرو اور ان کی زبان وترجمان تھے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اسلام کی جڑیں مستحکم کرنے اور تشخص اسلامی کی حفاظت میں ان کا بنیادی کردار رہا، بلاد عربیہ اور بلاد اسلامیہ میں ان کی دعوت دور دور پہونچی اور ان کے افکار وپیغام کو انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا، عالم اسلام کی سیاسی، سماجی تبدیلیوں پر ان کی نظر بہت گہری تھی، خطرات کا احساس بہت پہلے سے کرلیا کرتے تھے اور "نذیر عریاں" کی طرح صاف لفظوں میں خطرات سے آگاہ کرتے ان سے تحفظ کی تدبیریں بتاتے۔

دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں (خواہ یورپ ہو یا امریکہ، آسٹریلیا ہو یا افریقہ) حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات وافکار کی خوشگوار روشنی وہاں تک پہونچی ہے اور ہر ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ پر مولانا مرحوم نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

حضرت مولانا کی شخصیت کی شاہ کلید

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیا کچھ نہیں تھے، آپ بلند پایہ مفکر، زبردست داعی الی اللہ، شہرۂ آفاق مصنف، مورخ، مفسر، ادیب وانشاء پرداز، سحر بیان مقرر وخطیب اور ممتاز ترین مربی وعالم ربانی تھے، لیکن میری نظر میں ان کی شخصیت کی شاہ کلید دعوت الی اللہ ہے، ان کا دعوتی پہلو تمام دوسرے پہلوؤں پر حاوی اور غالب ہے، جب وہ سیرت نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو تاریخ اسلامی کی ان شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی حیات اور کارناموں میں دعوت وعزیمت کا پہلو بہت نمایاں ہے "السیرۃ النبویہ"، لکھتے ہیں تو حیات نبویؐ کے دعوتی پہلو کو سب سے زیادہ اجاگر کرتے ہیں، نصابی کتابیں مرتب کرنے میں انبیاء کرام کے ایمان افروز قصوں کو اپنی توجہات کا مرکز بناتے ہیں اور قصص النبیین جیسی البیلی کتاب وجود میں آتی ہے جس کی سطر سطر میں ادب کی چاشنی اور دعوت کی تڑپ ہے، مختارات میں ادب عالی کا انتخاب کرنے بیٹھتے ہیں تو عربی ادبیات سے ایسے شہ پارے تلاش کر کے لاتے ہیں. جن میں دعوتی برق ورعد پنہاں ہیں، "ماذا خسر العالم" میں امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان سناتے ہیں تو امت مسلمہ کو اس کا کھویا ہوا داعیانہ وقائدانہ مقام یاد دلاتے ہیں، ہندستان کے مقامی حالات میں ان کا داعیانہ ذہن "پیام انسانیت" کے نام سے ایک نیا عنوان تراشتا ہے اور پیام انسانیت کے غلاف میں اسلام کی دعوت برادران وطن تک پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں، غرضیکہ ان کی تمام تحریروں اور تحریکوں میں دعوت کی روح رچی بسی ہوئی ہے، اس لئے میرے خیال میں حضرت مولانا علی میاں رحمتہ اللہ علیہ سب سے اول اور سب سے آخر میں جلیل القدر عالم ربانی اور داعی الی اللہ تھے ان کے سارے کاموں اور کارناموں کو اگر ہم ایک لفظ میں کشید کر لینا چاہیں تو وہ لفظ "دعوت" ہے۔

داعی کا لفظ اس دور میں بڑا ہلکا اور پامال سا ہو گیا ہے حالانکہ یہ لفظ بڑا پر عظمت ہے، انبیاء کرام کی کوششوں کا سر عنوان "دعوت الی اللہ" ہے، صحابۂ کرام کی دینی جدوجہد کا خلاصہ "دعوت الی اللہ" ہے، داعی انبیاء کرام کا وارث وامین ہوتا ہے، اس کے دل میں انبیاء والا

سوز و گداز ہوتا ہے، اس کے دل و دماغ میں تمام انسانیت کے لئے خلوص و محبت، فکر مندی و دل سوزی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، داعی الی اللہ بڑا حساس و زیرک ہوتا ہے، زمانہ کی حرکت و رفتار کا نباض، حقیقت آگاہ اور حق آشنا ہوتا ہے، خلوص و محبت کے ساتھ حکمت و دانائی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، اس کی لغت میں مایوسی اور پست ہمتی کے الفاظ نہیں ہوتے، وہ ناامیدیوں میں امید کے چراغ جلاتا ہے۔

ایک بلند پایہ داعی عظیم مفکر بھی ہوتا ہے۔ اپنے دور کی فکری گتھیوں کو اسلامی بنیادوں پر سلجھاتا ہے، امت کی ذہنی و فکری رہنمائی کرتا ہے، اسی لئے علوم اسلامیہ سے وابستہ معرکۃ الاراء فکری مسائل میں بھی اسے اپنا موقف واضح کرنا ہوتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ اور علوم اسلامیہ

علوم اسلامیہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کو سب سے زیادہ دلچسپی تفسیر قرآن سے تھی، تفسیر قرآن سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کے درس قرآن میں شرکت کی اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ حضرت مولانا مرحوم نے ایک مدت تک بڑے ذوق و شوق سے تفسیر قرآن کا درس دیا۔ قرآن کی تلاوت اور قرآن میں تفکر و تدبر آخری عمر تک ان کا محبوب ترین مشغلہ رہا، ایک بار میں نے ان سے بذریعہ خط مشورہ چاہا کہ کن تفسیروں کو مطالعہ میں رکھا جائے تو انھوں نے تحریر فرمایا۔

"تفسیر کے سلسلے میں میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ متن قرآن زیادہ سے زیادہ پڑھیں اور اس سے ذاتی ربط پیدا کریں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا رسالہ الفوز الکبیر ضرور مطالعہ میں رکھیں، باقی کسی ایک تفسیر کا مشورہ دینا بہت مشکل ہے"۔

ان کی تحریروں اور تقریروں کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن کریم تھا، آیات قرآنی سے تذکیر و استنباط میں ان کا ذہن بڑا اخاذ اور رسا تھا، اپنی برجستہ تقریروں میں انھوں نے آیات قرآنی اور مضامین قرآنی کا جس کثرت اور لیاقت کے ساتھ استعمال کیا ہے اس سے ان کے

تبحر علمی، دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

احادیث نبویہ سے انھیں بہت مناسبت تھی فن حدیث انھوں نے بڑے جلیل القدر اساتذہ سے سیکھا ان میں نمایاں ترین نام حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ہیں، کچھ دنوں انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث کا درس بھی دیا۔

علم فقہ کی تحصیل بھی انھوں نے ماہر فن اساتذہ سے کی، لیکن اس علم سے تدریسی اشتغال کا انھیں زیادہ موقعہ نہیں ملا، اس لئے مسئلہ بتانے اور فتویٰ دینے سے وہ ہمیشہ گریز فرماتے تھے، کوئی اگر مسئلہ پوچھتا تو مفتی صاحب ندوۃ العلماء یا کسی دوسرے استاذ فقہ کے پاس بھیج دیتے، استفتاء پر مشتمل خطوط دار الافتاء ندوۃ العلماء یا مجلس تحقیقات شرعیہ بھجوا دیتے۔

ائمہ مجتہدین اور فقہ اسلامی مولانا کی نظر میں

بیسویں صدی میں متجددین کا ایک طبقہ پوری اسلامی فقہ کو ائمۂ مجتہدین کی ذاتی رائے قرار دے کر مسترد کر دینے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ شریعت کا جو اکندھے سے اتار پھینکا جائے، یہ طبقہ فقہائے مجتہدین کے علمی کارناموں کا استخفاف کر رہا تھا اور ان کے خلاف زبان طعن دراز کر رہا تھا، اس پس منظر میں حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ نے فقہ اسلامی اور فقہائے اسلام کا زبردست دفاع کیا۔ اپنی متعدد تحریروں میں فقہائے.... مجتہدین کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا اور نئی نسل کے دل ودماغ میں فقہ اسلامی اور فقہاء کے اجتہادی کارناموں کی اہمیت جاگزیں کر دینے کی کوشش کی، حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں "اسلام جزیرۃ العرب سے (جہاں زندگی سادہ اور تمدن انتہائی محدود تھا) نکل کر مصر وشام، عراق وایران اور دوسرے وسیع، زرخیز اور سرسبز وشاداب خطوں میں پہونچ گیا تھا جہاں کا نظام تمدن ومعیشت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات ومسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع

واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ صحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ (قرآن وحدیث اور سنت وقواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

یہ اللہ کا بڑا فضل تھا اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کار عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو اپنی ذہانت دیانت اخلاص اور علم مین تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے۔ اپنے تعلق باللہ للّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کردی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ واعزاز اور کسی لذت وراحت سے سروکار نہیں رکھا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کو دوبار عہدۂ قضاء پیش کیا گیا اور انھوں نے انکار کیا، یہاں تک کہ قید خانہ میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ امام مالکؒ نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعیؒ نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا اور اپنی صحت قربان کردی امام احمدؒ نے تن تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک اور اہل سنت کے طریقے پر پہاڑ کی طرح جمے رہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل وتحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کردیا جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کرسکتے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہو جانا اس دین کی زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی اور امت اس ذہنی

انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتری سے محفوظ ہو گئی، جس کی دوسری قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں اور وہ تدریجی طور پر ایسے لادینی راستے پر پڑ گئیں کہ ان کے لئے لادینی نظام زندگی اختیار کرنا ضروری ہو گیا، یا پھر ایسے غیر اسلامی قوانین کو انھیں اختیار کرنا پڑتا، جو اس کی دینی روح اور اصول و مبادی سے متصادم ہوں اور وہ مسیحی یورپ کے نظریہ دین وسیاست کی تفریق کے ان اصولوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے جو خاص حالات وماحول اور مسیحی مذہب کی مخصوص وضع اور ساخت کا نتیجہ تھا۔

اگر خدانخواستہ علمائے متقدمین فقہی اجتہاد، احکام اور مسائل کے استنباط واستخراج میں کسل مندی اور سستی اور ڈھیل سے کام لینے اور جدوجہد کے بجائے راحت وآرام کو اختیار کرتے یا ان کے علمی کارنامے اہمیت کے حامل نہ ہوتے اور ان کے فطری ملکہ اور صلاحیت میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا تو اس وقت کی حکومت عملی زندگی اور وقت کے مطالبات وتقاضوں سے مجبور ہو کر رومی اور ایرانی قوانین کو اسلامی دنیا پر منطبق کر دیتی، اس لئے کہ نئے حالات ومسائل سے مسلمانوں کا مقابلہ تھا، تجارت وزراعت، جزیہ وخراج، محکومین اور مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات ورواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں۔ ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا اور نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جاسکتا تھا حکومت مفصل ومکمل آئین وقانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اور قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھیں، جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذراسی غفلت اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی ؎

یک لحظہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد

اور مساجد میں تھوڑے وقت اور محدود مدت کے لئے دینداری کی زندگی گذارنا اور

اپنے گھروں بازاروں اور عدالتوں میں زیادہ وقت جاہلی یا لادینی زندگی گذارنا اس کے لئے نوشتہ تقدیر بن جاتا، جیسا کہ اس وقت ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جن کا سرکاری مذہب تو عیسائیت ہے لیکن ان کے پاس مسیحی قانون شریعت موجود نہیں یا جیسا کہ (انتہائی شرمندگی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) ان ملکوں اور حکومتوں کا حال ہے جو عقیدے اور عبادات کی حد تک تو مسلمان کہلاتی ہیں لیکن اسلام کو قانون شریعت کے طور پر قبول نہیں کرتیں، اگر یہ بات اس مسیحیت کے لئے قابل قبول اور گوارا ہے جو دستور اور قانون سازی کے سرچشمہ سے محروم ہے اور دین کو زندگی پر منطبق کرنے پر اس کو اصرار بھی نہیں لیکن یہ کسی طرح بھی اس اسلام کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا جو دین و دنیا اور عبادت و سیاست کا جامع ہے۔

چنانچہ امت اسلامیہ اپنی زندگی کے انتہائی سنگین مرحلہ سے گذر رہی تھی بلکہ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں ایک غلطی یا معمولی لغزش بھی اس کے رشتۂ حیات کو اسلامی نظام اور قانون سے کاٹ کر رکھ دیتی اور آنے والی نسلوں کو ایسی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیتی جس میں دین و مذہب کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں بھی نہ پائی جاتی۔

اسی طرح اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عبادات کے احکام و مسائل بیان کئے جائیں تاکہ سہو و نسیان اور انسانی بھول چوک اور شریعت کی ناواقفیت کی وجہ سے جو باتیں پیش آتی ہیں ان کو حل کیا جائے جو لوگ نئے نئے اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں ان کے مسائل کا حل، نماز میں بھول چوک، رکعات میں کمی زیادتی، روزہ دار کے احکام و مسائل، زکوٰۃ کب اور کن چیزوں پر کتنی مقدار میں فرض ہے، اسی طرح حج جیسی عبادت جس کی ادائیگی میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے اور ایک بڑے رقبہ میں حاجی کو شعائر حج ادا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور قدم قدم پر سنت اور اسوۂ نبوی کا لحاظ اس کو رکھنا پڑتا ہے۔ ان تمام امور میں فوری احکام اور بروقت فیصلہ کی ضرورت تھی، کسی ادنیٰ تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور نہ ہی اس بات کی ضرورت کہ ہر کسی و ناکس کو قرآن و سنت سے براہ راست رجوع کر کے مسائل اخذ کرنے کا مشورہ دیا جائے، اس لئے ضروری تھا کہ احکام و

جزئیات کا وجود ہو اور فقہی ذخیرہ آسانی کے ساتھ ہر ایک کو میسر آسکے ایسے سرآمد روزگار علماء اور ماہرین شریعت کی موجودگی بھی ضروری تھی جو عوام کی رہنمائی کے لئے ہر وقت مستعد ہوں اسی بنا پر اسلام دیگر مذاہب طرح تاریخی یادگاروں کا ایسا میوزیم بننے سے محفوظ ہو گیا جہاں ہر طرح کی عبادات اور طرح طرح کی حرکات و سکنات پائی جاتی ہیں اس کا مشاہدہ ہمیں ان مذاہب کے ماہانہ یا سالانہ تہواروں میں اچھی طرح ہو جاتا ہے جن کے ماننے والوں میں عملی وحدت اور یک جہتی کا فقدان ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں روحانیت، اخلاقی و دینی رنگ پایا جاتا ہے اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد، حج کے مقامات اور شعائر کی ادائیگی، سب میں یکسانیت نظم و وحدت، ہم آہنگی اور باہمی ربط و اتحاد پایا جاتا ہے، ان میں عقیدے اور عبادات کی وحدت ہوتی ہے کہ ایک ہی شریعت کے آگے سب سرنگوں ہوتے ہیں اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ دینی تعلیمات میں حیرت انگیز وحدت اور اصالت ہے، دوسرے محدثین اور فقہاء کا کمال اور ان کا عظیم احسان ہے کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے اسلامی شریعت کے ذخیرہ کو نہ صرف محفوظ اور باقی رکھا بلکہ قرآن و سنت اور یکساں دینی نظام سے اس کو مربوط کر دیا۔

اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب اور شرعی احکام و مسائل کے استنباط میں جس اجتہادی بصیرت کا ثبوت دیا گیا وہ انتہائی بروقت مناسب اور برمحل تھا اور فطری و منطقی تقاجوں اور اس انسانی، عالمی اور ابدی دین کی خصوصیات کے عین مطابق..... جس طرح صرف و نحو عربی زبان و بیان کے قواعد کی بنیاد قرآن مجید عربی اشعار اور اولین عرب کے کلام پر رکھی گئی اور ان کا تدریجی ارتقاء ہوا اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ فقہ کی تدوین انتہائی ضروری تھی کہ عرب و عجم پر یہ دین حاوی تھا اور اس کے دائرے میں داخل ہونے والا ہر مسلمان اس کا مکلف ہے، اس لئے بھی کہ فقہ کا تعلق مسلمان کی پوری زندگی سے ہوتا ہے اور عقیدہ و عبادت سے اس کا غیر معمولی ربط و تعلق اور اخروی عذاب و ثواب، نجات و ہلاکت اور سعادت و شقاوت کا

دار و مدار ان فقہی احکامات پر ہی ہے"(۱)

دور حاضر اور اجتہاد

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے اجتہاد و تقلید کے معرکۃ الآراء مسئلہ میں بھی نقطۂ اعتدال کی طرف امت کی رہبری کی، اپنے اپنے حدود و قیود میں دونوں کو ضروری قرار دیا، دور حاضر میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ اس طبقہ پر سخت نکیر کرتے ہیں جو اجتہاد کے نام پر شریعت اسلامی کی حقائق ثابتہ سے کھلواڑ کرنا چاہتا ہے، ایک جگہ حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"اس دور میں اجتہاد کی باتیں بہت ہو رہی ہیں اور یہ نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ اس زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت ہے، چنانچہ اجتہاد کا نعرہ لگانا ایک طرح سے ترقی پسندی کی علامت بن گیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد اس زمانہ کی حاجت اور اس دین کی ضرورت ہے جو زندگی کے قافلے کی رہنمائی اور قیادت کرتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں اور بھی اس کی ضرورت ہے جب کہ تمدن اور صنعت و تجارت نے ایسی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کر لی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، جدید تجارتی معاملات اور معاہدوں میں ایسے فقہی احکامات اور فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اسلامی فقہ کے اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں لیکن شرعی مسائل اور جدید عصری ایجادات کے بارے میں جو لوگ اجتہاد کا نعرہ لگاتے رہتے ہیں وہی اسلامی دنیا کے وہ قائدین و مفکرین اور مغربی دانش گاہوں کے فضلاء ہیں جنھوں نے خود مغربی تہذیب و تمدن کا سامنا پورے عزم و ارادے اور ایمان و یقین سے کرنے میں اپنی مہارت اور ذہانت و ذکاوت کا ثبوت نہیں دیا ہے، حالانکہ ان کا فرض تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے سائنسی ایجادات اور ترقی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کے درمیان تمیز کر کے وہی چیزیں لیتے جو مشرقی قوموں اور انکے دین و مذہب اور تہذیب و مزاج سے میل کھاتیں اور ان قوموں کو بھی روشنی دکھاتے جو مادیت کا شکار ہو چکی ہیں، وہ مغرب سے جو کچھ حاصل کرتے پہلے اس سے اس غبار کو جھاڑ دیتے جو قرون مظلمہ ہی

سے ان کا جزبن گئی ہے اور اب بھی اس کی وجہ سے نفسیاتی کشمکش اور اعصابی تناؤ میں مبتلا ہیں، مغربی دانش گاہوں کے ان فضلا، کو اس کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ اس دور میں وہ ان علوم سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے کہ جن میدانوں میں انھوں نے تخصص کیا ہے اور جو ان کا خاص موضوع رہا ہے اس میں بھی انھوں نے اپنے رول کو ادا نہیں کیا اور نہ ہی نظام تعلیم وتربیت کو آزاد اسلامی نظام تعلیم کے سانچے میں انھوں نے ڈھالنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ کام بھی اجتہاد ہی کی طرح ہے لیکن انسان کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کرپاتا تو دوسروں کو موردالزام ٹھہراتا اور اس سے مطالبہ کر بیٹھتا ہے"

اس گرفت اور احتساب کے باوجود یہ بات بہر حال اپنی جگہ صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اجتہاد کی ضرورت اپنی جگہ پر ہے، اس مسلہ پر کوئی اختلاف نہیں، جو لوگ علوم شریعت میں بصیرت اور اس پر دسترس رکھتے ہیں وہ اس میدان میں اپنا قائدانہ کردار ادا کریں اور اصول فقہ جیسے قیمتی خزانہ سے جس کی کوئی نظیر قوموں اور ملتوں میں نہیں ملتی، احکام ومسائل کے استنباط میں فائدہ اٹھائیں، فقہ کا یہ ذخیرہ عرصہ سے صرف تاریخ بن کر رہ گیا ہے، جس سے ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور کے مجتہدین کس طرح احکام ومسائل کا استنباط کیا کرتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن وقت کی گھڑی کو نہ تو اپنی جگہ روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کو معطل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کو ماضی کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے، جبکہ اسلام ایسی قوموں اور معاشرہ کا دین ہے جو ان مسائل ومشکلات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے۔

اجتہاد کے معطل ہونے کی وجہ

مختلف ادوار، ملکوں اور شہروں میں امت نے اجتہاد کو اختیار کیا اور علماء اس پر گامزن رہے، مذاہب اربعہ کی کتابیں ان مثالوں سے بھری پڑی ہیں، لیکن تاتاری حملے کے بعد مذاہب اربعہ (جدید مفہوم میں ہم اس کو علمی اکیڈمی یا ادارے سے تعبیر کرتے ہیں) پر کسی قدر پژمردگی اور کمزوری چھاگئی، اس لئے کہ تاتاری حملے نے خود اعتمادی اور ذہانت کے سوتوں کو

خشک کر دیا تھا۔

جو قومیں تاتاری قوموں کے ماتحت ہوئیں ان کے اندر مسلح اور غیر مسلح لشکر کے مقابلے کی جرأت ختم ہو کر رہ گئی، چنانچہ اسلامی دنیا کے مشرقی حصے کے علماء نے اس خاص وقفہ میں اجتہاد کی سرگرمیوں پر کسی حد تک پابندی لگانے ہی میں عافیت سمجھی، اس لئے کہ انھیں اندیشہ ہونے لگا کہ اگر اجتہاد کی اجازت دیدی گئی تو حکام اور والیان سلطنت کے سیاسی اور انفرادی مصالح کا اس میں خیال رکھا جائے گا اور اس سے نفع کے بجائے نقصان زیادہ ہوگا، اس کا بھی امکان ہے کہ دین میں تحریف کا سبب انفرادی اجتہاد بن جائے یا اس امت کی رفتار میں انحراف اور کجی پیدا ہو جائے، اگرچہ ان علماء کا یہ خیال وقتی طور پر پابندی کے لئے تھا جس کی بنیاد فقہ کے اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ جلب منفعت پر دفع ضرر کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اب اگر اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہی ضروری ہے تو ضرور کھولا جائے لیکن اصول فقہ کی کتابوں میں اس کے لئے جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا لحاظ ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ انفرادی طور پر اجتہاد کے بجائے اجتماعی طور پر اجتہاد کیا جائے، وہ اس طرح کہ شریعت کے ماہرین کی ایک اکیڈمی ہو جس میں کسی مسئلہ پر طویل غور و فکر، بحث و مباحثہ اور تبادلۂ آراء اور قرآن و سنت اور فقہ و اصول فقہ کے پورے ذخیرے کے بھرپور جائزے کے بعد فیصلہ کیا جائے تاکہ کسی سازش یا کسی سیاسی قوت یا استبدادی حکومت کا عکس نہ پڑنے پائے۔

اجتہاد کے حدود اور اس کا میدان

جدید طبقہ کے لوگ اجتہاد کی دعوت دیتے ہیں خصوصاً عصری دانشگاہوں کے پرجوش جذباتی نوجوان اور اسلامی ملکوں کے بعض سربراہ، ان کی اس دعوت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہر مسئلہ میں اجتہاد مطلق کی دعوت دے رہے ہیں، وہ مغربی اقدار و قیم اور عصری پیمانوں کو جوں کا توں لینے پر مصر ہیں، گویا کہ زمانہ پہلے اسلامی دور کی طرح ہو گیا ہے جب اسلام نیا نیا آیا تھا اور انسانی سوسائٹی مکمل طور پر انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی اور گذشتہ دور میں فقہاء اور مجتہدین نے جو نتائج نکالے اور علم و تحقیق اور مطالعہ کے بعد جو اصول انھوں نے

بنائے تھے وہ اپنی قیمت اور اہمیت کھو چکے ہیں اور اب موجودہ زمانہ اور قوموں کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں، اس میں زیادہ سطحیت، لاپروائی، نام نہاد ترقی پسندانہ ادب کے پھیلائے ہوئے پرپیگنڈے کا اثر ہے، اس ادب نے نوجوانوں کے سامنے زمانہ کی ایسی تصویر کھینچی جیسے یہ دور بالکل نیا ہے اور گذشتہ زمانہ سے یہ دور کسی طرح بھی ہم آہنگ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ تصویر تخیلات پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ برابر حقیقت نہیں، واقعیت و منطقیت سے زیادہ اس میں جذباتیت سے کام لیا گیا ہے۔

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کا اختتام اس تقریر کے اقتباس پر کروں جو میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک سیمینار بہ عنوان "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کی تھی۔

"زمانہ اپنی تغیر پذیری اور زیادہ صحیح الفاظ میں تغیر پرستی یا اقبال کے الفاظ میں "تازہ پسندی" کے لئے بدنام زیادہ ہے اور بدکم ہے، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیری ہی کا نام ہے، زمانہ ثبات اور تغیر کے متوازن مرکب اور مجموعے کا نام ہے جب کبھی اس کا تناسب بگڑے گا یعنی ٹھہراؤ تغیر پر غالب آجائے گا یا تغیر ٹھہراؤ پر غالب آجائے گا تو زمانے، سوسائٹی اور تہذیب کا قوام بگڑ جائے گا، ان دونوں کے تناسب کا معاملہ کیمیاوی اجزاء کے تناسب سے بھی کہیں زیادہ نازک ہے، زمانہ جہاں تغیر کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کو بدلنا چاہئے اس لئے کہ بدلنا زندگی کی کوئی کمزوری، کمی یا عیب نہیں وہ زندگی کا عین مزاج ہے اور زندگی کی تعریف ہے ؎

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو، وہ درخت شاداب اور پر ثمر نہیں کہلایا جاسکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھو دے۔

تغیر پذیری یا اس کے بجائے اگر آپ اس کو نمو یا ترقی کا نام دیں تو میرے خیال میں آپ

اس کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں گے. زمانہ تغیر قبول کرنے کے ساتھ مقابلہ کی بھی ایک طاقت رکھتا ہے، ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ زمانہ کتنا بدل گیا اور اس تبدیلی کے مظاہر بھی ہم کو صاف نظر آتے ہیں، لیکن زمانے نے اپنی اندرونی صلاحیتوں کو باقی رکھنے اور اپنے صالح اجزاء وعناصر کو محفوظ رکھنے کے لئے کتنی کشمکش کی اور کس قوت مقابلہ سے کام لیا، عام حالات میں ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے اس کے لئے ایک خاص طرح کی خوردبین کی ضرورت ہے.

ایک دریا ہی کو آپ لے لیں جو روانی اور حرکت کے لئے سب سے بہتر مماثل ہو سکتا ہے، دریا کی کوئی موج اپنی پہلی موج کی بالکل عین اور مثال نہیں ہوتی، لیکن دریا اپنی گذرتی ہوئی موجوں کے باوجود اپنے نام کے ساتھ، اپنے حدود کے ساتھ، اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ ہزاروں برس سے قائم ہے، دجلہ وفرات آج بھی دجلہ وفرات کہلائیں گے اور گنگ وجمن آج بھی گنگ وجمن کہلاتے ہیں.

زمانے کے اندر ٹھہراؤ بھی ہے اور بہاؤ بھی، اگر زمانہ ان دونوں خصوصیتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی افادیت کھو دے گا: اسی طرح کائنات میں جتنے بھی وجود، تخصیتیں اور ہستیاں ہیں سب کے اندر مثبت اور منفی لہریں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور دونوں لہروں کے ملنے سے وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ منصب پورا ہوتا ہے جو ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

مذہب زندگی کا نگراں ہے

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک پیرو اور طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن پسند نہیں کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے، یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہو سکتی ہے کہ وہ درجہ حرارت وبرودت بتلائے، یہ مرغ بادنما (Weather Cock) کی بھی تعریف ہو سکتی ہے جو کسی اونچی عمارت یا ہوائی اڈے پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہو سکتی،

میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ باد نما کا مقام دینا چاہتا ہو، کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (Ack-nowldege) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوگے.

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے اور اس کے لئے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لئے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہ محض ساتھ دینا، یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے یہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے اور یہ غیر تخریبی رجحان ہے اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم از کم اس مذہب کے پیروؤں کے حق میں کیا ہوگا. مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے وہاں وہ زندگی کا محتسب نگراں، گارجین (Guardian) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے.

گارجین کا کام یہ نہیں ہے کہ جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے اس کے ہر صحیح و غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے. مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے، مذہب کا نام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرے، مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا اور ترغیب اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، اور اگر کوئی غلط دستاویز اس کے سامنے آتی ہے جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کریگا بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راہ میں مزاحم ہو.

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور

فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو رد کے ماہر اخلاقیات و نفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کردے، لیکن مذہب اس کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔

اگر ہم نے اس باریک بینی، گہرائی و گیرائی، امانت و احساس ذمہ داری، اس دین کے مزاج اور اس کے پیغام سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا اور اسی کے ساتھ ہم نے موجودہ زمانہ کے مزاج و خصوصیات کو سمجھا جس میں نمو اور تغیر کی صلاحیت ہے اور ثبات و استقامت بھی، اور اس نے قدیم صالح عناصر کو باقی بھی رکھا ہے۔ اگر ہم نے ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھ لیا تو فقہ اسلامی کی ضرورت (وسیع معنوں میں) کو ہم پوری کر سکتے ہیں اور ہم اسلامی سوسائٹی کی بھی ضرورتوں کو پوری کر سکتے ہیں، اور اسلامی احکام اور دینی تعلیمات پر ہم اس مہذب اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی عمل کر کے دکھا سکتے ہیں اور اس زندگی کا بھی ساتھ دے سکتے ہیں جو تیزی اور انتہائی سرعت کے ساتھ ترقی کرتی جارہی ہے (۲)

تقلید کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر

تقلید کے مسئلہ میں بھی حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہت معتدل نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا نقطۂ نگاہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ تھا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ تحسین و استحسان کے انداز میں بیان فرمایا ہے، مولانا مرحوم رقم طراز ہیں:

شاہ صاحب غایت انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہب فقہی یا معین امام کا مقلد تو ضرور ہے لیکن اس کی نیت محض صاحب شریعت کی پیروی اور اتباع نبویؐ ہے لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے اس تک براہ راست پہونچ جائے، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ عامی شخص ہے، یا اس کے پاس براہ راست تحقیق کرنے کے

لئے وقت اور فرصت نہیں، یا ایسے وسائل (علم و تحقیق) حاصل نہیں جن سے وہ نصوص کا خود پتہ چلالے، یا ان سے مسئلہ استنباط کرلے، شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزمؒ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرلے تحریر فرماتے ہیں :

"ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لئے واجب الطاعت نہیں سمجھتا وہ حلال اسی کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا اور حرام اس کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، لیکن چونکہ اس کو براہ راست آں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے اقوال و احوال) کا علم حاصل نہیں، اور وہ آپ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے،، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے، اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سنت نبویؐ کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے، جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا، اسی وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے، بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون کرے اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا؟

سب کو معلوم ہے کہ استفتاء اور افتاء کا سلسلہ عہد نبویؐ سے لے کر برابر چلتا رہا ہے، اور دونوں میں کیا فرق ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک سے فتویٰ لیتا ہے یا کبھی ایک سے فتویٰ لیتا ہے کبھی دوسرے سے، ایسی حالت میں کہ اس کا ذہن صاف ہے، اس کی نیت سلیم ہے، اور وہ صرف اتباع شریعت چاہتا ہے، یہ بات کیسے جائز نہیں؟ جبکہ کسی فقیہ کے بارے میں ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر آسمان سے فقہ اتاری اور ہم پر اس کی اطاعت فرض ہے" (۳)

ایک دوسری جگہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ اجتہاد و تقلید کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے معتدل نقطۂ نظر کی تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"حضرت شاہ صاحب کے ان وہبی کمالات اور تجدیدی امتیازات میں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص طور پر نوزا تھا وہ متوازن اور معتدل مسلک اور وہ نقطۂ اعتدال ہے جو انھوں نے اجتہاد و تقلید کے درمیان اختیار کیا، اور جو ان کے طبع سلیم، ذوق صحیح اور حقیقت پسندی کا بہترین مظہر ہے، ایک طرف وہ لوگ تھے، جو ہر مسلمان کو خواہ وہ عام ہو یا خاص براہ راست کتاب و سنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکام حاصل کرنے کا مکلف قرار دیتے تھے اور تقلید کی مطلق حرمت کے قائل تھے، اگر ان کے کلام میں اس کی صراحت نہیں ملتی تو ان کے طرز عمل اور ان کی تحریروں سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزم پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن یہ بالکل ایک غیر عملی بات ہے اور اس کا ہر مسلمان کو مکلف قرار دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام "فاسق" اور "ضال" سے یاد کرتا تھا جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین اور کسی خاص مذہب فقہی کے متبعین کو، یہ گروہ اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خود رائی سے بچانے، مسلم معاشرہ کو انتشار و فوضویت (انارکی) سے محفوظ رکھنے، دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے، اور احکام شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقع دینے کی ایک انتظامی تدبیر ہے لیکن انھوں نے اس انتظامی عمل کو تشریعی عمل کا درجہ دیدیا اور اس پر اس شدت سے اصرار کیا جس نے اس کو ایک مذہب فقہی اور مسئلہ اجتہادی کے بجائے منصوص اور قطعی عمل اور مستقل دین کا درجہ دیدیا (۴)

حضرت مولانا علی میاںؒ جس طرح اجتہاد کے نام پر شریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے بارے میں سخت ترین نکیر کرتے ہیں، اسی طرح تقلید میں غلو و انحراف کا سختی کے ساتھ نوٹس لیتے ہیں، تقلید کی جائز اور فطری شکل کی وضاحت کرنے کے بعد اس میں غلو و انحراف کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا اور کہیں کہیں ائمہ کی حیثیت وسائط اور وسائل

کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع و مطاع کی پیدا ہو گئی، لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہو گئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے، اس سلسلے میں عوام تو زیادہ قابل الزام نہیں ہیں کہ انھوں نے ان مذاہب کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا تھا اور ان کے لئے ترجیح کے اسباب معلوم کرنا اور ان کے مطابق ترک مذہب یا ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف انتقال مشکل بھی تھا اور خطرناک بھی، لیکن بہت سے علماء کی یہ حالت تھی کہ ان کو اگر اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث و سنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور اس کا قطعی علم حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام یا مذہب کا مسئلہ راجح اور حدیث و سنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح و صریح احادیث ملیں تب بھی وہ اس مسئلہ کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی طبیعت اس کے لئے منشرح نہیں ہوتی" (۵)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اس بات کے داعی تھے کہ تمام فقہی مسالک کو امت مسلمہ کا مشترکہ سرمایہ تصور کیا جائے، تمام ائمہ فقہ کا احترام کیا جائے، بیجا تعصب و تشدد سے گریز کیا جائے اور نئے مسائل کے حل میں کتاب و سنت کے ساتھ تمام فقہی مسالک سے استفادہ کیا جائے۔

فقہ اسلامی پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تحریریں مختصر ہیں لیکن جتنی بھی ہیں بڑی پر مغز اور فکر انگیز ہیں، آپ کی کتاب "ارکان اربعہ" احکام شریعت کے اسرار و حکم پر لاثانی کتاب ہے، اس موضوع پر امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس کتاب کے ذریعہ اس کام کو آگے بڑھایا گیا ہے، اجتہاد کے موضوع پر حضرت مولانا کا ایک مختصر رسالہ ہے، تاریخ دعوت و عزیمت کی جلد اول، دوم، پنجم میں فقہ اسلامی کی وکالت و ترجمانی میں طاقتور تحریریں ہیں، نئے مسائل کے حل کے لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے "مجلس تحقیقات شرعیہ" قائم فرمائی، اس ادارہ نے نئے مسائل کے حل میں خاصی پیش رفت کی،

حضرت مولانا "مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ" کے رکن اور "مجمع الفقہ الاسلامی الھند" کے سرپرست تھے، "مجمع الفقہ الاسلامی الھند" کے متعدد سیمناروں میں موصوف نے گراں قدر خطبات پیش فرمائے، جنہیں "اجتماعی اجتہاد" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربت کو انوار سے بھر دے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۱۔ مجلہ بحث و نظر فقہی سیمنار نمبر جلد ۲، شمارہ ۶ ص ۵۰ تا ۵۴۔

۲۔ ایضاً ص ۵۹ تا ۶۵۔

۳۔ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۵ ص ۲۰۸، ۲۰۹۔

۴۔ ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۵،

۵۔ ایضاً جلد ۲ ص ۳۳۷، ۳۳۸

کلمۃ الاسلام

اگر مجھ سے کوئی کسی ملک کی تعریف کرے اور بتائے کہ وہ بڑی فوجی طاقت کا مالک ہے، اس کی معاشیات بڑی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، دُنیا کی بڑی طاقتوں سے اس کے بڑے اچھے تعلقات ہیں، اور ان کی نظر میں اس کا بڑا احترام ہے، تو مجھے یہ سُن کر اطمینان نہیں ہوگا، میں کہوں گا کہ مجھے یہ بتایئے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبہ تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے، ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حدِ اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت اور قانون کے احترام کی کتنی عادت ہے؟ اگر وہ صاحب کہیں گے کہ اس کی طرف سے تو میں اطمینان نہیں دلا سکتا تو میں کہوں گا کہ پھر مجھے اس ملک کے حال و مستقبل کے بارہ میں کوئی اطمینان نہیں ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
کراچی یونیورسٹی (پاکستان)

مفکر اسلامؒ عربی کے صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء و مدیر: مجلہ "البعث الاسلامی"، لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) ابتدائے عمر ہی میں اپنے ادبی ذوق کے لئے معروف تھے، ان کے خاندان میں اُس وقت کئی ایسے لوگ موجود تھے جو ادب و شعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اور اس کی نمائندگی کرتے تھے، ان میں حضرت والا کے ماموں زاد بھائی سید حبیب الرحمٰن حسنی شعر و شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، اردو کے قدیم شعراء جو شعر و ادب میں حجت کا درجہ رکھتے تھے ان کے کلام سے ان کو خاص شغف تھا، اسی طرح خاندان کے بزرگ عالم دین و محدث مولانا سید ابوالخیر صاحب لکھنؤ کے ادب و زبان اور اس کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے خود بھی شاعر تھے شعر کہتے تھے اور برق تخلص فرماتے تھے، خود حضرت والا کے والد مرحوم علامہ عبدالحی حسنی اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے حالات پر ایک وقیع تصنیف کے مالک تھے جس کا نام "گل رعنا" ہے جو شروع ہی سے آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھی جس سے آپ نے ادبی ذوق حاصل کرنے میں بڑا استفادہ کیا، بہتر ہے کہ ہم حضرت مرحوم کے ادبی ذوق کی تعمیر اور اس کو پروان چڑھانے میں جن عوامل کا بھرپور اثر ہے اس کو خود ان ہی کی زبان سے سنیں، فرماتے ہیں:

"یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں میں نے اردو زبان و ادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، دین کے جن داعیوں اور علماء کو ابتدائے عمر میں اپنے ملک کی زبان و ادب کے مطالعہ اور اسکا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا، یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے

ہیں ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم و تعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دل نشیں کرنے میں دقت پیش آتی ہے، اور ان کی انشاء و تحریر میں وہ طاقت و دل آویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے؟ رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جایا کرتا تھا، میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی "الفاروق" آگئی مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی، عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے، اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔

"گل رعنا" گھر کی کتاب تھی اس کو اتنے بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنے معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے انکو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے، اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر مؤمن، غالب، ذوق، اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور انکا مطلب بیان کرنے کے سلسلے میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق کا بھی حصہ ہے، جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاذ کا درجہ رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔

اس زمانے میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا۔ اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں بعض عزیزوں کا ذخیرہ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی "نیرنگ خیال" بھی تھی عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک "نیرنگ خیال" اور "آب حیات" کی تقلید میں بہت سے

صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدے سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا زمانہ تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم، ارر تن ناتھ سر شار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، میرے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحب کے یہاں مولانا آزاد کے شہرۂ آفاق اخبار "الھلال" کے کئی سال کے فائل تھے، وہ بھی ذوق و شوق سے پڑھے، اور ان کے زور قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلادی جائے، بیکار اور بے اثر نہیں رہتی اپنا اچھا یا برا اثر ضرور کرتی ہے، اسلئے اسکا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یاد ایام" کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنف "گل رعنا" اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے اندلس پر تھا"

(ماخوذ از کاروان زندگی جلد: ۱-۹۳-۹۶)

اسی ادبی ذوق و مطالعہ کا اثر تھا کہ عربی زبان وادب کی طرف توجہ ہوئی اور علامہ تقی الدین ہلالی جو عربی زبان وادب کے محقق اور بلند پایہ عالم وادیب تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں تشریف لائے اور عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا، اور شب و روز ان کے ساتھ رہ کر عربی زبان پر پورا عبور حاصل کر لیا، اور عربی ادب کے بارے میں ان کے افادات اور ان کے طریقہ تعلیم سے ذوق ادب کو پروان چڑھانے میں بہت مدد ملی، اسی زمانے میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" بھی جاری ہوا، اس کی سرپرستی اور نگرانی تو علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ ہلالیؒ کرتے تھے، مگر اس کی تحریر و ترتیب اور اشاعت کی تمام تر ذمہ داری حضرت مولاناؒ اور مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر تھی، اس عربی ماہنامہ نے دار العلوم میں عربی ادب کا ذوق پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا اور عربی مضمون نگاروں کی ایک ٹیم اسکی وجہ سے تیار ہو گئی اس میں حضرت مولانا بے تکلف عربی بولنے اور لکھنے کیلئے مشہور و معروف ہو گئے۔

حضرت مولاناؒ کا سب سے پہلا عربی مضمون حضرت سید احمد شہیدؒ پر مصر سے شائع ہونے والے

مشہور عربی رسالہ "المنار" میں شائع ہوا یہ رسالہ وہاں کے مشہور عالم اور ادیب سید رشید رضا کی ادارت میں نکلتا تھا، انھوں نے اس مضمون کو نہ صرف یہ کہ شائع کیا بلکہ اس کو الگ سے رسالہ کی شکل میں بھی طبع کیا، یہ واقعہ دراصل حضرت مولانا کی ادبی عظمت کی دلیل ہے، اور عربی ادب میں ان کے عالی مقام کی نشاندہی کیلئے کافی ہے۔

اس کے بعد حضرت مولاناؒ برابر اپنی ادبی استعداد بڑھانے اور عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے کیلئے عربی رسائل واخبارات اور عربی ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہے عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے اور انشاء و تحریر کی مشق کی طرف متوجہ کرنے اور اس کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرانے میں حضرت مولانا کے برادر بزرگ مولانا سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر واہتمام کا بڑا دخل ہے۔ حضرت مولاناؒ "کاروان زندگی" میں فرماتے ہیں۔

"بھائی صاحب عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے، شاید ہندوستان کے چند ہی آدمی بلاد عربیہ کے اخبارات سے واقف ہونگے اور ان کے مطالعہ کا اہتمام کرتے ہونگے جب سے وہ حج ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء سے آئے تھے مکہ مکرمہ کا اخبار "ام القری" ان کے نام جاری تھا، اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد انھوں نے ایک ندوی فاضل مولوی سید سعید اشرف صاحب سے جو لکھنؤ کے مشہور اردو اخبار "ھمدم" میں عربی سے اردو میں ترجمہ کا کام کرتے تھے، یہ طے کر لیا تھا کہ وہ عربی اخبارات پڑھنے اور ان سے کام لینے کے بعد ان کو پہونچا دیا کریں گے، مولوی سید سعید اشرف صاحب کے ذریعہ جو اخبارات بھائی صاحب کے پاس آتے تھے، ان میں دمشق سے نکلنے والا "فتی العرب" اور فلسطین سے نکلنے والا "الجامعة السلامية" یاد ہے ان دونوں اخبارات کی عربی بڑی اچھی اور طاقتور ہوتی تھی، خاص طور پر "الجامعة الاسلامية" (جو مفتی امین الحسینی صاحب کا ترجمان تھا) کے افتتاحیے بڑے طاقتور، فصیح وبلیغ اور آتشیں قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے اور "الهلال" کے مولانا آزاد کے لکھے ہوئے افتتاحیوں کی یاد تازہ کرتے تھے، میں اگرچہ عربی ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھ چکا تھا، لیکن ان اخبارات کے سمجھنے میں مجھے دقت پیش آتی تھی، اس میں بھائی صاحب نے میری رہنمائی فرمائی، وہ جدید تعبیرات واصطلاحات کی تشریح فرماتے اور میں رفتہ رفتہ ان کو بلا تکلف پڑھنے لگا اور مجھے اس سے انشاء

و تحریر میں بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی، ان دونوں اخباروں کے ایڈیٹر فصیح اللسان، صحیح التعبیر اور عربی پر بڑی قدرت رکھنے والے اہل قلم اخبار نویس تھے۔

اس وقت دار العلوم کی جمعیۃ الاصلاح کے دار المطالعہ میں "المنار" "الهلال" "المقتطف" "مجلة الزهراء" "المجمع العلمی" "العرفان" وغیرہ رسائل آتے تھے، مولانا مسعود عالم ندویؒ کی دوستی و رفاقت کی وجہ سے میں بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا، ہلالی صاحب آئے تو انھوں نے استاذ محب الدین الخطیب کے ہفتہ وار رسالہ "الفتح" کا تعارف کرایا اور اس کے منگوانے اور پڑھنے کی ترغیب دی، اس رسالہ میں اس وقت کے بلند پایہ اسلامی مفکر اھل قلم امیر البیان امیر شکیب ارسلان وغیرہ مضمون لکھتے تھے اس رسالہ کے مطالعہ سے جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع تھا ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہونچا" (۱۲۵-۱۲۶)

عربی زبان وادب کا ذوق اور مہارت حاصل ہونے کے بعد حضرت مولاناؒ نے ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کے عربی مدارس کیلئے عربی زبان وادب کا نصاب تیار کرنے کی طرف توجہ فرمائی، اور بچوں کیلئے کتاب (قصص انبیین للاطفال) (جو تین حصوں پر مشتمل تھی اور بعد میں اس سلسلہ میں دو حصوں کا اضافہ ہوا) اور "القراءة الراشدة" کا سلسلہ شروع فرمایا، اور درجات عالیہ کے طلبہ کیلئے "مختارات من ادب العرب" دو حصوں میں لکھ کر نہ صرف ہندوستان کے مدارس عربیہ کے حلقوں میں ایک ادبی اور فکری انقلاب برپا کیا، بلکہ اس کتاب کے ذریعہ جو قرن اول سے لیکر عصر حاضر تک کیلئے ادبی نمونوں پر مشتمل تھی اور زندہ عربی زبان وادب کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی، خود بلاد عربیہ کے علمی اور ادبی حلقوں اور وہاں کے مدارس و جامعات میں عربی ادب کی اس نئی نمائندگی کو رشک و شکر کے جذبے کے ساتھ دیکھا گیا، اور وہاں کے تعلیمی مراکز نے اس کو قبول کیا، اور داخل نصاب کیا۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی اس ادبی کوشش کی کامیابی کے بعد ۱۹۴۴ء میں اپنی وہ عظیم المرتبت اور معرکۃ الآراء کتاب عربی زبان میں لکھی جسکا نام بھی اپنی ایک اھم شخصیت رکھتا ہے، یعنی (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) اس کتاب نے تمام علمی اور ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا، اور ایک نئے اسلامی نظریئے کا ان کو علم ہوا، کہ مسلمانوں کے عروج و زوال سے عالم انسانیت کو نقصان پہونچ سکتا ہے، کتاب کے اندر اسی نقطۂ نظر کو عقلی اور نقلی دلائل سے اتنا مستحکم کر کے پیش کیا گیا ہے

کہ کسی کو بھی اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کتاب کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ہم اس جانب بھی اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ نے عربی ادب کا ایسا معتدل اور سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جسے "اسلوب الدعوۃ" اور "ادب الدعاۃ" کا نام دینا بالکل مناسب ہے اور عصر حاضر کا کوئی بھی مؤرخ جدید عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت اس اعلیٰ اسلوب سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر میں ادب کے عناصر:۔

حضرت مولاناؒ کی نظر میں "اخلاص و سچائی" ادب کے دو اہم بنیادی عنصر ہیں جو خصوصیت کے ساتھ دعا و مناجات اور اذکار و اوراد میں پائے جاتے ہیں۔ اور ادب کی طاقت و قوت اور تاثیر بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ مولاناؒ رقمطراز ہیں "ادب کے اہم ترین عناصر میں سے اخلاص و سچائی بھی ہے مگر اس کی اہمیت سے اکثر ناقدین ادب غفلت برتتے رہے ہیں، حالانکہ یہی دونوں عنصر ادب کے اندر طاقت و قوت اور زندگی کی روح پھونکتے ہیں، اور اسے ایک ابدی حقیقت کا درجہ عطا کرتے ہیں، دعا و مناجات کے علاوہ ادب کی کوئی صنف ان دونوں عنصروں سے بیک وقت مزین نہیں ہوتی آپ غور کریں کہ داعی و مناجی اگر نرم دل نرم خو، زخم خوردہ، اور حالات کا مارا ہوا ہو، نیز اپنے رنج و غم کو بیان کرنے پر اسے قدرت تامہ بھی حاصل ہو، تو کیا اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کسی ادبی معجزہ سے کم ہونگے؟ یقیناً وہ کلمات دل کے ٹکڑوں اور اشک جگر سوز سے کم نہ ہونگے جو برسہا برس تک ہزاروں انسانوں کو رُلانے کے لئے کافی ہوں گے، ان کلمات کی تاثیر اور اعجاز پر ایک حیثیت سے اور غور فرمایئے جبکہ وہ اس زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں جو وحی الٰہی سے ہمیشہ تر و تازہ رہتی تھی، اور فصاحت و بلاغت جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، مثال کے طور پر طائف والی دعا کو دیکھئے!

اہل طائف نے آپ کی دعوت کو ٹھکرا دیا، اور آپ کے ساتھ بڑی سنگدلی کا معاملہ کیا، آپ پر پتھروں کی بارش کی حتیٰ کہ آپ کے قدم مبارک لہولہان ہو گئے اس بے کسی و کرب کے عالم میں آپ کی زبان پر وہ دعا جاری ہوئی جو طاقت و قوت اور تاثیر و صداقت سے لبریز ہے، آپ نے بارگاہِ

خداوندی میں عرض کیا"اللهم إليك اشكو ضعف قوتي و قلة حيلتي وهو اني على الناس، رب المستضعفين: أنت ربي إلى من تكلني؟ إلى بعيد يتجهمني أو إلى عدو ملكته أمري ، ان لم يكن على غضب فلا ابالي، غير أن عافيتك هي أوسع لي، اعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات ، و صلح عليه أمر الدنيا و الآخرة، من أن يحل لي غضبك أو ينزل علي سخطك، لك العتبىٰ حتى ترضى، ولا حول ولا قوة إلا بالله"

(ترجمہ)"الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے، اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے،، کیا بیگانہ ترش رو کے، یا اس دشمن کے جو میرے اوپر قابو رکھتا ہے، اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اسکی پروا نہیں، لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے، میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں، کہ تیرا غضب مجھ پر اترے، یا تیری ناراضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضا مندی اور خوشنودی درکار ہے، اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے"۔

حضرت مولاناؒ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ادب کو مختلف اصناف میں تقسیم کیا اور ہر صنف کی خصوصیت و اہمیت کو اجاگر کیا، مثلاً خطوط نویسی کے ادب کو ادباء و ناقدین کے نزدیک سادگی و حقیقت پسندی اور تکلف و تصنع سے دوری میں وہ اہمیت حاصل تھی جو کسی اور صنف کو حاصل نہ تھی، لیکن حضرت مولاناؒ نے اس کے اندر مزید اضافہ فرمایا وہ تحریر فرماتے ہیں،" شخصی رسائل کو سادگی و سچائی اور تکلف و تصنع سے دوری کیوجہ سے ناقدین ادب نے بڑی اہمیت دے رکھی ہے، حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ادب کی ایک ایسی صنف بھی موجود ہے جس میں مذکورہ صفات ان رسائل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں، اور اس میں تاثیر کی وہ طاقت ہے جس کے سامنے ان رسائل کے تمام لغوی مصطلحات ھباءً منثوراً ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ اس صنف میں متکلم اپنے دل کی باتوں کو نکالکر رکھ دیتا ہے، اور اس کی زبان اس کے دل کی صحیح اور قادر الکلام ترجمان ہوتی ہے، چنانچہ وہ القاب و آداب اور

مدح و تعریف سے بے نیاز ہو کر، سامع کو خاطر میں نہ لا کر اپنے قلب سے مخاطب ہوتا ہے، اور اپنے جذبات واحساسات اور ضمیر سے سرگوشی کرتا ہے ادب کی اس اعلیٰ قسم کا نام "دعا" "ومناجات" ہے۔

ادب کی ایک دوسری صنف بھی ہے جسے ہم ادب تراجم یعنی سوانح عمری کا ادب کہتے ہیں، ادباء کے نزدیک اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس راہ میں کسی ادبی بلاغت اور فنی جمال کی ضرورت نہیں، چنانچہ جب وہ لوگوں کی سوانح عمری اور کتابوں کی تقدیم کے لیے قلم اٹھاتے تو ہر ایک کیلئے ایک ہی قسم کے اسلوب بیان اور متشابہ اصطلاحات اور ایک دوسرے سے قریب الفاظ استعمال کرتے اور وہ اس سلسلہ میں کسی جداگانہ امتیازی خصوصیت کی رعایت نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص کی سوانح عمری اور ہر کتاب کی تقدیم کے وقت ایک ہی طرز بیان کو اپناتے، جس کی وجہ سے ادب تراجم کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس کو اس کے تنگ دائرہ سے نکال کر آفاقی وسعت عطاء کی، اور بلا سوچے سمجھے بے محل کلمات کے استعمال پر پابندی عائد کی، اور الفاظ کے درجۂ حرارت و برودت (TEMPERATURE) کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تاکہ کسی بھی شخص کی سوانح عمری یا کسی کتاب کی تقدیم کے وقت بے جا الفاظ کا استعمال نہ ہونے پائے، اس اہم پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں "بہت سے ادباء ومصنفین سمجھتے ہیں کہ کسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح عمری کا موضوع نہایت آسان کام ہے، لہذا جب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بڑی فیاضی اور دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے القاب واوصاف کا پل تعمیر کر دیتے ہیں، جو عموماً مدح سرائی وثناخوانی پر مبنی ہوتا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے کلمات میں ایسا اشتراک پایا جاتا ہے کہ اس میں عالم ادیب، صالح و متقی، حاکم اور سپہ سالار لشکر، سب شامل ہو سکتے ہیں، ان کلمات سے کسی ایک شخصیت کی تحدید و تعیین نہیں کی جا سکتی، اور نہ کسی کے حسن و جمال، کمالات وامتیازات اور آثار وعلامات کی ایسی تصویر کشی ہو سکتی ہے جس سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے اور ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرہ سے ممتاز ہو جائے، حقیقت تو یہ ہے کہ سوانح عمری کا موضوع اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ اس کے لئے چند اہلیتیں اور لیاقتیں درکار ہوتی ہیں، اس کے لئے سب سے پہلے تو ناقدانہ شخصی معرفت کی

ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ بات ایک ساتھ زندگی گزارنے کی راہ سے حاصل ہو جائے تو فبہا، ورنہ منصفانہ مطالعہ کی روشنی میں اس شخصیت کے حالات اور اس کی خصوصیات وامتیازات کا پتہ لگایا جائے گا، اسی کے ساتھ ساتھ مافی الضمیر کی ادائیگی اور تعبیر پر قدرت، لغوی ذخیرہ اور تعارفی الفاظ کی صلاحیت بھی ضروری ہے اس کے بعد انصاف پسندی اور احساس ذمہ داری کا وہ نازک مرحلہ آتا ہے جس میں سوانح نگار زیر بحث شخصیت کو اسی کے سانچہ وڈھانچہ کے مطابق اور اسی کے قد و قامت کے موافق الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، لہذا وہ اسے ایسا ڈھیلا ڈھالا جامہ نہیں پہنا سکتا جس میں وہ شخصیت حقیر و پست قامت معلوم ہو، اور اس بات کی غمازی کرے کہ وہ جامہ کسی دوسری بڑی شخصیت کے لئے تیار کیا گیا ہے، ایسا اس وجہ سے ہے کہ ہر انسان قامت و قیمت کے دونوں پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اکثر اوقات قامت کے مقابلہ میں قیمت کی حق تلفی بہت زیادہ ہو جاتی ہے، سوانح عمری کے اندر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی پاکیزہ محرک، اندرونی داعیہ ہو اور اس سے فکری ہم آہنگی اور قلبی تعلق ہو، یا نظر انداز کی ہوئی عزت کو بحال کرنے اور چھینے ہوئے حق کی دفاع کی خاطر ہو، یا عظمت رفتہ کی بازیابی، علم دوستی یا کسی کے جمال و کمال پر فریفتگی کی وجہ سے ہو، اگر سوانح عمری مذکورہ عوامل و محرکات سے خالی ہو گی تو اس کی حیثیت اس جامد و خشک تصویر اور اس نقش و نگار کے مانند ہو گی جو محض مادی منفعت اور تجارتی مفاد کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اس میں مصنف و شاعر اور ادیب کا کردار بالکل وہی ہو گا جو ایک پیشہ ور مغنی (گایک) اور کرایہ پر حاصل ہوئی نوحہ خواں عورت کا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے درجہ حرارت و برودت سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ وہ کسی زیادہ طاقت والے لفظ کو کم طاقت والے لفظ کی جگہ استعمال نہ کر سکے، اور کسی معتدل الفاظ والی شخصیت کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال نہ کرے جن سے کسی باعظمت و باکمال، یا کسی ذہین وفطین، یا کسی بااخلاق وباادب یا کسی صاحب علم، روشن دماغ اور حاضر جواب شخصیت کی عکاسی ہوتی ہو، اس کے بعد سوانح نگار کو چاہیئے کہ وہ زیر بحث شخصیت کو اس کے اختصاص کے طبقہ میں جگہ دے، لیکن یہ امر اسوقت دشوار گذار ہو جاتا ہے جب کہ شخصیت مختلف علوم و فنون اور جداگانہ

امتیازات و کمالات کی جامع ہوتی ہے، جیسا کہ عام طور سے علماء متقدمین تھے، ایسی صورت میں شخصیت کے اختصاص کی تعیین اسی وقت ممکن ہے جبکہ سوانح نگار اس کی تمام تصنیفات سے واقف اور اس کے سلسلہ میں اس کے معاصرین کی آراء سے باخبر ہو۔"

کتابوں کی تقدیم اور پیش لفظ کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "کسی معاصر یا بڑے عالم یا عزیز دوست کی کتاب کا مقدمہ لکھنا کوئی تقلیدی عمل نہیں ہے جو کسی کو خوش کرنے یا مؤلف و ناشر کی خواہش کی تکمیل کرنے کی غرض سے انجام دیا جاتا ہو بلکہ وہ ایک طرح کی شہادت اور تصدیق نامہ کا درجہ رکھتا ہے، اور اس کے لئے بھی اپنی جگہ پر کچھ آداب واحکام اور ذمہ داریاں ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ نگار سچی گواہی دینے، کتاب کی علمی تقسیم کرنے، اس موضوع پر دیگر کتب کے درمیان اس کی اہمیت بیان کرنے، مصنف کی جدوجہد کا صحیح ذکر کرنے، اور تالیفی و تصنیفی میدان میں اس کی کامیابی کی حد متعین کرنے کے بجائے تعریف و مدح سرائی سے کام لیتا ہے، اور سامان تجارت سمجھ کر اس کے اندر ایک دلال کا کردار کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ اپنی علمی و ادبی اہمیت کو کھو کر زندگی اور روح سے محروم ہو جاتا ہے، مقدمہ میں کتاب کے موضوع اور اس کے مقاصد، مؤلف کی حیات، معاصرین علماء کے درمیان اس کے مقام و منصب کی تعیین، اس کی عقلی و علمی نشو و نما، اور تالیف کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے، لہذا وہ تعریف و تمہید کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے ہر کتاب کے سرورق پر فٹ کیا جا سکتا ہو۔

اسی وجہ سے مقدمہ نگار اور کتاب کے موضوع کے درمیان علمی یا فکری تعلق کا پایا جانا ضروری ہے، اس موضوع پر اس کا مکمل مطالعہ ہونا چاہیئے، کتاب اگر کسی علمی یا ادبی یا فکری یا دعوتی موضوع سے تعلق رکھتی ہو تو مقدمہ نگار کا مصنف کے عقلی و علمی اور جذباتی رجحانات اور مزاج سے واقف ہونا ضروری ہے، اور اگر کتاب کا تعلق کسی دینی موضوع مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ سے ہو تب بھی مقدمہ نگار اور مصنف کے درمیان گہرے روابط کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مصنف کے اخلاص و اختصاص کا پتہ لگایا جا سکے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ مقدمہ کا محرک اندر کا داعیہ اور وہ قلبی جذبہ ہو جو کتاب کے

پڑھنے کے بعد از خود دل میں پیدا ہوا ہو، اور پھر وہ مقدمہ نگار کو بے تاب کر دے اور سوچنے پر مجبور کر دے کہ اگر وہ مقدمہ نہ لکھے گا تو ایک اہم فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، اور جذبات و تاثرات کے اظہار کی حسرت دل ہی میں باقی رہ جائیگی، یقیناً اس طرح کے طبع زاد اور منصفانہ مقدمے اپنے جلوہ میں تاثیر و فوائد کا ایک بحر ناپیدا کنار سموئے ہوئے ہوتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے ادب کی ایک دوسری بہت ہی اہم صنف کی طرح لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس کو ہم "أدب الرحلات" (سفر ناموں) سے تعبیر کرتے ہیں یقیناً سفر نامہ میں زندگی سماج اور ممالک و اقوام کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جس سے خود سیاح کی ذہنیت اور اس کے افکار و رجحانات کی غمازی ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاح بعض اہم اور بنیادی باتوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے، اکثر و بیشتر سفر ناموں سے جذبات درون اور مقصدیت کی روح اور سچی تصویر کشی کا اسلوب مفقود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی حیثیت ذہنی لطیفوں اور تسکین خاطر کے سامان سے زیادہ نہیں ہوتی۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عالمی طور پر سفر و سیاحت میں گزار، اور آپ کے سفر ناموں کا اسلوب نہایت ممتاز اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے، زندگی و سماج، طرز معاشرت اور علم و ادب کے بارے میں حقائق و معلومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان میں موجود ہے بعض اسفار کو آپ نے خود قلمبند کیا ہے، مثلاً "مذکرات السائح فی الشرق العربی" (شرق اوسط کی ڈائری) "اسبوعان فی ترکیا" (ترکی میں دو ہفتے) "أیام فی المغرب الاقصی" (مغرب اقصیٰ میں چند روز)۔

ان سفر ناموں میں بہت ہی دلکش و دلچسپ ادبی انداز کی کارفرمائی ہے یہ سفر نامے ادب و اسلوب، ایمان و عقیدہ، دعوتی و تربیتی روح کے اعتبار سے تاریخ کے تمام مشہور سفر ناموں سے بالکل مختلف ہیں، بلاشبہ سفر ناموں کی دنیا میں حضرت مولاناؒ کا یہ ایک انقلابی قدم اور بے مثال ادبی اسلوب کی دین ہے، جدید ادبی تاریخ کے رائج سفر ناموں کے اسلوب اور ان کے غیر مفید پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں "موجودہ زمانہ میں عربی زبان میں سفر نامے بڑی تعداد میں لکھے گئے، لیکن

وہ زیادہ تر علمی، جغرافیائی فوائد و معلومات پر مشتمل ہیں، وقت گذاری اور تفریح کا مواد اس میں خاصا موجود ہے، اور باوجود اس کے کہ اس سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، تاہم ان کا مرکزی نقطہ سیر و سیاحت، آثار قدیمہ و قابل دید مقامات کی عکاسی ہے اور اگر زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی ان میں ہے بھی تو بہت واجبی حد تک اور صرف اتنی جو مصنف کے دائرہ ذوق میں آتی ہو، یا اس کے سفر کیساتھ ہم آہنگ ہو، مثلاً سیاح اگر ادیب ہے تو اس نے مشاہیر ادب کے تذکرے اور اس ملک کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، اور اگر کوئی مذہبی شخص ہے تو اس نے دینی حالات پر پوری تفصیل سے کلام کیا ہے، اور اگر کوئی سیاسی یا منتظم ہے تو اس نے سیاسی شخصیتوں کے تذکرے اور سیاسی تحریکوں اور مکاتب خیال کی تصویر کشی میں سفر نامہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر یہ کتابیں ایمانی جذبے اور عقیدہ سے خالی اور لطیف احساسات سے عاری ہوتی ہیں اور ان کتابوں کے مصنف کیمرہ یا کارڈر کا رول ادا کرتے ہیں، واقعات و مشاہدات پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرتے، اس میں ان کے دل کی کوئی دھڑکن اور ان کے ضمیر کی کوئی آواز نہیں سنی جاسکتی، چنانچہ اگر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے بجائے کسی ایسے مصنف کا نام لکھ دیا جائے جسکا اس معاشرہ کے ساتھ نہ ثقافتی کوئی تعلق ہو، نہ عقیدہ اور مذہب اور جذبہ اور وجدان کا کوئی اشتراک ہو تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو وجہ فضیلت سمجھتے ہوں لیکن بہت سے علماء ادب اسکو نقص اور عیب قرار دیں گے، اس لئے کہ جس تحریر سے قاری کو مصنف کے زمانے اور ماحول کا بھی پتہ نہ لگ سکے، اور نہ اس کے مصنف کا عقیدہ اور مذہب و مسلک اس کو معلوم ہو سکے اور نہ اسکی محبوب قدروں اور آئیڈیل شخصیتوں کا اسے علم ہو، نہ اس کی گرمجوشی اور قوت مدافعت کا اندازہ ہو، اور نہ اس تحریر سے حزن والم کی تلخ کامی اور مسرت و شادمانی کی حلاوت محسوس ہو تو وہ ایک مصنوعی اور بے جان تحریر ہے، وہ نہ کسی کے دل پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

حضرت مولاناؒ کی نظر میں ادب دعوت (أدب الدعوۃ) کو جملہ ادبی اصناف میں سب سے زیادہ

اہمیت حاصل ہے، آپ اگر مولانا کے مطالعہ قرآن وحدیث کا گہرائی سے جائزہ لیں تو اس میں ادب دعوت کا عنصر پوری طرح نمایاں نظر آئے گا،، ادب کی اس صنف کا اسلوب بھی قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے مستفاد ہے اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں آپ نے اسی کو اپنایا بھی ہے لہذا اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مولاناؒ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے ادب کی اس صنف کے دروازے کھولکر اسے ایک مستقل ترقی پذیر اعلیٰ ادبی صنف قرار دیا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، اس موضوع سے متعلق آپ کے آٹھ محاضرات بھی ہیں جن میں اس ادب کی رعنائی اور حسن وجمال بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے۔ آج کے مفکرین اور داعیوں کو، اس اسلوب کو اپنے دعوتی سفر میں ضرور اختیار کرنا چاہیئے، ان محاضرات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ادب دعوت کے مقصود اسلوب اور اس کے مطلوبہ طریقہ کار کی رہنمائی ملتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دعوت کی حکمت اور زمان ومکان کے ساتھ اس کی ہم آہنگی۔

(۲) سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے۔

(۳) سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت کا ایک اعلیٰ نمونہ۔

(۴) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی چند مثالیں اور اس کی نبوی حکمت۔

(۵) سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ۔

(۶) آل فرعون کے مرد مؤمن کی دعوت جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔

(۷) خاتم الرسل محمد ﷺ کی دعوت کے دو شاندار نمونے اور اس کی حکمت۔

(۸) حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی۔

مندرجہ بالا عناوین کی روشنی میں قاری اس نتیجہ تک پہونچ سکتا ہے کہ ادب دعوت جو کہ جملہ ادبی اصناف میں سب سے نازک اور مشکل صنف ہے، نفسیات وماحول، افکار ورجحانات اور اپنے حکیمانہ اسلوب کی رعایت کیوجہ سے وہ ایک ترقی پذیر ادبی صنف ہے، حضرت مولاناؒ سب سے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اس ادب کی تعیین کے مطابق اسے ایک زندہ اور پائندہ صنف کے حیثیت سے دنیا کے سامنے

پیش کیا ہے اور اس کے چار بنیادی عناصر کی تعیین کی ہے، وہ چار اہم عناصر یہ ہیں!

(۱) عقیدہ (۲) عاطفہ (۳) اخلاص (۴) صدق

اگر داعی اپنے کلام میں ان عناصر کو اختیار کرلے تو وہ لوگوں کے نہاں خانۂ دل تک پہونچ کر ان پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اسکا بھی شمار ان ادباء میں ہو سکتا ہے جنہوں نے ادب کو دعوت اسلامی کو دنیا میں عام کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم نے مذکورہ بالا اصناف کے علاوہ عربی زبان وادب کے دیگر اصناف کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول فرمائی، مثلاً شاعری، بچوں کا ادب، افسانے اور ناول وغیرہ، یہ وہ اصناف ہیں جن سے کوئی بھی داعی جو زبان وادب کو اپنے فنی وادبی ذوق کے ساتھ حق وباطل کے معرکہ میں ایک عظیم ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہو، کسی حال میں استغناء نہیں برت سکتا ہے۔

☆☆☆ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

مکتوب مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی بنام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مخدوم ومکرم ومعظم ومحترم جناب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت عالی مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی اس وقت قدر کی، جس وقت یہ ناچیز ناقدری کر رہا تھا، اور آپ نے اس وقت اس عمل کی طرف قدم اٹھایا جس وقت یہ حقیر اوس سے پہلو تہی کر رہا تھا، آپ سنتے تھے، تعمیل کرتے تھے، سمجھتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے، اور اس کام کے انہماک اور دعوت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت میں تاثیر دی، اضلاع متصلہ سے باہر یہ کام آپ کی ہی وساطت ودعوت سے پھیلا، اور علمی حلقہ میں آپ ہی کی وساطت سے یہ چیز پہنچی، علماء میں جماعتوں کو لے کر پھرنے کی طرف آپ ہی نے توجہ فرمائی۔ علمی حلقہ کی طرف اس دعوت کو لے کر آپ ہی بڑھے، علماء کی طبائع کا جائزہ حضرت مرحوم آپ کی ہی وساطت سے لیتے تھے، اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ آپ ہی کے ذریعہ فرماتے۔ غرض کہ حق تعالیٰ شانہ آپ کو نہایت ہی جزائے خیر عطا فرمائیں۔

والسلام

از۔ محمد یوسف

تاریخ دعوت و عزیمت

اسلامی تاریخ کا ایک عظیم شاہکار

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
استاذ جامعہ اسلامیہ بھٹکل (کرناٹک)

شیخ علی طنطاوی مرحوم شام میں عدالت عالیہ کے مشہور وکیل اور موجودہ زمانہ میں عالم عرب کے مایۂ ناز صاحب قلم تھے، ان سے ۱۹۷۵ء میں ریڈیو میں انٹرویو کے دوران ایک سوال کیا گیا کہ کس جگہ سے آپ کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں، سوال کرنے والے کو امید تھی کہ وہ اپنے وطن دمشق کا نام لیں گے، جب انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کا نام لیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اس نے تعجب سے پوچھا کہ لکھنؤ کہاں ہے تو شیخ طنطاوی نے کہا شیخ ابوالحسن علی ندوی کا شہر تو وہ فوراً سمجھ گیا، لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں حضرت مولانا کی بعض کتابوں کی شہرت خود ان کی ذات و شخصیت پر بھی حاوی و غالب ہو گئی ہے ان میں سرفہرست :-

مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر)

اور رِجَالُ الْفِكْرِ وَالدَّعْوَةِ (تاریخ دعوت و عزیمت) ہے، اگر بقول عرب علماء شیخ ندوی ہند کی طرف سے عالم عرب کیلئے ایک نایاب و قیمتی تحفہ ہیں تو مولانا کی طرف سے عالم اسلام کیلئے تاریخ دعوت و عزیمت ایک گرانقدر ہدیہ ہے۔

سابق صدر ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی زندگی کے مصروف ترین ایام قیام راج بھون در اشٹرپتی بھون کے تھے، سیاسی سرگرمیوں میں کسی شخص کیلئے خارجی مطالعہ اور وہ بھی ۲، ۴ روز میں ۳، ۴ سو صفحات کا انہماک کے ساتھ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، آخر تاریخ دعوت وعزیمت میں وہ کیا باتیں تھیں جس نے ۱۵ر جولائی ۱۹۶۳ء کو اس کتاب کو پڑھ کر صاحب کتاب کے نام ڈاکٹر صاحب کو اس طرح اپنا تاثر لکھنے پر مجبور کیا کہ :۔

محب محترم! مجھے آپکی اس کتاب نے بہت رُلایا، کن کا ذکر ہے اور کس کے قلم سے، اچھوں کا حال سن کر اپنی بُرائیاں کس وضاحت سے سامنے آتی ہیں اور کیسا کیسا رلاتی ہیں لیکن پھر تسکین بھی ہوئی، خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ کے قلم سے اس زمانہ میں جو تحریریں نکل رہی ہیں ان سب کا یہی حال ہے"۔

اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ حضرت مولانا کی ملت اسلامیہ کے لئے علمی و دینی خدمات میں سب سے بھاری پلڑا کس کتاب کا ہے، تو میں کہوں گا کہ ماذا خسر العالم کے بعد، نہیں اس کے برابر ہی تاریخ دعوت وعزیمت کا بھی۔

ایک سال قبل ۲۲ر مئی ۱۹۹۸ء کی شام میں نے خود حضرت مولانا سے جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں قیام کے دوران ایک مجلس میں سوال کیا کہ آپ کی ایک سو سے زائد علمی وتحقیقی تصنیفات میں خود آپ کیلئے وہ کون کون سی محبوب ترین کتابیں ہیں جن کو تحریر کرنے میں آپ کو زیادہ محنت کرنی پڑی اور جن کو آپ اپنے لئے مغفرت وتقرب الی اللہ کا وسیلہ خیال کرتے ہیں تو حضرت مولانا نے جن ۳، ۴ر کتابوں کا نام لیا اس میں خود یہ کتاب شامل تھی۔

آخر یہ تاریخ اسلامی کے کس گوشہ پر لکھی گئی کتاب ہے جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ مصنف کی چالیس سال سے بھی کم عمر میں لکھی جانے والی اس کتاب کا عربی ایڈیشن چند سال قبل دار القلم کویت کی طرف سے ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا، اور اس کے متعدد عربی، انگریزی اور اردو وغیرہ کے ایڈیشن سے مختلف افراد وادارے کروڑپتی بن گئے، لیکن خود صاحب کتاب

آج بھی تکیہ رائے بریلی کے اس کچے مکان میں رہتا ہے، جس کو بارش کے موسم میں سیلاب سے گھر جانے کا سب سے زیادہ خطرہ رہتا ہے، لیکن وہ دنیا کی نعمتوں سے بے نیاز زیر لب ہمیشہ اقبال مرحوم کے یہ اشعار گنگناتا رہتا ہے ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

اقبال کے یہ اشعار بھی مولانا کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں ؎

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دل نواز
بزم دم گفتگو گرم دم جستجو !
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز !

مولانا کا وہ کونسا ادیبانہ ہی نہیں، بلکہ ساحرانہ اسلوب ہے جو قطب زمانہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کو ۲۲ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ مصنف کے نام اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے کہ "آپ کی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت مجھے ایسی حالت میں ملی کہ میں لب گور تھا بیٹھنا مشکل، سننا مشکل، لیکن اسنے مجھے ایسا پکڑا کہ چھ سات روز میں پوری سن لی، آپ نے سلاسل کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے بہت مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ اس سے امت کو فائدہ پہنچائے آمین"۔

تو لیجئے خود صاحب کتاب سے مختصراً ان اسباب و محرکات کی تفصیل سن لیجئے، جس نے اس کو چالیس سال سے بھی کم عمر میں اس اہم موضوع پر اپنی پوری توجہ مبذول کرنے پر مجبور کیا حضرت مولانا اپنی خود نوشت سوانح حیات کاروان زندگی پہلی جلد صفحہ ۴۱۱ میں رقمطراز ہیں :۔

"عرصہ سے یہ احساس میرے دل میں چٹکیاں لیتا تھا اور اس کا تعلیم یافتہ اور دینی

جذبہ رکھنے والوں کے حلقہ میں بیٹھ کر تجربہ بھی ہو چکا تھا، کہ اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں گہرے اور لمبے شگاف ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی صدیوں کے بعد کچھ شخصیتیں ابھری ہیں، جنھوں نے بگڑے ہوئے حالات اور طاقتوں سے پنجہ آزمائی کی ورنہ عام طور پر سیل حوادث اور اقتدار وقت کے رجحان اور مذاق کے ساتھ بہنے والے علماء و مشائخ اور مصنفین و مفکرین نظر آتے ہیں، یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی یہ احساس شکست خوردگی دراصل اسلام کے طرز تالیف اور تربیت کا نقص ہے جو حکومتوں، سیاسی واقعات اور جنگوں کے گرد گھومتی ہے اور اس نے اسلام کی تاریخ تجدید و اصلاح کو مرتب اور علمی انداز میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی، مختصر الفاظ میں یہ تاریخ اسلام کا نقص نہیں، بلکہ تاریخ نویسی کا نقص ہے"۔

یہی وہ اسباب و محرکات تھے جس نے فوری اس طرف مولانا کو توجہ دینے پر مجبور کیا، حضرت مولانا نے اس کتاب میں دلائل و شواہد سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اسلام کی بقا و تسلسل کیلئے ہمیشہ غیبی انتظامات ہوئے اور اسلام کے قلب و جگر کو زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے جس تریاق کی امت کو ضرورت محسوس ہوئی وہ بروقت عطا کیا گیا، دوسری طرف مولانا نے تاریخ عالم کے اپنے وسیع مطالعہ سے اس بات کو بھی ثابت کیا کہ اسلام کے برخلاف دوسری امتوں میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی رہی، گویا اسلام کے علمی دفاع میں اس کتاب میں بھی مولانا نے حسب معمول مدافعانہ و معذرت خواہانہ اسلوب کے بجائے خود دارانہ بلکہ جارحانہ اسلوب

اختیار کیا ہے اور موجودہ عیسائیت، یہودیت اور بدھ مت وغیرہ سے اسلام کو اس معاملہ میں پورے دلائل کے ساتھ ممتاز و نمایاں ثابت کیا ہے۔

دراصل اسلام کے متعلق اس کے اندر اصلاحی خلاء کی غلط فہمی کے پائے جانے کی دو وجوہات تھیں، اول مغربی مستشرقین اور خود غیر مسلم مصنفین کا مسلسل وہ پروپیگنڈہ و تاثر جس سے جھوٹ بھی سچ معلوم ہونے لگے، کہ اسلام کی تجدیدی تاریخ میں گہرے شگاف پائے جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ خود مسلم مصنفین کی جانب سے جن کا عالمی تاریخ نویسی میں سب سے بڑا حصہ ہے (جس کیلئے صرف علامہ ابن عساکرؒ کی مثال کافی ہے جنھوں نے صرف دمشق کی تاریخ پر ۷۴ جلدیں یعنی کم و بیش ۲۵ ہزار صفحات لکھے) مسلم امت کے درمیان پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو دور کرنے پر سنجیدہ توجہ نہیں دی گئی، بلکہ صرف زبانی یا کسی کتاب میں سرسری اس کی تردید کی گئی، اس کے جواب میں دلائل و شواہد سے پہلی صدی سے اب تک کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا علمی انداز میں مرتب جائزہ نہیں لیا گیا، گویا یہ تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا خلا تھا، جس کو پُر کرنا اس امت کے لئے فرض کفایہ تھا، ملت اسلامیہ کی طرف سے یہ سعادت حضرت سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ کے ایک فرزند ارجمند کے مقدر میں تھی، جس کے جد امجد نے آج سے ڈیڑھ صدی قبل ملک میں ملت اسلامیہ کو درپیش سب سے بڑے خطرہ کا بالاکوٹ کے میدان میں خود اپنی جان کا پیش کر کے مقابلہ کیا تھا۔

اس اہم علمی و تحقیقی کام کے لئے حضرت مولانا نے صرف تاریخ عالم و تاریخ اسلام کا سرسری جائزہ نہیں لیا، بلکہ تاریخ کو اس مقصد کیلئے پھر ایک بار دوبارہ پڑھا، مذاہب و فرق اور علوم و فنون کا از سر نو جائزہ لیا، تراجم و تذکروں کی کتابوں کو کھنگالا، اس طرح اصلاحی تاریخ کی ترتیب کے ضمن میں مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط کی تاریخ بھی مرتب ہو گئی۔

تاریخ نویسی کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ کا یہی وہ تفرد ہے جس کو پاکستان کے مشہور سیارہ ڈائجسٹ نے اپنے مارچ ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں یوں بیان کیا تھا کہ مولانا ندوی ہمیشہ

عام ڈگر سے ہٹ کر موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں، برصغیر کے مشہور طنز نگار رشید احمد صدیقی نے بھی ۲۴ جنوری ۱۹۷۵ء کو صاحب کتاب کے نام ایک مکتوب میں کچھ اسی طرح لکھا تھا کہ مولانا آپ جن موضوعات سے بحث کرتے ہیں اس کی سطح اور انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قدیم کو جدید میں جس خوبی و خوبصورتی سے ڈھالتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

ملت کے مایۂ ناز سیرت نگار اور فخر ہند علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے سے کم عمر مصنف کو آج سے نصف صدی قبل ہی کچھ اس طرح خراج تحسین پیش کر چکے ہیں کہ آپکی کتابیں پڑھ کر آنکھیں پرآب ہو جاتی ہیں، آپ کا انداز بیان اور انشاء بھی دل پذیر ہے۔

مولانا مسعود عالم ندویؒ نے ایک دفعہ مصنف تاریخ دعوت وعزیمت کو لکھا کہ آپکی تحریر میں کیسی دلنوازی ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی۔

جامع ازہر کے پروفیسر ڈاکٹر یوسف موسیٰ جن کا خود عالم عرب کے چوٹی کے ادباء میں شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ میں نے شیخ ندوی کی بعض سیکڑوں صفحات پر مشتمل کتابیں ایک دن سے بھی کم میں ختم کی ہیں۔

مشہور امریکی نومسلمہ فاضلہ مریم جمیلہ نے جو سابق میں یہودیت کی ایک ممتاز اسرائیلی عالمہ تھیں، جب تاریخ دعوت وعزیمت کو پڑھا تو ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں مصنف کے نام ایک خط میں اپنے تاثرات کا کچھ یوں اظہار کیا کہ۔

"مولانا آپ نے موضوع کی وضاحت کا حق ادا کر دیا ہے اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، اس سے میں بہت متاثر ہوئی، میری ناقص رائے میں یہ آپکی بہترین تصنیف ہے جس کیلئے میں سراپا مدح وستائش ہوں، سچ تو یہ ہے کہ میرے نقطۂ نظر سے پوری کتاب بے حد حوصلہ آفریں ہے اور اس میں تاریخ اسلامی کے صحیح پس منظر میں صائب نظریات پیش کئے گئے ہیں، غرض یہ کہ میری نظر میں اس انداز سے اس موضوع پر پہلی دفعہ لکھا گیا ہے۔"

قطب زمانہ اور خود مصنفِ کتاب کے مرشدِ روحانی جن سے ان کو خلافت و اجازت بھی حاصل ہے اپنے ہر دلعزیز خلیفہ کے نام ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ تاریخ دعوت وعزیمت آپ کا بڑا کارنامہ ہے، کیا عرض کروں، ایسا ذوق معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ اندازہ ہمیں کو ہے، آپ کی کتاب سے سیری ہی نہیں ہوتی۔

مصلح امت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنھیں اپنے پاس آنے والے تمام لوگوں میں بقول خود ان کے سب سے زیادہ انسیت اس کتاب کے مصنف ہی سے تھی ۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ کو گورکھپور سے مولانا کے نام ایک خط میں کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ:۔ اس کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کے مضامین ارشادی یعنی الہامی ہیں، جس طرح میں بزرگوں کے اقوال سے اثناءِ گفتگو استدلال کرتا ہوں اسی طرح اس کتاب کے مضامین کو انشاء اللہ لوگوں کے سامنے پیش کرونگا۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو اس موضوع پر مولانا کے قلم اٹھانے سے سب سے زیادہ خوش تھے جب یہ کتاب پڑھی تو خوشی سے پھولے نہیں سمائے، اور فوراً مصنف کو مبارکبادی کا خط لکھا کہ "خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کے ذریعہ پوری ہوگی، مجھے تاریخ دعوت وعزیمت ملی، گم گشتہ چیز ہاتھ آگئی، پڑھ رہا ہوں اور جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی دفعہ مطالعہ سے استفادہ کرتا رہوں گا"۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور برصغیر کے مشہور مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم اس سلسلۂ تاریخ کی تدوین کے اتنے قدرداں تھے کہ شاید ہی کوئی انکی علمی مجلس اس کتاب کے تذکرہ سے خالی ہوتی، وہ اس کو معلومات افزاء دفتر کہتے تھے اور اس موضوع پر لکھی جانیوالی تمام کتابوں میں سند کا درجہ دیتے تھے۔

مولانا کوثر نیازی مرحوم سابق وزیر مذہبی امور پاکستان نے اپنے سفرنامہ "یہ ممکن نہ تھا کہ لکھنؤ جاکر ندوہ نہ جاؤں" میں اس کتاب کا کچھ یوں خراج تحسین پیش کیا ہے کہ اسلام کے مسلسل تجدیدی کارناموں پر اس کتاب میں جو لاجواب تذکرہ مولانا نے قلمبند کیا ہے، ہمارے پورے

اسلامی لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

علی گڑھ کے سابق پروفیسر وصی احمد صدیقی کے تاثرات بھی اس کتاب سے متعلق سننے سے تعلق رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا نے اس کتاب میں تاریخ کے خاکستر میں دبے ہوئے انگاروں کو کرید کر نکالا ہے اور پھونک پھونک کر روشن کیا ہے، اس طرح کہ زمین کے یہ ستارے اپنی چمک سے آسمان کے تاروں سے کہیں زیادہ منور نظر آتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر ایک بیتاب خواہش دلمیں پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش! ماضی کے دور دراز سائے مستقبل کا آئینہ ہو جائیں"۔

دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کے بانی ڈاکٹر مصطفےٰ سباعیؒ نے اس کتاب کے عربی ایڈیشن کے مقدمہ میں اپنا ذاتی تاثر کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:۔

یہ کتاب اسلامی تاریخ کے اس اہم خلا کو پر کرتی ہے جس کی ضرورت زمانہ سے شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی اس سے شیخ ندوی کی گہری اسلامی فکر، وسیع مطالعہ، خالص دینی رجحان اور اسلام کی صاف شفاف روح سے ان کی گہری مناسبت کا غیر معمولی اندازہ ہوتا ہے"۔

کچھ انگریزی اخبارات کے تاثرات بھی اس کتاب سے متعلق سماعت فرمائیے:۔

IMPACT INTERNATIONAL لندن کا مشہور اخبار اس کے انگریزی ایڈیشن کو پڑھ کر اپنے شمارہ نمبر ۲ اور جلد نمبر ۱۷ میں یہ گواہی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تاریخ دعوت عزیمت ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے اسلام کے متعلق اس کے ماننے والوں میں ایک ایسی امنگ پیدا ہوتی ہے جس کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔

اپنے ہی ملک میں مدراس سے نکلنے والے مشہور اخبار CRESCENT ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جس اہم موضوع پر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے

(بقیہ صفحہ ۴۲۰ پر ملاحظہ ہو)

"منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین"

ایک اجمالی تبصرہ

مولانا عبد القیوم قاسمی
استاذ مدرسہ رحمانیہ پسائی، سنت کبیر نگر (یوپی)

قدرتی نظام کے تحت ہر دور میں ایسی شخصیات عالم وجود میں آتی رہیں جنھوں نے پوری انسانیت کو اپنی بے پناہ دینی خدمات، علمی قابلیت اور محیر العقول کارناموں سے روشناس کرایا، انھیں نابغۂ روزگار ہستیوں میں ایک ممتاز ہستی حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی تھی، جنھوں نے زندگی کے بیشتر شعبوں میں اسلامی تعلیمات کو جس خصوصی اندازِ فکر کے ساتھ پیش کیا وہ ایک ہمہ گیر اور بڑا کارنامہ ہے۔

حضرت علی میاں ندویؒ اپنے وقت میں عالمِ اسلام کی آبرو تھے، آپ کا نام سنتے ہی ہر شخص اپنے دل میں بے پناہ عقیدت ومحبت محسوس کرنے لگتا، آپ کی شخصیت ایسی دلنواز پرسوز اور پرکشش تھی کہ ہر شخص ان کو اپنا تسلیم کرتا تھا، اپنی ذات میں آپ ایک انجمن تھے، علم وفن، تحقیق وتدقیق، زہد واستغناء اور تقویٰ وطہارت میں اکابر واسلاف کی یادگار تھے، حضرت کی خصوصیات وکمالات کو کسی ایک مضمون میں بیان کرنا مشکل ترین کام ہے، یہاں صرف آپکی ایک تصنیف کی روشنی میں مختصر سا تعارف پیش کرنا مقصود ہے، جس کی ایک ایک تحریر

آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، اس کا ایک ایک موتی سلاست و روانی اور الفاظ کی فراوانی کا شاہکار ہے۔

۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء کی بات ہے، مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کا حضرت مولانا کے نام پیغام آیا، جس میں انھوں نے عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے طلبہ کے سامنے حضرت مولانا کو عربی مقالات پیش کرنے کیلئے ایک خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا تھا، موصوف نے اپنے خطبات و محاضرات کا موضوع "النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن" منتخب کیا۔

مفکر اسلام نے ان خطبات کا اکثر حصہ رمضان ۱۳۸۲ھ جنوری ۱۹۶۳ء میں اپنے چھوٹے سے گاؤں "دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی معروف بہ تکیہ کلاں" میں لکھا، جہاں دور دور تک کوئی کتب خانہ موجود نہیں تھا، اس لئے قدرتاً ان خطبات کیلئے قرآن کریم کو اساس بنایا، اگر کسی خاص ماخذ کی ضرورت ہوتی، یا کسی خیال کی وضاحت اور کسی قول کی تائید مقصود ہوتی تو ندوہ کے وسیع کتب خانہ سے مدد لیجاتی، اس طرح یہ چند خطبات تیار ہوئے جو الگ الگ عنوان سے لکھے گئے اور بعد میں ان میں معمولی اضافہ بھی کیا گیا۔

شوال ۱۳۸۲ھ۔ فروری ۱۹۶۳ء میں مدینہ منورہ حاضری ہوئی، خطبات کا سلسلہ ذوالقعدہ ۱۳۸۲ھ مارچ ۱۹۶۳ء میں شروع ہوا، خطبات ہفتہ میں دو بار یونیورسٹی کے لیکچر ہال میں پڑھے جاتے تھے، افتتاحی خطبات شیخ عطیہ محمد سالم مدیر تعلیمات مدینہ یونیورسٹی کا ہوتا اور تبصرہ واظہار خیال شیخ عبدالعزیز بن باز فرماتے تھے، سامعین میں طلبہ کے علاوہ جامعہ کے اساتذہ اور شہر کے معززین کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی۔

اوّلاً کل چھ خطبات تیار ہوئے:۔

۱۔ پہلا خطبہ! نبوت:۔ "انسانیت کو اس کی ضرورت اور تمدن پر اس کا احسان"

شروع میں گرانقدر تمہیدی گذارشات ہیں، اس کے بعد نبوت کے تعلق سے ادب و حکمت اور شخصیات کی قرآن کی روشنی میں ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جس سے زیادہ خوبصورت اسلوب نہیں ہوسکتا جس میں قرآن اپنی بلاغت کے انداز میں ان شخصیات کو عقلی، اخلاقی اور عملی

صلاحیتوں کا حامل قرار دیتا ہے، ظاہر ہے کہ انبیائے کرام خلاصۂ مخلوقات، انسانیت کے کامل نمونے اور ان کے باہمت افراد ہیں۔

آگے چل کر "نبوت کی حکیمانہ تمثیل"۔ "انبیاء کی تعلیمات سے بے نیازی کا انجام"۔ "انبیاء کے علوم اور دوسروں کے علوم کا تقابل" اور اس طرح کے متعدد عناوین کے ذریعہ ان کی بالاتری، امت کے حق میں ان کی سرگرمیاں، ان کے فرائضِ منصبی اور ان کے حقیقی پیغامات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۲ دوسرا خطبہ! انبیاء کرامؑ کی امتیازی خصوصیات، مزاج و منہاج"

اس میں نبوت کے خصوصی مزاج اور اس کے حاملین کے بنیادی امتیازات کو مؤثر اور بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جس سے یہ طبقہ انسانی طبقات کے دوسرے مفکرین و مصلحین سے ممتاز نظر آتا ہے۔

خود ساختہ اسلوب، مصنوعی انداز، نئی تنظیم کے طریقۂ کار اور جدید اصولوں نے مقام نبوت کے فہم و ادراک پر بڑا ظلم کیا ہے، ان کا اندازِ فکر اور زاویہ نگاہ بجائے خود قابل ذکر ہے، لیکن وہ اس سے ہٹ کر نبوت کے اعلیٰ مقام کا صحیح تصور نہیں پیش کرتے، وہ اپنے ذہن کو ایسے راستے کی جانب موڑتے ہیں جو نبوت کے مزاج و منہاج سے ادنیٰ مطابقت نہیں رکھتا۔

اس سلسلہ میں مفکر اسلام نے انبیاء اور دوسرے رہنماؤں کا بنیادی فرق، انبیائے کرام کی دعوت میں حکمت و تیسیر ان کی دعوت کا سب سے اہم رکن توحید اور عقیدۂ آخرت کو نہایت اچھوتے اور نفسیاتی انداز میں واضح فرمایا ہے۔

۳ تیسرا خطبہ! "ہدایت کے امام اور انسانیت کے قائد"

دنیا میں ہمیشہ خود ساختہ رہنماؤں کی ایک طویل تاریخ رہی ہے، جنھوں نے قوموں کو اپنے تجربات کا نشانہ اور قیادت و سیادت کا ذریعہ بنایا، ان قائدین کی کوتاہ نظری، نفس پرستی اور قومی عصبیت نے انسانیت کے سر پر طویل بدبختی لاد دی اور مشرق و مغرب میں آج بھی

خاصی تعداد انھیں طالع آزما اور ستم ظریف قائدین کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہی ہے، ان ناکام تجربوں اور غلط نتائج کی زد سے عقائد و ایمانیات بھی محفوظ نہیں رہتے، اسلئے ایسے قائدین کی ضرورت ہوئی جو ایک طرف امانت دار اور خیر خواہ ہوں تو دوسری طرف نفع اندوزی اور مادی معاوضہ کی خواہشات سے بری ہوں۔

اسی تعلق سے انبیائے کرام کی امانتداری اور اخلاص، عصمت انبیاء کی حقیقت، خاص تہذیب اور طرز حیات کی طرف رہنمائی، ان سے جذبۂ محبت اور فنائیت جیسے اہم موضوعات کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں پیش فرمایا ہے جو پُر مغز اور ہمہ گیر تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

۴ چوتھا خطبہ! "ارادۂ الٰہی اور اسباب مادی"

قرآن سے گہری واقفیت رکھنے والا یہ دیکھتا ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت ہمیشہ بڑے تاریک اور مخالف ماحول میں ہوتی رہی۔ مادی اسباب کے لحاظ سے وہ کمزور اور بے سروسامان تھے ان کا سرمایہ وہ مضبوط عقیدہ اور ایمان ہے جس میں کامل اخلاص کے علاوہ طمع و نفاق کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہوتی۔

اس سلسلہ میں مصنف نے قرآنی واقعات کی روشنی میں انبیاء کے وہ حالات پیش کئے ہیں جن سے حق کی قوت اور اس کے بقا کی صلاحیت، باطل کی کمزوری اور اس کی سست رفتاری کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

یہ قصے صرف تاریخی نہیں بلکہ ذکر و موعظت، ترغیب و ترہیب، دعوت و ارشاد اور تقویت و تشجیع کی مثالی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے تنگ اور محدود مادی ذہنیت کو چیلنج کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کا قصہ اپنی ندرت و غرابت، حوادث کے متعین طبعی اسباب اور علت و معلول کے عام قانون کی کارفرمائی کے خلاف ایک تاریخی شہادت پیش کرتا ہے جس سے سیرت نبویؐ کے ساتھ گہری مماثلت کی نشاندھی ہوتی ہے۔

۵ پانچواں خطبہ! "رسالتِ محمدی کی عظمت" ـــــ عصر جاہلیت میں فسق و فجور، ظلم

وسرکشی، حقوق کی پامالی اور ظالم حکمرانی اگرچہ غالب تھی اور قابل افسوس تھی، لیکن جاہلیت کا یہ کوئی حقیقی المیہ نہیں، بلکہ حقیقی المیہ یہ تھا کہ علم صحیح، نیک نیتی، حق کیلئے سینہ سپر ہونے اور باطل سے پنجہ آزمائی کرنیوالی جماعت اس وقت کی وسیع وعریض دنیا میں کہیں پائی نہیں جاتی تھی، یہ المیہ اس حقانی گروہ کی نایابی کا تھا جو شر کی طاقتوں سے نبرد آزما ہو کر خیر کی بنیادوں پر ایک عالمِ نو کی تعمیر کر سکے، اور وہ المیہ اس عقیدۂ صحیح اور تصورِ حقیقی کی کمیابی کا تھا جس سے نشأۃِ ثانیہ کا آغاز ہو سکے، تاکہ بت پرستی اور خدا بیزاری کا پردہ چاک ہو سکے۔

اس نسبت سے مصنف نے "آفتابِ عالمتاب کی ضرورت"۔ "بعثتِ محمدی کی انقلابی تاثیر" "ایک عالمِ نو کا ظہور"۔ "امت محمدیہ ایک عظیم معجزہ" اور اس طرح کے دوسرے گرانقدر اور پُرمغز علمی مباحث کے ذریعہ رسالتِ محمدی کی عظمت ظاہر کی ہے۔

۶ چھٹا خطبہ ا "نبوتِ محمدی کا کارنامہ"

حقیقی انسانیت ہر گمشدہ چیز کی نعم البدل، ہر محرومی کی تلافی ہر خستہ حالی کا درماں ہے، انسان اپنے جوشِ عمل، قوتِ ارادی اور جد وجہد سے دنیا کو وہ تمام چیزیں مہیا کر سکتا ہے جسکو دُنیا کھو چکی ہے، کیونکہ دنیا کا مقدر انسان کے مقدّر سے وابستہ ہے اور دنیا انسان ہی کیلئے بنائی گئی ہے، اس کی قدر ومنزلت اسی کے سبب سے ہے۔

انسانی فطرت کے امکانات، اسکی مخفی صلاحیت، ذہنی افق کی وسعت، بلند پروازی، گہرائی وگیرائی اور اس کی عالی ظرفی کا اگر دنیا کے اسرار وعجائب سے مقابلہ کیا جائے تو یہ وسیع کائنات اس کے سامنے ایسے معلوم ہوگی جیسے سمندر کے آگے قطرہ، اور صحرا کے مقابل ذرّہ، انسان کے مضبوط اور غیر متزلزل ایمان کے سامنے پہاڑ ہیچ ہے اور اسکی محبت کے بھڑکتے شعلوں کے سامنے آگ سرد ہے، اگر انسانی اخلاق کے حسن اور اس کے جذبات کی لطافت کو آشکارا کیا جائے تو عالم کی تمام رنگینیاں اور دلفریبیاں ختم ہوتی نظر آئیں گی، خلّاق عالم کی یہ عظیم ترین نشانی ہے جو اس نے انسان کو بہترین صورت، مکمّل سیرت اور عمدہ ترین ساخت عطا فرمائی

گھٹے اگر تو اک مشت خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سمانہ سکے!

جب انسانی ساخت میں کجی اور اس کی تہذیب میں فساد پیدا ہو جاتا ہے، تو اس کے سدھار کیلئے انبیاءؑ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، پھر وہ ایسا منظر پیش کرتے ہیں جس کو آنکھ کی تاریخ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا، جس کے نتیجہ میں انسانیت ایک مضبوط ملت و جماعت بن کر ابھرتی ہے، یہی نبوت کا بڑا کارنامہ اور عظیم معجزہ ہے، انبیاء میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردم سازی اور آدم گری کا کام اس سطح سے شروع کیا جہاں سے کسی نبی کو نہیں کرنا پڑا تھا، اور اس سطح پر پہونچایا جہاں تک کسی نبی کا عمل نہیں پہونچا تھا،

اس کے تحت مصنف نے بڑے دلکش اور عجیب انداز میں اسکے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جس کا ایک ایک جملہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، اور اس خطبہ کا آخری حصہ انتہائی سبق آموز اور بڑا فکر انگیز ہے۔

خطبات کا یہ سلسلہ چھٹے خطبہ پر ختم ہو چکا تھا، لیکن حضرت مولانا کے بقول موضوع کا مزاج اور وقت کی ضرورت کا تقاضا یہ ہوا کہ خطبات کا یہ سلسلہ آگے چل کر "ختم نبوت" کے موضوع پر اختتام پذیر ہو، اس طرح ساتواں اور آٹھواں خطبہ "ختمِ نبوت" پر لکھا گیا، جو سب سے نازک اور مشکل ترین مرحلہ سے گزرا ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں:۔

"اس موضوع پر قلم اس وقت اٹھایا گیا جب قادیانیت کے مسئلہ نے ۱۹۷۴ء کے وسط میں ایک بار پھر پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور قادیانی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے اعلان نے ایک بار پھر اس سوال کو زندہ کر دیا کہ عقیدۂ ختم نبوت کی اسلام میں اتنی اہمیت کیوں ہے؟ اس سوال کا مدلل طریقہ پر جواب دینا اس طرح قلب و دماغ پر مستولی ہوا کہ مصنف ایک طویل عرصہ تک کوئی دوسرا علمی و تحقیقی کام نہ کر سکا اور اس کے مطالعہ اور غور و خوض کے نتیجہ میں وہ مضمون تیار ہوا جو اس سلسلہ کی آخری کڑی اور کتاب کا آخری مضمون ثابت ہوا

جس پر صحیح معنیٰ میں کتاب کی تکمیل ہوتی ہے"۔

اس پس منظر سے موضوع کی نزاکت واہمیت اور اس کی تیاری میں مصنف کی دلسوزی اور بیدار مغزی کا بخوبی پتہ چلتا ہے، اور اسکے ساتھ ان کی غیرت اسلامی کا بیّن ثبوت بھی ملتا ہے۔

اس خطبہ میں ختم نبوت پر عقلی ونقلی دلائل کا بالاستیعاب جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد تاقیامت آپکی سیرت وحیات کو امت کیلئے قابل تقلید نمونہ بتلایا گیا ہے، پھر اگلے مذاہب اور دوسری آسمانی کتابوں کے ذریعہ پہلے سے چلے آرہے طالع آزما اور نفس پرست نبوّت کے دعویداروں کا پردہ چاک کیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری خطبہ "ختم نبوت" کے موضوع پر ایک جامع دستاویز اور تاریخ ساز کارنامہ ہے۔

قارئین! مفکر اسلام مصنّف عالی مقام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، وہ عالم فنا سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے، لیکن انکی بلند پرواز روح، ان کے نقوشِ حیات اور ان کے آثارِ زندگی ہم سے بہ زبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ تم بھی اپنے اندر جوہر پیدا کرو، اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اور اپنے بلند عزم وحوصلہ کو اجاگر کرو اور دربارِ عالی سے آہِ سحر گاہی کی سوغات حاصل کرو۔

عطّار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

آج ہم میں ساز کی کمی نہیں، بلکہ اس سوز کی کمی ہے جس میں ہمارے اسلاف کی زندگی گزری ہے، جس سے انھوں نے مقام بلند حاصل کیا۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

آج مفکر اسلامؒ اپنی تمامتر خوبیوں اور خصوصیات کے ساتھ عدم کی آغوش میں محوِ خواب ہیں، جب تک اس روئے زمین پر زندگی کی رونقیں باقی رہیں گی، اور بساطِ حیات پر جب

(بقیہ صفحہ ۴۹۲ پر)

حضرت مولانا کی تصانیف پر ایک نظر

از: جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

ندوۃ العلماء کے ناظم، دارالمصنفین کی روح رواں، ہندوستان کے جید عالم، عربی اور اردو کے دلنواز ادیب وانشاء پرداز، عالم اسلام کے نامور مصنف اور خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس سال شاہ فیصل ایوارڈ ملا ہے، جو اسلامی ممالک کا گویا نوبل پرائز ہے۔

سعودی عرب کے سابق فرمانروا شاہ فیصل شہیدؒ پر دنیا کے مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے، وہ اپنی اسلامی حمیت اور غیرت کے لحاظ سے فخر اسلام تھے، ان ہی کی یاد میں یہ ایوارڈ قائم ہوا ہے، اسکا پہلا ایوارڈ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو دیا گیا، دوسرا جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ملا، جس سے نہ صرف ان کی ذات گرامی، بلکہ ہندوستان کے نام کو بھی اسلامی ممالک میں فضیلت حاصل ہوئی، اب تک ہندوستان کی تین جلیل القدر شخصیتوں کو نوبل پرائز بھی مل چکے ہیں، سر رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کے شعری اور ادبی کارنامے، سر سی، وی رمن کو ان کی سائنسی تحقیقات اور ابھی مدر ٹریسا کو ان کی انسانی ہمدردی وخدمات پر اس انعام سے نوازا گیا، ہندوستان کو ان تینوں شخصیتوں پر فخر ہے، تو اب اس کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قابل قدر ہستی پر بھی ناز ہے کہ شاہ فیصل ایوارڈ سے ان کے علم وفضل کا اعتراف اسلامی دنیا میں کیا گیا۔

وہ اس وقت نہ صرف علم کی آبرو ہیں بلکہ اپنی گوناگوں ذاتی خوبیوں کی وجہ سے عطر مجموعہ ہیں۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، پاک دل اور پاکباز ع :-

ان کی ادا دلفریب، ان کی نگہ دل نواز!

وہ اپنی گفتار کی شان اور کردار کی آن میں ان بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو دین کے برہان رہے ہیں، وہ ایام کے مرکب کبھی نہیں بنے بلکہ اس کے راکب بن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

وہ بڑے اچھے خطیب اور بڑے اچھے اہل قلم بھی ہیں، اُردو میں بولنے کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صداقت، عدالت اور پیام انسانیت کا درس دے کر اپنے سامعین کو دنیا کی امامت کیلئے تیار کر رہے ہیں، عربی میں بولتے ہیں تو اپنے مغلوب گمان حاضرین کے دل میں یہ یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ محبت کی زبان، معمارِ جہان اور دنیا کی عزت و ناموس کے پاسبان ہیں، ان کی ان کی تقریریں قلمبند کر دی جاتی ہیں تو ان میں دلنشیں تحریروں کی لذت ملتی ہے اور پھر انکی بعض تحریریں ایسی بھی ہیں جن کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دلپذیر تقریر سامعہ نواز ہو رہی ہے، ان کا شمار اس وقت اسلامی ممالک کے ممتاز ترین خطیبوں میں ہوتا ہے۔

ان کے قلم کی گل فشانیاں بہت سی کتابوں میں ظاہر ہو چکی ہیں، ان میں نغمۂ عشرت بھی ہے اور نالۂ ماتم بھی ہے سرمایۂ گداز بھی ہے اور نوائے درد بھی، وہ جب کوئی چیز اردو میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ اثر طاری ہوتا ہے کہ وہ اس کے ضمیرِ لالہ میں چراغ آرزو روشن کر رہے ہیں، عربی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حدیثِ سوز و سازِ زندگی بیان کر رہے ہیں، شام کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے لکھا ہے کہ وہ انکی عربی نثر میں کھویا ہوا نغمہ پاتے ہیں اور بے ردیف و قافیہ کی شاعری بھی۔

ان کی شہرت "سیرتِ سیّد احمد شہیدؒ" سے پھیلی، جس میں یہ پیام ہے کہ دنیا میں ثباتِ زندگی ایمانِ محکم ہی سے ہے اور ایک راسخ مسلمان تند رو بن کر کس طرح کوہ و بیاباں سے گذر سکتا ہے اور بقول استاذی المحترم مولانا سیّد سلیمان ندویؒ یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھوں میں رُشد و ہدایت

اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ ہے۔ انھوں نے اس کا عطر کھینچ کر عربی ممالک کیلئے عربی میں بھی "إِذَا هَبَّتْ رِيحُ الْإِيمَانِ" کے نام سے پیش کیا جو اردو میں "جب ایمان کی بہار آئی" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

ان کا رسالہ "مذہب و تمدن" وہ مقالہ ہے جو ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک منتخب جلسہ میں پڑھا گیا اس میں انھوں نے اس وقت اپنے سامعین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو ان کو موجودہ مادی تمدن کے دریا کے رُخ کے خلاف تیرنا پڑے گا، بلکہ اس کا رخ بھی پھیرنا ہوگا، ان کو اپنے افکار و خیالات اور رسوم و عادات کی سب سے پہلے قربانی دینی ہوگی جو مادی تمدن اور نظام حیات میں رہنے کی وجہ سے ان کی زندگی کا جزء بن گئی ہیں یہی پیام وہ اپنی پوری زندگی میں دیتے رہے ہیں۔

عربی میں انکی ایک اہم تصنیف "مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِينَ" ہے جس کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" ہے، اس میں انھوں نے بڑی دلسوزی اور جگر کاوی سے اس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں میں جب حاسۂ مذہبی اور خدا طلبی کا عالمگیر فقدان ہوا اور وہ دنیا طلبی کے بحران میں مبتلا ہوئے تو پھر ان کی بے حمیتی، پست خیالی اور تن آسانی سے زوال آیا، مگر وہ یہ بھی پیام دیتے ہیں کہ ان کی خاکستر میں اب بھی شرار آرزو ہے وہ خواب گراں سے اٹھ کر اپنے اشک صبح گاہی سے وضو کریں تو اب بھی ناموس ازل کے امین بن کر معمار جہاں بن سکتے ہیں، یہی صدا ان کے دل سے برابر اٹھتی رہی۔

ان کی کتاب "مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت" میں اس دعوت و تبلیغ کے علمی اصول اور اس تبلیغ کے عملی آئین کا ولولہ انگیز تذکرہ ہے جس سے نام کے مسلمان کام کے مسلمان اور قومی مسلمان اصلی مسلمان بن سکتے ہیں، ۱۹۵۰ء میں مصر، سوڈان، شام اور فلسطین کے سفر پر گئے تو انھوں نے عربی میں اپنا سفرنامہ "مُذَكَّرَاتُ سَائِحٍ فِي الشَّرْقِ الْعَرَبِيِّ" کے نام سے لکھا، جس کو جماعۃ الازہر للتالیف والترجمۃ والنشر نے شائع کیا اردو میں مزید اضافہ کے ساتھ یہ

"شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے چھپا ہے، اس سفر میں وہ اسلامی تحریکات کے داعیوں مصلحوں مفتیوں، تعلیمی اداروں کے استادوں، طالبعلموں اور حکومتوں کے عہدیداروں سب ہی سے ملے، وہاں کی علمی مجلسوں میں جو تقریریں کیں جو مضامین پڑھے یا وہاں کے لوگوں سے جو باتیں کیں، ان سب میں ان کے سوز دل کی وہی چنگاریاں ہیں جو ان کے دل میں برابر بھڑکتی رہتی ہیں انکے دو اور سفرنامے "دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں" اور "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" ہیں، ان میں بھی ان ممالک کی ذہنی اور روحانی کشمکش کا محاسبہ ہے، وہ دارالعلوم دیوبند میں ایک مقالہ پڑھنے کیلئے مدعو کئے گئے تو انھوں نے اپنے مقالہ "ظالمانِ علوم نبوت کا مقام" میں دور جدید کے فتنوں کی طرف توجہ دلا کر، ان کو یہ پیغام دیا کہ نئے ماحول کی ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست کھا جانا مردوں کا کام نہیں، یہ ایک مدرسانہ کی صورت میں بھی شائع ہوا،

اسی زمانہ میں انھوں نے یوپی کے مختلف شہروں میں تقریریں کیں، جن میں یہ بتایا کہ دنیا پر خود غرضی اور بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، اسے چادروں سے نہیں روکا جا سکتا، مگر ہم اپنے کو اس طرح سنوار سکتے ہیں کہ ہم انسانیت کا درد محسوس کریں اور اپنے بلک کو ایک نمونہ کا ملک بنا دیں، جس میں ایمان، یقین، اخلاق، ہمدردی، اور ایثار کی فضا ہو، ان تقریروں کا مجموعہ "پیام انسانیت" کے نام سے طبع ہوا اور یہ پیام ان کی رگِ جاں بن گیا۔

ان کی "تاریخ دعوت وعزیمت" میں ان کے قلم کی روانی اور تحریر کی رعنائی سے ان کے ایمانی جوش کی ولولہ انگیزی کچھ اس طرح نمایاں ہوئی ہے کہ اس کی تین جلدیں جہاد زندگانی میں مردوں کیلئے شمشیریں ہیں، ان کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی ہو گئے ہیں۔

انھوں نے تذکرۂ "مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ" میں ایسی دوکان سجائی، جہاں سے جذب وشوق اور درد ومحبت کا سودا مل سکتا ہے۔

دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں عربی میں ایک مضمون "رِدَّۃٌ جَدِیْدَۃٌ" لکھ کر اسلامی ممالک کے لوگوں کی توجہ اس ذہنی ارتداد کی طرف دلائی جو یورپ کی لادینی سیاست اور مادی تمدن

کی تاخت کے پیچھے آرہا ہے، اس کے مقابلہ کرنیکی کوشش کو مقدس ترین جہاد قرار دیا اس کا اردو ترجمہ "نیاطوفان" کے نام سے شائع ہوا پھر عربی میں "القادیانی والقادیانیۃ" اور اردو میں "قادیانیت" لکھ کر اس کو محض ایک مذہبی جسارت و جدت اور نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیا، یہ کتاب قادیانیوں کے سروں پر ایک خنجر بن کر لٹکی، "ہندوستانی مسلمان" ان عربی تقریروں کا مجموعہ ہے جو عرب ممالک کیلئے "آل انڈیا ریڈیو" سے نشر کی گئیں، یہ عربی تقریریں المسلمون میں بھی شائع ہوتی رہیں اور مزید اضافہ کے ساتھ اردو میں بھی شائع ہوئیں، اس سے ہندوستان کے تمدن و تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

ان کی "سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ" میں اخلاص، عشق الٰہی، استقامت علی الشریعت، تاثیر صحبت، اصلاح وارشاد کی شمع فروزاں ہے، بڑے دردِ دل کے ساتھ عربی میں "مَوْقِفُ الْعَالَمِ الْإِسْلَامِيِّ تجاهَ الحَضَارَةِ الغَرْبِيَّةِ" لکھی جو اردو میں "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کے نام سے طبع ہوئی اس میں اس کا اظہار ہے کہ تجدد و مغربیت کے اثر سے اسلامی ممالک کے عوام و خواص میں اخلاقی کینسر پیدا ہو رہا ہے، مگر اس کا علاج یہ ہے کہ اگر ان میں طاقتور ایمانی جذبہ، اللہ کے نام پر اتباع و انقیاد کا ولولہ اور اخلاص پیدا ہو جائے، تو وہ نبی خاتمؐ کی خیر الامت کی حیثیت سے موجودہ دور کی انسانیت کی آخری آس بن سکتے ہیں۔

عربی میں ان کی ایک اہم تصنیف "النبوۃ والانبیاءُ فِی ضَوءِ القرآن" بھی ہے جس کا اُردو ترجمہ "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" ہے، اس میں انسانی زندگی اور تمدن پر انبیاءِ کرام کے احسانات دکھائے گئے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً لندن، لیڈسن برلن، جینوا اور اندلس کے سفر پر بھی گئے، وہاں کی یونیورسٹیوں اور علمی مجلسوں میں عربی میں تقریریں کیں، مضامین پڑھے، ان سب میں یہ پیام تھا کہ یورپ کے مسلمان طلبہ وہاں کے تمدن سے متاثر نہ ہوں کیونکہ اس کا ظاہر روشن ہے اور باطن تاریک ہے، وہ اس سرزمین میں داعی، بنکر رہیں، اسلام کی ابدیت پر پورا اعتماد رکھکر مغرب و مشرق کے درمیان نئی نہر سوئز تعمیر کرنے کے خیال سے

اپنے وطن کو واپس جائیں، اردو میں یہ مجموعہ کچھ اضافہ کے ساتھ "مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں" کے نام سے شائع ہوا۔

"الطَّرِیْقُ اِلَی الْمَدِیْنَۃ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر سرشارانہ انداز کی تقریریں اور تحریریں ہیں، اس کا اردو ترجمہ "کاروانِ مدینہ" کے نام سے چھپا پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا، ۱۹۶۷ء میں یہودیوں سے عربوں کو جو شرمناک شکست ہوئی، تو مولانا کی اسلامی غیرت بروئے کار آئی، اس المیہ پر کویت اور مکہ معظمہ میں بڑی دردانگیز تقریریں کیں، مضامین لکھے، مصر کے صدر جمال ناصر پر بڑی جرأتمندانہ تنقیدیں کیں، ان کا مجموعہ کویت سے "اَلْمُسْلِمُوْنَ وَقَضِیَّۃُ فِلَسْطِیْن" کے نام سے شائع ہوا، اضافہ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ "عالم عربی کا المیہ" کے عنوان سے چھپا، اس میں بڑی بے باکی، لیکن بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلائی گئی کہ عربوں کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی این الوقتی، جھوٹے معیار کے سامنے سپراندازی، باصرہ اور سامعہ کی لطف اندوزی کی بدولت یہ رسوا کن ہزیمت ہوئی، اس جائزہ سے عربوں کی غیرت پر ضرب کاری لگی۔

مولانا بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیحد متأثر ہوتے ان کی باتوں کی سوغات ہند و عرب کے دوستوں کے سامنے پیش کرتے، پھر ان کی اٹھائیس مجلسوں کے ملفوظات کو اپنے ایک پرمغز مقدمہ کے ساتھ "صحبتے با اہلِ دل" کے نام سے مرتب کیا تو یہ عرفانیات کا ایک گلدستہ بن گیا۔

مولانا کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحیؒ اپنے دور میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے بھی بلند تر پایہ کے مصنف اور عالم تھے، ان کی یادوں کی جوت "حیاتِ عبدالحیؒ" میں اس طرح جگائی ہے کہ ان کے حقیقی اعماق اور آفاق سامنے آجاتے ہیں۔

اقبال پر بھی عربی میں "رَوَائِعُ اِقْبَالْ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اقبال کے پیام عشق الٰہی اور عشقِ رسولؐ سے خود بیخود نظر آتے ہیں اور اپنے ناظرین کو بے خود بنانا چاہتے ہیں

عرب ممالک میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سمجھے گئے، اس کا اُردو ترجمہ "نقوشِ اقبال" کے نام سے ہوا، انگریزی میں بھی یہ ترجمہ کی گئی۔

"الصِّرَاعُ بَيْنَ الْمَادِيَّةِ وَالرُّوحَانِيَّةِ" کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھ کر یہ بتایا ہے کہ اگر سورۂ کہف کے مضامین کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اس میں عہد حاضر کی مادی تہذیب کی طلسم سازی اور باطل آرائی کے زہر کا تریاق مل جائے گا، اس کا اُردو ترجمہ "ایمان اور مادیت" کے نام سے ہوا۔

انھوں نے عربی میں "الْأَرْكَانُ الْأَرْبَعَةُ" لکھ کر نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دینی اور روحانی حکمتوں اور ان کی مطلوب کیفیتوں کی تشریح ایسی ادبی خوبیوں کے ساتھ کی کہ یہ جدید حجۃ اللہ البالغہ کہلائی، یہ ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا شاہکار ہے، اس کا ترجمہ اُردو میں بھی ہوا۔

ان کی اہم تقریریں رسالوں کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہیں، ان ہی میں ایک اہم مجموعہ "پاجا سراغِ زندگی" ہے جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کو یہ پیام دیتے رہے ہیں کہ شاخِ ملت الٰہی کے دم سے ہری ہو سکتی ہے، "پرانے چراغ" میں جہت ہی محبت اور درد سے اپنے ان محبوبوں کی بزم سجائی ہے جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

وہ امریکہ کے سفر پر بھی گئے ہیں، وہاں کے مختلف یونیورسٹیوں اور مجلسوں میں جو تقریریں کیں ان کا مجموعہ عربی میں "احادیث صریحۃ فی امریکہ" کے نام سے شائع ہوا، جس کا ترجمہ اُردو میں بھی کیا گیا، وہاں انھوں نے صاف صاف کہا کہ امریکہ میں مشینوں کی تو بہار دیکھی، لیکن آدمیت اور روح کا زوال پایا، وہاں کے مسلمانوں کو تعلق باللہ اپنے کاموں میں اخلاص اور انابت کی روح پیدا کرنے کی تلقین کی، یہی پیام وہ ہر جگہ دیتے رہتے ہیں، جو کوئی نیا نہیں، لیکن وہ اسکو اپنی تقریر اور تحریر میں کچھ ایسے ایمانی ولولے، قلبی درد اور داعیانہ انداز سے کہتے اور لکھتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والے زبانِ حال سے کہہ اٹھتے ہیں: ع ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا۔

وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا بڑا احترام کرتے، ان کے علمی کارناموں کے بھی معترف رہے

مگر وہ اس کے قائل نہیں کہ اسلام کو سمجھنے کا حق صرف ان ہی کو تھا، اس لئے اسلامی تعلیمات سے متعلق ان کی نظری و فکری تعبیرات سے اختلاف عالمانہ اور مخلصانہ انداز میں اپنے رسالہ "عہد حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں کیا، اس کا ترجمہ عربی میں بھی کیا گیا۔

عربی میں ان کی تازہ ترین تصنیف "السِّیرَۃُ النَّبَوِیَّۃ" ہے اس کے لکھتے وقت شاید انکے ہر بُنِ مو سے یہ آواز نکل رہی ہو:۔

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اس کے ترجمے اردو اور انگریزی میں بھی ہوئے۔

مولانا کے ان علمی کمالات اور دینی خدمات کا اعترافِ شاہ فیصل ایوارڈ سے ضرور کیا گیا، مگر جن کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں تو: ع ہے ان کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی۔

اس ایوارڈ کے ساتھ ان کو لاکھوں کی رقم بھی ملی، مگر انھوں نے اعلان کیا کہ یہ ساری رقم افغانستان کے پناہ گزینوں، مکہ مکرمہ کے ادارۂ تحفیظ القرآن اور مدرسہ صولتیہ میں تقسیم کردی جائے اپنی ذات کیلئے کچھ بھی نہ رکھا۔ ع جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزاء کچھ اور ہے۔

ایوارڈ کے ملنے سے زیادہ وہ اپنی اس شانِ استغناء کیلئے مبارکباد کے مستحق ہیں، مردانِ خدا کا یہی شیوہ رہا ہے، نواب کلب علی خاں والیٔ ریاست رام پور نے مولوی محب اللہ امروہوی کے ذریعہ سے مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ اگر وہ رام پور تشریف لائیں تو ان کی خدمت میں ایک لاکھ روپئے کا نذرانہ خوشی سے پیش کیا جائے گا، جب مولوی محب اللہ امروہوی یہ پیام لے کر ان کے پاس پہونچے، تو وہ عشقِ الٰہی پر گفتگو فرما رہے تھے، نواب رام پور کی خواہش ظاہر کی گئی تو انھوں نے فرمایا: میاں! لاکھ روپئے پر خاک ڈالو، باتیں سنو!

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں ؛ تو دل کو بہ از جامِ جم دیکھتے ہیں!

پھر وہ عشق الٰہی ہی پر باتیں کرتے رہے۔

رائے بریلی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رہائش گاہ کے کمرے میں ٹاٹ بچھے ہوئے ہیں ان کو اس پر بیٹھ کر جو حقیقی سکون ملتا ہے وہ شاہجہاں کو تختِ طاؤس پر بیٹھنے میں نہ ملا ہوگا، وہ چاہتے تو اپنے ٹاٹ کو مخملیں فرش میں تبدیل کر سکتے تھے، مگر

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں!
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے۔

❖ ❖ ❖

حجازی خطیب

"مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہندوستان کے حجازی خطیب ہیں، انھیں عربی میں قلم و زبان کی شہسواری حاصل ہے، خود عرب ادیب و خطیب اُن پر رشک کرتے ہیں، بعض اسلامی و عربی مسائل پر اُن کی تجزیاتی کتابیں اور مختلف عصری و سیاسی مسائل پر اُن کی تقریریں، ادب و خطابت کا سرمایۂ عظیم ہیں، اُن سے کئی چیزیں حاصل ہوتی ہیں، مثلاً اظہار کا طریق، اسلوب کا رنگ، الفاظ کا استعمال، معانی کا جماؤ، سلاست کا نکھار، متانت کی چاشنی اور ایجاز و اختصار کی رونق، کسی تحریر و تقریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے سامع اور قاری کے لئے بوجھل نہ ہو اور کسی موڑ یا مرحلے میں دماغ تھکاوٹ محسوس نہ کرے بلکہ محسوس ہو کہ وہ اس میں ڈوب چکا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلتے۔ اور جب تک زیرِ مطالعہ کتاب ختم نہ ہو اس کی کیفیت ذہن و دماغ پر طاری رہتی ہے۔"

(نقوش کاشمیری)

(۴)

اشخاص، ادارے اور تحریکات

حضرت مولانا علی میاںؒ دیار عرب میں

پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی
(صدر مرکز علمی جامعہ نگر نئی دہلی)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحبؒ دائرہ شاہ علم اللہؒ (تکیہ کلاں) ضلع رائے بریلی کے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کی روح عربی اور مزاج دعوت و اصلاح اور طرز زندگی نبوی و ربانی تھا، اور اسی عالی مرتبت خاندان کی اس شاخ کے گل سرسبد تھے جس کا سرمایہ و اثاثہ تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف فکری، و دینی، اصلاحی اور دعوتی رہنمائی تھا، دادا مولانا فخر الدین خیالیؒ قادر الکلام شاعر اور مصنف تھے۔ جوش جہاد اور عزم و حوصلہ کے اپنی آپ مثال تھے، والد مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحبؒ ایک بلند پایہ ادیب مصنف اور جلیل القدر عالم تھے، انھوں نے ہندوستان کی علمی و اسلامی خدمات کو عربی زبان میں تحریر کر کے عرب دنیا میں متعارف کرایا اور اپنی عظیم الشان تصنیف (الأعلام بما فی الهند من الأعلام) کی آٹھ جلدوں میں تقریباً ساڑھے چار ہزار ہندوستانی ارباب علم و فن کے حالات لکھے اس کے علاوہ بھی عربی میں کئی کتابیں تحریر کیں اردو میں بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں اور ان میں "گل رعنا" اردو شعراء کے تذکرہ پر مشتمل بڑی معتبر کتاب ہے۔

حضرت مولاناؒ کی تعلیم و تربیت اسی دینی اور دعوتی ماحول میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی اور ایسے وسائل و اسباب بھی مہیا کر دیئے کہ جیسے انھیں اسی خاص مہم اور دعوت کیلئے تیار کیا گیا ہو، عربی تعلیم و عرب اساتذہ شیخ خلیل عربؒ اور ڈاکٹر تقی الدین ہلالیؒ سے حاصل کی جنہیں تعلیم اور زبان کا ذوق پیدا کرانے میں خاص ملکہ حاصل تھا، اسی کے پہلو بہ پہلو وہ اسلام و عرب دنیا کے رجحانات، خیالات اور نظریات پر اچھی نظر رکھتے تھے مولانا مرحوم نے عربی زبان و ادب میں دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی زبان و ادب کا گہرہ مطالعہ کیا۔ جس سے انھیں اپنے وطن اور عالمی حالات و کوائف کے سمجھنے اور واقفیت حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی اسلامی

علوم، ہندوستان کے ممتاز و بلند پایہ علماء اور روحانی تربیت، مایہ ناز ستودہ صفات بزرگوں اور اہل اللہ سے حاصل کی جس نے ان کے اندر بلند نگاہی اعلیٰ ظرفی، تواضع وانکساری، دلنوازی ودلآویزی اور شیریں کلامی پیدا کردی۔ وہ جب ۱۹۳۴ء میں میدان عمل میں اترے تو ان کے پیش نظر صرف اپنا ملک ہی نہیں پورا عالم اسلام بلکہ پوری دنیائے انسانیت تھی۔ اور ان کا یہ یقین تھا کہ جس طرح ماضی میں اسلام نے دنیا کو تاریکی سے نور تک رہنمائی کی تھی آج بھی وہی عقیدہ اور اس کی مقدس کتاب (قرآن مجید) اس بحران وانتشار، مایوسی و محرومی، انارکی وخود فریبی سے تمام عالم کو نجات دے سکتی ہے۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ جس امت نے عہد ماضی میں یہ کردار ادا کیا اس دور میں بھی وہ اپنی انہیں خصوصیات کو اپنا کر انقلابی تبدیلی لاسکتی تھی، اور وہ امت عرب ہے جس کے بارے میں مولاناؒ نے لکھا ہے کہ میں عربوں کو اس خواہش و آرزو کے ساتھ مخاطب کرتا ہوں کہ وہ اپنے عالمی مقام و حیثیت کو بحال کرکے اس مبارک قیادت و رہنمائی کو اپنے ہاتھ میں لے لیں جس قیادت کے پاسبانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: (وجعلنا منهم امةً يهدون بأمرنا لما صبروا وكانوا بآياتنا يوقنون) (اور ہم نے ان میں سے ایک امت تیار کی جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیتوں پر وہ یقین رکھتے ہیں)۔

ایک ممتاز عرب ادیب اور دانشور ڈاکٹر انور الجندی نے اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربوں کی جانب توجہ مبذول کی۔ انہیں بیدار کیا اور انھیں اپنے حقیقی منصب اور ذمہ داری سنبھال لینے کی دعوت دی۔ اور انھیں یاد دلایا کہ اللہ عزوجل ہی نے انہیں یہ سرفرازی عطا کی ہے اور قرآن مجید نے انھیں اسکی دعوت دی ہے اور اسلام نے انھیں دنیا کی قیادت کیلئے تیار کیا ہے ۱۹۴۷ء سے قبل مولانا علی میاں صاحبؒ نے کسی عرب ملک کا سفر نہیں کیا اور نہ دیکھا مگر ان کا سب سے پہلا عربی مضمون حضرت سید احمد شہیدؒ سے متعلق مصر کے مشہور معیاری رسالہ "المنار" میں شائع ہوا، جیسے اس کے نامور و ممتاز عالم و صحافی سید رشید رضا نے اہتمام سے شائع کیا، وہ اس قدر مؤثر و پسندیدہ تھا کہ انھوں نے مضمون نگار سے اجازت لے کر

رسالہ کی شکل میں شائع کیا، اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مولانا مرحوم کا دوسرا مضمون "اکبر الہ آبادی اور انکی شاعری" سے متعلق ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان "الضیا" میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر عربی کے عظیم انشاء پرداز وادیب امیر شکیب ارسلان (جن کو عرب دنیا میں امیر البیان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) نے خط لکھ کر بڑے بلند الفاظ میں مضمون نگار کی ستائش کی۔

عربی زبان وادب کے طالب علم کے بطور حضرت مولاناؒ عرب دنیا اور خصوصاً حجاز و مصر سے، وہاں کی شخصیات، اداروں اور انکی زندگی کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ واقف تھے، لیکن وہاں کا کوئی سفر نہ ہو سکا تھا جس کے دیکھنے اور سب سے بڑھ کر حج وزیارت کی آرزو تھی، حسن اتفاق دیکھئے کہ پہلا سفر، سفر حج ہی ہوا اور والدہ معظمہ اہلیہ اور ہمشیرہ کے ساتھ اور مرافق و معاون کے طور پر اپنے بڑے بھانجہ مولانا سید محمد ثانی صاحبؒ کو منتخب فرمایا جو بقول حضرت مولاناؒ انکے دینی و علمی کاموں میں دست راست اور قوت بازو اور عزیز ترین فرد خاندان تھے اس مبارک سفر کی مسرت کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے کیجئے فرماتے ہیں "یوں تو ہر مسلمان کو حج کی تمنا اور شوق ہوتا ہے لیکن سیرت کے مطالعہ اور شغف حدیث کے درس اور عربی زبان کے ناتے مجھے خصوصی تمنا اور آرزو تھی۔ یاد ہے کہ اکثر امین آباد سے تیزی کے ساتھ اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے تانگوں کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں ارمان اٹھتا کہ کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب ہم بھی حج کیلئے اسٹیشن جا رہے ہونگے آخر وقت آگیا۔ ؎

دن گنے جاتے تھے جس دن کیلئے

مولاناؒ کا یہ سفر صرف حج وزیارت ہی کا سفر نہ تھا بلکہ دعوت واصلاح، ملاقات و تبادلۂ خیالات، اہم دین، علمی امور اور ادبی شخصیات سے تعارف اور حجاز و عالم عرب کی ہمہ جہت سرگرمیوں و تحریکوں سے واقفیت اور معلومات کا بھی تھا، دونوں مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی حج وزیارت سے متعلق مولاناؒ کا مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" خاصہ کی چیز ہے، اور اس سفر کے بارے میں "کاروان زندگی" اور "کاروان مدینہ" نیز "شرق اوسط میں کیا دیکھا" میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

حجاز میں حضرت مولاناؒ کا قیام چھ ماہ رہا، حرمین شریفین کی برکتوں کے ساتھ دعوت وتبلیغ کے

اسفار اور علماء وادباء واعیان حجاز سے ملاقاتیں اور مختلف ملی، دینی اور دعوتی مسائل سے متعلق تبادلۂ خیال بھی ہوا دہلی میں منعقدہ ایشیائی کانفرس کے تیار کردہ عربی رسالہ "إلى ممثلي البلاد الاسلامية" (مسلم ممالک کے نمائندوں کے نام) چھپ چکا تھا اور امامِ حرم مکی شیخ عبدالرزاق حمزۃ، شیخ عمر بن حسن آل شیخ (جو مملکت سعودی عرب کے شیخ الاسلام و چیف جسٹس شیخ عبداللہ بن حسن کے بھائی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ادارہ کے سربراہ اور ولی عہد مملکت پرنس سعود بن عبدالعزیز کے معتمد و مشیر تھے ان سے مولاناؒ کو خاص تعلق درس پیدا ہو گیا جو ہمیشہ قائم رہا) اور شیخ محمد علی الحرکان (حرم میں مدرس اور بعد میں وزیر قانون ورابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ہوئے) وغیر کی خدمت میں پیش کیا گیا انھوں نے پسند کیا۔ متأثر ہوئے اور آخر الذکر وترکی عالم شیخ عثمان ساعاتی نے اپنی مجلسوں میں پڑھکر سنایا۔ سعودی عرب میں ابتک مصر وشام وغیرہ کے جتنے لٹریچر یہاں پہونچے تھے ان میں یہ رسالہ ایک نئی فکر نیا انداز اور مؤثر و مخلصانہ طرز بیان کا حامل تھا، شیخ عمر بن حسن آل شیخ سے قریبی تعلق نے ان کے ذریعہ شاہی خاندان تک اپنا پیغام پہونچانے کا مولاناؒ کے دل میں داعیہ پیدا کر دیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک جملہ (اللہ کے بندے! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ھادی" بنا کر مبعوث کئے گئے "تحصیلدار" بن کر مبعوث نہیں ہوئے تھے) کو بنیاد بنا کر ایک مؤثر خط پرنس سعود (جو بعد میں سعودی بادشاہ ہوئے) کے نام لکھا اور ان کی خدمت میں بھجوادیا۔ جو بعد میں (بين الجباية والهداية) کے عنوان سے رسالہ کی شکل میں شائع ہوا اور اردو کے علاوہ مختلف زبانوں میں منتقل کیا گیا حضرت مولاناؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسالمين" (جس کا تذکرہ آئندہ سطروں میں آئیگا) اس وقت تک زیر طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی اس کا مسودہ ساتھ لے گئے تھے اور امام حرم شیخ عبدالرزاق حمزہؒ کو دکھایا، انھوں نے پڑھ کر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور شائع کرنے پر زور دیا۔

حجاز میں قیام حج کے موقع پر دوسرے عرب ممالک کے حجاج اور زائرین سے ملاقات و گفتگو سے مولاناؒ کو عرب دنیا کے حالات مغربیت، تجدد پسندی، قوم پرستی اور فکری، اخلاقی و دینی اور علمی و معاشرتی بدحالی و پسماندگی سے بہت دکھ ہوا، اور ان میں کام کرنے کا جذبہ و جوش پیدا ہوا اس کیلئے بے

چین و بے قرار ہوگئے چنانچہ انھوں نے اپنے عزیز ترین دوست، رفیق علم و دعوت مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو (جو اس وقت عراق کے سفر پر تھے) ایک پرزور خط لکھا اس خط کا ایک اقتباس "کاروان زندگی" (ج ا ص ۵۲-۳۵۱) سے نقل کر کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں:

"دین کی تخم ریزی کیلئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھئے" حجت تمام کر دیجئے، دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلائے اور بدن کو گھلائے خون دیدہ اور خون جگر بہائے اور اس طرح بہائے کہ دجلہ و فرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں۔ ایک ایک کا گریبان تھام کر کہیئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، اے عالم کی آبرو، اے ابراہیم علیہ السلام و محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنی بن حارثہؓ کے خون شہادت، ابو عبیدہ الثقفیؓ کی پامالی اور استخوانی شکنی، سعد بن ابی وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں، جگر گوشۂ رسول ﷺ کی تشنگی اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزی کی حمایت سنت، عبد القادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ توائم ضلالت کا ادیغاشیہ بردار اور اسکی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شور قیامت برپا کر دیجئے کہ ؎

گرفتہ چیناں احرام و مکی خفتہ در بطحا"

۴ ستمبر ۱۹۵۰ء کو حضرت مولاناؒ کا دوسرا سفر حج حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کے حکم سے انکی رفاقت میں ہوا (حضرت رائے پوریؒ مولانا کے شیخ اور بزرگ و سرپرست تھے) یہ سفر عالم عرب کے طویل سفر و دورہ کا نہ صرف پیش خیمہ ثابت ہوا بلکہ اس نے دینی، دعوتی علمی و ادبی فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور برکتوں کا نزول مسلسل و پیہم جاری و ساری ہو گیا مولاناؒ سے دنیائے اسلام و انسانیت کیلئے وہ خدمت لی گئی جو صدیوں میں لی جایا کرتی ہے، برکت کا آغاز اس طرح ہوا کہ حج کے فوراً بعد کلید بردار خانہ کعبہ عالی مرتبت شیبی صاحب نے از خود حضرت مولانا کو بیت اللہ شریف میں داخلہ کی دعوت دی اور فرمایا کہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ آیئے، یہ شرف تمام رفقاء کو حاصل ہوا بلکہ کچھ حضرات جو اس وقت موجود نہیں تھے ان کے لئے دوبارہ محترم شیبی صاحب نے باب کعبہ کھولا اور

انہیں اس سعادت کا موقع ملا، اس سفر میں حج کے بعد قیام کے دوران سعودی عرب کے علماء وادباء اور داعیان سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ملاقاتوں جلسوں تقریروں اور سعودی ریڈیو سے مولاناؒ کو خطاب کرنے کے مواقع ملے، آپ بڑے درد وخلوص کے ساتھ اپنے مخصوص دعوتی انداز میں پیغام نشر کیا اس وقت تک آپ کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" قاہرہ (مصر) سے چھپ چکی تھی اور متعدد عربی رسائل منظر عام پر آچکے تھے، اسکی بناء پر عرب ممالک کی مختلف شخصیتوں سے بھی ملاقاتیں آسان ہوئیں اور سود مند بھی، آپ نے مصر، سوڈان، شام، فلسطین اور شرق اردن کے سفر کا بھی ارادہ کرلیا۔ چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو قاہرہ روانہ ہوئے اور جامع ازہر کے علاوہ جامعہ فواد اول (قاہرہ یونیورسٹی) انجمن شبان مسلمین کے سربراہوں شیخ عبدالمجید سلیم، شیخ محمود شلتوت، احمد محمد شاکر، شیخ حامد فقی، مفتی امین حسینی، امیر عبدالکریم ریفی، اور ممتاز ادباء، ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود عقاد، احمد حسن زیات اور محمود محمد شاکر، نیز جماعت اخوان مسلمین کے ممتاز داعیوں شیخ محمد الغزالی، شیخ صالح عشماوی، ڈاکٹر سعید رمضان اور سید قطب شہید سے ملاقاتیں رہیں انکی دعوت پر لیکچر دئے، تقریریں کیں چھ ماہ کے دوران قیام میں مصر کے مختلف شہروں، قصبوں، اور گاؤں کے دورے کئے، اور گفتگو و تقریر کی اور جمعہ کے خطبے بھی دئے، اس کے بعد سوڈان کا سفر کیا۔ اور وہاں کے وزیر اعظم اور اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، سوڈان سے مصر ہوتے ہوئے ملک شام کا سفر کیا وہاں ۴۸ دن قیام کیا اور دمشق، حلب، حمص، حماہ، اور دوسرے شہروں کو دیکھا، شخصیتوں سے ملے اور خطاب کیا، اور شام یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی دعوت پر مسئلہ فلسطین پر جامع ومؤثر مقالہ پڑھا، مفتی اعظم شام شیخ ابوالیسر عابدین کے علاوہ ممتاز علماء شیخ محمد بھجت البیطار، شیخ ابوالخیر میدانی، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، استاذ محمد المبارک، اور دمشق اکادمی کے سربراہ استاذ محمد کرد علی سے ملاقاتیں رہیں، وہاں سے فلسطین روانہ ہوئے اور بیت المقدس، الخلیل، نابلس وغیرہ کے دورے کئے اور تقریریں کیں مقالات پڑھے، فلسطین سے واپسی میں اردن تشریف لے گئے اور عمان میں اردن کے بادشاہ شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملاقات کی، اور عرب ممالک وفلسطین کے مسائل پر طویل گفتگو کی، بادشاہ نے آپ کے مشوروں پر

عمل کرنے کا وعدہ کیا لیکن دوسرے جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد مسجد اقصیٰ کے دروازہ پر قتل کر دیئے گئے وہاں سے دمشق واپس آکر ۱۲/اگست ۱۹۵۱ء کو مدینہ منورہ ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ واپس ہوئے، اور حسب وعدہ اپنے سفر کی رپورٹ پیش کی، اس پورے سفر کی روداد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے روزنامچہ کی شکل میں لکھی تھی جو "مذاکرات سائح فی الشرق الغربی" کے نام سے شائع ہوئی۔ مولانا شمس الحق صاحب ندوی کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" کے نام سے طبع ہوا۔ ۱۳-۱۴ مہینے کے بعد ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو واپسی ہوئی، استقبال کرنے والوں سے لکھنؤ اسٹیشن اندر سے باہر تک بھرا ہوا تھا۔ یہ راقم سطور بھی دبا دبایا ایک کونہ میں کھڑا تھا۔ لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ سفر کا ماحصل سنائیں آپ اسٹیشن کی مسجد تشریف لے گئے اور مختصر تقریر فرمائی آخر میں علامہ اقبالؒ کے یہ دو شعر پڑھے:-

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اس طویل سفر کے بعد تقریباً پانچ سال تک حضرت مولاناؒ کا کسی عرب ملک کا سفر نہیں ہوا، مارچ ۱۹۵۶ء میں شام یونیورسٹی کے کلیہ الشریعۃ کی دعوت پر بحیثیت استاذ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) دمشق تشریف لے گئے جو بڑے اعزاز اور فخر کی بات تھی، اہل ندوہ و متعلقین کے ساتھ قدرتی طور سے حضرت مولاناؒ کو مبارک باد کا خط لکھا جس کا جملہ ملاحظہ ہو:

"یہ امتیاز آپکی شخصیت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ سارے ہندی علماء کیلیے سرمایہ افتخار ہے، یا لیت کثر اللہ أمثالکم فینا" کاروان زندگی (ج ۱ ص ۴۲۱)

یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ حضرت مولاناؒ ایئر انڈیا کی اس فلائٹ سے تشریف لے گئے جو اسی دن پہلی مرتبہ بمبئی سے دمشق روانہ ہوئی تھی، دمشق ایئرپورٹ پر ہندوستانی سفارت خانہ کے افسران

(جو پہلی فلائٹ کی وجہ سے آئے تھے) کے علاوہ شامی وزارت تعلیم کے نمائندے شام یونیورسٹی کے افسران اور ڈین فیکلٹی آف شریعت ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، اساتذہ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء، ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی استاذ محمد المبارک، ڈاکٹر یوسف العش، حضرت مولاناؒ کے قدیم مخلص حجازی دوست شیخ محمود الحافظ، اور کلیۃ الشریعۃ دمشق میں زیر تعلیم ندوی فارغین، پروفیسر سید رضوان علی، پروفیسر محمد راشد اور راقم سطور، استقبال کرنے والوں میں شامل تھے، ہم سب اس اعزاز پر نازاں و فرحاں تھے، یونیورسٹی نے حضرت مولاناؒ کے قیام کا یرموک ہوٹل میں انتظام کیا تھا مگر حضرتؒ ہوٹل میں صرف تین دن ٹھہرے، اس کے بعد اپنے سابق میزبان شیخ عبدالوھاب صلاحیؒ کے مکان میں منتقل ہوگئے، ہوٹل کا کرایہ بھی یونیورسٹی کے بجائے منتقل ہونے سے قبل ہی خاموشی سے ڈاکٹر سعید رمضان صاحبؒ (مصر کے ممتاز اخوانی رہنما، شعلہ بار مقرر، مجلۃ "المسلمون" کے مدیر اور امام حسن البنا شہیدؒ کے داماد، اس وقت دمشق میں جلاء وطنی کی زندگی گزار رہے تھے حضرت مولاناؒ کے تا زندگی محب و مخلص رہے) نے ادا کردیا تھا، مولانا کے محاضرات کا عنوان "التجدید والمجددون فی تاریخ الفکر الاسلامی" تھا جو بعد میں "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" کے نام سے ۴ جلدوں میں شائع ہوئے اور اردو ترجمہ "تاریخ دعوت وعزیمت" کے عنوان سے پانچ حصوں میں طبع کیا گیا۔

پہلا لکچر ۴/اپریل ۱۹۵۶ء کو اور آخری و آٹھواں لکچر ۳۰/مئی ۱۹۵۶ء کو یونیورسٹی کے وسیع لکچر ہال میں ہوا، لکچر میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے لیکر اساتذہ و طلباء و کارکن اور اعیانِ شہر اور افاضل علماء پابندی سے شریک ہوتے تھے، بعض عمر رسیدہ علماء وادباء کو تاخیر ہوجانے کے خوف سے ان نگاہوں نے دوڑ کر ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، شریک ہونے والوں میں ڈاکٹر معروف دوالیبی صاحب جو شام کے دوبار وزیر اعظم اور طویل عرصہ تک پارلیمنٹ کے اسپیکر اور شام کی سب سے قدیم اور بڑی تحریک آزادی کو کامیابی سے ہم کنار کرانے والی پارٹی (حزب الشعب) کے سکریٹری جنرل تھے اور اس وقت سعودی سربراہ شاہ فہد کے مشیر ہیں، ممتاز فقیہ وعالم اور وزیر قانون شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء، ممتاز مفکر و مصنف استاذ محمد المبارک علامہ شام شیخ محمد بہجۃ البیطار رحمہ اللہ اور ممتاز علماء

ودانشور اور سامعین سے ہال بھرا رہتا تھا۔

شام میں حضرت مولانا کا تین مہینہ قیام رہا، محاضرات کے علاوہ جلسے، تقریریں، خطبے ہوا کرتے تھے۔ ریڈیو شام نے بھی کئی تقریریں نشر کیں جن میں "اسمعی یاسوریہ" بھی شامل ہے۔ مولانا رحمہ اللہ کا شام کا یہ قیام بے حد مفید اور نتیجہ خیز تھا شامیوں نے بڑی محبت، فراخدلی، عالی ظرفی اور مہمان نوازی کا معاملہ کیا جو تاریخ ساز ہے (اس مختصر مقالہ میں تفصیل کی گنجائش نہیں، اس کے لئے علاحدہ وقت اور مقالہ درکار ہے)

ان لکچروں کے دوران کئی روز کا وقفہ ہوا تو حضرت مولاناؒ نے تین دن کے لئے لبنان کا سفر کیا، ایک صبح کو لبنان کے تاثرات املا کرائے، راقم سطور نے حضرت مولانا کو دکھا کر برادر محب و مخلص محمد الحسنیؒ کو لکھنؤ بھیج دیا، انھوں نے "البعث الاسلامی" میں شائع کر دیا، اس کا ترجمہ "شرق اوسط کی ڈائری" کے آخر میں منسلک ہے، لکچرز کے آخر میں ترکی کا پہلا سفر ٹرین سے فرمایا، جس کی روداد "دو مہینہ ترکی میں" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر سعید رمضان صاحب اور ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی صاحب نے دمشق میں اسلامی کانفرنس منعقد کرنا طے کیا۔ اور ۲۶ر جون ۱۹۶۵ء کی صبح اس کا افتتاح رکھا، کانفرنس کا موضوع "مسئلہ فلسطین" تھا۔ عالم عرب کے منتخب نمائندے شریک ہوئے۔ جن میں حضرت مولانا رحمہ اللہ اور شیخ محمد منتصر اللہ صاحب ہندوستان سے (حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو دعوت دی گئی تھی مگر تشریف نہ لا سکے) پاکستان سے بانی امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ، انڈونیشیا سے ڈاکٹر محمد ناصر صدر ماشومی پارٹی، سوڈان سے ڈاکٹر حسن ترابی، مراقب عام اخوان مسلمین الجزائر سے شیخ بشیر الابراھیمی، فلسطین سے مفتی الحاج امین الحسینیؒ کے اسماء گرامی مجھے اس وقت یاد ہیں۔ میری زندگی کی یہ پہلی عربی کانفرنس تھی، جس کی مکمل کاروائی عربی زبان میں اور شعلہ بار آتش بیاں عظیم مقرروں کے ہر ہر جملے پر فلک شگاف نعروں و تالیوں کا منظر میرے لئے حیرت انگیز، پرکشش اور چشم کشا تھا، اتنے پر ہجوم جلسے میں نے پہلی بار دیکھے تھے، (اس کے بیان کے لئے الگ مقالے کی ضرورت ہے۔)

مولاناؒ نے کانفرنس میں جو مقالہ پڑھا تھا اس کا عنوان "اسلامی بیداری اور مسئلہ فلسطین" تھا، حضرتؒ کا دمشق میں تین ماہ کا قیام بڑا تاریخ ساز نتیجہ خیز اور مفید رہا، حضرتؒ نے کاروان زندگی میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"دمشق کا تقریباً تین ماہ کا قیام، زندگی کے خوشگوار ترین ایام تھے، جو ابھی تک (حرمین شریفین کو مستثنیٰ کر کے) کہیں میسر نہیں آئے"

راقم سطور جب بھی حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو دمشق کے ان خوشگوار دنوں کا ذکر فرماتے اور کبھی کبھی گلوگیر ہو جاتے، حضرت مولاناؒ نے دمشق، حلب، حمص و حماہ میں اپنی علمی و دعوتی مصروفیتوں، محاضرات و تقریروں کے پہلو بہ پہلو وہاں کے بزرگوں اور اولیاء سے روابط قائم کئے اور ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے رہے اور ان بزرگوں نے مولاناؒ کے ساتھ بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ کیا، جن بزرگوں کی خدمت میں حضرتؒ کے ساتھ اس راقم سطور کو حاضری کا شرف حاصل ہوا، ان کے نام یاد رہ گئے ہیں، دمشق کے شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ سعید البرھانی، شیخ ابراہیم الفلائنی (قطنا) شیخ محمد مکی کتانی اور شیخ ہارون العسل الحجاز جن سے ایک علم و دانش بہت کم واقف تھے۔ حضرت مولاناؒ کے واسطہ سے ان کا تعارف ہوا اور ان کی جانب رجوع کیا، ان سے بیعت ہونے والوں میں ہمارے استاذ گرامی مراقب عام جماعت اخوان مسلمین، کلیۃ الشریعۃ، دمشق یونیورسٹی کے بانی ڈین اور ممتاز عالم و مفکر و فقیہ اور شعلہ بار خطیب ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ کی ذات گرامی بھی تھی، ان کی وفات پر ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑا موثر مضمون اپنے رسالہ "حضارۃ الاسلام" میں شائع کیا اور مرثیہ بھی لکھا۔

شام میں حضرتؒ کی محبوبیت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ خواہ چند سکنڈ کے لئے سہی اپنے گھر لے جانے کے لئے بے تاب رہتے تھے، ممتاز محدث و سلفی عالم شیخ ناصر الدین البانی اور سخت گیر و متشدد سلفی شخصیت شیخ محمد محمود استنبولی رحمہما اللہ نے اصرار کر کے مدعو کیا، یہ عاجز بھی شریک دعوت تھا، (میں نے اس طرح کے متعدد واقعات ایک دوسرے مضمون میں ذکر کئے ہیں) محاضرات کے دوران ماہ رمضان آگیا، عرب ماہ مبارک میں شب بیدار رہتے ہیں، اکثر و بیشتر تراویح کے بعد ڈاکٹر سعید

رمضان صاحب آجاتے اور باصرار گھر لے جاتے، وہاں منتخب اہل علم واخوانی نوجوان بھی ہوتے اور دیر رات تک یہ علمی ونورانی نشست رہتی، ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ نے ڈاکٹر سعید رمضان صاحب سے فرمایا کہ آپ ہمیں بار بار اپنے دولت کدہ پر لے جاتے ہیں تکلف کرتے ہیں، اہل خانہ کو تکلیف دیتے ہیں..... جواب دیا شیخ یہ میں نہیں کرتا ہوں میری اہلیہ (امام حسن البنا شہید کی صاحبزادی) اصرار کر کے مجھے بھیجتی ہیں اور کہتی ہیں کہ شیخ ابوالحسن کو لے آؤ وہ میرے والد مرحوم سے مشابہ اور ہم شکل ہیں، انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر مجھے سکون حاصل ہوتا ہے۔

دمشق میں قیام کے دوران اس کی علمی عربی اکیڈمی (المجمع العلمی العربی) کے صدر استاذ خلیل مردم بک کی دعوت پر وہاں کی متعدد نشستوں میں حضرت مولاناؒ سے ہندوستانی علماء کے علمی کارناموں اور تصنیفات سے متعلق تبادلۂ خیال ہوا، مولانا کے والد بزرگوار سابق ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم سید عبدالحیؒ الحسنیؒ کی نزھۃ الخواطر اور دیگر تصنیفات کا تذکرہ ہوا، انھوں نے "الثقافة الاسلامية في الهند" کا مسودہ دیکھ کر اس کی طباعت کی خواہش ظاہر کی، چند ماہ کے بعد کتاب اکیڈمی نے شائع کر دی اسی دوران مولانا کی کتاب مختارات من ادب العرب کی طباعت کا بھی آغاز ہو گیا،

"المجمع العلمی" (مجمع اللغة العربية دمشق) نے حضرت مولاناؒ کو اپنا رکن بھی منتخب کیا، اور شام کے صدر جمہوریہ شکری القوتلی مرحوم کی جانب سے اس کی سند حضرتؒ کی خدمت میں بھیجی گئی، اس تقریب سے حضرتؒ نے اس کے مجلّہ کے لیے ایک گراں قدر مضمون (ادب عربی از سر نو جائزہ کی ضرورت) کے عنوان سے بھیجا جسے مجلّہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا مضمون بصیرت افروز اور انقلاب انگیز تھا، جس میں مولاناؒ نے اسلامی تعمیری اور اخلاقی ادب کی جانب ایک قلم کو توجہ دلائی تھی، اور اس کے نمونے پیش کئے تھے، یہی مضمون دراصل عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے قیام کا سبب بناء جس کی تخم ریزی حضرت مولاناؒ نے ۱۹۵۷ء کی تھی وہ ۱۹۸۱ء میں شجر سایہ دار و ثمر آور بن کر نمودار ہوا، اور چند برسوں میں چمنستان ادب میں اس نے اپنا نمایاں مقام بنالیا ہے۔

شام سے بغداد کراچی ہوتے ہوئے جولائی کے پہلے ہفتہ میں لکھنؤ واپسی ہوئی اسی سفر کے بعد

۱۹۶۴ء میں تیسری بار اور ۱۹۷۳ء میں رابطۂ عالم اسلامی کے وفد کے سربراہ کے طور پر چوتھی بار دمشق تشریف لے گئے مگر اسی شب کے آخری پہر اچانک سرحد پر پہونچادئے گئے۔

کویت کا پہلا سفر ۱۹۶۲ء میں کیا اور "اسمعی یا زهرة الصحراء" (اے لالۂ صحراء میری بات سن) کے عنوان سے بڑی مؤثر اور پر مغز تقریر کی اس کے بعد کویت کی دعوت پر سیمیناروں اور کانفرنسوں میں (۶۸، ۸۳ اور ۱۹۸۷ء) میں شرکت کی اور خطاب فرمایا۔

متحدہ عرب امارات کے کئی بار مختلف تقریبات سے سفر کئے آخری بار دبئی کے وزیر دفاع امیر محمد کی جانب سے ایوارڈ کے رمضان ۱۴۲۰-۱۹۹۹ء انھیں کے چارٹرڈ جہاز سے دبئی تشریف لے گئے۔ اور بیرون ہند و عرب ملک کا یہ آخری سفر تھا۔

۱۹۷۲ء میں اسلامی یونیورسٹیوں کی تنظیم کی دعوت پر مراکش تشریف لے گئے اور اس کے اہم شہروں میں منعقد جلسوں میں تقریریں کیں، یونیورسٹیوں کے اساتذہ و طلباء سے خطاب کیا، شاہ حسن ثانی کی دعوت میں شرکت کی، انھوں نے خاندانی رشتہ کی وجہ سے بڑا اکرام کیا، اس سفر کی روداد "دو ہفتہ مراکش میں" کے عنوان سے شائع کیا، الجزائر کی کانفرنس "الملتقی الاسلامی" میں دوبارہ ۸۲-۱۹۸۶ء میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔

۱۹۷۳ء میں رابطۂ عالم اسلامی کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شام، لبنان، عراق، اردن، افغانستان اور ایران کا دورہ کیا ان ملکوں میں جلسوں محفلوں اور سیمیناروں میں مقالے پڑھے اور تقریریں کیں، جس کی مفصل رپورٹ ان کی کتاب "نہر کابل سے نہر یرموک تک" میں شائع ہوئی ہے۔

۱۹۸۴ء میں ادارہ آل بیت عمان، اردن کی دعوت پر عمان تشریف لے گئے اس ادارہ کے سربراہ امیر حسن بن طلال ہیں جو اس وقت مملکت اردن کے ولی عہد تھے۔ اور حضرت مولاناؒ سے احترام محبت کا تعلق رکھتے تھے اس ادارہ اور اردن، یرموک، زرقاء، اربد، مفرق اور جبرش کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور مرکز اخوان مسلمین، مرکز جماعت تبلیغ اور فلسطینی طلباء و نوجوانوں سے خطاب کیا۔

یمن سے کئی بار دعوت نامے آچکے تھے مگر جانے کا موقع نہ مل سکا تھا اس مرتبہ یمن

یونیورسٹی اور بعض اسلامی تنظیموں اور سرکاری حلقوں سے بڑا اصرار ہوا چنانچہ اسی اردن کے سفر کے ساتھ یمن جانا طے ہو گیا تھا عمان سے حرمین شریفین تشریف لے گئے عمرہ و زیارت کے بعد یمن کے دار السلطنت صنعاء روانگی ہوئی، چھوٹے خواہر زادہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء اور ایڈیٹر صحیفہ "الرائد" عربی اس سفر میں ساتھ تھے، یمن سے حضرت مولاناؒ کو اس بناء پر مزید انسیت تھی کہ یہ ان کے عربی کے اولین استاذ شیخ خلیل بن حسین یمانی کا وطن تھا، وہاں جی بھی لگا اور ہر حلقہ سے بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا گیا، یونیورسٹی اور سرکاری حلقوں سے لے کر عوامی حلقوں تک سے گفتگو کی، خطاب کئے اور مقالے پڑھے، اس سفر عمان و صنعاء کی مکمل کارگزاری کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "نفحات الایمان بین صنعاء و عمان" جو خاصہ کی چیز ہے، ۱۹۹۰ء میں قطر کی سیرت کانفرنس میں شرکت کی اور حضرت مولاناؒ نے اس کانفرنس میں نہ صرف مقالہ پیش کیا بلکہ سیرت کی کتابوں اور اسلامی تاریخ سے عطر کشید کر کے رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ عربی زبان میں (السیرۃ النبویۃ) کے عنوان سے تیار کر دی، جس نے تمام علمی و اسلامی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا اس کا اردو ترجمہ (نبی رحمت) کے نام سے کئی بار شائع ہو چکا ہے، دیگر عرب ممالک کے سفر تو ہوتے رہے لیکن حرمین شریفین کے لئے حاضری کی کوئی تقریب نہیں ہو رہی تھی ۱۹۵۱ء والے حج کو دس سال پورے ہو گئے تھے حضرت مولاناؒ کے دل میں خیال و اشتیاق فزوں تھا کویت کے سفر کے دوران ایک شخص دعوت نامہ حج کے لئے موصول ہوا تھا مگر حضرت نے اس دعوت نامہ پر جانا پسند نہیں فرمایا۔

مارچ ۱۹۶۲ء میں دہلی میں مقیم سعودی سفیر عزت مآب شیخ یوسف الفوزان کا اچانک خط ملا کہ مولاناؒ کے لئے سعودی حکومت کا ایک اہم پیغام ہے، خود تشریف لائیں یا اپنے کسی نمائندہ کو بھیج دیں حضرت مولاناؒ نے اپنے منجھلے بھانجے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب (حال ناظم ندوۃ العلماء) کو سفیر صاحب کے پاس بھیجا، سعودی سفیر صاحب نے بتایا کہ سعودی حکومت مدینہ منورہ میں اسلامی یونیورسٹی قائم کر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مولانا اس یونیورسٹی میں تدریس کی خدمت قبول کر لیں،

یہ سعودی فرمارواں شاہ سعود کا مولاناؒ کے نام ذاتی خط تھا، مولاناؒ نے دمشق یونیورسٹی کی طرح یہاں بھی ملازمت سے معذرت کر کے توسیعی خطبات کی منظوری دے دی (تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے) کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ مولاناؒ یونیورسٹی کی مشاورتی کمیٹی کے رکن نامزد کیے گئے ہیں اور اس کی پہلی نشست اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخری ہفتہ میں مدینہ منورۃ میں منعقد ہوگی، مولاناؒ حج کی نیت سے روانہ ہوئے، اسی دوران شیخ صالح قزاز مرحوم (سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ) کا پیغام پہونچا کہ ۱۴ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ کے ایوان شاہی میں اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوگا اس میں حکومت سعودی عرب کی جانب سے مدعو ہیں۔ مولاناؒ نے دونوں اجلاس میں شرکت فرمائی، اور مکہ مکرمہ کی اس اسلامی کانفرنس کی نظامت آپ کے سپرد کی گئی جس میں شاہ سعود بن عبدالعزیز اور لیبیا کے شاہ ادریس سنوسی نے بذات خود شرکت کی، صدر اجلاس شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ کی عدم موجودگی میں آپ کو ہی ان کی قائم مقامی سپرد کی گئی۔ اس کامیاب نظامت کی عربی کے ممتاز ادیب وانشاء پرداز استاذ علی طنطاویؒ نے اپنے بلیغ قلم سے بڑی مؤثر وادلآویز اور شاندار تصویر کشی کی ہے۔ اس کانفرنس نے رابطۂ عالم اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا اور حضرت مولاناؒ اس کے بانی رکن منتخب کیے گئے، ان دونوں اداروں کی رکنیت کی وجہ سے حضرت مولاناؒ کا حرمین شریفین کا سفر تاحیات سال بہ سال ہوتا رہا کبھی کبھار مصروفیت اور ناسازی طبع کی وجہ سے حضرتؒ نے معذرت فرمائی۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں مکہ مکرمہ میں "دعوت اسلام" کانفرنس منعقد ہوئی، راقم نے بھی کانفرنس میں شرکت کی سعادت حاصل کی اور اس سے عظیم تر سعادت یہ حاصل ہوئی کہ مندوبین کانفرنس کو ایک صبح خانہ کعبہ کے اندر داخلہ، نوافل ودعا کرنے کے لئے موقع عنایت کیا گیا، راقم اور برادر زادہ سعید مرتضیٰ سلمہٗ بھی حضرت مولاناؒ کے ساتھ شرف یاب ہوئے، و للّٰہ الحمد والمنۃ۔

حضرت مولاناؒ ایک عام رکن کے طور سے ان اداروں میں شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ ان اداروں میں بھی اور دوسرے مراکز جامعات اور ادبی حلقوں میں بھی اپنا دینی، دعوتی اور ادبی پیغام بڑی جراءت مگر نرمی وسلیقہ مندی سے پہونچاتے تھے، جس کا خوشگوار رد عمل ہوتا تھا۔

عالمی رابطۂ ادب اسلامی (۱۹۸۴ء) کے قیام کے بعد اس کی کانفرنسوں اور مجلس عاملہ کے جلسوں میں بھی (جو عموماً کسی عرب ملک میں منعقد ہوئے) شرکت فرماتے تھے عالمی رابطۂ ادب اسلامی کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ عمان (اردن) میں ۲۰/ اگست تا ۲۵/ اگست ۱۹۹۸ء میں منعقد کیا گیا، حضرت مولاناؒ کی صحت اس وقت کافی کمزور اور مضمحل تھی، شروع میں شرکت سے معذرت فرمائی لیکن رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبدالباسط بدر کی شدید خواہش اور اصرار اور کچھ طبیعت بحال ہو جانے کی وجہ سے مزید بر آں حرمین شریفین کی حاضری کی کشش سے سفر پر آمادہ ہوگئے، اس سفر میں حضرت مولاناؒ کی رفاقت میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نائب صدر رابطۂ ادب اسلامی (ناظم ندوۃ العلماء) مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء رئیس تحریر مجلۃ البعث الاسلامی) مولانا سید واضح رشید صاحب ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء و عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ و رئیس تحریر "الرائد") جناب حاجی عبدالرزاق صاحب الحاج بھائی محمد عثمان صاحب حیدر آبادی الحاج محمد عرفان صاحب اور راقم سطور دہلی سے براہ راست عمان روانہ ہوئے اور عمان کے وقت کے مطابق ساڑھے نو بجے پہونچے، لوٹس ہوٹل میں تمام اراکین کا قیام تھا، اردن کا قیام بڑا مصروف گذرا، سابق ولی عہد سلطنت امیر حسن (جو اس وقت شاہ حسین کی بیماری اور امریکہ میں علاج کی وجہ سے قائم مقام بادشاہ تھے) نے بڑی تکریم اور اعزاز کیا، اپنے محل میں شاندار دعوت کی اس میں مولاناؒ نے اپنے انداز میں گفتگو کی امیر حسن نے اس کا جواب دیا گفتگو کے دوران ادب اسلامی سے متعلق اچھا مذاکرہ بھی ہوا زرقاء یونیورسٹی آل بیت یونیورسٹی، اصحاب کھف اور دوسرے مقامات بھی دیکھنے گئے وزارت اوقاف کی جانب سے حضرت مولاناؒ کی تقریر کا پروگرام اور اس کے بعد پر تکلف عشائیہ کا نظم تھا، اس کمزوری، اضمحلال اور ضعف کے باوجود حضرت مولاناؒ نے آیت "الا تفعلوہ تکن فتنۃ۔۔۔" کی روشنی میں بڑی پر جوش تقریر فرمائی جس نے حضرت کے شباب و جوانی کی تقریروں کی یاد دلادی، اسے خود حضرت مولاناؒ کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

"عمان کے اس قیام کا سب سے بڑا حاصل اور زریں موقع وزارۃ اوقاف کا وہ شاندار اور جامع جلسہ تھا

جس میں عمان سے دانشوروں، اعلی تعلیم یافتہ اور مختلف شعبوں کے ذمہ داروں کا کثیر نمائندہ طبقہ ایک طرح سے عمان کا جوہر (Cream) جمع تھا وزیر اوقاف الدکتور عبدالسلام..... نے راقم کا مفصل تعارف کرایا اور بعض تصنیفات خصوصاً "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا ذکر کیا، راقم نے قرآن مجید کی آیت "الا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر" (الانفال ۷۳) کو عنوان بنا کر مسلمانوں کو بالعموم اور عربوں کو بالخصوص ان کے فرض و ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ یہ کب نازل ہوئی اور کتنے لوگ اس کے مخاطب تھے، یہ سورۃ انفال کی آیت ہے، اور بخاری شریف کی حدیث ہے کہ اس تیسری مسلم شماری میں مدینہ طیبہ میں (ڈیڑھ ہزار) مسلمان نکلے، جب ان سے یہ کہا جارہا ہے کہ اگر تم نے دنیا کو جاہلیت سے نکالنے اور خدا پرستی، ایمان و توحید اور دعوت اسلامی کے لئے عالمگیر محاذ نہیں بنایا اور اپنی پوری توانائی اس محاذ پر نہیں لگائی تو پھر دنیا میں فتنہ اور فساد کبیر برپا رہے گا، اب عربوں کو سمجھنا چاہئے کہ اتنی بڑی تعداد اور ان وسائل و امکانات کا مالک ہونے کے ساتھ جو ان کو اس وقت حاصل ہیں ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ خدا کو کیا جواب دیں گے" (کاروان زندگی ج ۷ ص ۱۶۶)

شام کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ احمد کفتارو صاحب کی جانب سے حضرت مولاناؒ اور راقم کو دعوت نامہ ملا تھا، حضرت مولانا کا ضعف و کمزوری کی وجہ سے سفر نہ ہو سکا، لیکن راقم کو اجازت دی کہ ان کے جلسہ میں دمشق جاکر شرکت کروں، ۲۵ راگست ۹۸ء کی صبح میں لکھنؤ کے تاجر الحاج محمد عرفان کی ہمراہی میں ٹیکسی سے روانہ ہوا، اور ۳۱ راگست کی شب جدہ آگیا، حضرت مولاناؒ مدینہ منورہ پہونچ چکے تھے، ہم نے یہ شب اپنے داماد عزیزی سید احمد حسن سلمہٗ کے یہاں گزاری اور صبح روانہ ہو کر مدینہ منورہ ظہر کے وقت پہونچ گئے، اسی وقت حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھ کر خوش ہوئے اور پوری روداد سفر سنی، مفتی اعظم شیخ کفتارو کے تحفے (سند، گھڑی و طغرا) پیش کئے عمرہ و زیارت سے فارغ ہو کر ۶ ستمبر ۹۸ء کو حضرتؒ اپنے رفقاء کے ساتھ جدہ سے لکھنؤ روانہ ہوئے، حضرت کا حرمین شریفین کا آخری سفر تھا۔

حضرت مولاناؒ نے تقریباً تمام عرب ممالک کے ایک سے یادہ بار سفر کئے اور انہیں خطاب کیا انکی اپنی ذمہ داری یاد دلائی، ان تقریروں کو "اے عربوں مجھ سے صاف صاف سن لو" اور مسلمان

عربوں سے صاف صاف باتیں" نیز" عرب واسلام" کے عناوین سے کتابیں شائع ہو چکی ہیں، عربوں نے ان کی باتیں سنیں اور ان کی بے حد قدر و تکریم واعزاز کیا، اور ان کتابوں کو پڑھا بھی اور پڑھایا بھی دانشوروں نے بھی اور عوام نے بھی، خاص طور سے مولاناؒ کی پہلی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (جس کا اردو ترجمہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" ہندوستان میں شائع ہو چکا تھا) (کو جب مصر کے موقر و معتبر ادارہ لجنة التأليف والترجمة والنشر) نے شائع کیا تو پوری عرب دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور بہت جلد ان حلقوں میں بھی پہنچ گئی جو زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے، اس کتاب نے ان کے بھولے ہوئے سبق اور ان کے اصل مقام وذمہ داری کو یاد دلایا تھا، مولاناؒ نے ۱۹۵۱ء کے حج کے بعد پانی کے جہاز سے مصر جانے کا ارادہ کیا، جس کی تفصیل گزشتہ سطروں میں گزر چکی ہے ان کے ایک رفیق سفر نے بتایا کہ ہم کسی روز سے کوشش کر رہے تھے کہ کسی جہاز میں جگہ مل جائے مگر حاجیوں کی واپسی کی وجہ سے بہت بھیڑ تھی اور ہماری گزارش کوئی سننے کے لئے تیار نہیں تھا، چنانچہ ایک صبح کو میں جہاز کے کپتان کے پاس پہونچنے میں کامیاب ہو گیا، اس سے بڑے ادب ولجاجت سے عرض کیا کہ ہمارے ایک بڑے عالم و بزرگ مصر جانا چاہتے ہیں ہم کئی روز سے تگ ودو کر رہے ہیں مگر جگہ نہیں مل رہی ہے، براہ کرم توجہ کیجئے وہ ہندوستان کے قابل احترام عالم ہیں اس نے ابتداء میں معذرت کی مگر یک دم سے اس نے سوال کیا کہ ان عالم کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا شیخ ابوالحسن علی، نام سنتے ہی کہا: ماذا خسر..... کے مصنف؟ میں نے جواب دیا جی ہاں! وہی! اس نے کہا کہ کہاں ہیں چلو مجھے ملاؤ اس نے ملاقات کے بعد اسی وقت سفر کا نظم کر دیا اور فرسٹ کلاس میں جگہ کی پیش کش کی، حضرت مولاناؒ نے اپنے مزاج کے مطابق معذرت کی اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا، عصر حاضر کے ممتاز عالم، عظیم دانشور اور نامور خطیب و رہنما ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی نے مولاناؒ کے بارے میں اپنے نقوش وتاثرات تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں جامعہ ازہر کا طالب علم تھا، اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا مطالعہ کر رہا تھا کہ چند ہندوستانی طالب علم آئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ آپ شیخ ابوالحسن علیؒ ندوی کو جانتے ہیں، میں نے کہا کون؟

ماذا خسر العالم..... کے مصنف؟ طلبا نے جواب دیا، جی ہاں! کل وہ قاہرہ پہونچ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ جیسے ہی وہ آئیں مجھے ان کے پاس لے چلنا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی اس ملاقات کے بعد مولاناؒ کے ایسے گرویدہ ہوئے اور ان کے علم و فضل اور زبان وادب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے ساتھ مصر کے گاؤں، شہر اور دیہات کے سفر کئے، اپنے گاؤں لے گئے اور اس کی مسجد میں خطبہ دلایا اور مسجد ہی میں ساتھ قیام کیا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی ایک جگہ تحریر کرتے ہیں: ہم نے شیخ (ابوالحسن) کی کتابوں اور رسالوں میں ایک نئی زبان اور جدید روح محسوس کی ،ان کی توجہ چند ایسے مسائل کی جانب ہوئی جن کی جانب ہماری نظر نہیں پہونچ سکی تھی، شیخ ہی کی تحریر نے ہیں حضرت ربعی بن عامرؓ کے فارس کے سپہ سالار اعظم رستم کے دربار میں ان کے جراءت مندانہ موقف اور بلیغانہ گفتگو کی جانب توجہ دلائی، جنھوں نے چند جملوں میں اسلامی فلسفہ اور اس کے مقاصد کو خوبصورت انداز، شاندار طرز بیان اور مؤثر طور سے بیان کر دیا تھا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے "مبعوث" کیا ہے کہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت میں لگادیں، اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعتوں میں لا کھڑا کریں اور مذاہب کے جور و ستم سے آزاد کرا کے اسلام کے عدل وانصاف کے دامن تلے پہنچادیں، میری دانست میں مولانا شیخ ابوالحسن علیؒ ندوی پہلے ایسے شخص ہیں کہ جنھوں نے ہمیں ان الفاظ و موقف کی اہمیت و قیمت سے روشناس کرایا اور اسی سے متاثر ہو کر بعد میں دوسرے مصنفین نے لکھنا شروع کیا۔

عربوں کا مزاج رہا ہے کہ وہ کسی غیر عرب کو نہ تسلیم کرتے ہیں نہ اس کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر احمد امین جو ممتاز ادیب محقق اور عالم تھے، "ماذا خسر..... کے مقدمہ میں یہ لکھ گئے کہ ..... تاہم اس کتاب کے مصنف عجمی ہیں" کتاب چھپ کر آئی اس وقت انہیں کے زیر نگرانی پروفیسر شکری فیصل مرحوم (شامی نژاد) نے اس پر "الثقافۃ") میں جو ڈاکٹر احمد امین کی ادارت میں نکلتا تھا، کتاب پر ایک مفصل تبصرہ لکھا اور اس کی علمی فکری اور تاریخی خوبیوں کا اجاگر کرتے ہوئے اس کی زبان اور طرز تحریر پر دل کھول کر داد دی اور لکھا: مصنف کا قلم عجمی ہونے کے باوجود بلاغت و فصاحت میں کسی عرب سے کم نہیں، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پروفیسر شکری فیصلؒ کے رفیق کار

ہونے کا اس عاجز کو شرف حاصل ہے انہوں نے اس واقعہ کو کئی بار بیان فرمایا مرحوم بڑے نامور ادیب انشاء پرداز اور محقق تھے، راقم السطور نے دمشق میں اور مدینہ منورہ میں انہیں حضرت مولاناؒ سے بڑی عقیدت، ادب اور احترام سے ملتے ہوئے اور مجلس میں بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے۔

دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں حاضری کے چند روز ہوئے تھے کہ عالم عرب و اسلام کے ممتاز مفکر و نامور مصنف استاذ گرامی پرفیسر المبارک نے درجہ میں فرمایا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب "ماذ خسر العالم بانحطاط المسلمین" اس صدی کی بہترین کتاب ہے، اگر کسی نے یہ کتاب نہ پڑھی تو اس کا مطالعہ ناقص رہے گا، یہی تاثر شام کے ممتاز ادیب و عالم اور مدینہ یونیورسٹی کے سابق استاذ "شیخ محمد المجذوب" نے اپنی کتاب "علماء و مفکرون عرفتھم" میں بیان کیا ہے مصر و شام، فلسطین و عراق اور سعودی و خلیج کے علماء و مفکرین نے بھی اس کتاب کو اس دور کی بہترین کتاب قرار دیا اور اس فائدہ اٹھایا، اس کتاب کا مقدمہ لکھنے والے ڈاکٹر موسیٰ یوسف، استاذ سید قطب شہیدؒ شیخ احمد الشرباصی کے علاوہ علامۃ الشام شیخ محمد بہجۃ البیطار، جماعت اخوان مسلمین شام کے مراقب عام ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، نامور ادیب والبیلے انشاء پرداز استاذ علی الطنطاوی، سعودی عرب کے چوٹی کے ادیب شیخ عبدالعزیز الرفاعی و شیخ عبدالغفور العطار نے بے حد تحسین و ستائش کی اور اعتراف کیا کہ ہر لحاظ سے یہ کتاب اس صدی کی ممتاز کتاب ہے۔ جس نے امت مسلمہ کی رہنمائی اور قیادت کا فریضہ انجام دیا ہے اس کتاب کے بعد مولاناؒ کی عربی میں بڑی معرکۃ الآرا کتابیں شائع ہوئیں۔ اس میں عرب مسائل اور مشکلات سے بحث کی اور بڑے اخلاص و ہمدردی کے ساتھ حل پیش کئے عرب ممالک کے پہلے اور دوسرے طویل اسفار کے بعد مولانا محترم دمشق اور مدینہ منورہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور سے تشریف لے گئے۔ دمشق یونیورسٹی میں "تاریخ دعوت و عزیمت" کے موضوع پر لکچر دیئے، جن کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے اور مدنیہ یونیورسٹی میں "النبوۃ والانبیاء" سے متعلق اس کے بعد رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامی مدینہ یونیورسٹی کے بنیادی رکن کے طور سے مسلسل سفر ہوئے، سیمینار، کانفرنس تعلیمی، علمی مجلسوں اور اکادمیوں کی دعوت پر بار بار عرب ممالک کے سفر ہوتے رہے،

ہر سفر میں مولاناؒ نے اپنے لیکچر، خطبوں، تقریروں اور ریڈیو ٹیلی ویژن پر عوام، خواص اور سلاطین و شہزادگان کو خطاب کیا اور بڑی جرءت و بے باکی سے ان کی کمزوریوں، مغربی تہذیب، سامراجی طرز اور تجدد و ترقی پسندانہ خیالات، نظریات و رجحانات کے زیر اثر ہو جانے پر سخت الفاظ میں تنقید کی، "اسمعیات" کے نام سے ہر ملک کو مخاطب کیا، سن اے مصر، سن اے شام، سن اے لالہ صحرا (کویت) سن اے ایران اور عالم کا پیغام جزیرۂ عرب کے نام، ایسے واضح صاف صاف اور بے باک و نڈر بیانات ہیں جس نے یقینی طور پر عالم عرب کو متاثر کیا۔

راقم سطور کا کئی بار حضرت مولاناؒ کی رفاقت میں عرب ملکوں میں جانا ہوا، کانفرنسوں، سیمیناروں اور مجلسوں میں نشست و برخاست کی سعادت حاصل ہوئی، اس میں مولانا نے عرب قومیت اور اس کے داعیوں پر شدید ترین تنقید کی خصوصاً مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے زیر قیادت قوم پرستی کو عقیدہ (اسلام کا بدیل اور جمال عبدالناصر کو "نبی القومیۃ العربیۃ" بنادیا گیا تھا، مولانا سے اس کیلئے اسکے خلاف پرزور تقریریں کیں اور مضامین تحریر کیئے اور جس جرءت، حق گوئی اور سلیقہ سے بات کی، عرب علماء و مفکرین نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے ان کو اپنا ترجمان بنالیا، اپنی انہیں خوبیوں کی بناء پر ہر کانفرنس، اجلاس اور سیمیناروں میں مندوبین کی نمائندگی کے لئے منتخب کئے جاتے تھے۔ اسی طاقتور و مضبوط موقف کا ہی نتیجہ تھا کہ عرب ممالک میں اس سیلاب بلا پر بند لگایا جاسکا، اور تمام عرب تحریکوں، اداروں، مراکز و معاہد نے اسی روشنی و رہنمائی میں اپنے کاموں کو جاری رکھا، ہمارے ملک میں کچھ ایسے عناصر جو عالم عربی کے حالات و واقعات سے ناواقف یا انجان تھے، حضرت مولانا کے اس موقف اور ان کی دعوت پر معترض تھے بلکہ کچھ نے اس نفرت و ناپسندیدگی کا اظہار کیا مولانا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"میں اس کو اپنی بدقسمتی سمجھوں یا خوش قسمتی کہ مجھے عالم عربی کی کمزوریوں اور بیماریوں اور اس کے سر پر منڈلانے والے خطرات سے واقفیت کے وہ مواقع حاصل ہوئے جو (خاص حالات و اسباب کی بناء پر) ہندوستان میں میرے محدود علم میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوں گے، میری تعلیم و تربیت شروع

سے عرب اساتذہ کے ماتحت ہوئی، بدو شعور ہی سے اس سرزمین سے اپنے وطن سے انس اور واقفیت پیدا ہو گئی ۱۹۴۷ء سے پہلے مجھے ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن عرب کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے میں وہاں کی تحریکات، رجحانات، مکاتب خیال اور شخصیتوں سے اتنا واقف ہو گیا تھا کہ مجھے کسی عرب ملک میں کبھی اجنبیت اور بیگانگی احساس نہیں ہوا"

مولاناؒ نے عربوں سے متعلق ان کے مسائل اور اسکے حل کے لئے اپنے بیانات اور آزادانہ، تنقید کو بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ انہیں ایسا کیوں کرنا پڑا تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ذاتی داستان جس کا سنانا میرے لئے کچھ زیادہ خوشگوار اور آسان کام نہیں ہے، اس لئے پیش کی گئی کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ میں عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں اور نہ میری معلومات سیکنڈ ہینڈ ہیں اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آگیا ہوں میں اپنے کو (ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی) اس وسیع وعظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کے قسمت سے وابستہ ہے ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لئے قومیت عرب کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے اور فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعوی کرنے کا حق ہے کہ:

میرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہائے عجم رہا۔
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی۔

مولاناؒ کے اس امتیاز، انفرادیت، اخلاص وللّٰہیت، بے لوثی و بے نیازی اور اس کے ساتھ عرب مسائل و مشکلات ہمدردی، عربوں کی مغربیت، اشتراکیت قومیت اور اس کے نتیجہ میں عقیدۂ اسلام اور رسول عربی ﷺ سے دوری اور اجنبیت کے خطرہ کا بروقت اظہار نے ہی عرب دنیا میں ان کو وہ مقام عطا کر دیا جو اس دور میں کسی غیر عربی کو حاصل نہ ہو سکا، مولانا کی عربی زبان وادب سے متعلق "مختارات من ادب العرب" ہو "قصص النبیین" و "روائع اقبال" ہو یا اسلامیت سے متعلق "الارکان الاربعہ" و "الصراع بین الفکر الغربیة والفکرة الاسلامیة" ہو یا "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ہو یا "کارثۂ فلسطین" ہو ہر ایک نے اپنا اثر و رنگ تمام عرب ممالک کی فضاؤں میں دکھایا جس طرح عربوں نے ان کی حمیت دینی، غیرت اسلامی، ربانیت و روحانیت، تعلیمی و تربیتی فکر و فضیلت کا اعتراف کیا اور اثر قبول کیا عرب دنیا ان کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتی تھی، مولانا کی تصنیفات عرب ممالک میں بے حد مقبول ہیں، شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جس کے متعدد ایڈیشن اور ہزاروں کی تعداد میں شائع نہ ہوئی ہو "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمون" کے چالیس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں میرے مدینہ منورہ کے دوران قیام ایک مدنی بزرگ کے ذریعہ کتاب "شیخ الاسلام ابن تیمیہ" کے پچاس ہزار نسخے شائع کرا کے مفت تقسیم کئے گئے۔

مصر و شام میں مولانا کی تصنیفات کا داخلہ اور اشاعت ممنوع ہے لیکن اگست ۱۹۹۸ء میں مجمع ابی النور الاسلامی دمشق کے جلسہ تقسیم اسناد کی دعوت پر یہ عاجز دمشق گیا، تو حضرت نے اپنی تصنیفات کے کچھ نسخے ساتھ کر دیئے کہ دمشق کے پبلشر دار ابن کثیر کو پہنچا دوں، پہنچا تو اس کے مالک استاذ علی نے بتایا کہ حکومت سے انہوں نے ان کتابوں کی اشاعت کا اجازت نامہ حاصل کر لیا ہے اب کئی کتابیں اور سید عبدالماجد کے قلم سے مولانا کی مختصر سوانح حیات بھی شائع کر دی ہے۔

مولاناؒ کی مقبولیت اور ان کے اثرات کو جاننے کے لئے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، راقم سطور دمشق کے مدارس تحفیظ القرآن کے ایک انعامی جلسہ میں تقریر کر کے بیٹھا ہی تھا کہا ایک چھوٹا سا بچہ آیا، سلام کیا، ہاتھ کو بوسہ دیا، اور کہا کہ شیخ ابوالحسن کیسے ہیں؟ میرا اسلام پہنچایئے اور دوبارہ

آیئے تو ساتھ لایئے، میرا انہیں دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے، میں نے پوچھا کہ تم شیخ کو کیسے جانتے ہو؟ جواب دیا کہ میں نے انکی کتابیں پڑھی ہیں، اور جب وہ شام آئے تھے تو میرے والد ان سے ملتے رہتے تھے۔ انھوں نے ان کے حالات وواقعات بتائے ہیں، میری بڑی آرزو ہے کہ ان سے ملاقات کرنے اور ان کی باتیں سننے کی سعادت حاصل کروں۔ یہ تنہا ایک واقعہ نہیں ہے اسی طرح کی بے شمار کہانیاں ہیں جو عرب دنیا میں سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

آخر میں بطور نمونہ عالم عرب کے ممتاز و جلیل القدر اسلامی مفکر و استاذ و مصنف استاذ محمد المبارک (جو کلیۃ الشریعۃ دمشق میں راقم سطور کے استاذ تھے) کا حضرت کے نام ایک مختصر خط پیش ہے:

"میرے معزز استاذ ابوالحسن علی الحسنی ندویؒ، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور اپنی نگرانی میں رکھے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دمشق میں آپ سے ملاقات کا موقع ہمارے لئے بڑی سعادت کا باعث تھا۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ مجھے آپ سے جو خصوصی محبت ہے وہ کسی مفکر و داعی سے نہیں باوجودیکہ میں ان سب حضرات کا قدر دان ہوں اور سبھی سے محبت رکھتا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ حشر میں مجھے آپ کے ساتھ اپنی رحمت کے سایہ میں رکھے گا۔

محمد المبارک ۱۶ر رمضان ۱۹۸۴ء۔

عربوں کو مولانا علی میاںؒ کی ذات میں ایک ایسی شخصیت مل گئی تھی جس نے اپنے زور قلم اور فصاحت بیان سے ان کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا اور اسلامی فکر و ورثہ کے تحفظ و بقا میں سجدہ ذانہ کردار ادا کیا اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ اپنے سایہ رحمت میں رکھے۔

☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
اور
تبلیغی جماعت

از: مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی
(مدیر ماہنامہ "الفرقان" - لکھنؤ)

یہ موضوع جو اس ہیچمداں کے سپرد کیا گیا ہے، اس کی حیثیت دراصل چودہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں رقم کئے گئے دعوت و عزیمت کی تاریخ کے ایک اہم باب کی ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ مورخانہ دیانتداری کے ساتھ اس موضوع پر اپنے معلومات و مشاہدات کا حاصل پیش کروں۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

پہلے میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی شخصیت کے ان پہلوؤں کا تذکرہ کروں گا جن کی وجہ سے انہیں داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی برپا کردہ دینی جدوجہد سے خصوصی مناسبت ہوئی۔

حضرت مولانا کا سنہ ولادت ۱۹۱۴ء ہے۔ مشیت خداوندی نے ان کے لئے جس خانوادے کا انتخاب فرمایا تھا وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں نہ صرف عالی نسبی بلکہ علمی، تہذیبی، روحانی اور اخلاقی ہر لحاظ سے ممتاز اور غیر معمولی استعداد کا حامل تھا۔ چنانچہ بہت سے اوصاف و کمالات انہیں فطری طور پر اپنے آباء واجداد سے ورثہ ملے ان کے والد ماجد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان

کی شخصیت کے علمی، ادبی اور تصنیفی پہلو اظہر من الشمس ہیں۔ سن وسال کے اعتبار سے بزرگی کے مرحلے میں داخل ہونے سے بہت پہلے وہ حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ سے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں "اپنے زمانہ کے اہل اللہ اور عارفین میں تھے" اور جن کے بارے میں خود حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ نے یہ شہادت دی ہے کہ وہ "معرفت کا لب لباب اور دنیا کے لئے زینت وبرکت کا باعث تھے" اس وقت صلاح وتقویٰ کی سند پاچکے تھے جب انہوں نے (یعنی سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ نے) اپنی صاحبزادی محترمہ خیر النساء صاحبہ کے لئے دوسرے رشتوں پر ان کو یہ کہہ کر ترجیح دی تھی کہ :

"سید جوان صالح، عالم اور ہونہار ہیں۔ میں ان پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے نزدیک غربت اور امارت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اصل دیکھنے کی چیز صلاحیت اور علم ہے" "حضرت مولانا" ابھی ۹-۱۰ سال کے کمسن بچے ہی تھے کہ ان کے سر سے ایسے باکمال باپ کا سایہ عاطفت اٹھ گیا اس حادثہ کے بہانے ان کی عظیم المرتبت والدہ ماجدہ کو جو شروع سے اعلیٰ روحانی استعداد اور غیر معمولی ذوق دعا سے بہرہ ور تھیں۔ مشیت الٰہی نے وہ بے چینی واضطراب بخش دیا۔ جو دعا کی جان ہے۔ اور پھر جس طرح ہر طرف سے کٹ کر وہ صرف مالک حقیقی سے لو لگانے اور اپنے لخت جگر کے لئے دعا ومناجات اور اس کی تربیت ونگرانی کے لئے یکسو ہوگئیں اس سب پر غور کرنے سے "ان ربی لطیف لما یشاء" کی ایک اور عملی تفسیر سامنے آتی ہے۔ خود حضرت مولانا نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب خدا کا کسی پر فضل خاص ہونے والا ہوتا ہے اور خدا کسی کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی سبب سے اس کے اندر بے کلی اور بے چینی اور اضطراب وپریشانی پیدا کردیتا ہے، ہزاروں سکون قربان اس بے چینی پر جو سب سے ہٹا کر خدا کے آستانے پر کھڑا کردے اور سب سے توڑ کر اس سے جوڑ دے۔"

حضرت مولاناؒ کی والدہ ماجدہ کا یہ حال خود انہی کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتی ہیں :

"دعا گویا میری غذا تھی، بغیر دعا کئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ تمام مشاغل چھوٹ گئے۔ اگر بات بھی کرتی تو دعا کیساتھ کرتی، کوئی گھڑی دعا سے خالی نہ گذرتی، جمعہ گویا روز عید تھا اور فی الحقیقت عید کا دن بھی ہے، تمام دن دعا کرتی، خاص کر عصر سے غروب آفتاب تک

تنہا بیٹھ کر دعا میں ایسی مشغول رہتی کہ کسی طرف سے آنکھ نہ اٹھاتی، مرغ کی آواز پر اور ہر اذان کے ساتھ دعا کرتی، حتی الامکان کوئی وقت دعا کا ضائع نہ کرتی، اور کوئی بات نہ چھوڑتی، ہر خوف سے امان مانگتی، اور ہر خوبی کی طالب ہوتی، یہ اس مالک حقیقی کی رحمت وعنایت تھی کہ جو جو معاملات زندگی پیش آنے والے تھے، دعا کے وقت سب پیش نظر ہو جاتے اور اس قدر جوش پیدا ہو جاتا کہ بے خودی ہو جاتی اور تمام جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور اس کی شان قدرت پر نظر کر کے تڑپ جاتی جس طرح مرغ ذبح تڑپتا ہے مگر بے خودی میں بھی دعا جاری رہتی اور ہر وقت اپنے قیافے پر نظر کرتی اور کہتی :

جو عیب قسمت کے ہیں مٹا دے تیرا ہی عالم میں نام ہوگا

اس کی عنایت وشفقت پر مجھے اس قدر ناز تھا کہ یہ کہتی تھی کہ "یا ارحم الراحمین، اگر تو مجھے میری کوشش میں کامیاب نہیں کرے گا تو ایسی چیخ ماروں گی کہ آسمان وزمین ہل جائیں گے اور تیرے در سے ہرگز سر نہ اٹھاؤں گی :

نہ اٹھونگی میں اس در سے کوئی مجھ کو اٹھا کر دیکھے
مجھے ہے آرزو جس کی، اٹھوں گی میں وہی لے کر

یہ اس کی محبت اور عنایت ورحمت تھی کہ اتنی بڑی سرکار میں مجھے ایسا ڈھیٹ کر دیا تھا اور بے حجاب کہ میں کہتی اور کہہ کر اپنی بات پر اڑ جاتی۔ اور اتنا بڑا بادشاہ مالک الملک ہو کر مجھ ادنیٰ فقیر کی ناز برداری کرتا۔

ان کی تمام تر تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ان کے واحد لخت جگر "حضرت مولانا" ہی تھے۔ چنانچہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کی شہادت ہے کہ :

"ان کی ساری زندگی دعا تھی اور ان کی ساری دعا چچا میاں (یعنی حضرت مولانا علی میاں) کے لئے تھی، وہ جس وقت بھی دعا کرتیں اور جس کے لئے بھی کرتیں وہ دراصل ان ہی کے لئے ہوتی۔ (ذکر خیر : ص : ۱۱۶)

ان کی منظوم دعاؤں کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے :

مری اولاد کو تو یا الٰہی اتنی ہمت دے
کہ ہو کر قوت بازو خبر لیں ہم ضعیفوں کی

انہیں کے علم اور اقبال کی شہرت جہاں میں ہو
ہے شہرت جیسی عالم میں نبی کے ہمشیروں کی
ابوبکر و عمر عثمان علی میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر ہوں ان میں اور وہی فطرت کریموں کی
ترے دربار سے بہتر کی بھی امید بر آئے
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی

اور مناجات کے چند اشعار ہیں :

دعا مقبول ہو میری ہو اور میرا مدعا حاصل
میری اولاد پر ہوں رحمتیں اور برکتیں نازل
تو کر فضل و کرم ان پر رہے تیرا کرم شامل
انہیں اسلام کی خدمت میں تو کر ماہر و کامل
انہیں کے ہاتھ سے اسلام کا اب بول بولا ہو
انہیں کے نور ایمان سے دو عالم میں اجالا ہو

اور حضرت مولانا کے لئے ان کی یہ دعا سنئے کہ :

رہے زندہ باقی جہاں میں علی
رہے ترے حفظ و اماں میں علی
ہو آباد کون و مکاں میں علی
ہو سرسبز باغ جہاں میں علی
علی سے ہو روشن چراغ جہاں
علی سے ہو سرسبز باغ جہاں

اپنے بارے میں ان کی تمناؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے لکھا تھا :

"میرے لئے ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مجھ سے دین کی تقویت اور اسلام کی اشاعت ہو، کبھی کبھی مجھ سے پوچھتیں، علی! تمہارے ہاتھ پر کبھی کوئی مسلمان بھی ہوا ہے؟ میں کہتا کہ

ہاں! اکا دکا کبھی کسی نے کلمہ پڑا ہے۔ فرماتیں کہ یہ آرزو ہے کہ جماعت کی جماعتیں تمہارے ہاتھ پر مسلمان ہوں، ایک روز بڑی ٹھنڈی سانس لے رہی تھیں۔ چھوٹی ہمشیرہ نے کہا کہ آخر آپ کی خواہش ہے کہ علی نبی ہو جائیں فرمایا کہ کیا میں نہیں جانتی کہ نبوت ختم ہو گئی۔ میری آرزو ہے کہ ان کے ہاتھ پر جماعتوں کی جماعتیں اسلام لائیں، اور دنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اسلام کا ڈنکا بج جائے۔ (ذکر خیر : ص : ۷)

والدہ ماجدہ کے بعد حضرت مولانا کی شخصیت پر براہ راست سب سے زیادہ اثر ان کے بڑے بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کا پڑا۔ ان کی بزرگی، عالمانہ وقار و سنجیدگی، حلم و بردباری اور جدید و قدیم کی جامعیت جیسے اوصاف محتاج بیان نہیں۔ ان کو دعا و مناجات اور عبدیت کا جو ذوق ملا تھا اسکا ایک ثبوت ان کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے والدہ ماجدہ محترمہ خیر النساء صاحبہ کی منظوم مناجاتوں کے مجموعہ کلید باب رحمت کے دیباچے کے طور پر اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابو الحسن علی کے نام سے لکھا تھا۔ صرف ۲۶ سال کی عمر میں سائنس سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے اپنے والد ماجد کے نام اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے جو خط لکھا تھا، اس سے ان کے دین کی پختگی اور دین کی گہری سمجھ اور فطری حقیقت پسندی اور عملیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ نیز آگے چل کر انہوں نے جس طرح مولانا کو جب کہ ان کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی ڈاکٹر امبیڈکر کے پاس اسلام کا پیغام لے کر بھیجا اور پھر ۱۹۵۰ء ۱۹۵۱ء میں جب کہ مولانا شرق اوسط کے ایک طویل دعوتی دورے پر گئے ہوئے تھے ان کو جس طرح کے خطوط لکھے ان کے مطالعہ سے اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کی بے پناہ فکر مندی اور ملکی و عالمی حالات سے گہری واقفیت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

صرف ایک خط کا اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں، لکھتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے اور تمہیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان و کرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند ایسے ملکوں کے غیر مسلموں میں استکبار قبول حق سے بڑا مانع ہے۔ افریقہ میں مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے ناآشنا ہے۔ گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے۔

قرین عقل یہ ہے کہ حق کیے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزوجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لئے کھول دیں۔ مصر افریقہ کا دروازہ ہے اگر اہل مصر کو اس کے ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور مغرب صحراء اعظم اور صحرا کے جنوب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں، مصر ہو کر گذریں تو ان کی دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قرب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ اسلام سے منور ہو سکتا ہے۔ مصری سوڈان کا تعلق ایک طرف مصر سے ہے اور جنوب میں یوگینڈا کینیا اور کانگو سے ہے۔ سوڈان کے لوگ بہ نسبت مصر کے تمدن جدید سے دور اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔

مصر میں جو سوڈانی مقیم ہیں ان میں بھی کام ہونا چاہئے، ازہر کے سوڈانی طلبہ کے ذریعہ سے تمام سوڈانیوں کو جمع کیا جاسکتا ہے اور ان لوگوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے جو سوڈان کی رائے عامہ پر اثر رکھتے ہیں اور قاہرہ میں مقیم ہیں"

حضرت مولانا نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

میں نے گوشہ نشیں زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکر مندی، اتنی وسیع اور گہری واقفیت اور اس کے حالات و تغیرات کے تتبع کا ایسا ذوق نہیں دیکھا، کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ ان کا دل اس سے متعلق تھا"

اہل نظر جانتے ہیں کہ شخصیت کے بننے بگڑنے میں شروع کے یہ سال کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے حضرت مولانا کی قسمت پر جن کے لئے قسم ازل نے بہترین انتظام شروع ہی سے مقدر کر دیا تھا۔ شاب نشافی عبادة الله شاید ایسے ہی خوش نصیب نوجوانوں کے لئے کہا گیا ہے۔ چنانچہ سلامت طبع اور اعلیٰ استعداد کی جو دولت انہوں نے فطرۃً وراثت میں پائی تھی اسے اس ماحول اور اس انداز تربیت سے کتنی جلا ملی ہوگی اس کا اندازہ کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اب آیئے ذرا ایک اجمالی نظر اس دور کے ہندوستان پر ڈالیں جو شکست و ریخت کے عمل سے

گذر رہا تھا۔

انگریزوں نے ایک طرف تو منظم منصوبہ بند اور پیہم اقدامات کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن سے انہوں نے اقتدار چھینا تھا اور جو ان کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے ذلت و پستی، پسماندگی و انحطاط اور غربت و افلاس کی عبرتناک مثال بنادیا اور دوسری طرف اس کی بھی کوشش کی کہ ہندوستانی قوم کے ایک مخصوص طبقے کو لائق بنادیں کہ اگر انہیں اس ملک کو چھوڑ کر جانا پڑے تو وہ طبقہ اسی راہ پر گامزن رہ کر اور انہی کی سکھائی ہوئی تدبیروں کے ذریعہ ان کے چھوڑے ہوئے ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔ اور اسلام اور مسلمانوں کو بالکل کچل کر رکھ دیں۔

وہ زمانہ ہمارے ممدوح ریحانۃ العصر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے عنفوان شباب کا ہے۔ یہ وہی دور ہے جب یہ سارے خطرات نوشتہ دیوار کی طرح سامنے آگئے تھے۔ اس وقت ان خطروں کو محسوس کرنے والے مسلمان دو گروہوں میں منقسم تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اصولی و اجمالی طور پر مولانا کا رجحان اس گروہ کی طرف تھا جسے علماء کی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے :

میں کچھ اپنے خاندانی ماحول اور کچھ تاریخی مطالعہ کی بنا پر ان علماء کے طرز عمل اور مسلک کو نہ صرف پسند کرتا تھا بلکہ ضروری سمجھتا تھا جو جنگ آزادی میں برادران وطن کے نہ صرف دوش بدوش بلکہ جہاں تک قربانیوں اور اپنی ملت کے افراد کے غیظ و غضب اور مخالفت و مقاطعہ کا ہدف بننے کا سوال ہے ان سے آگے ہے۔ میں نوعمری کے باوجود یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کو ضرور ایک دن آزاد ہونا ہے۔ غیر ملکی اقتدار کی یہ صورت حال غیر فطری، غیر انسانی اور زیادہ دنوں تک باقی رہنے والی نہیں، اگر مسلمانوں نے اپنے ملک کی تحریک آزادی میں حصہ نہیں لیا، تو ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان اس کی سرزمین پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہیں گے اور ان کا اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کا مطالبہ عزت و ہمدردی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ (کاروان زندگی : ص :۲۵۱)

یہاں پر ایک بہت اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ خود جمعیۃ علماء ہند کے اندر صف اول کے لوگوں میں ایسے حضرات تھے جو کانگریس کے ساتھ غیر مشروط اشتراک کرکے اور اپنی الگ شناخت بنائے بغیر مسلمانوں کی تمام تر طاقت کو اس کے اندر جھونک دینے اور ضم کردینے کے حق میں نہیں

تھے۔ بلکہ ان کا احساس تھا کہ کانگریس کے پیش نظر ہندوستانی اقوام کی جمہوریت متحدہ کی تشکیل کے بجائے ہندوستان کی قومیت متحدہ کا جو نصب العین ہے اسے زیادہ گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہندوستان کی ساری قوموں یا فرقوں کو توڑ پھوڑ کر ایک قوم بنا دیا جائے جس سے ہر ایک کے قومی یا فرقہ وارانہ امتیازات مٹ جائیں۔ میری محدود معلومات کے مطابق ان علماء میں دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں ایک مولانا ابوالحاسن محمد سجاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی، باہر کے لوگوں میں دو حضرات ان احساسات میں شریک تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور راقم کے والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان خطرات و احساسات کو سب سے زیادہ طاقتور، مدلل اور مفصل انداز سے منظر عام پر لانے کا کام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ہی انجام دیا۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں پر تنقید کے طویل سلسلے سے فارغ ہو کر احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اصل نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر ایک جماعت کی تنظیم اور ایک ہمہ گیر اصلاحی و دعوتی تحریک کی آواز لگا چکے تھے۔

اس عرصہ میں حضرت مولانا اپنی پہلی مایہ ناز تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف میں مصروف و منہمک تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں اس کام کا آغاز کیا تھا۔ اور ۱۹۳۹ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ مصنف کتاب نے اس کا ایک نسخہ والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کو بھی بھیجا۔ اس کتاب پر ان کا تاثر نقل کرنے سے پہلے یہاں یہ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء ہی سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں وہ (یعنی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی) شدید فکر مندی اور اضطراب میں مبتلا تھے۔ اور ۱۹۳۹ء تک پہنچتے پہنچتے ان کا اضطراب آخری حدوں کو پہنچ گیا تھا، جو ان کے اس معرکۃ الآراء مضمون میں صاف نظر آتا ہے جو جنوری فروری ۱۹۳۹ء (ذی الحجہ ۵۷ھ) کے الفرقان میں "ہمارا نصب العین اور طریقہ کار" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔

ایسی شدید اضطرابی کیفیت میں انہیں یہ کتاب ملی اس کے بعد کیا ہوا؟ انہی کی زبانی سنئے :

"یوں تو ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زندگی میں غافلوں اور کم ہمتوں کے لئے قربانی کا درس اور عزیمت کا پیام ہوتا ہے لیکن آج جو ہندوستانی مسلمان اپنے کو فتنوں کی دنیا اور بگڑے ماحول میں گھرا دیکھ کر سر پکڑ کے بیٹھ گیا ہے۔ اس یاس و قنوط نے اس کو زندہ درگور کر دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے طاقتور قلم سے میوات کے ایک دورے سے واپسی پر ان کا مضمون "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے نکلا تو میں نے اس کو بار بار پڑھا یاد آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو سڑک یونیورسٹی کی طرف جاتی ہے اس پر پرچہ کھولے ہوئے ایک استغراق کی حالت میں مضمون میں پڑھ رہا تھا اور آنے جانے والی سواریوں کا بھی ہوش نہیں تھا"۔

اس سفر میں مولانا کی حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے جو پہلی ملاقات ہوئی اس کا حال خود انہی کی زبانی سنئے :

"ہمارے (نظام الدین پہونچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے جیسے برسوں کی جان پہچان تھی، یا انتظار ہی میں تھے، خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سیرت احمد شہیدؒ کا مصنف ہوں اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے تو شفقت محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا، سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو متاثر کیا اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا، ان میں مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی، پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبے کا احساس نظر نہیں آتا تھا، دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی جو روبہ ترقی تھی....."

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی ملاقات میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ذات سے تو ہمارے مولانا کو کافی یگانگت اور مناسبت محسوس ہوئی۔ مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ ان کی دعوت کو گہرائی اور تفصیل سے سمجھتے اور ہندوستانی مسلمانوں کو درکار ایک ایسی جدوجہد کی حیثیت سے اسے منتخب کرتے جس کی انہیں تلاش تھی۔ البتہ اس ملاقات سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ ربط و تعلق ہو گیا جس کی بنا پر آئندہ ان کی جدوجہد کو سمجھنے اور وقت آنے پر فیصلہ کرنے کی راہ کھل گئی۔

اس عرصہ میں پیش آنے والے واقعات بتاتے ہیں کہ جس قسم کی ہمہ گیر اور جامع جدوجہد کی ان دونوں کو تلاش تھی، باوجود کچھ تحفظات اور سابقہ تجربوں کے اس کے لئے ان کی نگاہ انتخاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہی پر پڑی۔

چنانچہ والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک طویل گفتگو کے بعد مولانا مودودی سے کہا کہ "اب آپ کوئی تاریخ مقرر کر کے جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیالوں کو دعوت دیجئے اس

کے بعد کیا ہوا، یہ بھی ان کی زبانی ہی سنئے : وہ لکھتے ہیں :

"مقررہ تاریخ پر ہم خیال حضرات اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے اور جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی (یہ شعبان ۶۰ھ اگست ۴۱ء کا مہینہ تھا).....

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ میرا جو رابطہ اور تعلق تھا اور خیالات و جذبات میں جو ہم آہنگی تھی اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ وہ لاہور کے اس اجتماع میں شریک نہیں ہوئے تھے جس میں جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی لیکن اس اجتماع کی اور جماعت کی تشکیل کی ساری تفصیلات مولانا موصوف کو بعض ان رفقائے جماعت سے معلوم ہو چکی تھیں جو لکھنؤ سے لاہور پہنچ کر اس تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ نیز اس سلسلے میں میری ان کی خط و کتابت برابر ہوتی رہتی تھی۔ بہر حال انہوں نے جماعت میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے اس کی اطلاع دے دی تھی، میں نے ایک سفر لکھنؤ کا کیا، جن حضرات کے ذہن ترجمان کے مطالعہ سے جماعت اسلامی کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ ان کا ایک مختصر سا اجتماع ایک رفیق کے مکان پر ہوا۔ میں نے تفصیل سے دعوت کا تذکرہ کیا اور لاہور کے تاسیسی اجتماع کی کاروائی اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات ذکر کئے اور پھر جماعت میں شرکت کے شرائط وغیرہ بیان کئے، مولانا علی میاں اور چند اور دوستوں نے اسی اجتماع میں کلمہ شہادت کے اعادہ کیساتھ باقاعدہ جماعت کی رکنیت قبول کی۔"

جماعت اسلامی سے اس وابستگی کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آمد و رفت حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے یہاں جاری رہی ادھر مختلف اسباب نے مولانا جو جماعت اسلامی سے وابستگی جاری رکھنے کے سلسلے میں خلجان بڑھنے لگا..... مولانا نے اپنی مختلف تحریروں میں وہ اسباب بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں صرف اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے :

"میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطہ ارتقاء وہ تھا، جب میری ہندوستان کی مشہور تبلیغی تحریک کے داعی و بانی مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں آمد و رفت زیادہ ہوئی۔ میں جب ان کی زندگی، ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان و احتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی، اور مجھے احساس ہوا کہ دعوت نبوت اور اس کے حال کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک ایسی تحریک و دعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہیں، جس کی بنیاد خالص مطالعہ، ذہانت اور کسی

فلسفہ ونظام کے رد عمل پر ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار لکھنو سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کا حال لکھا اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحب سے میرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روز افزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہو جانے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا۔" (پرانے چراغ صفحہ : ۳۱۴ر جلد ۲)

حضرت مولانا کی خود نوشت سوانح کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو : مولانا کی طرف انجذاب اور ان کے مقام سے ہلکی سی شناسائی میں اس کو بڑا دخل تھا کہ میں ان سے ملنے سے پہلے "مکتوبات امام ربانی" "ازالۃ الخلفاء" "صراط مستقیم" اور "منصب امامت" پڑھ چکا تھا۔ اور (اپنے تاریخی ادبی مطالعہ وذوق کے باوجود) اس کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرز فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے جس میں سے ایک کا سر چشمہ ذہانت، مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا رد عمل ہوتا ہے اور دوسرے کا سر چشمہ کثرت عبادت وانابت و دعا قرآن مجید میں عمیق تدبر سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہوتی ہے، مولانا محمد الیاس صاحب کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی :

این ہمہ مستی و مدہوشی ہمہ باد و بود
بادیقاں انچہ کرد نرگس مستانہ کرد

اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دعوت کی علمی و فکری بنیادوں اور اس کے بنیادی اصول و مبادی کے سمجھنے اور ان کی مرتب علمی انداز میں تفہیم و تشریح کرنے کا خاص ملکہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو حاصل تھا۔ اور اس وجہ سے بھی انہیں ان کا خصوصی التفات حاصل تھا اسی سلسلہ کے چند واقعات ذکر کرنے کے بعد حضرت مولانا نے لکھا ہے :

"اسی مناسبت واعتماد کی بناء پر حضرت زیادہ سے زیادہ قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب وجوار کے کسی نظام میں ذمے داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا، اب میں کس سے بات کروں؟" (کاروان زندگی : ص : ۲۶۳ جلد ۱)

۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات ہو گئی، تاہم حضرت مولانا کا تعلق ان کی شروع کی ہوئی دعوتی جدوجہد سے قائم رہا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق کی خصوصی نوعیت اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے حضرت مولانا ہی سے ان کی آپ بیتی سنی جائے، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں میرا موقف اور طریق فکر کے زیر عنوان لکھا ہے :

"حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ذات سے گہری عقیدت، ان کے فہم دین و اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کے لئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی) واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی جو ایک خاص علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا، مکمل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی، اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے جن کا ذہنی و فکری سانچہ پہلے سے تیار ہو گیا ہو اور انہوں نے اپنے ذہن و مطالعہ سے کام لینا نہ چھوڑا ہو، یا زیادہ صحیح الفاظ میں انہوں نے دماغی سپر اندازی اور ماضی سے مکمل علیحدگی اختیار نہ کی ہو، اس لئے تحریکوں اور دعوتوں کے لئے وہ لوگ زیادہ مفید اور کار آمد ہوتے ہیں جن کا سانچہ انہیں تحریکوں اور دعوتی کام میں آنے کے بعد بنتا ہے اور ان کو کوئی فکری ہجرت یا سفر نہیں کرنا پڑتا۔

میرا معاملہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس سے مختلف تھا، میرا ایک فکری و علمی پس منظر تھا، اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف و تذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، میں ہر دور میں منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا اور میرے نزدیک خوب سے خوب کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا، اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارے میں جو دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو نمو و ارتقاء، زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے۔ ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر

ہو جائے گی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا:

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا، مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جو اب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا کچھ زیادہ منظم موثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول و دعوت اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے (جن کو اس تحریک میں چھ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے۔ مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اسکا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں۔ اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلے میں اس احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی۔ کئی بار متوجہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو، باہر سے مشورے دینا، خصوصاً ان لوگوں کا جو عمل اور قربانی دینے والوں کی صف اول میں نہیں ہیں اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی وقف نہیں کر دی ہے، مفید اور موثر نہیں ہوا کرتا، اور بہت سے داعی اور ذمے دار اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی ایسا شخص امام کو لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو اور جس کے قبول کر لینے کو فقہاء مفسد صلاۃ سمجھتے ہیں۔

اس احساس اور بار بار کی کوششوں کے غیر مفید ہونے کے تجربے، نیز جماعت کے اخلاص و للّٰہیت، مولانا محمد یوسف صاحب کی قوت باطنی اور قوت دعوت اور اس میں فنائیت و استغراق اور کام کے ہر حال میں نہ سرف مفید بلکہ زندگیوں میں تبدیلی لانے والا عمل دیکھ کر اس سلسلے کو وہیں روک دینا مناسب سمجھا گیا"۔

آخر میں اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے راقم سطور عرض کرتا ہے کہ یہ حضرت مولانا محمد

الیاس کی شخصیت اور ان کی دینی دعوت ہی تھی جس پر ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی نگاہ انتخاب کافی تلاش و جستجو کے بعد ٹھیری تھی، اور اگر کوئی شخص ان حضرات کے ذوق مزاج کو پیش نظر رکھے اور ان حالات و عوامل پر بھی نظر رکھے جو ذوق مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، مثلاً خاندانی ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت وغیرہ (اس مقالے میں ان عناصر کا مختصر تذکرہ آچکا ہے جن کا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ذوق و مزاج کے بنانے میں بنیادی حصہ تھا) تو وہ اس انتخاب کو بالکل فطری قرار دے گا۔ اور اسے اس پر کوئی اشکال نہیں ہوگا۔ بہر حال ان دونوں "رفیقوں" نے اپنے تمام علمی و دیگر مشاغل کے ساتھ نہایت پر عزم اور حوصلہ مندانہ انداز میں اپنے آپ کو عملی طور پر حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی برپا کردہ دینی جدوجہد میں مشغول کر دیا تھا۔ ان کے اس فیصلے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جس دینی و تہذیبی ارتداد کا سنگین خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس سے ان کی حفاظت اور ہر کچے پکے گھر میں رہنے والے مسلمان کو یہ احساس دلانے کے لئے کہ ایمان و اسلام ہی اس کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور اس سے اس کی حفاظت کے لئے خود فکر اور محنت کرنی ہے، ان کے نزدیک عمومی طاور مفید و موثر بھی تھا اور منہج دعوت سے قریب تر بھی۔ انہیں امید تھی کہ اس کے ذریعہ ایمانی شعور اور اسلامی غیرت و احساس کی دولت بھی عام ہو جائے گی۔ اور انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی و قومی سیرت و کردار میں بھی بہتری آجائے گی اور اسی تربیت سے فیض یافتہ افراد ہی ہوں گے جو دوسرے تمام دینی و ملی محاذوں کو سنبھالیں گے۔

یہی وہ امید ہے جو روح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائی کی ان دونوں حضرات کی سینکڑوں تقریروں اور تحریروں میں جن کا سب سے بڑا ذخیرہ "الفرقان" کی فائلوں میں آج بھی محفوظ ہے۔

یہاں یہ بات یاد لانا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت کے جن پہلوؤں نے حضرت مولانا کو زیادہ متاثر کیا تھا ان میں ایک وہ بھی تھا جس کا تذکرہ "دینی حمیت" کے زیر عنوان انہوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"مولانا کی فطرت میں دین کی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، ان کی اس دعوت کی ایک بڑی وجہ جو ان کو کسی کل اور کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی، دین کا یہی بڑھتا ہوا تنزل و انحطاط اور کفر

کا روز افزوں غلبہ واقتدار تھا جس کو ان کی حساس اور بیدار فطرت اور ان کا غیور مزاج ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اللہ کی توفیق اور دین کی گہری نظر کی بنا پر انہوں نے دین کے کام کی جو ترتیب اپنے ذہن میں قائم کر لی تھی، اس میں کسی فوری تاثر اور جذبے کی وجہ سے وہ ترمیم اور تغیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی عالی ظرفی اور خداداد ضبط و تحمل سے دوسری چیزوں کو اس طرح برداشت کرتے تھے کہ گویا ان کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں یا ان کا سرے سے علم نہیں، لیکن کبھی کبھی پیمانہ ضبط سے کچھ قطرے چھلک کر گرتے اور دل کی انگیٹھی کے کچھ شرارے بھڑک اٹھتے تو پاس والوں کو بھی محسوس ہوتا کہ دینی حمیت کے کس طوفان کو مولانا نے دل کے کوزے میں بند کر رکھا ہے۔"

حضرت مولانا نے مزید لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خاکسار راقم نے لال قلعہ کے پاس سے گذرتے ہوئے پوچھا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا میں لال قلعہ کی سیر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں، ہاں میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھاتے تھے۔ غیر مسلم اہل شوکت کی شان و شوکت کے مقامات و مرکزوں کے متعلق فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ان جگہوں سے قنوت نازلہ پڑھے بغیر گزرے تو سلب ایمان کا خطرہ ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اور واقعات نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا نے لکھا ہے:

"اسی دینی حمیت کی بنا پر آپ نے ابتداء میں حکومت کی جبری تعلیم کی سخت مخالفت کی اور علماء کو اس کی طرف متوجہ کیا، شدھی سنگھٹن کے زمانے میں تحریک ارتداد کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور وہ میوات میں کامیاب نہیں ہونے پائی۔"

اس کوتاہ نظر راقم کے نزدیک یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ان دونوں حضرات کو یہ محسوس ہوتا گیا کہ ان تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ محدود دائرے میں انفرادی زندگیوں میں تبدیلی تو آرہی ہے مگر دینی حمیت اور اجتماعی شعور کے لحاظ سے ترقی نہیں ہو رہی ہے، اور اس سلسلے کی کوئی کوشش بھی کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی (اس طرح کی کوششوں کی تاریخ بھی کافی طویل ہے) تو اسی رفتار سے ان حضرات کی توجہ اس ملک میں دین کی بقاء و تحفظ کے دوسرے محاذوں کی طرف بڑھتی گئی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی زندگی کے آخری ۲۰-۲۵ سالوں میں اپنی بے شمار تقریروں اور تحریروں میں اس سلسلے کے اپنے تاثرات و احساسات اپنے مخصوص حکیمانہ انداز اور

شفقت بھرے لب و لہجے میں ظاہر کئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نجی مجلسوں میں اس موضوع پر جب گفتگو چھڑ جاتی تھی تو بڑے درد کے ساتھ یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

تو ہی ناداں چند کلیوں پہ قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم ترین اصلاحی جدو جہد کے ذمے داروں کو کوئی ایسا محتاط اور درمیانی راستہ تلاش کر لینے کی توفیق دے جس سے ایک طرف تو کام کرنے والوں کی ظاہری اور عملی یکسوئی میں کوئی خاص فرق نہ آئے اور دوسری طرف دیگر اہم اصلاحی تقاضوں کی تکمیل میں بھی ایک جماعتی کارکن کی حیثیت سے نہ سہی، ایک عام مسلمان کی حیثیت سے ان کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہو۔ وہ دوسرے دینی کاموں کو بھی دین کا کام سمجھتے رہیں۔ جیسا کہ شروع میں ان کا عام طرز عمل تھا، اور آج بھی بلاشبہ بہت سے افراد کا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر موقع ملے گا تو حضرت مولانا کی روح عالم برزخ میں اس دعا پر آمین کہے گی۔

☆☆☆

بقیہ تاریخ دعوت و عزیمت :۔

اس انداز سے آج تک اس موضوع پر لکھا ہی نہیں گیا ہے"۔

غرض یہ کہ ملت اسلامیہ پر تاریخ کے اس اہم خلاء کو پر کرنے کا ایک فرض کفایہ تھا، جس کی تکمیل اللہ تعالیٰ ہی نے محض اپنی توفیق سے اپنے ایک برگزیدہ اور محبوب بندہ سے کرائی جس کے لئے وہ پوری امت مسلمہ کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے۔

○○○

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور دینی تعلیمی کونسل

عظیم تحریک ★ عظیم قائد

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ❊ شعبۂ اردو ممتاز کالج لکھنؤ

دینی تعلیمی تحریک کے ذریعہ قاضی محمد عدیل عباسی اور مولانا محمود الحسن صاحبانؒ نے ضلع بستی کا نام جس طرح روشن کیا ہے وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے ہم ان حضرات کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی صاحب کا یہ تفصیلی مقالہ ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں ——— مدیر

❊ ❊ ❊

بیسویں صدی کی آخری ساعتیں عالم اسلام، ملتِ اسلامیۂ ہند اور ملک و قوم کے تعلق سے جیسی المناکی پر ختم ہوئیں اسکی کیفیت اور رنج و غم کی وہ شدت تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اللہ کے حکم سے سفر آخرت اختیار کیا تو موجودہ حالات کی نزاکت اور مستقبل کی تشویشناک صورتِ حال میں حساس قلب و نظر نے یہ محسوس کیا کہ دردمندی

دلسوزی اور غیرت وحمیت، جرأت ایمانی اور شان امتیازی کے ساتھ ملت کی چارہ گری اور مسیحائی کی وہ آخری شمع بھی گل ہوگئی جو مشعل راہ کے طور پر افراد اور جماعتوں نیز ملک وملت کی سطح پر مختلف قافلوں کی رہنمائی کیلئے بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتی تھی۔

حضرت مولانا کی سیرت وشخصیت کے جلوۂ صد رنگ میں اقبال واوج کمال، فکر وخیال کے جلال وجمال اور حیات وخدمات کے نقوش لازوال نمایاں ہیں، ان ساری کیفیات میں ان کا نمایاں ترین وصف وہ روشن ضمیری تھی جو معرفت، معنویت، حقیقت، صداقت اور عظمت سے مزین کی گئی تھی، ابتدائے عمر میں مشائخ وقت نے اسے محسوس کرلیا تھا، اور ان کی نگاہ رمز شناس نے اس جوہر آبدار کو تلاش کرلیا تھا، ہماری خوش بختی تھی کہ ہمیں ایسی عظیم شخصیت کے شجر سایہ دار کے سایہ میں زندگی کے لمحات گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی، سفر وحضر اور شب وروز کی خلوت وجلوت میں ہمرکابی اور استفادہ کی توفیق ملی، وہی بارگاہ تھی جہاں سے ایمان ویقین کے چشمے ابلتے تھے، ذہنوں کو حرارت فکر میسر آتی تھی، چہروں کے اضمحلال اور دلوں کے اضطراب کو دور کرنے کیلئے سامان تقویت وہیں سے ملتا تھا، طاقت وتوانائی کا مظہر ایک کوہ گراں تھا، موجوں کی طغیانی اور بے پایاں روانی سے بھرپور ایک بحر ناپیدا کنار تھا، زندگی اپنی اس خوش رنگی پر نازاں، وہ اپنی ملت کیلئے مشفق مہرباں، اپنے ملک کی بہی خواہی کیلئے نغمہ خواں وہ قافلہ کو رواں دواں رکھنے کی خاطر بہترین حدی خواں، اقبال کی زبان جس کی آواز فضائے دشت میں بانگ رحیل سمجھی جاتی تھی، جس کی خاموشی میں انکار کا ہجوم، جس کی گفتار میں گنجینۂ معنی کا طلسم، جس کے انداز تحریر میں جہان معنی کی دھوم، وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان بھی تھا، ذاتی زندگی میں بوریہ نشینی کی عظمتوں کا امین وپاسبان بھی تھا، اس کی عاجزی وانکساری میں سیرت وشخصیت کی شان وشکوہ بھی نمایاں تھی، پوری زندگی ایک پیغام دعوت فکر، ہر پیغام میں بلند آہنگی ہر دعوت میں اخلاص وللہیت کی خوشبو، ہر فکر میں دین کی آبیاری کا جذبہ وجستجو اپنوں کے درمیان نظر آئے تو بریشم کی نرمی کا احساس دلوں کو گرما دے، روح کو تڑپا دے، حق وباطل کی رزم آرائی ہو تو مؤمنانہ شان سے فولادی قوت اور فکری ثبات واستحکام واستقلال کی خوبصورت جلوہ گری

نظر آئے، وہ حقیقی معنوں میں ایسے مرد مجاہد تھے جس کے رگ و پے میں مستی کردار کی چمک آشکارا تھی یہی خصوصیت تھی جس نے عام مسلمانوں میں حضرت مولانا کو مقبول بنایا تھا، یہی وصف تھا جس نے تمام تنظیموں اور تحریکوں میں انھیں وقار و اعتبار و افتخار بخشا تھا، اخلاص و کردار کی اسی دولت نے انھیں عالم اسلام میں مسند علمی عطا کی تھی، علم و معرفت کی یہی شانِ استغناء تھی جس نے مغربی دنیا کو انکا گرویدہ بنایا تھا، مشرق ان کا قصیدہ خواں، مغرب ان کیلئے رطب اللساں اور اب ان کے بعد ان کے غم میں مشرق و مغرب اور عرب و عجم سب اس محرومی پر ماتم کناں اور نوحہ خواں ۔

؎ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ۔

حضرت مولانا کا علمی اور دینی رشتہ اور ربط و تعلق بے شمار تنظیموں اور تحریکوں سے تھا، لیکن ان میں چند دعوتی تحریکیں ایسی تھیں جو ان کے ذہن و فکر بلکہ اعصاب پر ہر لمحہ رچی بسی رہتی تھیں، سوتے جاگتے ان کیلئے فکر مندی کا اظہار ہوتا تھا، دینی تعلیمی کونسل سے حضرت مولانا کا رشتہ اسی طرح کا تھا، اس تنظیم و تحریک نے آزاد ہندوستان میں نوجوان نسل کے اندر دین کو باقی رکھنے کا جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے وہ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے، الحاد و ارتداد کی آندھی میں توحید و رسالت اور آخرت کے تصورات کو اجاگر کرتے ہوئے پوری ملت کو اس پر آمادہ کر دینا اور اس کیلئے ہر قربانی کیلئے تیار ہو جانا، اپنے ملی تشخص کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرنا، زبان، تہذیب اور معاشرتی ترجیحات کے ساتھ زندہ رہنے کا عزم کرنا، سخت ترین حالات میں بادِ صرصر کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو جانا اور طویل جد و جہد کے بعد ایک پوری نسل کو محفوظ کر دینا دینی تعلیمی کونسل کی شناخت ہے، صلہ و ستائش سے بے نیاز اس تنظیم و تحریک نے اس ملک میں پہلی مرتبہ تاریخ سازی کا مرقع پیش کیا ہے، حضرت مولانا نے ایک موقع پر فرمایا تھا :-

"جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی و فکری و تعلیمی تاریخ، بلکہ ان کی ملی تاریخ دیانتداری کے ساتھ لکھی جائے گی تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا کہ اس چالیس سال کی مدت میں دینی تعلیمی کونسل نے کیا فکر دیا کیا لٹریچر پیدا کیا، کس طرح ہندوستانی

مسلمانوں کے دینی تعلیمی مقدمہ کو مضبوط دلائل سے ثابت کیا۔

پچاس برس قبل دینی تعلیمی تحریک کا آغاز قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے اپنے ضلع بستی میں کیا تھا، ۱۹۵۹ء کی آخری تاریخوں میں (۲۰، ۲۱، دسمبر ۱۹۵۹ء) قاضی صاحب مرحوم کی دعوت پر ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد بستی ہی میں ہوا، حضرت مولانا علی میاںؒ نے اسکی صدارت فرمائی تھی اور اسی موقع پر دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا، تو متفقہ طور پر حضرت مولانا اس کے صدر منتخب ہوئے اس وقت سے لیکر تادم آخر وہ صدر کونسل کی حیثیت سے رہنمائی اور سرپرستی فرماتے رہے۔

چالیس برس کی اس مدت میں تحریک و تنظیم کیلئے ہمہ وقت کی فکر مندی، ہندوستان میں نوجوان نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت، اس کی اہمیت اور افادیت پر اظہارِ خیال اور حالات حاضرہ پر مؤمنانہ شان سے جرأتمندانہ تنقید وتبصرہ کی ایک تاریخ ہے جو حضرت مولانا کے نام نامی سے مزین اور آپ کے اثرات سے متاثر ہے۔

ان کی شخصیت تاریخ ساز، ان کے اندازِ کردار وگفتار میں ایک نمایاں شانِ امتیاز، تقریر وتحریر میں قرآن وسیرت کا اعجاز، فکر وخیال میں عقاب وشاہیں کی پرواز، عاشق حجاز و دانائے راز، حضرت والا کی صدائے دلنواز پورے عالم اسلام اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی متفقہ آواز ان کی ذات گرامی ملک وملت کی آبرو اور اعزاز سمجھی گئی ہے۔ ان کی بے غرضی، بے نفسی، دردمندی اور دلسوزی ایمانی جرأت اور اسلامی غیرت وحمیت میں پوشیدہ عظمتوں کا راز یہی تھا، وہ ساری زندگی ملت کی کشتی کو ساحلِ مراد سے ہمکنار کرنے کی جد وجہد میں ایک بے باک، بے خوف اور مجاہد ملاح کی طرح مصروف رہے، ان کا یہ طرز عمل قابل تقلید نمونہ ہے، ان کا جذبۂ ایثار مشعلِ راہ، انکی فکر چراغِ راہ، ان کی انھیں صفات وخصوصیات کی بناء پر مشرق ومغرب ان کیلئے چشم براہ اور انکے قلب ونظر ان کیلئے فرشِ راہ رہے ہیں۔

دینی تعلیمی کونسل نے اپنے قیام سے لیکر اب تک مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے

آزاد ہندوستان میں یہ واحد تنظیم ہے جس نے اپنے گرد و پیش سے یکسو ہو کر تعلیم کے میدان میں اپنی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا ہے، مشہور مجاہد آزادی اور مجاہد اردو قاضی محمد عدیل کی دعوت پر اکابرینِ ملت اور دانشورانِ گرامی جمع ہوئے، تو سب کے سامنے صرف ایک سوال تھا کہ آئندہ اپنی نوجوان نسل کو اس انقلاب سے کیسے محفوظ رکھا جائے جو خصوصی طور پر ریاست اتر پردیش میں تعلیم کی راہ سے داخل ہو رہا تھا، ملک کی آزادی کے فوراً بعد اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا گیا کہ مسلمانوں کے جذبۂ حریت نے اس منزل کو آسان کیا ہے، اس کا اعتراف بھی مشکل ہو گیا کہ اردو نے اپنی بے پناہ قربانیوں اور اپنے جذبۂ مسلمانہ و شوقِ والہانہ سے جد و جہد آزادی میں غیر معمولی کارنامے انجام دئے تھے، اس نے اپنی سرمستی اور رجز خوانی سے فضا اور ماحول کو گرم کیا تھا، لیکن آزادی کے بعد بے چاری اردو ہی ہدف ملامت قرار دی گئی، بہ یک جنبشِ قلم اس کی تعلیم بند کر دی گئی، سرکاری اسکولوں میں جو کچھ پڑھایا جانے لگا وہ مسلمانوں کے تعلق سے تشویشناک تھا، قاضی صاحب مرحوم نے بہت پہلے اس کا اندازہ کر لیا تھا، اور اپنے ضلع کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے مکاتب قائم کریں، جہاں اردو و قرآنِ پاک کی تعلیم کے ساتھ عصری مضامین کی تعلیم کا بھی بند و بست کیا جائے، انھوں نے اسی عنوان سے مسلمانوں کے ذہنوں کو تیار کیا اور ضلعی سطح پر اس تحریک کو پھیلا دیا، یہ بالکل نئے انداز کا کام تھا جس نے سب کو متوجہ کیا اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ آئندہ اسی راہ سے اسلامی تشخص اور اپنی مادری زبان اردو کو بچایا جا سکتا ہے، قاضی صاحب ملت کے اس سنجیدہ ترین محاذ پر تنہا سربکف تھے، لیکن ان کے اخلاص کی خوشبو اور ان کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی دور تک پھیلی، اندازہ ہوا کہ اگر تعلیم کے اس ابتدائی محاذ کو دل جمعی، مستعدی، دیانت اور متانت کے ساتھ سنبھال لیا جائے تو ایک روشن مستقبل گرفت میں آ سکتا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم نے پچاس برس قبل اپنی ایک رپورٹ میں اس تحریک کے آغاز و ارتقاء پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"ملک کی آزادی کے بعد تعلیم کے نصاب و تعلیم میں سرکاری طور پر جو عظیم انقلاب ہوا ہے

اور مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ پر اس کے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور ہو سکتے ہیں وہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے مذہبی اعتقادات بلکہ ان کے مذہبی وجود کیلئے ایک عظیم خطرہ ہیں ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں اور بچیوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام کیا جائے اور اس کے لئے ایک مضبوط اور وسیع نظام بنایا جائے۔

مندرجہ بالا خیال کے ماتحت ضلع اور شہر کے کچھ ارباب درد اور اصحاب فکر حضرات بستی میں ۵ راگست ۱۹۵۱ء کو مدعو کئے گئے، جلسہ میں شہر اور ضلع کی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی اور بہت غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر طے ہوا کہ ۲ رستمبر ۱۹۵۱ء کو ضلع کے دردمند اور صاحب فکر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو مدعو کیا جائے اور ان کے مشورہ و صلاح سے انجمن تعلیمات دین کی تشکیل کی جائے۔

اس جلسہ کے انعقاد کی خبر سے پورا ضلع بستی گونج اٹھا، وقت مقررہ پر علمائے کرام اہل فکر اور مختلف مقامات ضلع کے نمائندے گوشے گوشے سے تشریف لائے اور ۲ رستمبر ۱۹۵۱ء کو صبح ۸ بجے پہلا اجلاس جامع مسجد بستی میں منعقد ہوا، قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم اور مولانا محمود الحسن (سابق ناظم دینی تعلیمی کونسل) نے صورت حال کی بھرپور ترجمانی کی اور اس تشویشناک کیفیت کا اظہار کیا، اس جلسہ میں حسب ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی:۔

"مسلمانان ضلع بستی کا یہ جلسۂ عام تجویز کرتا ہے کہ ضلع بستی میں مسلمان بچوں اور مسلمان بچیوں کی مذہبی تعلیم کیلئے انجمن تعلیمات دین ضلع بستی کے نام سے ایک انجمن بنائی جائے۔

دوسرا اجلاس بعد نماز ظہر جامع مسجد ہی میں منعقد ہوا، حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:۔

۱۔ "مسلمانان ضلع بستی کا یہ جلسۂ عام تجویز کرتا ہے کہ دستور العمل کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے وہ انجمن تعلیمات دین ضلع بستی کا دستور العمل قرار دیا جائے"۔

۲۔ "انجمن تعلیمات دین کے عہدہ داران اور مجلس انتظامیہ کے انتخاب کیلئے ایک عارضی کمیٹی سات حضرات پر مشتمل بنائی جائے۔

۳۔ "یہ جلسۂ عام تجویز کرتا ہے کہ مجلس انتظامیہ ۹ اصحاب پر مشتمل ہو، ایک سب کمیٹی اس غرض کیلئے بنائے کہ وہ جدید نصاب تعلیم جہاں تک مسلمان بچوں پر غیر اسلامی اثر مرتب کرنے والا ہو، حکومت سے اس کی تبدیلی آئینی طریق پر کرانے کیلئے مؤثر کارروائی کرے اور اس کے متعلق مجلس انتظامیہ کو مسلسل اپنی رپوٹ روانہ کرے، یہ بھی طے ہوا کہ مجلسِ انتظامیہ کو سب کمیٹی کی کارروائیوں میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہوگا"۔

۴۔ "مسلمانانِ ضلع بستی کا یہ جلسۂ عام تجویز کرتا ہے کہ جب تک عہدہ داروں اور مجلسِ انتظامیہ کا انتخاب نہ ہو جائے، اس وقت تک عارضی کمیٹی جو تجویز ۳ کے مطابق بنائی گئی ہے، کام کرے، اور مولانا محمود الحسن صاحب اس کے داعی (کنوینر) ہوں گے"۔

قاضی صاحب مرحوم جو تمام سرگرمیوں کا مرکز اور پوری تحریک کے بانی اور قائد تھے انہوں نے لکھا ہے:۔

"چند دنوں کے بعد شدہ شدہ دستور العمل انجمن تعلیماتِ دین ضلع بستی، مسلمانانِ ضلع بستی سے اپیل، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم صباحی و شبینہ مکاتب کیلئے درجہ اول سے پنجم تک، فارم الحاق اور فارم رکنیت طبع کرائے گئے، نصاب تعلیم کے مرتب کرنے میں کافی وقت صرف ہوا ہندوستان میں جتنی کوششیں دینی مکاتب کے نصاب مرتب کرنے کی ہوئی ہیں خاص کر جمعیۃ العلماء اور جماعت اسلامی نے جو نصاب تیار کئے ہیں سب دیکھے گئے اور کتابیں جو ہر نصاب میں تجویز ہوئی ہیں پڑھی گئیں، اور ہمارا خیال ہے کہ ہم نے جو کوشش نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے مرتب کرنے میں کی ہے وہ ایک کامیاب کوشش ہے، اس میں سب سے زیادہ اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ بدقسمتی سے جو فرقہ وارانہ اختلافات باہمی طور پر مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں ان سے قطعی اور کلی طور پر بچ کر چلا جائے اور درسی کتابیں وہ رکھی جائیں جن پر کسی فرقۂ اسلام کو معمولی سا بھی اعتراض کرنے کا موقع نہ رہے، دوسرے یہ کوشش کی گئی کہ بچوں اور بچیوں کا دماغ اسلامی تربیت کے سانچے میں ڈھالا جائے اور ان کے ذہن میں اسلامی اصول کو ایسے ٹھوس طریقہ پر جما دیا جائے جو کسی باد مخالف سے ہل نہ سکے"۔

انجمن تعلیماتِ دین کی تحریک و تنظیم میں شرکت اور رکنیت کے دروازے تمام مسلمانوں کیلئے کھلے ہوئے تھے، اس کیلئے ایک فارم طبع کرایا گیا جس میں اس کا اعلان ہوتا تھا:۔

"ہم اشخاص ذیل انجمن تعلیماتِ دین ضلع بستی کی رکنیت منظور کرتے ہیں اور اپنے کو حسب ذیل شرائط کا پابند کرتے ہیں۔

۱۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ اپنے بچوں اور بچیوں اور ان بچوں اور بچیوں کو جو ہماری نگرانی یا اثر میں ہوں، سرکاری اسکولوں میں تعلیم دیتے ہوئے زبانِ اُردو کے ذریعہ دین کی تعلیم دلانا اپنے اوپر واجب رکھیں گے۔

۲۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ اپنے گھروں میں چٹکی نکالیں گے اور اپنی آمدنی میں سے وہ خواہ غلہ کی شکل میں ہو یا نقد کی شکل میں حسبِ استطاعت تعلیم دین کے لئے مستقلاً نکالیں گے۔

۳۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ تعلیم دین کی اشاعت میں پوری کوشش کریں گے، اسکے لئے وقت، علم، سرمایہ اور محنت کی قسم میں سے جو بھی خدمت کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں گے۔

ایک بڑی عظیم دینی تعلیمی تحریک کے یہ ابتدائی نقوش تھے، اس وقت اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایک بندۂ خدا نے اپنے چند مخلص رفقاء کار کے ساتھ جس کام کا آغاز کیا ہے، مستقبل میں اسکے ایسے غیر معمولی اثرات نمایاں ہوں گے، بے دست و پائی میں عزم و ارادہ کی طاقت و توانائی کا مظاہرہ تھا، جذبۂ خودداری اور دینی غیرت و حمیت کی ایسی مثال آزاد ہندوستان میں مشکل سے نظر آئے گی۔

قاضی محمد عدیل عباسیؒ نے "تحریک کی تاریخ" کے عنوان سے جو کتابچہ مرتب کیا تھا اس کو پڑھ کر اس خون جگر کا اندازہ ہوتا ہے جو اس گلشن کی آبیاری میں صرف کیا گیا، کیسی مبارک تھی وہ ساعت اور کیسے قابلِ مبارکباد تھے وہ چند نفوس جو ماضی اور حال کی المناکیوں اور تباہ کاریوں کی افسردہ و مضمحل اور انتہائی تشویشناک صورت حال میں مایوس و دل شکستہ ہونے کے بجائے بنام خدا میدان میں سرگرم

ہو گئے، ان کیلئے ہر بحر پر آشوب پایاب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا، ان کے سامنے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان تھا۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی مدد کرو، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو ثبات و استقامت عطا کرے گا۔"

قاضی صاحب مرحوم کی وہ تحریر نقش اوّل ہے، پچاس برس قبل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک ستارۂ سحری کی نمود صبح فردا کی بشارت سنا رہی تھی۔

"انجمن تعلیماتِ دین ضلع بستی کا قیام ۱۹۵۰ء میں اس وقت ہوا جب آزادی کے حصول کے بعد اچانک اردو جلا وطن کر دی گئی اور نصاب تعلیم منافیٔ اسلام اسباق سے بھر دیا گیا، ہمارے سامنے دو بڑے مقاصد تھے۔

۱۔ بچوں کے خام ذہنوں پر سرکاری نصاب تعلیم کی کتابوں کے اسباق کے زہریلے اثر کو مٹانا اور اس کا واحد طریقہ یہ قرار دیا گیا کہ آزاد خود کفیل مکاتب کھولے جائیں۔

۲۔ جمہوری اور آئینی طریقوں سے جد و جہد کرنا کہ حکومت اس غلطی کو محسوس کرے اور نصابِ تعلیم کی اصلاح کر کے اسے سیکولر بنا دے۔

اسی وقت یہ بھی محسوس کیا گیا کہ یہ کام انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ تمام سیاسی اور مذہبی فرقہ بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک متحد جماعت نہ بنائی جائے، کیونکہ ایک طرف آزاد خود کفیل مکاتب کے قیام میں جبریہ تعلیم اور ایجوکیشنل کوڈ کے قواعد و ضوابط کی بہت سی دقتیں سدّ راہ تھیں، دوسری طرف حکومت اور محکمۂ نظام تعلیم کو متوجہ کرنے کیلئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جو ہر طبقۂ خیال اور عام مسلمانوں کی نمائندہ ہو، اسی لئے بنیادی جلسہ طلب کیا گیا، اس میں ہر نقطۂ نگاہ کے لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔"

تحریک کے ابتدائی مراحل اور مکاتب کے قیام کی بنیادی جد و جہد، انداز فکر، طریق کار اور طرز عمل پر قاضی صاحب نے اپنے تاثرات کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

"جب یہ اسکیم شروع کی جارہی تھی تو اس پر شک اور شبہ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کی کامیابی پر اکثر لوگوں کو یقین نہیں آرہا تھا، لیکن جیسے ہی ہم لوگ کام کرنے کیلئے نکلے تو یہ پتہ چلا کہ گویا کہ قوم تیار بیٹھی ہے۔

اس طریقہ کار کا نام ہم نے "آگ لگانا" رکھا تھا، جس طرح ایک جگہ آگ لگتی ہے تو قریب میں پھیل جاتی ہے، اسی طرح ہماری تحریک آگ کے شعلوں کی طرح پھیلتی تھی"۔

مسلمانوں کی کسی بھی دینی تنظیم و تحریک میں ایک بڑا مسئلہ مسلک کا ہوتا ہے، اس کی عصبیت بعض وقت مقاصد کو یکسر ختم کر دیتی ہے اور ابتداء ہی میں اتحاد و اتفاق کے بجائے نفرت اور عداوت کی فضا ایسی گرم ہوتی ہے کہ اپنے ہی بنائے ہوئے نشیمن خاکستر ہو جاتے ہیں، دینی تعلیمی تحریک میں بھی یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رہا، بزرگوں کے ذہن و فکر میں اس کی ایک واضح تصویر تھی، مستقبل کا ایک غیر مبہم خاکہ تھا جس میں رنگ آمیزی کا غیر معمولی ہنر انھیں آتا تھا، ایسے نازک ترین رشتے کو انھوں نے آخر تک قائم رکھا، اور ان کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ یہ شیرازہ منتشر ہونے سے محفوظ رہ گیا مکاتب کیلئے جو نصاب تعلیم مرتب کیا گیا اس میں اس کا لحاظ رکھا گیا۔

"ایسا بھی ہوا کہ ہم کسی گاؤں میں گئے اور وہاں لوگوں نے ہمارے عقائد پر بحث شروع کر دی تو ہم نرمی سے سمجھا دیتے تھے کہ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ کیا پڑھاؤ یعنی کون سی کتاب پڑھاؤ، ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ دین پڑھاؤ، بریلی، دیوبندی، اہلحدیث سب اپنی اپنی کتابیں پڑھائیں، ہمارا مطالبہ حکومت سے یہ ہے کہ بچے کے دماغ کو کس ڈھانچے میں ڈھالا جائے، یہ والدین اور سرپرست کا کام ہے اس میں حکومت دخل نہیں دے سکتی، اگر ہم خود بچے کے دماغ کو کسی خاص سانچے میں ڈھالیں تو یہ ایک ایسا تضاد ہوگا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں اور پھر ہم کس منہ سے حکومت سے یہ مطالبہ کریں گے کہ بچے کے ذہن و مزاج کی تربیت میں دخل انداز نہ ہو، اکثر لوگ سمجھ جاتے تھے اور خوش ہو کر تحریک کا خیر مقدم کرتے تھے"۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ایک دلچسپ واقعہ بھی ہے اور تحریک کے سلسلے میں ایک بلیغ اشارہ بھی ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحریک ریشمی رومال کی طرح قاضی صاحب نے بھی ایک علامت متعین کی تھی، اس کی روداد خود قاضی صاحب نے یہ کہتے ہوئے بیان کی ہے :-

"اگر کسی نے ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لیا تو ہم لوگ اس گاؤں سے السلام علیکم کہہ کر رخصت ہو جاتے تھے اور تب ہمارا آپس کا محاورہ یہ تھا کہ "اس گاؤں کو پھونک دو" چنانچہ ڈٹ کر اس کے اتر، دکھن، پورب، پچھم کے مواضعات میں مکاتب کھول دیتے تھے اور انجام یہ ہوتا تھا کہ وہی حضرات ہمارے پاس دوڑے ہوئے آتے تھے اور کہتے تھے کہ چلئے ہم گاؤں کا جلسہ کر رہے ہیں، مکتب کھول دیجئے۔

مکاتب کے قیام کی اس تحریک کے ساتھ ان مسلمان طلباء کی فکر بھی دامن گیر تھی جو ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں زیر تعلیم تھے، ان کی ایک فہرست تیار کی گئی، میرے والد ماجد مولانا محمود الحسن صاحب کا ہمیشہ یہ مزاج رہا کہ وہ نوجوان طلباء میں دینی روح پھونکنے کی کوشش میں سرگرم رہتے تھے، بستی میں بھی میرے عم محترم قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم اور والد ماجد نے باہمی مشورہ سے طلباء کی تنظیم قائم کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے سامنے نامور علماء کرام کی تقریریں کرائی جائیں۔

"طلباء پنسل کاغذ لیکر بیٹھیں اور مضمون نوٹ کرتے جائیں ان کے بعد پندرہ روزہ جلسے کر کے ان ہی تقریروں کو دہرائیں اور مسائل دینیہ پر اپنا مطالعہ پیش کریں"۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی تقریر ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء کو مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی توحید کے موضوع پر ہوئی، اس جلسہ میں درجہ ۶ سے درجہ ۱۲ تک کے قریب دو سو طلباء شریک ہوئے۔

۶ ستمبر ۱۹۵۳ء کو اسی طرح کا دوسرا جلسہ منعقد ہوا جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے طلباء کو "رسالت" کے موضوع پر خطاب فرمایا، بقول قاضی صاحبؒ: "یہ دونوں تقریریں اس درجہ جامع اور پر اثر تھیں کہ طلباء میں دین سیکھنے اور سمجھنے کا کافی جوش و جذبہ پیدا ہو گیا"۔

۷ ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو "آخرت" کے موضوع پر مولانا محمد اسحاق سندیلوی صاحب طلباء کو خطاب کرنے والے تھے، مگر کسی خاص وجہ سے تشریف نہ لاسکے تو مولانا محمود الحسن صاحب نے اس کام کو پورا کیا۔

۲۹ ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے "عقائد کے فطری تقاضے اور عملی مطالبے" پر تقریر کی، قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ آخر کے دونوں مضامین بہت مشکل تھے، مگر ۹ ر نومبر اور ۲۰ ر نومبر ۱۹۵۲ء کو جب طلباء کے اجتماعات ہوئے اور ان میں انھوں نے جو تقریریں کیں ان سے پتہ چلا کہ کس طرح طالبعلموں نے اصل مضمون کو پالیا ہے۔

۹ ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو حضرت مولانا علی میاںؒ نے اسی طرح کے جلسہ میں "نماز کی اہمیت اور فضیلت" پر نہایت بلیغ تقریر فرمائی، طلباء کی سیرت سازی اور ذہنی تربیت کیلئے ایک "دار المطالعہ" کی ضرورت بھی محسوس کی گئی جہاں تفسیر، سیرت، اخلاق اور آداب کی کتابیں ہوں اور نوجوان طلباء ان سے استفادہ کرسکیں

"چنانچہ طلباء کے اجتماع کی طرح اس دار المطالعہ کے بنیادی خیال پر بھی ہندوستان کے مایۂ ناز عالم مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تائید کی مہر ثبت کی اور جس طرح طلباء کی تحریک کو چلانے کیلئے اپنا قیمتی وقت دیا تھا اس کام کیلئے بھی اپنی آمادگی ظاہر کی، ۱۰ ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو شیخ کرم حسین صاحب مختار کی کوٹھی میں ایک جلسہ شہر کے پڑھے لکھے لوگوں کا کیا گیا اور جناب مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی ایک نہایت دردانگیز تقریر کے ساتھ اس دار المطالعہ کی بنیاد رکھی"۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم اپنی نوعمری سے آزادیِ وطن کی تحریک سے وابستہ تھے، صفِ اوّل کے سیاسی رہنماؤں سے ان کے مراسم تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے ذاتی تعلقات تھے، وہ ایک کہنہ مشق نامور صحافی تھے، اور اس دور کے بڑے اُردو اخبارات مدینہ بجنور، مسلم دہلی اور زمیندار لاہور کے چیف ایڈیٹر رہ چکے تھے، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد سبحانی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور اسی طرح کے دوسرے بے شمار

قائدین ملک و ملت سے قاضی صاحب کے قریبی روابط تھے، اس پوری صف نے علم و ادب، سیاست اور صحافت اور تہذیب و معاشرت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، یہ ایسے صاحب بصیرت اور دیدہ ور حضرات تھے جن کی نگاہیں بہ یک وقت ماضی اور حال کے ساتھ مستقبل کے مسائل اور انکی نزاکتوں پر لگی ہوئی تھیں، قاضی صاحب سیاسی طور پر کانگریس کی اعلیٰ قیادت کے قریب تھے، وہ تقریباً بیس برس اسمبلی کے ممبر (ایم، ایل، اے) رہے اور اپنے ضلع میں ڈسٹرک بورڈ کے چیرمین بھی تھے، عملی سیاست کے روز و شب میں انھیں آزاد ہندوستان کے اس رنگ و روپ کا اندازہ ہو گیا تھا جو چند دنوں بعد وجود میں آنیوالا تھا، دریا کا مزاج اور موجوں کی طغیانی، فضا اور ماحول کا رخ دیکھ کر مایوسی کے بجائے عزم و استقلال اور جرأت و ہمت کے ساتھ انھوں نے اپنی قوم کے سامنے وجود و بقا کا یہ نسخۂ کیمیا پیش کیا، خطرناک تصورات کا جو تاثر تھا وہ قاضی صاحب کی تحریروں میں نمایاں ہے :-

"ملک آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہوا، آزادیِ تقریر و آزادیِ تحریر، آزادیِ مذاہب وغیرہ کے نعرے لگے، دستور نے مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو کاغذ پر تحفظات دئے لیکن ہم رات کو آزادی کا جشن منا کر سوئے اور صبح دم اٹھے تو اُردو جلا وطن کی جا چکی تھی، ہندی نہ صرف سرکاری زبان بلکہ عام زبان قرار پا گئی تھی، نصاب تعلیم جو پہلے سیکولر تھا، بہت جلد ہندو دھرم کے عقائد سے بھر دیا گیا، اب یہ سوال پوری قوت کے ساتھ سامنے آیا کہ آئندہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت کیسے کی جائے، کیسے اس آگ کے دریا کو عبور کیا جائے، اسی کے ساتھ عام جبریہ پرائمری تعلیم کا رواج ہوا، یعنی ہر بچے اور ہر بچی کو پڑھنا تھا اور سرکار اس کی ذمہ دار تھی، لیکن پڑھنا کیا تھا؟ وہ جس سے بچے اور بچیاں اسلام سے منحرف اردو سے نابلد، اپنے اسلاف سے قطعی بے تعلق ہو کر انکی راہ سے مخالف سمت چلے جائیں۔

بیاباں کی اس شب تاریک میں دینی تعلیمی تحریک قندیل رہبانی بن کر نمودار ہوئی، اب

سوال لائحہ عمل کا تھا، ان ہوش ربا حالات میں ضلع بستی کے چند رضا کاروں نے خود کفیل مکاتب کی بنیاد ڈالی اور قوم متوجہ ہو گئی۔"

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ اپنی علمی دینی تصنیفی اور ملکی و قومی مصروفیات کے باوجود ابتداء سے قاضی صاحب مرحوم کی تحریک اور سرگرمیوں سے واقف اور شریک تھے، وہ ان دونوں بزرگوں کی رہنمائی اور سرپرستی کے معترف اور قدرداں تھے، انھوں نے اپنی تحریر میں اس کا اظہار کیا ہے :۔

"ہم مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی کے بھی انتہائی شکر گزار ہیں ان دو بزرگ ہستیوں نے کارکنان انجمن کے دلوں میں کام کی لگن پیدا کی اور ہمیشہ ہماری ہمت افزائی اور رہنمائی کرتے رہے۔"

حضرت مولانا علی میاںؒ نے (کاروانِ زندگی جلد اول ص ۴۵۹ تا ص ۴۶۲) خود اپنے قلم سے اس تحریک اور تاریخ کو محفوظ کیا ہے، اس میں صورت حال کی صحیح عکاسی، محرکات اور عوامل کا تجزیہ تحریک کی ضرورت اور اہمیت، ملی تشخص، غیرت و حمیت رکھنے والی مسلم قوم کی ذمہ داریاں، اسکی خیر خواہی اور رہنمائی اور وطن دوستی کے سچے جذبات کی قدردانی، مستقبل میں ایک زندہ باوقار اور داعیِ ملت کی حیثیت سے اس ملک میں مسلمانوں کے وجود و بقا کا انحصار اس پیغام و اعلان میں تلاش کر کے نمایاں کیا گیا ہے جو دینی تعلیمی تحریک اور دینی تعلیمی کونسل کے وجود و تاسیس میں پوشیدہ رہا ہے :۔

"ہندوستان کے آزاد ہونیکے بعد جہاں تک ملت اسلامیہ ہندیہ کا تعلق ہے، اس کے اہم ترین اور موت و حیات کا فیصلہ کرنے والے مسائل میں مسلمانوں کی نئی نسل کا اسلام کے بنیادی عقائد ایمانیات اور اپنے ملی تشخص اور امتیاز پر برقرار رہنے کا مسئلہ تھا۔

تقسیم کے فوراً بعد ہی بیک ریڈروں میں ہندو دیو مالا کی باتیں اور مشرکانہ کہانیاں اور اسباق صاف نظر آنے لگے اور یہ نظر آنے لگا کہ اگر یہ سلسلہ چند سال اور جاری رہا تو ملتِ ابراہیمی

اور امت محمدی کی نئی نسل اسلام کے عقیدۂ توحید خالص سے ناآشنا یا منحرف اور شرکِ جلی اور کفریہ عقائد کی معتقد یا ان سے متأثر ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں کرنے کے دو کام تھے ایک سلبی، NEGATIVE اور ایک ایجابی POSCTIVE منفی اور انتظامی تو یہ کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی تعلیمی پالیسی میں دیانتداری کے ساتھ نا مذہبی اور غیر جانبدار ہو نیز یہ کہ نصاب کو بھی سیکولر بنایا جائے مثبت یہ کہ بیسک اور بنیادی تعلیم کا انتظام مسلمان اپنے بچوں کیلئے خود کریں اس کیلئے مدارس و مکاتب قائم کریں جن میں اُردو اور عقائد و دینیات کی ابتدائی تعلیم ہو اور مسلمان بچوں کے ذہن میں اسلام کے نقوش ثبت ہو جائیں۔

اس خطرہ کا واضح طور پر احساس سب سے پہلے قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ہوا جو ایک ممتاز نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمان تھے، اپنی وسیع واقفیت، حقیقت پسندانہ ذہن اور اسلامی ضمیر و احساس کی وجہ سے انھوں نے اس خطرہ کو نہ صرف یہ کہ جلد ہی بھانپ لیا بلکہ یہ ان کے ذہن و اعصاب پر ایسا مستولی ہو گیا کہ انھوں نے اپنی پوری توانائی اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اس پر مرکوز کر دیں وہ عرصہ تک اپنے ضلع کے حدود ہی میں اس خطرہ کا مقابلہ اور مدارس و مکاتب قائم کرنے کا کام خاموشی سے کرتے رہے، وہ اسی دائرہ کے اندر عرصہ تک محدود ہو کر کام کرنا چاہتے تھے، لیکن جب مولانا محمد منظور نعمانی، راقم سطور اور بعض دوسرے دوستوں کے سامنے وضاحت کیساتھ یہ مسئلہ آیا تو ہم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر قدم نکالیں اور اس کو کم سے کم صوبائی پیمانہ پر انجام دینے کی کوشش کریں۔

ہماری گفتگوؤں کے بعد وہ اس پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کی تاریخوں میں بستی میں ایک صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بلائی۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنی سوانح حیات "تحدیثِ نعمت" میں اس تحریک کے پس منظر اسکے آغاز

وقیام اور اپنے ربط وتعلق پر روشنی ڈالی ہے :۔

"۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کیلئے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں ایک نہایت سنگین مسئلہ یہ بھی تھا کہ ایک طرف تو تعلیم لازمی کی جارہی تھی تو دوسری طرف اُردو کی تعلیم ختم کر دی گئی تھی اور پھر جو کچھ پڑھایا جارہا تھا اس میں ہندو دیو مالا خوب خوب شامل کی گئی تھی، اس صورت حال نے ان تمام مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا جو اس کے نتائج کا اندازہ کر سکتے تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے قاضی محمد عدیل عباسی کو کہ انھوں نے اس خطرناک صورت حال سے نپٹنے کیلئے ایک عملی اسکیم تیار کر کے اپنے ضلع بستی میں اس کے مطابق کام شروع کر دیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ ملک کے موجودہ حالات میں یہ ہماری نئی نسل کے دین کی حفاظت کا انتظام ہے اور اللہ کی طرف سے قاضی صاحب کو خاص طور پر اس کام کی توفیق عطا ہوئی ہے۔

میں نے رفیق محترم مولانا علی میاں سے یہ سب ذکر کیا ـــــــ میرا اور علی میاں کا ان سے اصرار جاری رہا کہ وہ یوپی کی سطح تک کام کو پھیلانے پر بہر حال غور کریں۔

بالآخر ایک وقت آیا کہ انھوں نے کام کے اس پھیلاؤ کیلئے ہمت کر لی، ۱۹۵۹ء کی بات ہے ان کے شہر بستی میں ریاستی سطح کی ایک کانفرنس بلائی گئی اور دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا قیام عمل میں آیا، مولانا علی میاں کو کونسل کا صدر منتخب کیا گیا اور قاضی صاحب نے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریاں قبول کر لیں"۔

اس تاریخ ساز کانفرنس کا اعلان ہوا تو پورے ملک میں اس کے انعقاد کا زبردست خیر مقدم کیا گیا، مسلمانوں کی تمام جماعتوں، تنظیموں اور تحریکوں کے سربراہوں کی طرف سے تعاون کا اظہار ہوا، مسلکی اختلافات سے اوپر اٹھ کر صدق دلی کے ساتھ یہ محسوس کیا گیا کہ آزاد ہندوستان میں دین کی حفاظت اور اس کی آبیاری کا ایک مؤثر ذریعہ مل گیا ہے، کانفرس کے داعی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے لکھا ہے :۔

"صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس جو ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو زیر صدارت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بستی میں منعقد ہوئی، اس نے ایک نیا خیال ایک نیا جذبہ ایک نیا حوصلہ ملت اسلامیۂ ہند کو دیا جیسے ہی اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کے فرائض و مقاصد کا اعلان ہوا تمام ہندوستان کے ہر طبقۂ خیال کے علماء و زعماء کے دماغوں پر تحریک کا تخیل چھا گیا، بلا امتیاز جماعت ہر اہل الرّائے اور دانشور کو اس میں مدعو کیا گیا، دیوبند، ندوہ، سہارنپور، بریلی علی گڈھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی، جماعت اہل حدیث ریاست کے تمام مسلم اسکول اور کالج، الغرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جسے دعوت نہ دی گئی ہو، اور الحمد للہ کہ سب نے شرکت بھی کی"۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کو بطور خاص قاضی صاحبؒ نے کانفرنس کا افتتاح کرنے کیلئے مدعو کیا تھا لیکن متعین پروگرام کے باوجود مولانا عین وقت پر اپنی بیماری کے سبب تشریف نہیں لاسکے، انھوں نے قاضی صاحب کو ایک طویل گرامی نامہ ارسال فرمایا جس میں ایک جملہ ان کی فکر و دردمندی اور اس تحریک کی اہمیت و افادیت کا مظہر تھا مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا وہ گرامی نامہ کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا، اور ان کے اس جملہ نے عوام اور خواص سب کو متاثر کیا تھا:۔

"کانفرنس کے اعلان نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کردیا ہے"۔

یہ ایک جملہ نہیں بلکہ ایک طویل تاریخ کا خوبصورت عنوان ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی مکمل ترین ملّی تاریخ جب کبھی سپرد قلم کی جائے گی تو اس میں دینی تعلیمی کونسل کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ کا وہ اقتباس پیش کردیا جائے جو قاضی صاحب مرحوم کے انتقال پر "قاضی عدیل عباسی کا عظیم کارنامہ" کے عنوان سے قومی آواز لکھنؤ کے خصوصی ضمیمہ میں تحریر فرمایا گیا تھا:۔

"اس سے زیادہ ٹھوس، مفید اور تعمیری تحریک اور جد وجہد ادھر ایک طویل عرصہ سے مسلمانان ہند کی تاریخ میں وجود میں نہیں آئی، واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب ہی کے اس درد و فکر مندی نے جو ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کے بارے میں ان کو بے چین کئے ہوئے تھی بیسیوں علماء و اہل دین کو تڑپایا اور ان کو ان کے گوشۂ عزلت سے باہر لے آئی خود اس ناچیز کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہے اور وہ قاضی صاحب کے اس احسان کو مدت العمر تک نہیں بھول سکتا۔"

مولانا محمد منظور نعمانی نے تحدیث نعمت میں اپنے تعلق اور تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس تحریک میں اپنے حصہ کو میں اللہ کی ایک بڑی نعمت ہی سمجھتا ہوں اور اس کے لئے شکر گزار ہوں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے موجودہ ذمہ داروں اور کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے اور یہ نہایت ضروری کام اطمینان بخش پیمانہ پر جاری رہے۔"

بستی کانفرنس میں مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"اس کام کیلئے جماعتوں کو اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنی چاہیئے۔"

اس کانفرنس میں مولانا سید اسعد مدنی، مولانا محمد میاں، مولانا ابو الوفاء شاہجہاں پوری شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا نذیر احمد بنارسی، خطیب الہند مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری، مولانا مفتی عبد القیوم علی گڈھی، مولانا مفتی شاہ سلیم اللہ بنارسی، حیات اللہ انصاری ایڈیٹر قومی آواز بڑے جوش و اعتماد کے ساتھ شریک ہوئے تھے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدر سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے کانفرس کا افتتاح کیا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ گورکھپور تک آگئے تھے، لیکن وہاں شدید بخار کی وجہ سے بستی نہیں آسکے، اس کانفرنس کے کچھ دنوں بعد نوگڑھ ضلع بستی میں ایک کل ہند اہل حدیث کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح سفیر سعودی عرب نے کیا تھا، مولانا عبد الرؤف جھنڈا نگری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں دینی تعلیمی کونسل

اور اس کی تحریک کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے قاضی صاحب کا نام لیا اور اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا :۔

سرِّ خدا کہ عارف و زاہد کسے نہ گفت
واحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مولانا محمود الحسن صاحب (ناظم دینی تعلیمی کونسل) نے اپنے ایک مضمون میں اس وقت کی فضا اور ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"جس وقت دینی تعلیمی کونسل نے کام شروع کیا تو اگرچہ آزادی کو دس برس سے زائد گذر چکے تھے، لیکن مسلمانوں میں ہر طرف ایسا خوف و ہراس طاری تھا، جس کا اندازہ آج کرنا مشکل ہے، جبری تعلیم کے قانون کے مفہوم کی اشاعت نے مسلمانوں کو اور بھی سراسیمہ بنا رکھا تھا، سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس خوف و ہراس کو دور کیا جائے، دینی تعلیمی کونسل نے اپنی تجویزوں، کانفرنسوں کی تقریروں اور متعدد مطبوعہ کتابچوں کے ذریعہ مسلمانوں کو ہمت دلائی، جبری تعلیم کی تشریحات کیں اور آزاد مکاتب قائم کرنیکی پکار دی، چنانچہ کونسل کا کام جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، خوف و ہراس اور احساسِ کمتری کی فضا صاف ہوتی گئی"۔

بقول قاضی صاحبؒ :۔

"کانفرنس کے بعد ایک ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہوا جو کم دیکھنے میں آیا ہے، بہت سے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے کہ کچھ نہیں ہو سکتا، اب کام ملا: اس میں گرم جوشی سے لگ جائیں گے، کسی نے کہا کہ عوام کے دماغوں پر ایسا اثر ہوا ہے جیسے کہ پیاسے کو پانی مل جائے، کچھ علماء نے کہا کہ اس تحریک میں کام کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے، اور کسی نے یہ بتلایا کہ اس تحریک میں حصہ لینا نفلی عبادتوں سے زیادہ باعثِ ثواب ہے"۔

دینی تعلیمی کانفرنس کے انعقاد اور دینی تعلیمی کونسل کے قیام میں اصلاً حضرت مولانا علی میاںؒ

اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی مخلصانہ کوششوں کا دخل تھا اور انھیں حضرات کے اصرار کی بناء پر مسلمانوں کے سامنے وہ شاہراہ عمل روشن ہوئی جس نے مستقبل کے مسائل کو آسان کر دیا قافلہ کی ترتیب و تشکیل، سفر کا آغاز اور اس کیلئے جذبہ و شوق میں والہانہ کیفیتوں کا اظہار ہوا، سب سے زیادہ پرکشش یہ اعلان تھا کہ کانفرنس کی صدارت عالم اسلام کے نامور خطیب اور عظیم مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کریں گے، خود مولانا کاروانِ زندگی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس پہلی کانفرنس کی صدارت کیلئے قرعۂ فال میرے نام نکلا، کونسل کی صدارت کے لئے بھی میرا ہی انتخاب ہوا، میں نے عجلت میں سہارنپور اور ہردوئی کے درمیان ٹرین ہی پر خطبہ لکھا جو چھپ گیا، یہ کانفرنس اور خطبہ ایک طرح سے ایک سفر اور سمت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کے ملی تشخص اور ان کے بنیادی مسائل کی تاریخ لکھنے والا اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا، تقسیم ہند کے بعد مشکل سے دو ایک تحریکیں ہوں گی جو دینی تعلیمی کونسل کی تحریک کی طرح ٹھوس بنیادی اور وقت کے اہم ترین مسئلہ پر شروع کی گئی ہوں گی"۔

قاضی صاحب نے اپنے ایک کتابچہ میں یہ واقعہ بھی تحریر کیا ہے:۔

"مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے بعد کانفرنس فرمایا تھا کہ:۔ انگریز راج کے آغاز سے ایسی کانفرنس نہیں ہوئی، تو حضرت مولانا علی میاں ندوی نے جواب دیا تھا کہ انگریز راج سے قبل ہی اس طرح کا اجتماع کب ہوا تھا"۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت تھے، حضرت نے انھیں قرآن پاک کا ایک چھوٹا نسخہ دیا تھا، جو تحریک خلافت کے زمانہ میں قاضی صاحب اپنے گلے میں ہمہ وقت پہنے رہتے تھے، زمیندار کی ادارت کے زمانہ میں جب وہ سنٹرل جیل لاہور میں قید تھے اور یہی نسخہ ان کے تقویت قلب کا باعث تھا، زندگی آخری ساعتوں تک قاضی صاحب اسی قرآنِ پاک سے تلاوت کرتے تھے، ان کے بعد یہ نسخہ اب بھی قدر و منزلت کے ساتھ گھر میں محفوظ ہے۔

قاضی صاحب کے والد محترم قاضی محمد بسم اللہ عباسی عاصی صاحبِ کشف بزرگ اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بیعت اور مجاز تھے، حضرت کے صاحبزادے ایک مرتبہ قاضی صاحب کے آبائی گاؤں بیارا تشریف لائے تھے تو ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا، ایک سبق آموز منظر تھا جسے ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ قاضی محمد عدیل عباسی کے والد قاضی محمد بسم اللہ عباسی کہاروں کیساتھ خود بھی اس پالکی کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے پانچ کلومیٹر کا سفر طے کیا تھا، خود حضرت کے صاحبزادے جو انھیں بابا کہتے تھے وہ منع کرتے تھے تو خاموشی سے صرف یہ کہدیتے تھے کہ آپکو کیا معلوم میری نگاہیں اس وقت کس کو دیکھ رہی ہیں۔

اس واقعہ کا ذکر یہاں اسلئے مناسب سمجھا گیا کہ وہ خاندانی دینی اور ذہنی پس منظر واضح ہوجائے جو قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں رہا ہے، مولانا علی میاںؒ سے انکی قربت میں یہ رشتہ بھی کارفرما تھا، مولانا علی میاںؒ نے انھیں غیور اور باحمیت مسلمان اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے انھیں راسخ العقیدہ اور صاحبِ استقامت مردِ مومن لکھا ہے، ایک عظیم واقعہ جو اس پوری تحریک ودعوت کی اصل روح ایک مشعل نورانی اور اشارۂ غیبی تھا جسے قاضی صاحب مرحوم نے اپنے اخلاص وللّٰہیت کی بناء پر سپرد قلم کرنے سے گریز کیا، لیکن اکثر بیان کرتے وقت آبدیدہ ہوجایا کرتے تھے۔

آبائی مکان سے متصل اپنی زمین پر قاضی صاحب کے والد محترم نے ایک چھوٹی سی مسجد اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی، جس کی دیواریں خام تھیں، چھپّر اور پھوس سے اس کی چھت بنائی گئی تھی، اس مسجد میں بڑی نورانیت اور روحانیت تھی، مشہور تھا کہ بے شمار جنات وہاں قیام پذیر اور قاضی بسم اللہ عباسی سے بیعت تھے۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے ذہن وفکر میں دینی تعلیمی تحریک اور مکاتب کے قیام کا خاکہ اور منصوبہ نمودار ہوا اور جس وقت بے سروسامانی اور غیر یقینی مستقبل کی کیفیت میں انھوں نے اپنے گاؤں میں سب سے پہلے ایک مکتب کی بنیاد رکھی تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ ایک بڑی تنظیم وتحریک

کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے، اس وقت کسی خبر بھی نہیں تھی کہ اس مدھم روشنی سے ہزاروں چراغ روشن ہوں گے اور یہی چراغ فضا اور ماحول کی تاریکیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی صاحبان کے تقاضے سے مجبور ہو کر قاضی صاحب نے بستی میں کانفرنس کا ارادہ کر لیا تو ایک خواب دیکھا کہ آبائی گاؤں میں اپنے دروازے پر ایک بڑا دینی اجتماع کیا ہے، والد محترم کے ہاتھوں سے تعمیر کی گئی مسجد میں ظہر کے وقت ایک کثیر مجمع ہے جسمیں حضرات صحابہ کرام کی کثیر تعداد بھی موجود ہے، یہ احساس غالب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو منور کر یا، اسی درمیان دیکھا کہ وضو سے فارغ ہو کر حضرت علیؒ نے قاضی صاحب سے فرمایا:۔

"جلسہ بہت کامیاب رہا"۔

قاضی صاحب نے اس خواب کا ذکر مولانا علی میاںؒ اور مولانا منظور نعمانی صاحبؒ سے کیا تھا لیکن یہ گذارش بھی کی تھی کہ یہ حضرات اپنی کسی تقریر و تحریر میں اس کا اظہار نہ فرمائیں، مولانا علی میاںؒ کی آخری علالت کے دوران کسی خاص موقعہ پر مہمان خانہ میں یہ خواب اور واقعہ میں نے عرض کیا تو حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب نے ان سے اس کا ذکر کیا تھا، حضرت مولانا نے اسی وقت اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہارِ تشکر کے طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق اور مناسبت سے ابوالحسن علی کو بھی یہ سعادت نصیب فرمائی، ایک جملہ اکثر فرماتے تھے اس وقت بھی فرمایا کہ:۔ قاضی صاحب اور تمہارے والد مولانا محمود الحسن صاحب کیلئے بلاناغہ میں ایصالِ ثواب کرتا ہوں، یہ میرے معمولات میں شامل ہے، اس کا اہتمام میں نے بیت اللہ اور مسجد نبوی میں بھی کیا ہے، اللہ نے ان سے بڑا غیر معمولی کام لیا ہے، میں نے محسوس کیا کہ حضرت مولانا اس وقت کسی اور کیفیت میں تھے، جس کا تأثر چہرے پر نمایاں تھا، پھر فرمایا: "تم اس کام میں لگے رہو، یہ بڑی سعادت کی بات ہے، تم تحریک کی بہترین ترجمانی کرتے ہو"۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے ان دعائیہ کلمات اور تأثرات کو میرے حق میں قبول فرمائے اور مجھے خدمت کے مواقع میسر آتے رہیں، میں اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوں کہ خود حضرت مولانا نے مجھے دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ کا رکن اور پھر اس کا

سکریٹری نامزد کیا، اے اللہ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اپنے حضرت والا کی شفقتوں اور انکی نگاہِ انتخاب کی لاج رکھ سکوں، اے اللہ میرے بزرگوں نے جس دینی تحریک میں اپنی عمریں کھپا دیں مجھے بھی اس میں آخر تک لگے رہنے کی سعادت نصیب فرما، اے اللہ جس گھر اور گاؤں سے اس کا آغاز ہوا وہاں اس کی فکر باقی رہے اور محض اللہ کی عنایت سے جو شانِ امتیازی ان کے حصہ میں آئی ہے اس کی قدر و حفاظت کا جذبہ بیدار رہے اور اس کی سچی توفیق اس گھر کے ہر فرد اور گاؤں کے ہر مسلمان کو ملتی رہے۔

قاضی صاحب اپنی ڈائری میں بچپن کی دینی تربیت، گھر کے اسلامی ماحول، اپنے والد صاحب کے درس و تعلیم و طریقۂ تربیت پر تفصیل سے واقعات لکھے ہیں:۔

"۷ رسال کی عمر سے روزمرہ عشا اور فجر دو وقت والد مرحوم آواز دیتے تھے، عدیل کہاں ہے؟ نماز کیلئے بھیجو، عام طور پر کہا جاتا تھا سو رہے ہیں، فوراً کہتے پانی کا چھینٹا دو جگاؤ، چنانچہ روزمرہ عشاء اور فجر کے وقت میرے منھ پر پانی کے چھینٹے پڑتے تھے اور پنجوقتہ نماز باجماعت پڑھائی جاتی تھی ـــــ کیا مجال تھی کہ کسی بچے کو بلا قرآن پاک اور دینیات پڑھے ناشتہ مل جائے یا وہ اسکول چلا جائے ـــــ وہ کہتے تھے کہ اگر سرکاری تعلیم کی شرط یہ ہے کہ میرا لڑکا دینیات نہ پڑھے تو اس کا نام اسکول سے خارج کر دیں۔

آج اسی احسان کو ہم لوگ یاد کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ خدا ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کی سخت گیری نے ہم لوگوں میں نماز کی عادت ڈالدی، یہ ہمارے اعمال بد کی شامت ہے کہ ہم اسے عبادت میں تبدیل نہ کر سکیں، لیکن وہ اپنا کام کر گئے آج میں اگر سفر و حضر کھوٹے سکوں ہی کی طرح دو سجدے وقت پر لگا لیتا ہوں تو یہ انھیں کا طفیل ہے، اور اگر ہمارے لڑکوں میں یہ عادت نہیں ہوئی تو یہ ہماری غلطی ہے، کاش کہ والدین اس نکتہ کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

والد مرحوم کی آواز کی گونج دلوں میں تلاطم برپا کرتی رہی اور آخر کار پختہ عمر میں مطالعہ

اور مشاہدہ کے بعد راہِ حق نظر آ ہی گئی"۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے کاروانِ زندگی میں اپنے بچپن کے حالات والد صاحب کے انتقال اور والدہ محترمہ کی تربیت اور شفقت کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کیا ہے :۔

"ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں لیکن نماز کے بارے میں مطلق تساہل نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر کبھی سو گیا خواہ کیسی ہی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز سونے نہ دیتیں، اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں، اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں"۔

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کو مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد جو راہِ حق نظر آئی تھی اس کا مظاہرہ دینی تعلیمی تحریک اور دینی تعلیمی کونسل کی شکل میں پورے ملک کے سامنے اس وقت ہوا جب انھوں نے حضرت مولانا علی میاں کی صدارت میں اپنے شہر بستی میں وہ ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی جسے تمام بزرگان ملت اور خود حضرت مولانا علی میاں نے وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا، مولانا اکثر فرماتے تھے کہ "یہ کام قرب الٰہی کا ذریعہ ہے"۔

بستی کانفرنس کا خطبۂ صدارت جو حضرت مولانا علی میاںؒ نے، عجلت میں سہارنپور اور ہردوئی کے درمیان ٹرین پر لکھا تھا، وہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کے بغیر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی، دینی دعوت و پیغام اسکی ابدیت اور عظمت، اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اور ان کی ذمہ داریاں، ان کے سامنے روز پیش آنے والے مسائل کا مثبت ذکر اور اسپر مؤمنانہ شان سے اظہار خیال، حکومت کی عدم توجہی، دستور ہند اور سیکولرزم کے برعکس حکومت کے شعبۂ تعلیم کے غیر اخلاقی اور غیر جمہوری اقدام پر بے لاگ تبصرہ، ایک مومن کی صدائے حق، ایک مجاہد کی شانِ حریت اور جذبۂ جہاد، ایک مورخ کی نگاہِ دوررس اور انداز استدلال ایک محب وطن کی لازوال

حبُّ الوطنی، ایک بیقرار قلب ونظر کا آئینۂ جلال وجمال، ماضی کی الم ناکیاں، حال کی خطرناکیاں اور مستقبل کی اندیشہ ناکیاں، بپھرے ہوئے سمندر میں موجوں کی طغیانیاں اور باہمت باحوصلہ دیدہ ور فہم وفراست کی طاقت وتوانائیوں سے لبریز ایک ملّاح کی جرأتِ رندانہ اور ادائے قلندرانہ اور ان ساری کیفیات سے مربوط واضح نشانیاں حضرت مولانا علی میاں کے اس پہلے خطبۂ صدارت میں روز روشن کی طرح عیاں ہیں، علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ادب وانشاء اور زبان وبیان کے دلکش انداز واسلوب کی جو وارثت ندوۃ العلماء کے حصہ میں آئی اس میں حضرت مولانا نے اپنے منفرد لب ولہجہ اور انداز نگارش سے چار چاند لگا دئے، یہ خطبہ اس لحاظ سے بھی ایک ادبی اور علمی شاہکار ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ غیب سے جن بزرگوں پر روحانیت کی بارش کی ہے، ان میں ہمارے حضرت کا نام نامی نمایاں ہے، لیکن انھوں نے کبھی خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات پر اکتفا نہیں کی بلکہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا فریضہ انجام دیتے رہے، آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں جن محرکات اور سنجیدہ ترین عوامل کا ذکر ہوگا ان میں یہ خطبۂ صدارت یقیناً سنگ میل قرار دیا جائیگا۔

حضرات!

"ایک سپاہی اور رضا کار کیلئے اگر ایسے اعزاز ومنصب کے قبول کرنیکے لئے جو آپ اپنے اس رفیق کو عطا فرما رہے ہیں کوئی جواز ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کو اس کے ذریعہ اپنی آواز کے زیادہ وقیع اور اپنی دعوت کے زیادہ وسیع بننے کی توقع ہو، یہ توقع بعض اوقات بعض جسارتوں کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتی ہے، اس توقع پر اسلامی معاشرہ کا ایک معمولی فرد خانۂ خدا کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر اذان دینے کی جرأت کرتا ہے امید ہے کہ آپ کا حسنِ التفات اور میری مخلصانہ گذارشات اس جسارت کیلئے جو میری زندگی کا ایک اتفاقی واقعہ ہے وجہ جواز بن جائے گی۔

امید ہست کہ بے گانگیٔ عرفی را
بدرستیٔ سخنہائے آشنا بخشند۔

حضرات ! آپ معاف فرمائیں مجھے کہانی ذرا دور سے شروع کرنی ہوگی، ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے کا سب سے بڑا محرک اور سب سے طاقتور اور گہرا جذبہ یہ تھا کہ اس غیر ملکی اقتدار کی موجودگی میں وہ فضا اور ماحول میسر نہیں جس میں ہندوستانی اپنے اپنے عقیدہ اپنے اپنے جذبات و روایات اور اپنی قومی خصوصیات کے ساتھ نشو و نما اور ترقی حاصل کر سکیں اور ان کی آئندہ نسلیں اپنے عقیدہ، مسلکِ زندگی اور قومی مزاج کی حامل ہوں۔

انگریزی حکومت نے اگرچہ براہِ راست اس ملک کی آبادی کے عقیدہ اور تہذیب و معاشرت میں مداخلت نہیں کی تھی، اس کا نصابِ تعلیم بھی غیر دینی اور سیکولر تھا، جس میں کسی قوم کی تہذیب، کسی دور کے فلسفے اور کسی مذہب کی الٰہیات کی تعلیم نہ تھی اور مسیحیت کی مقدس شخصیتوں کو اس میں اجاگر نہیں کیا گیا تھا، اس دورِ حکومت میں آبادی کے ہر عنصر کو مذہبی آزادی حاصل تھی اور اس کا پرسنل لا بھی محفوظ تھا، ایک بے لاگ مؤرخ کی حیثیت سے ہم کو ان حقائق کا اعتراف کرنا چاہیئے، لیکن ان تمام ظاہری انتظامات اور تحفظات کے باوجود غیر ملکی حکومت اس ماحول اور فضا کو پیدا کرنے سے نہ صرف قاصر بلکہ اس میں حارج تھی جو ایک قوم یا آبادی کے مختلف عناصر کے آزادانہ نشو و نما و ترقی کیلئے ضروری ہے۔ ایک غیر ملکی حکومت میں دراصل ان امنگوں کی تکمیل ناممکن ہے جن کے سہارے قومیں زندہ رہتی ہیں جن کی خاطر وہ جدوجہد کرتی ہیں اور جن کی راہ میں ان کو ہر مشکل آسان، ہر تلخ شیریں اور ہر زیاں نفع معلوم ہوتا ہے اس کی موجودگی میں اس مسلک زندگی پر قائم رہنا مشکل ہے جو ایک صاحبِ شعور و صاحبِ مقصد قوم کو زندگی سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

یہ تھا وہ احساس جس نے انگریزی حکومت سے گلو خلاصی حاصل کرنے اور ملک کو آزاد کرنے پر ابھارا، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی جدوجہد کا محرک یہی جذبہ اور یہی توقع تھی اور کسی جدوجہد میں ان کیلئے جب ہی

کشش اور معنویت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کو اس کے نتیجہ میں اپنے عقیدہ اور مسلک زندگی کی آزادی، اپنی اخلاقی قدروں کا تحفظ اور اپنی ذہنی و روحانی امنگوں کی تکمیل کا سامان نظر آئے، اس کے بغیر ایک خالص اسلامی آبادی کے ملک کی آزادی اور کسی مسلمان سلطنت کا قیام بھی ایک لفظِ بے معنیٰ اور ایک سعیِ لاحاصل ہے۔

جنگ آزادی کے رہنماؤں نے اس حقیقت کا بار بار اعلان کیا اور اطمینان دلایا تھا، اور آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان کے آزاد دستور نے اس کا پورا تحفظ کیا، ہندوستان نے اپنے لئے غیر دینی طرزِ حکومت انتخاب کر کے ایک فیصلہ پر مہر لگا دی۔

لیکن ۴۷ء کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کو ایک ایسی صورتحال سے سابقہ پڑا جس کی قطعاً توقع نہیں تھی اور جو اس ملک کے حالات اور دستور سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتی یہاں ایک ایسا نصاب تعلیم جاری کیا گیا جس میں کھلے طریقے پر ایسے مذہبی تصورات اور روایات کی نمائندگی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی حس مجروح ہوتی ہے، بلکہ وہ انکے اعتقادات و مسلمات سے متصادم ہے، اس فلسفہ اور مذہبی تصورات و روایات کو ہم ہندو علم الاصنام یا ہندو میتھالوجی کے علاوہ کسی لفظ سے صحیح طور تعبیر نہیں کر سکتے۔"

حضرت مولانا نے اس کے بعد اپنے خطبہ میں اس طرح کے حوالے پیش کئے ہیں جن سے مذکورہ حقائق کی نشاندہی اور درد و کرب کی ترجمانی ہوتی ہے، مولانا نے بڑی جرأت اور بلند آہنگی سے اپنے خطبہ میں مسلمان دانشوروں، بزرگوں، صوفیاء اور جلیل القدر فاضل باکمال مصنفین اور بلند پایہ محققین کا ذکر کیا، جنھوں نے اس وقت کی پوری متمدن دنیا کے ذہن پر اپنی بلندی و انفرادیت کا نقش قائم کر دیا انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا اور جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس ملک کو زرخیز بنانے میں صرف کیں اور پھر اسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہیں اور ہم جن کی ہمت و بصیرت سے اپنی زندگی کا چراغ جلا سکتے اور اس کی لو بڑھا سکتے ہیں۔

حضرت مولانا نے طویل خطبہ میں جو کچھ فرمایا اس میں چند بنیادی اور اہم باتیں شاہ سرخیوں کے

طور پر اس طرح نظر آتی ہیں :-

- "ہمارا ملک اس وقت ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے جس میں جذبات عقل پر، فرقہ پرستی حب الوطنی پر، تنگ نظری وسیع النظری پر اور نسلی و لسانی تعصبات انسان دوستی پر غالب ہیں۔
- اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جا رہا ہے۔
- ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جا رہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے۔
- اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت و تہذیب کا ایک دور گزرا ہے جو چھ سات سو برس کی طویل مدت ہے، یہ ہندوستان کی تہذیب و ترقی کا ایک شاندار دور ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے خارج کرنا اس ملک کے ساتھ بڑی ناانصافی اور وطن دشمنی ہے۔
- اس ملک کا ضمیر زندہ اور بیدار ہے۔
- شریف النفس اور نیک طینت انسانوں کی اس ملک میں بہت بڑی تعداد ہے اور وہی اس ملک قوت و عزت کا سرچشمہ ہیں۔
- ہمیں امید ہے کہ اگر ہم اپنا مطالبہ قوت اور معقولیت کے ساتھ پیش کریں گے اور اس ملک دستور کے تحفظ کا مطالبہ کریں گے تو ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔
- ہم سچے محب وطن اور ملک دوست اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک اس ملک کی ساری اچھی حسین اور مفید چیزوں پر فخر کرنا ان کی حفاظت کرنا اور ان کو زندہ رکھنا اپنا فرض نہ سمجھیں۔
- ہم اس وقت کے انتظار میں (جب حکومت کو اپنے فرض کا پورا احساس ہو جائے) نہیں رہ سکتے۔
- قوموں کی زندگی میں چند برس کی مدت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
- ہم کو اپنی جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے۔
- ہم کو حکومت سے بہت واضح و پر زور طریقہ پر مطالبہ کرنا چاہیئے کہ سرکاری نصاب تعلیم

اور نظام تعلیم مکمل طور پر سیکولر ہو اور حکومت اسکے نفاذ میں پوری جرأت وخلوص سے کام لے۔

- دوسرا حصہ وہ ہے جو خود ہم سے متعلق ہے اور اس کے بارے میں ہم خدا اور اس کے بندوں اور اپنی آئندہ نسلوں کے سامنے جوابدہ ہیں۔
- نصاب تعلیم حقیقی معنیٰ میں غیر مذہبی و سیکولر ہو جائے پھر بھی ہمیں اپنے بچوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔
- ایک ایسی ملت کو جس کی زندگی کا اتنا بلند معیار ہو ایک ایسے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالہ نہیں کیا جا سکتا اور زمانہ کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔
- اس کیلئے مسلمانوں کو ایسا ہی انتظام کرنا ہوگا جیسے ان کو اپنی نمازوں اور دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے مساجد ومعابد اور روح وجسم کے رشتے کو برقرار رکھنے کیلئے ضروریات زندگی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔
- اس کیلئے ان کو مساجد میں وعظ وتلقین، گھروں میں اصلاح وتربیت اور مکتبوں اور مدرسوں میں دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔
- اس کیلئے ان کو سارے ملک میں صباحی وشبینہ مکاتب کا ایک ایسا جال بچھا دینا ہوگا جس سے کوئی قریہ اور کوئی محلہ محروم نہ رہے۔"

قاضی محمد عدیل عباسی کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے (جن کے نتیجہ میں وہ تاریخی کانفرنس اور اسمیں حضرت مولانا کا تاریخی خطبۂ صدارت وجود میں آیا جو ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے علاوہ ہندوستان کے سنجیدہ مخلص، صاف ذہن عوام وخواص کیلئے ایک عظیم تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے) حضرت مولانا نے تحریر فرمایا:۔

"ایک شخص کی کوشش اور مقصد کے عشق نے بیسیوں اداروں کا کام کیا اور ہمیں نئے تجربہ سے آشنا کیا ہے کہ ایک شخص کا عزم اور اس کی حکمت عملی کس طرح عمومی چندہ سے بے نیاز ہو کر سیکڑوں مدرسوں کو چلا سکتی ہے، اور کس طرح چھوٹے چھوٹے دیہات اور

اور تعصبات اپنے بچوں کی تعلیم میں خود کفیل ہو سکتے ہیں"۔

حضرت مولانا نے خطبہ کے آخر میں جو پیغام مسلمانوں کو دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے من وعن پڑھ لیا جائے، اس سے ایمان تازہ ہوتا ہے، روح میں فرح وانبساط، قلب ونظر میں وسعت، اور حرکت وعمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، مولانا کے اندازِ نظر اور زاویۂ فکر کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ سخت ترین حالات میں بھی مایوسی کے بجائے عزم، افسردگی اور اضمحلال کے بجائے ذوق وشوق، احساسِ کمتری کے بجائے جرأتمندانہ طرزِ عمل کا اظہار ہوتا تھا، اکثر ایسے مواقع پر حضرت مولانا کا اندازِ تحریر وتقریر غیر ضروری جوش وجذبہ کو ابھارنے کے بجائے سنجیدہ دعوت فکر کا ترجمان ہوتا تھا۔

وہ محرمِ رازِ درونِ میخانہ تھے، وہ عندلیبِ باغِ حجاز تھے، وہ رہ ورسم شاہبازی سے پوری طرح باخبر تھے، انھیں ملت کا درد بھی تھا، ملک سے بے پناہ جذبہ محبت بھی، وہ مسلمانوں کے غمگسار بھی تھے اور سرزمین ہند کے طرفدار بھی اور بیک وقت ملک وملت کی بہی خواہی، ترقی اور ارتقاء کے طلبگار بھی تھے، وہ ملک کی وحدت اور سالمیت کیلئے فکرمند بھی رہتے تھے اور مسلمانوں کے اندر غیرت وحمیت اور خودی وخودداری اور ایثار پسندی کے جلوۂ خوش رنگ کو دیکھنے کے تمنائی بھی تھے۔

حضرت مولانا کا ایک جملہ اپنی گہری معنویت کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ اسے جلی حروف میں لکھ کر نمایاں کیا جائے:

"شرطِ اول عزم اور شرطِ ثانی نظم ہے اور ان دونوں کی موجودگی ہر مشکل کو آسان اور ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے"۔

چالیس برس قبل حضرت مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت اور قیادت قبول فرمائی تھی، اسوقت ایک قافلہ کے سامنے جو پیغام دیا گیا تھا، وہ دینی اور ملی تحریکات میں سرگرم افراد اور جماعتوں کیلئے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے:

حضرات! "قوموں کے اجتماعی فیصلوں نے دنیا کے نقشے اور قوموں کی تقدیریں بدلدی ہیں

آج جس چیز کی ہم سب کو زیادہ ضرورت ہے اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آسکتی ہے اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی وہ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے کو اپنے پیغمبر کو اپنے عقیدہ اور فرائض دینی کو پہچان سکیں، خالص رواجی یا معاشی تعلیم دلانا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے۔

اگر ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہم اس میں سچے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب کوئی مصلحت، کوئی تعزیر ہم کو اس صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کر سکتی اور اگر ہمارا یہ فیصلہ نہیں تو حکومت کی کوئی رعایت کوئی استثناء، کوئی تحفظ، کوئی انتظام ہم کو اس فساد و الحاد اور اس انحراف و ارتداد سے بچا نہیں سکتا جس کی طرف دنیا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

جو قومیں اپنے بارے میں خود فیصلہ نہ کر سکیں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور جو قومیں خود فیصلہ کر لیں ان کے فیصلہ کو کوئی بدل نہیں سکتا"۔

دینی تعلیمی کونسل کی عظیم دینی اور ملی تحریک سے متعلق حضرت مولانا کے اس پہلے خطبۂ صدارت کے طویل اقتباسات اس غرض سے پیش کئے گئے ہیں کہ یہ خطبہ اب نایاب ہے اسکا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ قاضی محمد عدیل عباسی صاحبؒ کے صاحبزادے قاضی محمد ارشد عباسی صاحب کے پاس بستی میں محفوظ ہے، تحریک و تنظیم کی جو فلک بوس عمارت تعمیر ہوئی اس کی خشتِ اوّل کے طور پر یہ خطبہ یادگار رہے، حضرت مولانا کو آخری ایام میں یہ خطبہ یاد آیا، میں نے ان کے سامنے پیش کیا تھا حضرت کی خواہش تھی کہ ان کے خطبات یکجا شائع ہو جائیں، یہ ذمہ داری میرے سپرد فرمائی تھی انشاء اللہ دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے اس کی تکمیل ہوگی، حضرت اکثر مجھ سے فرماتے تھے کہ "قاضی صاحب اور اپنے والد کی سوانح اور دینی تعلیمی کونسل کی خدمات اور تاریخ مرتب کرو"۔ "دینی تعلیمی کونسل کی خدمات" کے عنوان سے میرا ایک مضمون "قومی آواز" میں شائع ہوا تو مجھے طلب فرمایا،

اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میں نے لکھنؤ، علی گڑھ اور سہارنپور کانفرنسوں کی روداد مرتب کی تو حضرت نے اس کا مسودہ دیکھ کر دعا فرمائی اور جب تک وہ چھپ کر نہیں آگئی برابر استفسار کرتے رہے، میرے ساتھ شفقت و محبت کا مظاہرہ ایسا تھا جس سے دوسرے حضرات بھی متاثر ہوتے تھے چار برس کی عمر میں حضرت نے میری بسم اللہ کرائی تھی، اس وقت سے لیکر آخر تک میں ان کی محبتوں سے مالا مال ہوا، ندوہ کے مہمان خانہ میں ایک موقع پر میں نے پاؤں میں جوتے پہنانے کی کوشش کی تو فرمایا: تمہارے ہاتھ قدم کیلئے نہیں قلم کیلئے ہیں، چار مہینے گزر گئے خدا گواہ ہے کہ اس مدت میں ایک لمحہ کیلئے بھی میری آنکھوں کے سامنے سے حضرت کا چہرہ اوجھل نہیں ہوا، فکر و تصور میں بسا ہوا، آنکھوں میں سمایا ہوا، اب تک کوشش کے باوجود کچھ لکھنے کیلئے ذہن و دماغ کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنا میرے لئے مشکل رہا، آج جب اس ذمہ داری کو کسی طرح ادا کرنا چاہتا ہوں تو دل و نظر کی کیفیت ناقابل بیان ہو رہی ہے، دل قابو میں نہیں ہے، آنسوؤں میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے، اللہ کی ذات بڑی ہے، وہ چاہے تو اپنے ایک ناقص بندہ کو بھی سعادت سے نواز دے، یہ اس کی شان کریمی بھی ہے، شان رحیمی بھی۔

دینی تعلیمی کونسل کی تاسیس اور خدمات کا تقاضا ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل سے واقعات بیان کئے جائیں، لیکن یہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہے، اس وقت میرے پیش نظر صرف حضرت مولانا علی میاں کی ذات گرامی ہے جو گذشتہ چالیس برسوں میں مرکز نگاہ رہی ہے، یہ سرگزشت بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیل و توضیح کی طالب ہے، مگر میں اس کو مختصراً بیان کرنیکی کوشش کرتا ہوں چند اہم واقعات اور حضرت مولانا کے خطبات سے ضروری اقتباسات پیش کئے جائیں گے، جن سے تحریک اور مولانا کے تعلق پر روشنی پڑے گی، دینی تعلیمی کونسل کے صدر کی حیثیت سے مولانا کا ایک مقام وہ تھا جس سے خارجی سطح پر لوگ واقف اور عظمتوں کے معترف تھے، لیکن حضرت کی ایک حیثیت اس کے سرپرست اور بزرگ خاندان کی تھی جس کی بناء پر داخلی طور پر معاملات کی فکر اور مالیات کی فراہمی بھی اس تعلق میں شامل تھی، کونسل کے قیام کے بعد پورے صوبۂ اتر پردیش میں

جوش و جذبہ سے بھری ہوئی ایک ایسی فضا نمودار ہوئی جس میں مسلمانوں کا ہر طبقہ بیدار، کام کے لئے آمادہ و تیار اور ہر ضلع میں تحریک و تنظیم کے لئے ماحول خوشگوار نظر آنے لگا، مولانا محمود الحسن صاحبؒ جو اب تک بستی اور قریب کے اضلاع میں مصروف تھے اب اس کے بعد پوری ریاست میں سرگرم ہو گئے، ان کی ڈائری اور کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شب و روز سفر کا ایک سلسلہ تھا، ایک فکر دامنگیر تھی، ایک تصور اور تاثر تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل ایمان و عقیدہ پر قائم رہے اور اس ملک میں دین کی حفاظت کا قابلِ اطمینان بند و بست ہو جائے، ان کی تحریروں میں یہ جذبہ نمایاں ہے :۔

"اگر ملک کے اندر ہم کو سرکاری ملازمتوں میں اپنا حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے اوپر دنیاوی ترقیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ نہ صرف ہمارے امن و سکون کو برباد اور ہماری عزتِ نفس کو پامال کر دیا گیا ہے، بلکہ ہماری زندگیوں اور ہماری عزت و آبرو کو بھی غیر یقینی حالت تک پہونچا دیا گیا ہے، تو ہمارا اس صورتِ حال کو بدلنے کیلئے فکر مند ہونا بجا ہے، لیکن ان سارے مسائل سے بڑا مسئلہ ہمارے لئے اپنی آئندہ نسلوں کے دین و ایمان کا مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کے سامنے کسی مسئلے کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اگر یہ سارے مسائل حل طلب رہ جائیں اور ہمیں موت آجائے تو ان کے لئے اللہ کی بارگاہ میں ہم سے باز پرس نہیں ہوگی، لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس حال میں موت آگئی کہ ہماری نسلوں کے ایمان کا مسئلہ باقی رہا اور ہم نے اسے حل کرنے کی پوری جدوجہد نہ کی تو ہم اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور ہم کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔"

میرے والد محترم مولانا محمود الحسن صاحبؒ تحریک و تنظیم سے متعلق اپنی ڈائری میں ضروری یادداشتیں نوٹ فرمایا کرتے تھے، وہ سب مرتب ہو جائے تو سرگرمیوں کی ایک اہم تاریخ محفوظ ہو سکتی ہے، ۷ راپریل ۱۹۶۰ء کو پہلی بار رائے بریلی کا جو سفر مولانا علی میاںؒ سے ملاقات کی خاطر انھوں نے کیا تھا اسکا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کیا گیا ہے :۔

"زندگی میں پہلی بار سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے وطن میں حاضری کا شرف حاصل ہوا علی میاں آج کل یہیں ہیں، ضلع دینی تعلیمی کنونشن رائے بریلی کے سلسلے میں مولانا سے بات ہوئی، چونکہ حافظ عبدالشہید صاحب اور دو ایک حضرات جو رائے بریلی میں کام کے لئے ضروری ہیں آج موجود نہیں ہیں، اس لئے کسی مشاورتی نشست کا انتظام آج نہیں ہو سکا، میں ۱۰ بجے دن کو تکیہ پہونچ گیا تھا، سارا دن خالی تھا، اس لئے کتابوں کے مطالعے کا موقع مل گیا، غلام رسول مہر کی کتاب سید احمد شہید، مولانا محمد جعفر صاحب ساکن مجھوا میر ضلع بستی کی منظورۃ السعداء اور مکاتیب سید احمد شہید موجود تھیں، انھیں دیکھتا رہا، سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کی بھی زیارت ہوئی جو اب خالی پڑا ہے، سئی ندی میں وضو کرتا اور اس مسجد میں نماز ادا کرتا رہا جو ندی کے متصل شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام سے تعمیر ہوئی تھی۔

شام کو بعد عصر میں، مولانا علی میاں اور قاری رشید الحسن صاحب وہ پتھر دیکھنے گئے جو سید صاحب کی قوت جسمانی یا قوت روحانی کے مظہر کے طور پر آج سئی ندی کے کنارے پڑا ہوا ہے، قاری رشید الحسن صاحب جو ہمارے ساتھ تھے نواب علی حسن خاں صاحب مرحوم والی بھوپال کے پوتے ہیں اور آجکل دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قراءت کے شعبہ میں مدرس ہیں، یہ پتھر جسے سید صاحبؒ نے زمین سے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا تھا، اور بیس قدم پر لے جا کر پھینک دیا تھا ایک چراغ دان ہے کھمبے کی شکل کا اس کا وزن اس کے حجم کو دیکھتے ہوئے دس من پختہ سے کم نہیں معلوم ہوتا۔"

۸ راپریل ۱۹۶۰ء :-

"حافظ عبدالشہید صاحب (تاجر غلہ) جو کانپور گئے تھے رات واپس آگئے اور آج صبح مولانا علی میاں کا خط پاکر فوراً آئے ان کے سپرد ہوا کہ آج ہی بوقت عصر مسجد دائرہ میں جو وسط شہر میں ہے، شہر کے تمام اہم اور ممتاز حضرات کا مشاورتی اجتماع کریں۔

جمعہ کی نماز قاری رشید الحسن صاحب کی اقتدا میں مسجد شاہ علم اللہ میں ادا کی، قاری صاحب قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں، ذہن و دماغ پر وہ روحانی کیفیت بھی طاری تھی جو گزرے ہوئے بزرگوں اور شہیدوں کی اس سرزمین کے ذرے ذرے پر چھائی ہوئی ہے، اسلئے نماز میں اور زیادہ لطف و کیف حاصل ہوا۔

۴ بجے مولانا علی میاں، قاری رشید الحسن صاحب اور علی میاں کے ایک عزیز کے ساتھ مشاورتی اجتماع میں شرکت کیلئے شہر کی جانب روانہ ہوا۔

پہلے علی میاں صاحب نے تفصیل سے مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کی عام ترویج واشاعت اور اس کیلئے مسلمانوں کی ہر طرح کی آمادگی اور تیاری کی ضرورت بیان کی اور پھر میں نے انجمن تعلیماتِ دین کے قیام کی ضرورت، کنونشن کے انتظامات وطریق کار اور جدوجہد کے نقشے پیش کئے، اس کے بعد عارضی انجمن تعلیماتِ دین ضلع رائے بریلی کی تشکیل بالاتفاق عمل میں آئی۔

دینی تعلیمی کونسل کے قیام اور مولانا علی میاں کے صدر منتخب ہونے کے بعد مختلف اضلاع میں انجمن تعلیماتِ دین کی تشکیل اور ضلع کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں آیا، لیکن رائے بریلی کے مذکورہ بالا جلسے اور انجمن کی تشکیل کی اہمیت اس لئے ہے کہ حضرت مولانا کی سرپرستی اور رہنمائی میں یہی پہلی تشکیل تھی جو اتفاقاً رائے بریلی ہی میں عمل میں آئی، پوری تحریک کے سلسلے میں جو رائے بریلی کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی، وہاں کے مسلمانوں اور مدارس کے ذمہ داروں کو آج بھی اس کی قدر کرنی چاہیے حضرت مولانا غالباً اسی بناء پر رائے بریلی میں انجمن تعلیماتِ دین کے قیام واستحکام اور تحریک کے فروغ وترقی کیلئے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے اور اس کا اظہار فرماتے تھے کہ اس مسئلہ میں رائے بریلی کو مثالی ہونا چاہیئے، حضرت کے اس جذبۂ وفکر کو ان کی وصیت سمجھ کر قبول کرنا چاہیئے اور رائے بریلی کے مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے شہر اور ضلع میں حضرت کے دستِ مبارک سے لگائے گئے اس پودے کو خشک نہیں ہونے دیں گے، اس کی آبیاری کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی جس سے

حضرت والا کی روح کو شادمانی حاصل ہوگی اور انشاء اللہ رائے بریلی کے مسلمان اس کے ذریعہ اللہ کی رحمت اور برکت سے مالا مال ہوں گے۔

والد ماجد مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے اپنی کتاب "دینی تعلیمی کونسل، مقاصد، طریق کار، خدمات اور منصوبے" میں حضرت مولانا علی میاں کے پہلے خطبۂ صدارت کے متعلق اپنے تأثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مولانا موصوف کے خطبۂ صدارت نے مسلمانوں کے سامنے موجودہ حالات میں مسلمان بچوں کے ایمان کیلئے جو خطرات ہیں اور ان کے پیش نظر ان کی دینی تعلیم کے بندوبست کی جو ضرورت اور اہمیت ہے اس کو اس طرح واضح کیا اور اس انداز سے اپیل کی کہ ہر مسلمان کا قلب بے چین اور اس کا ایمانی جذبہ پوری قوت سے بیدار ہوگیا۔"

ڈائری کے صفحات جو تقریباً پچیس برسوں کی سرگرمیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں وہ حضرت مولانا علی میاں کی خدمات اور ان کے ذکر سے مزین ہیں، مولانا کی بین الاقوامی شخصیت تھی، عرب وعجم میں شہرت اور مقبولیت حاصل تھی، دینی، علمی اور تصنیفی مصروفیات تھیں، لیکن دینی تعلیمی کونسل کا خیال ہر فکر پر غالب نظر آتا تھا، چند واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی ڈائری میں درج ہیں، اس سلسلے میں اگر مولانا کے اسفار کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک کتابچہ تیار ہوجائے گا، اس مقصد کیلئے کوئی سفر طے ہوتا تو بعض وقت ضعف واضمحلال کے باوجود اس کی تکمیل کی فکر ہوتی اور اندازہ ہوتا کہ اگر سفر نہ ہوسکا تو اس کے تأثر سے طبیعت مزید بوجھل ہوگی اکثر دیکھنے میں آیا کہ اس حالت میں بھی سفر کے بعد انبساط کی کیفیت ظاہر ہوتی تھی، اسطرح کے بے شمار سفر میں مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا ہے اور میں نے بچشم خود اس کا مشاہدہ کیا ہے، میرے کرم فرما اور بزرگ مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے "میر کارواں" میں تحریر فرمایا ہے:۔

"مرحوم قاضی عدیل عباسی کے اخلاص کی قدر ان کی زندگی میں بھی کرتے تھے، اور ان کے انتقال کے بعد بھی اس کو یاد رکھتے ہیں، مرحوم کے بھانجے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی

کو اس نسبت سے اور ان کی صلاحیتوں کی بناء پر ہمیشہ عزیز رکھتے، اور ان کی کسی دعوت یا ان کے توسط سے جو دعوت مولانا کو دی گئی اس کو ان حالات میں بھی قبول کیا جبکہ ان کی صحت پر ضعف اور تعب کا اثر تھا۔"

۲۷ر جنوری ۱۹۶۳ء اتوار — ڈائری کا ایک صفحہ :-

"آج فیض آباد سے درسگاہ جماعت اسلامی مغل پورہ فیض آباد کے صدر مدرس صاحب لکھنؤ آئے، پہلے علی میاں کے پاس گئے اور پھر میرے پاس دفتر آئے۔ جبری تعلیم کے سلسلے میں جو مقدمہ چل رہا ہے اس پر یہاں کے وکلاء سے مشورہ کرنا تھا۔ حضرت مولانا علی میاں نے فون پر کہا کہ مقدمہ کونسل کی طرف سے لڑا جائے اور کوئی کوتاہی نہ ہو۔"

جبری تعلیم کا مسئلہ ہندوستان میں بہت قدیم ہے، تقریباً ۷۰ر سال قبل ۱۳۵۰ھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، جس میں دینی استقامت، ایمانی غیرت وحرارت اور جرأتمندانہ استدلال سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی، ۱۹۲۹ء میں دہلی میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا تھا کہ میونسپل کمیٹی دہلی اور اس کی تعلیمی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ :-

۱۔ قرآن مجید، حفظ وناظرہ خواں بچوں کو قرآن مجید کے مکتبوں سے جبراً چھین لیا جائے۔

۲۔ قرآن مجید پڑھنے والے بچوں کے سرپرستوں کے خلاف مقدمات فوجداری قائم کرائے جائیں کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم میں مشغول ہونیکی وجہ سے ابتدائی جبری تعلیم کے اسکولوں میں نہیں بھیج سکے۔

۳۔ کمیٹی نے مدارس قرآنی کے معلموں کو اس مضمون کے نوٹس دیئے کہ وہ ان مدارس کو بند کر کے لڑکوں کو جبری تعلیم کے اسکولوں میں بھیجدیں ورنہ فوجداری کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔"

۲۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو انجمن خادم القرآن کا اجلاس حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت میں جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں بزرگانِ ملت اور علمائے امت کی کثیر تعداد تشریف فرما تھی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد زکریا صاحبؒ بھی موجود تھے۔ اس موقع پر تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف اس تجویز کا اظہار مناسب ہے، جو اس جلسۂ عظیم میں منظور کی گئی تھی اور جو اس دور ابتلاء میں مسلمانوں کیلئے باعثِ تقویت ثابت ہوئی تھی:۔

"مسلمان قرآن مجید کی تعلیم سے کسی صورت میں بھی دستبردار نہیں ہو سکتے، کیونکہ قرآن مجید ہی کی تعلیم اور قرآن مجید ہی کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ان کی دینی نجات اور بقائے مذہب کا کفیل ہے۔

یہ جلسہ میونسپل کمشنروں سے استدعا کرتا ہے کہ معاملہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ کر عامۂ مسلمین کے مذہبی جذبات کی صحیح ترجمانی کریں اور قرآن مجید کی تعلیم کو مستثنیٰ کرانے کی پوری کوشش کریں، ورنہ مسلمان مجبور ہوں گے کہ وہ مدافعت کا کوئی قوی اور مؤثر ذریعہ اختیار کریں"۔

تقریباً نصف صدی کے بعد آزاد ہندوستان کی ریاست اتر پردیش میں جبری تعلیم کا مسئلہ دوبارہ شد و مد سے اٹھایا گیا اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے خوف و ہراس کا ماحول بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، سوچا گیا تھا کہ مکاتب کے قیام کی جو لہر اٹھی ہے اس کو دبانے کا یہ مؤثر ذریعہ ہوگا، اور مسلمان اس قانون سے گھبرا کر اس تحریک سے الگ ہو جائیں گے، لیکن دینی تعلیمی کونسل نے جو روح پھونک دی تھی، اسے آسانی سے دبانا مشکل تھا، مسلمانوں کا طرزِ عمل گھبراہٹ کے باوجود اس وقت یہ تھا ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ؛ بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے انجمن تعلیمات دین ضلع شاہجہاں پور کی تیسری کانفرنس منعقدہ ۲ جون ۱۹۶۸ء کے خطبۂ صدارت میں اس مسئلہ سے متعلق دو واقعات بیان کئے ہیں:۔

"مین پوری سے ہمارے دفتر میں تار موصول ہوا کہ وارنٹ جاری ہو گیا ہے اور گرفتاری ہونے والی ہے، میں نے فوراً جوابی تار دیا کہ "وارنٹ اور گرفتاری کا کوئی قانون نہیں ہے گھبراؤ مت، ناظم صاحب جا رہے ہیں" مولانا محمود الحسن صاحب وہاں پہونچے اور حالات درست ہو گئے۔

"گورکھپور میں جب نوٹسیں دی گئیں اور میں طلب کیا گیا تو وہاں پچاسوں آدمی جوش میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کیا کیا جائے، میں ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ آپ سے درخواست ہے کہ نوٹسیں واپس نہ لیجئے گا، مجھے صوبہ کے اندر کہیں مقدمہ لڑنا ہے اور چونکہ میں جنرل سکریٹری ہوں مجھے وقت دینا ہوگا، گورکھپور میں مجھے مقدمہ لڑنے میں سہولت ہے، چیرمین صاحب نے بڑی خاطر کی اور کہا کہ آپ مقدمہ کہیں اور لڑیں، میں مقدمات واپس لیتا ہوں، بس سکریٹری انجمن تعلیمات دین کی مہر لگی ہوئی رپورٹ آجانی چاہئے کہ بچے مکتب میں پڑھ رہے ہیں، میں واپس آیا تو دوستوں نے اضطراب انگیز لہجہ میں پوچھا کیا ہوا، میں نے جواب میں کہا کہ:۔

؎ تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا"۔

ان واقعات کے پیش آنے کے بعد مولانا علی میاں کی فرمائش پر قاضی صاحب مرحوم نے "آزاد اسلامی مکاتب اور جبریہ تعلیم" کے عنوان سے ایک مدلل اور طاقتور کتابچہ تحریر کیا جسکے عام ہونے کے بعد فضا بدل گئی، حکومت کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مسلمان اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ دینی تعلیمی کونسل کے نظام تعلیم و تربیت کو اپنی ریاست اتر پردیش کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی جاری کرنے کے خواہشمند تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہاں جو طریقۂ تعلیم مکاتب کے قیام کی شکل میں سامنے آیا ہے وہ پورے ملک میں پھیل جائے اور کسی گوشہ میں بھی مسلمان

دین کی ابتدائی اور ضروری تعلیم سے محروم نہ رہیں ، ۲۸ رجولائی ۱۹۶۳ء کو مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی ڈائری میں درج ہے :۔

"آج صبح گونڈہ میں کونسل کے انچارج دفتر مولوی نذیر احمد نوری صاحب نے آکر خط دیا جو بھوپال سے آیا تھا اور بتایا کہ ٹرنک کال بھی آیا ہے ، مولانا علی میاں نے فوراً بھوپال طلب کیا ہے تاکہ وہاں ریاستی دینی تعلیمی نظام بنانے کیلئے جو جلسہ ۲۹ رجولائی کو ہو رہا ہے اس میں شرکت کروں ، مولانا محمد عمران خاں صاحب بھوپال کے لکھنے کے مطابق اس سفر کا خرچ مولانا ابوالعرفان صاحب مہتمم ندوۃ العلماء سے ملا ۔ مبلغ پچاس روپئے ۔

۲۹ رجولائی ۱۹۶۳ء :۔

آج ۱۲ ½ بجے دن کو بھوپال پہونچا ، جھانسی سے مولانا عمران خاں صاحب کا ساتھ ہوگیا تھا جو دہلی سے واپس ہوئے تھے ۔

مولانا علی میاں صاحب برہان پور تشریف لے گئے تھے ۳ ½ بجے دن کو واپس آئے ۔ یہاں جلسے کے منتظم حضرات سے ریاستی دینی تعلیمی نظام کے مسئلے پر بات چیت ہوئی ، نام "مدھیہ پردیش دینی تعلیمی کانفرنس" طے ہوا ۔

رات میں جلسۂ عام ہوا ، مولانا علی میاں نے خطاب فرمایا ، پھر مجھ سے عرض کرنے کو کہا گیا اور آخر میں نظام کی تشکیل کی تجویز پاس ہوئی ، مولانا علی میاں نے بڑی رقت کیساتھ دعا فرمائی"

اسی طرح گجرات ، بمبئی اور بہار میں بھی اس تحریک کا تعارف ہوا اور ان جگہوں پر بھی کام کا آغاز و تنظیم کا قیام عمل میں آیا ، حضرت مولانا کی عمر اور صحت نے جب تک اجازت دی ، بلکہ بعض وقت اس کے بغیر بھی دینی تعلیمی کونسل کیلئے آسان یا مشکل کسی طرح کے سفر میں کبھی تکلف نہیں ہوا ، حالات کے کیسے کیسے نشیب و فراز سامنے آئے ، دقتیں ، دشواریاں ، مشکلات ، اختلافات کے دور بھی گزرے کبھی خود اپنی صفوں میں بھی انتشار نظر آیا ، لیکن حضرت کا مزاج تھا وہ اس طرح کے سارے طوفانوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا کرتے تھے ، قلب و نظر کو وسعت کونین کی دولت عطا ہوئی تھی ، تحمل اور برداشت

کی جو آخری حدیں ہوا کرتی ہیں، جہاں تک عام انسانوں کا ذہن پہونچنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے ہمارے حضرت اپنی ذاتی زندگی اور تحریک و تنظیم میں ہمیشہ اس مقام پر بھی اطمینان و یکسوئی کے ساتھ تنہا کھڑے نظر آتے تھے، یہ وہ مقام بلند تھا جہاں تک کسی دوسرے کیلئے ہم رکابی آسان نہیں تھی اس کا اثر طبیعت پر، ذہن و فکر پر اور پورے اعصاب پر نمایاں ہوتا تھا، لیکن زبان سے کبھی اسکا اظہار نہیں فرماتے تھے، اس طرح کے بیشمار واقعات جو ذاتی اور اجتماعی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں میرے علم میں ہیں لیکن انھیں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے اس وقت تو صرف اُن واقعات و حالات کو ظاہر کرنا مقصود ہے جو دینی تعلیمی کونسل اس کی تحریک اور حضرت مولانا کے تعلق اور فکرمندی سے متعلق ہیں جنھیں پڑھ کر اس اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے جو اس راہ میں انھیں بے چین کئے ہوئے تھا، اس طرح کے واقعات میں درسِ عبرت اور بڑی سبق آموزی پنہاں ہے کاروان زندگی جلد اوّل کے صفحہ ۵۱۴، ۵۱۵ کی عبارت اپنے اندر ایمان و استقامت اور درس و پیغام کی بڑی کیفیات سے آراستہ ہے:۔

"میں دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے مغربی یوپی کے ایک دورہ میں تھا، گرمی سخت تھی اور لو چل رہی تھی، بسوں کے ذریعہ سفر تھا اور بعض جگہ کئی کئی گھنٹہ دوپہر کی گرمی میں ٹھہرنا اور انتظار کرنا پڑا، ۲۲ رجون ۶۵ء کو میرٹھ کا پروگرام تھا، شب میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی فراغت پر اپنی قیامگاہ پر آکر سوگیا، فجر سے پہلے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بائیں آنکھ کی (جس میں آپریشن ہوا تھا) نظر بالکل جاتی رہی، طبیعت پر اس کا سخت اثر پڑا۔"

اس حالت میں بھی میرٹھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت فرمائی پھر سہارنپور تشریف لائے، حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فوراً لکھنؤ جانے کی ہدایت کی، سیتاپور آنکھ کے اسپتال میں داخل ہوئے، لیکن وہاں سے واپس آکر مسلم مجلس مشاورت کے سلسلے میں مصروفیات اس حد تک بڑھیں کہ دوبارہ آنکھ پر حملہ ہوا اور پھر سیتاپور اسپتال میں داخل ہونا پڑا جہاں پانچ آپریشن ہوئے، مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

"یہ میری زندگی کے سب سے زیادہ آزمائشی اور ایک طرح سے موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے کئی بار شدت تکلیف سے دعا کی کہ اگر اسی حالت کا باقی رہنا مقدر ہے تو ایمان کے ساتھ اٹھا لیجئے"

سیتاپور کے اس قیام سے متعلق حضرت مولانا نے ظفر احمد صدیقی صاحب مرحوم کے تعلق کا ذکر کیا ہے۔

"سیتاپور کے دونوں مرتبہ قیام کی پوری مدت میں جو بعض اوقات ڈھائی تین مہینے کے قریب بھی ہوئی میرے اور میرے ساتھ ٹھہرنے والوں اور عیادت کے لئے باہر سے آنے والوں کے کھانے کا انتظام کلیتہً بھائی ظفر احمد صدیقی وکیل سیتاپور نے کیا اور اس کا انحصار اپنے کھیت کے غلہ اور اپنی جائداد کی آمدنی پر رکھا میں کبھی ان سے درخواست کرتا کہ یہ سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہے، اب ہم کو خود اپنا انتظام کرنے کی اجازت دیجئے تو آبدیدہ ہو جاتے اور کہتے کہ بس یہ بات نہ کہئے اور جو کچھ آپ حکم دیں اس کی تعمیل ہوگی۔"

ظفر احمد صدیقی صاحب کی شخصیت کا اندازہ حضرت مولانا کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کو ایک لائق و مخلص رہنما اور کارپرداز اور اس کے بانی اور جنرل سکریٹری قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کو ایک سرگرم رفیق و معاون ظفر احمد صدیقی صاحب علیگ ایڈوکیٹ سیتاپور کی شکل میں مل گیا جنھوں نے اگست ۶۴ء میں بحیثیت سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اپنا کامیاب پیشۂ وکالت ترک کر کے اور سیتاپور سے لکھنؤ منتقل ہو کر اپنی پوری زندگی اور توانائیاں کونسل کیلئے وقف کر دیں۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی مختلف اوقات میں اس کے اعلانات اور محکمۂ تعلیم کے افسروں کے طرز عمل سے دور دوران سے زیادہ واقف آدمی کا ملنا مشکل تھا۔ انھوں نے ایک سپاہی اور رضا کار کے انداز میں پوری سادگی بلکہ جفاکشی کے ساتھ دینی کونسل کے غریبانہ دفتر ۹۹ گوئن روڈ لکھنؤ میں قیام اختیار کر لیا اور سب کشتیاں جلا کر ایک ایسے مسئلہ کے آستانہ پر آکر پڑ گئے جو ان کے نزدیک مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ تھا۔"

حضرت مولاناؒ کی صحت اور بڑھتے ہوئے ضعف اور مختلف عوارض کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر ظفر صاحب مرحوم نے مولانا سے عرض کیا کہ اب آپ مستقلاً رائے بریلی میں قیام کیجئے۔ لوگ استفادہ کی غرض سے وہیں پہونچیں گے۔ فرمایا جی تو میرا بھی اب یہی چاہتا ہے لیکن سوچتا ہوں قیامت میں پوچھا جاؤں گا کہ ملت پر وقت پڑا تھا تو تمہیں خانقاہیت سوجھی تھی تو کیا جواب دوں گا۔

اقبال کا شعر زندہ ہو گیا ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

دینی تعلیمی کونسل اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سلسلے میں ان مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو مولانا کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" پر ایڈیٹر قومی آواز جناب حیات اللہ انصاری صاحب مرحوم نے اداریوں کی شکل میں لکھے تھے اور جن سے علمی حلقوں میں دینی تعلیمی کونسل کی تحریک سے متعلق نئے اندازِ نظر کا دروازہ کھل گیا تھا اور سیاسی سطح پر اسکی اہمیت اور افادیت اور اسکی دستوری جمہوری اور آئینی جدوجہد پر غلط فہمیوں کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ حیات اللہ انصاری صاحب بستی کی پہلی کانفرنس میں بھی شریک تھے اور اس کے بعد بھی جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ وہ بلند پایہ صحافی اور مجاہد اردو تھے۔ اردو زبان و ادب اور اس کی ترویج و اشاعت میں وہ سرگرم رہے تھے اور عشق کی حد تک انھیں اپنی زبان اور اس کا ادب عزیز تھا۔ لیکن قومی تصورات اور نیشنلزم کے معاملے میں ان کا ذہن بالکل جداگانہ تھا۔ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم سے ان کے دیرینہ اور برادرانہ و مخلصانہ مراسم تھے اور اور دونوں ایک دوسرے کے سچے بہی خواہ اور بہترین دوست تھے دونوں کو ایک دوسرے کا غیر معمولی اعتبار حاصل تھا، زبان و ادب اور سیاسی نظریات میں کافی حد تک دونوں حضرات میں قدر مشترک موجود تھی۔ لیکن حیات اللہ صاحب کا کوئی عوامی رابطہ نہیں تھا اور قاضی صاحب ساری عمر عوامی سطح پر سرگرم عمل رہے حیات اللہ صاحب عملی سیاست سے دور تھے قاضی صاحب تقریباً چوتھائی صدی تک عوامی سیاست کے نشیب و فراز سے مردانہ وار ٹکر لیتے رہے۔ قاضی صاحب مرحوم سچے

پکے کانگریسی ہونے کے باوجود ایک مرد مومن بھی تھے اور وہ زندگی کے سارے معاملات و مسائل کو اسی حصار میں رکھتے تھے اور ہمیشہ انکی نظر اس نکتہ پر مرکوز رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس کے شدید مخالفین بھی کبھی انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرسکے اور عام مسلمانوں کے علاوہ علما، و مشائخ کی قربت اور اعتماد انھیں حاصل رہا اور ہر حلقہ میں ان کی خدمات کا اعتراف اور اس کی قدر دانی کی گئی۔ اس راہ میں قاضی صاحب مرحوم نے کبھی کسی رعایت سے کام نہیں لیا۔ حیات اللہ انصاری صاحب سے ان کے بے پناہ گھریلو تعلقات ہونے کے باوجود جب اس طرح کے مواقع آجاتے اور دونوں کے درمیان قلمی جنگ کا بگل بج جاتا اور غضب کا رن پڑتا تو منظر قابل دید ہوتا تھا اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ لیکن اخلاص کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک لمحہ کیلئے بھی تعلقات میں کبھی کشیدگی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ میں نے حیات اللہ صاحب سے ایک مرتبہ چند واقعات بیان کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ آپ دونوں کی طرح نہ دوست دیکھے گئے نہ دشمن۔ انھوں نے بڑی پیاری بات کہی تھی کہ ہم لوگ صرف اور صرف دوست تھے اور ایک دوسرے کے نظریات کے خلاف جو کچھ لکھتے تھے وہ اسی دوستی کا تقاضا اور اپنے موقف کا اظہار ہوتا تھا۔ کرپلانی کمیٹی کی رپورٹ پر حیات اللہ صاحب نے دستخط کردئے اور اس کے جواز میں اداریئے بھی لکھے تو قاضی صاحب کا قلم جوش میں آیا اور اس رپورٹ اور قومی آواز کے اداریوں کی دھجیاں اڑادیں حالانکہ دونوں سے انھیں عشق تھا دینی تعلیمی کونسل کے نقطۂ نظر سے کرپلانی کمیٹی کی رپورٹ انتہائی شرارت آمیز اور مضرت رساں تھی وہ کسی قیمت پر مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ اس مسئلہ پر دینی تعلیمی کونسل کی تجاویز اور مولانا علی میاںؒ مولانا محمد منظور نعمانیؒ قاضی محمد عدیل عباسی اور ظفر احمد صدیقی صاحب کے مضامین نے فضا و ماحول کا رنگ و رخ بدل کر رکھ دیا۔ یہی پائسوال کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا اور آخر کار ان دونوں کمیٹیوں کی سفارشات نافذ نہیں ہوسکیں اور حکومت نے انھیں واپس لے لیا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" پر حیات اللہ انصاری کا تبصرہ اس وقت منظر عام پر آیا جب دینی تعلیمی کونسل ایام طفولیت میں تھی لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے طور پر اس کی عوامی مقبولیت اور مستقبل پر مثبت انداز میں اثر انداز اور حاوی ہونے کی صلاحیتوں کی خوشبو

رچی بسی محسوس ہو رہی تھی اس دور کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہر حلقۂ فکر کی جانب سے اس کی تائید اور حمایت میں آوازیں گونجتیں اور ہر طرف سے اسکی افادیت کے نعرے بلند ہوتے تو یہ تحریک تو ایسی تھی جس میں دین وعقیدہ کی حفاظت کے ساتھ اردو زبان وادب کی حفاظت کا بھی پورا نظم قائم کیا گیا تھا جو کچھ بچا کھچا سرمایہ آج نظر آتا ہے وہ اسی دردمندی کی دین ہے۔ اس سلسلے میں دینی تعلیمی کونسل کی خدمات اور مولانا علی میاںؒ کے اعلانِ حق کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جمنا داس اختر نے غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس میں کسی تکلف کے بغیر بہ بانگِ دُہل کہا تھا کہ دعا دیجئے دینی مکاتب ومدارس کے ذمہ داران کو کہ ان کی جدوجہد نے طوفان میں اردو کی کشتی کو بچا لیا۔ انھوں نے اس موقع پر دینی تعلیمی کونسل اور قاضی محمد عدیل عباسی کا نام لیا تھا۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس مسئلہ پر قاضی صاحب سے ان کی مراسلت بھی ہوئی تھی۔

ان حالات میں حیات اللہ انصاری صاحب کا تبصرہ اس انداز سے سامنے آیا کہ اس میں مولانا علی میاںؒ پر اعتراضات کی بوچھار کے علاوہ دینی تعلیمی کونسل کو بھی ہدف ملامت بنانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اداریہ کی پانچ قسطوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ مولانا علی میاںؒ کی سرپرستی میں جو تحریک شروع کی گئی ہے اس کا ایشنلزم سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس راہ میں مزاحم ہے۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی اور اس کے دوررس نتائج ہو سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں قاضی صاحب نے ایک طویل خط کے ساتھ مولانا علی میاںؒ اور دینی تعلیمی کونسل کے ربط وتعلق اور دونوں کی حمایت میں ایک معرکۃ الآرا مضمون حیات اللہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ اُس انداز کا مضمون تھا جس کے متعلق قاضی صاحب اکثر کہتے تھے کہ لوہے کے قلم سے لکھا ہے۔ مجھے ایک مرتبہ انھوں نے سمجھایا تھا کہ یہ اصطلاح مولانا ظفر علی خاں نے ایجاد کی تھی جو انھیں اس قدر پسند آگئی تھی کہ وہ خود اس کا استعمال کرنے لگے تھے۔

قاضی صاحب کے گرامی نامہ کا مختصر حصہ نقل کر دینا مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بستی۔ یکم رجنوری ۱۹۶۲ء　　باسمہ تعالیٰ

مجی حیات اللہ صاحب!　　سلام مسنون

عرصہ سے شرف نیاز حاصل نہیں ہوا۔ میں ایک دن کے لئے لکھنؤ گیا تھا مگر آپ سے ملنے کا وقت نہیں ملا۔ وہاں میں نے مولانا علی میاں کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" اور آپ کی تنقید کا غلغلہ سنا میں نے اس وقت تک نہ کتاب دیکھی تھی اور نہ آپ کے مضامین دیکھے تھے۔ پانچویں قسط تو فوراً مل گئی کتاب بھی لے لی اور بستی آکر بقیہ قسطیں بھی حاصل کرلیں۔ پھر سب کو پڑھا اور غور کیا۔ مجھے اس بات سے تکلیف ہوئی کہ آپ کے تحریر سے دینی تعلیمی کونسل کے بارے میں سخت غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی ——— علی میاں کی مخالفت میں دلائل تلاش کرتے ہوئے آپ نے سب کچھ بھلا دیا۔ میں نے سوچا آخر کیا؟ بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایک جوابی مضمون لکھا جائے۔ چنانچہ وہ بھیج رہا ہوں۔ میں نے مضمون طبیعت کو روک کر لکھا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ خونِ جگر پی جاؤں ——— اگر آپ اسطرح دینی تعلیمی کونسل کو ملزم نہ بناتے تو میں آپ سے زبانی بات کرتا مگر آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ اخبار میں اس تحریک کو بدنام کریں آپ کی اور آپ کے اخبار کی ایک پوزیشن ہے اس لئے نوٹس لینا ضروری ہے اور نظر انداز کرنا ناممکن۔

اس خط کے ساتھ "حیات اللہ انصاری اور ہندوستانی مسلمان" کے عنوان سے جو مضمون روانہ کیا گیا اس کے کچھ اہم اجزاء ملاحظہ ہوں۔

"میں نے ہندوستانی مسلمان مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اس پر حیات اللہ انصاری کا پانچ قسطوں کا ہلکا پھلکا سا مضمون غور سے مطالعہ کیا۔ حیات اللہ انصاری ایک مشہور اہلِ قلم اور ایک پختہ کانشنلسٹ ہیں میرا اور ان کا ایک عرصہ سے ساتھ ہے اور میں ان کا ایک بڑا مداح ہوں۔ انھوں نے جو طویل بحث اس کتاب پر کی ہے اس پر بحث کرنا یا رائے دینا اس مضمون کا منشا نہیں ہے۔ سو لئے اس کے کہ مجھے پانچوں قسطوں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوا کہ گویا پورے مضمون کا کوئی دماغی پس منظر ہے اور خواہ مخواہ کرید کرید کر وہ باتیں نکالی گئی ہیں جو مضامین کتاب سے مترشح نہیں ہوتی ہیں۔ جہاں جہاں انھوں نے دینی تعلیمی کونسل اور نصابِ تعلیم

اور مولانا سید ابوالحسن علی کے خطبۂ صدارت بستی کانفرنس کا تذکرہ کیا ہے وہ ایسے الفاظ میں ہے جن سے شدید غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔"

نصاب تعلیم اور سیکولرزم

اب سب سے زیادہ زوردار بحث جو حیات اللہ انصاری نے کی ہے اور جسے بار بار لکھا ہے اس کا خلاصہ پانچویں قسط کے دوسرے کالم میں ہے اور الفاظ یہ ہیں۔

" انھوں نے (مولانا علی) بستی کی دینی تعلیمی کانفرنس میں جہاں یہ کہا کہ سرکاری نصاب کو سیکولر اور غیر مسلم عقیدوں سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ جن مسلمان بزرگوں نے اسلام کی ہندوستان میں تبلیغ کی ہے ان کو نیشنل ہیرو مان لیا جائے اور ان کو نصاب تعلیم میں جگہ دی جائے۔"

اسی بات کو دوسری اور تیسری جگہ بہت پھیلا کر بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مولانا علی میاں کو ہر طرح شک کا فائدہ دیا گیا گویا غیر جانبداری اور آزاد غور و فکر کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا گیا پھر بھی نتیجہ یہی نکلا کہ مصنف کتاب کا منشا یہ ہے کہ " جن جن مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف قلم یا تلوار سے ان کے نقطۂ نظر کے مطابق جہاد کیا ہے ان کے تذکروں کو محبت سے نیشنل ریڈروں میں شامل کرو اور ان بزرگوں کو نیشنلزم کا جز سمجھو"

میں نے پانچویں قسط بار بار اس نیت سے پڑھی کہ مجھے کوئی حوالہ ایسا ملے کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ مصنف کتاب ہندوستانی مسلمان نے واقعی یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جن لوگوں نے قلم یا تلوار سے ہندوؤں کے خلاف جہاد کیا ہے ان کو نیشنل ہیرو مانا جائے مگر کوئی ایسا حوالہ نہیں ملا۔

مولانا سید ابوالحسن علی۔ کا وہ معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت جو بستی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس

میں دیا گیا تھا اس سے تو کسی طرح یہ بات مترشح نہیں ہوتی ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کے ایک دینی اجتماع میں ایک بے باک وحق گو وحق پسند اور غیر جانبدار شخص کی طرح ان مسلمانوں کے کردار کو بتلایا ہے جن سے کورس کی کتابیں مزین کی جا سکتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا نیشنلزم ہے۔ جو مولانا ممدوح کے اس نظریہ کی مخالفت کرے گا۔

میں جملہ اصحاب نظر کو کھلا چیلنج دیتا ہوں کہ وہ دینی تعلیمی کونسل کے خطبات یا اس کی تقریروں میں خواہ وہ کسی کی ہوں اور خصوصیت سے مولانا علی میاں کی تقریروں اور ان کے خطبات میں کوئی ایک جملہ ایسا دکھلا دیں جو سچے نیشنلزم کے خلاف ہو۔

اگر حیات اللہ صاحب نے نیشنلزم کا کوئی اور نظریہ تیار کیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں، ڈاکٹر سمپورنانند ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ کو نیشنلسٹ کہتے ہیں تو کون انھیں روک سکتا ہے، خرد کا نام جنوں اور جنوں کا نام خرد رکھنا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

ایک مختصر کتاب کی جو معلومات سے لبریز ہو سخت ضرورت تھی اور اس سے مسلمانوں میں قوم پرورانہ جذبات شدت سے پیدا ہوں گے، کتاب کی افادیت اور مولانا ممدوح کے اسلوب بیان اور نگارش قلم کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غالباً حیات اللہ صاحب کی نظر ان جواہر ریزوں پر نہیں پڑی ورنہ وہ سب کچھ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھا ہے"۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس زمانہ میں حیات اللہ انصاری صاحب دینی تعلیمی کونسل اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی ذات گرامی کے خلاف اداریے لکھ رہے تھے اور نصاب تعلیم سے متعلق سیکولرزم اور نیشنلزم کی نئی نئی تعبیریں تلاش کرنے میں منہمک تھے، انھیں دنوں میں حکومت اتر پردیش نے اسکولوں میں یوجا پاٹ کا پروگرام شروع کرنے کا اعلان کر کے حیات اللہ صاحب کی تعمیر کردہ اس عمارت ہی کو زمیں بوس کر دیا جو محض مفروضہ پر تعمیر کی گئی تھی، اس طرح کا ایک نصاب تعلیم ۵۹ء میں مرتب کیا گیا تھا جب دینی تعلیمی کونسل کے قیام کے بعد اور مولانا علی میاںؒ کے خطبۂ صدارت کی روشنی میں قافلہ

کی نئی ترتیب کے ساتھ سفر کا آغاز کیا جا چکا تھا، حکومت کی طرف سے خاموشی سے حالات کا جائزہ لیا جاتا رہا اور ۶۲ء میں اچانک اس کا اعلان کر دیا گیا، اس وقت ہفت روزہ "ندائے ملت" کے شباب کا زمانہ تھا، پورے ملک میں اس کی آواز کو مسلمانوں کی متفقہ آواز سمجھا جاتا تھا، مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی صاحب نے ملی ضرورت کے طور پر "ندائے ملت" کا اجراء کیا تھا اور بلاشبہ ایک بڑی مدت تک اس نے اس ضرورت کو پورا کیا — ۲۲ر جون ۶۲ء کے ندائے ملت میں قاضی محمد عدیل عباسی نے آواز بلند کی :۔

"کارکنانِ دینی تعلیمی تحریک کیلئے ایک مقامِ آزمائش آگیا ہے اور وہ امتحان گاہ میں کھڑے ہیں، ہم ابھی نصابِ تعلیم کی اصلاح کیلئے کوشاں تھے کہ ایک نئی آفت اسکولوں میں عملی یوجا پاٹ کے پروگرام کی آرہی ہے۔

ہمیں جولائی سے پہلے پہلے اس سلسلہ میں کوئی بڑا قدم اٹھانا ہوگا۔"

۲۷ر جون ۶۲ء کو جونپور میں دینی تعلیمی کانفرنس کے موقع پر قاضی صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ :۔

"۵۹ء کے پراسپکٹس کے ملاحظہ سے معلوم ہوا کہ بیسک درجات میں بچوں سے عملی سبق کے طور پر پوجا کرائی جائے گی، اس معاملہ کی جانچ ہو رہی ہے اور اگر ایسا واقعی ہوا تو پھر ہم کو بچوں اور بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو تیار کرنا پڑے گا کہ وہ اس سے قطعی اجتناب کریں، ہم کسی حالت میں ایک لمحہ کیلئے اسے برداشت نہیں کریں گے، ہم اسکے مداوا کیلئے عرضداشتوں اور عدالتوں کے فیصلوں کا بھی انتظار نہ کریں گے، ہم بلاخوفِ نتائج اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیں گے۔

ساتھیو! جب تک ہم اس طرح کا جذبۂ عمل پیدا نہ کریں گے، ہم اس عبوری دور کے طوفان میں غائب ہو جائیں گے اور ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔"

یہ خطبہ ۱۲ر جولائی ۶۲ء کو "ندائے ملت میں حسب ذیل ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا :۔

"یہ خطبہ ایسے موقع پر دیا گیا ہے جبکہ یوپی کے مسلمان بچوں کی ایمانی بقاء کو ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے، اس کے مقابلہ کیلئے جس جذبۂ عمل کی ضرورت ہے خطبہ شروع سے آخر تک اس جذبۂ عمل کیلئے ایک پرسوز پکار کی حیثیت رکھتا ہے، ہم تمام مسلم اخبارات سے امید کرتے ہیں کہ اس اہم خطبہ کی نمایاں طور پر اشاعت کیجائے گی اور مسلمانوں سے امید کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ پکار ان کے کانوں سے ٹکرا کر واپس نہیں جائے گی۔"

اسی موقع پر مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے الفرقان میں اس مسئلہ پر وضاحت سے مضمون تحریر فرمایا جو ندائے ملت کی اسی اشاعت میں بھی شائع ہوا۔

"اس مسئلہ کی سنگینی پر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کون مسلمان ہے جس کو اس بات کے سمجھنے میں دقت ہوگی، کہ اس انداز سے تعلیم پانے والے بچے مردم شماری کے رجسٹر میں تو مسلمان رہ سکتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ مسلمان نہیں رہ سکتے۔

قاضی صاحب نے تمام مسلم جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر اس سنگین مسئلہ سے نمٹنے کیلئے بلا تاخیر میدان میں آجائیں۔"

۲۰ رجولائی ۶۲ء کے ندائے ملت میں اداریہ کی جگہ پر حضرت مولانا علی میاںؒ کا مضمون "مسلمانان یوپی اور حکومت یوپی کیلئے لمحہ فکریہ" کے عنوان سے شائع ہوا، یہ مضمون بہت طویل، مدلل اور جرأت ایمانی کا مظہر ہے، اس میں ایمان واستقامت کی وہ چنگاری ہے جو پلک جھپکتے شعلۂ جوالہ بن کر گرد وپیش کو خاکستر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"ندائے ملت کے ناظرین نے اخبار کی ۲۲ رجون ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب کا مضمون پڑھا ہے، جس میں پہلی مرتبہ اس نئی صورت حال کی اطلاع دی گئی تھی جس سے یوپی کے مسلمان دوچار ہو رہے ہیں، یعنی یہ کہ بیسک اسکولوں کے نئے پراسپکٹس کے مطابق تمام درجوں میں اب مذہبی تیوہار، جینتیاں اور یوم منائے جائیں گے، جنکی حیثیت مذہبی ہے اور جنکا اہم عنصر اور روح پوجا پاٹ اور غیر اللہ کی عبادت وتقدیس ہے،

جو مسلمان کیلئے قطعی طور پر حرام اور ناجائز ہے، اور اس طرح ان کو تعلیم کی منزل پر پہنچنے کیلئے کفر کی منزل سے گزرنا پڑے گا۔

کسی مسلمان کیلئے اس کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی اہم سے اہم مقصد یا کسی بڑے سے بڑے دنیاوی فائدہ کیلئے اپنے بچے کو ان تقریبات و رسوم میں شرکت کی اجازت دے یا اس کو گوارہ کرے۔

یہ صورت حال ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم کو اپنے بچوں کا ان تعلیم گاہوں کے فوائد اور سہولتوں سے محروم رہنا گوارہ ہے، لیکن ان کے ایمان، دینی احساسات اور شعور کو خطرہ میں ڈالنا اور مشرکانہ اعمال میں شریک ہونا کسی قیمت پر گوارہ نہیں، بس یہ اجتماعی فیصلہ بڑی سے بڑی صورتِ حال کو تبدیل کر سکتا ہے۔

ہم کو یقین ہے کہ یوپی کا محکمۂ تعلیم جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار کارکنوں پر مشتمل ہے اور جس کو ہر محکمہ سے زیادہ حقیقت پسند اور عملی ہونا چاہیئے، بہت جلد اپنی غلطی محسوس کرے گا اور اپنی قابلِ فخر ریاست کو جو علم و تہذیب اور باہمی اتحاد کا مرکز رہی ہے اس تلخ اور غیر ضروری کشمکش میں مبتلا کرنے سے گریز کرے گا۔"

اس مسئلہ پر دینی تعلیمی کونسل نے سنجیدگی کے ساتھ پورے صوبہ میں ایک روح پھونک دی، جسکے نتیجہ میں محکمۂ تعلیم کو کلی طور پر اس پراسپکٹس کو منسوخ کرنا پڑا، ۲۷ رجولائی ۶۲ء کے شمارہ میں "ندائے ملت" کی ایک رپوٹ شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ :-

"یوپی کے بیسک اسکولوں کا نیا پراسپکٹس محکمۂ تعلیمات نے واپس لینے کا اعلان کر دیا دینی تعلیمی کونسل کی جدوجہد کی یہ کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ بروقت اور مناسب جدوجہد سے ہر خطرہ کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

اترپردیش کے مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر نے ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو دینی تعلیمی کونسل کے نام سے جس ادارے کی بنیاد رکھی تھی اس کی مختصر سی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ

اتر پردیش کے محکمۂ تعلیمات نے ایک نئی اور سخت پریشان کن کارروائی کا ارتکاب کیا اس ادارے کی بیداری اور کارکردگی کی تعریف کی جانی چاہئے، کہ اس نے نئے پراسپکٹس کے اجراء سے پہلے ہی اس کا پتہ چلا کر اس کا جائزہ لینے کا کام شروع کر دیا۔"

اس اہم ترین مسئلہ پر غور و فکر اور لائحۂ عمل طے کرنے کیلئے دینی تعلیمی کونسل کا اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ۲۱ر جولائی کو طے تھا، اسی دن کونسل کا ایک وفد وزیر تعلیم سے ملا، اور اسی موقع پر ڈائریکٹر تعلیمات نے وزیر تعلیم کو بتا دیا کہ پراسپکٹس کی منسوخی کے احکامات جاری کر دئے گئے ہیں۔

اس فیصلہ کا وسیع القلبی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے حکومتِ اتر پردیش اور وزیر تعلیم کو توجہ دلائی کہ :۔

"ہم وزیر تعلیم اور محکمۂ تعلیم کی اس حقیقت پسندی کی قدر کرتے ہوئے توقع رکھتے ہیں کہ مسئلۂ تعلیم میں جو نزاکتیں ہیں ان کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور آئندہ جو بھی اقدام ہوگا، اس میں سیکولرزم اور جمہوریت کے جذبہ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

حضرت مولانا کی پوری زندگی میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں، جو احساس و تاثر سب سے زیادہ حاوی اور جس کا اظہار سب سے زیادہ واضح نظر آتا ہے وہ انسانوں کی فطرتِ صالحہ پر اعتماد ہے نازک ترین حالات میں بھی اور تیز ہوا کے جھونکوں میں بھی فکر کا یہ چراغ ہمیشہ روشن رہا، خدا آگہی کے ساتھ خود آگہی، خدا شناسی کے ساتھ خود شناسی اور اسی سے خودی اور خودداری کے چشمے ابلتے ہیں جن کے آب مصفا سے انسانیت کی سوکھی حلق میں نمی اس کے اضمحلال میں سرت کے نقوش، اسکی نگاہوں میں بلند نظری، ذہنوں میں بلند پروازی اور قلب میں سکینت و کشادگی، اطمینان و یکسوئی امید و یقین، مایوسی میں زندہ روشن فکری نظریات کا ظہور ہوتا ہے، قدرت نے اپنے خزانہ سے ان خصوصیات اور کیفیات کی بیشمار نعمتیں حضرت مولانا کی ذات گرامی پر بارش کی طرح برسائی تھیں، مولانا کے توسط سے ایک عالم اس سے مستفید ہوتا رہا، مولانا کا سبق یہی تھا کہ اپنی صلاحیتوں

کا استعمال خدا کی قدرت پر بھروسہ کے ساتھ ہو تو اس کے نتائج بڑے روحانی ہوتے ہیں، اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، دنیاوی طور پر حضرت مولانا اپنے ملک اور یہاں کے عوام سے بھی کبھی مایوس نہیں ہوئے، اور اسی جذبہ کے ساتھ، اسی یقین و امید کے ساتھ ہمیشہ دلوں پر دستک دیتے رہے، جگاتے رہے، بچاتے رہے، بلاتے اور سمجھاتے رہے، آواز کی نرمی، لہجہ کی شیریں بیانی، دردمندی اور دل سوزی نے ہمیشہ فضا و ماحول کو خوشگوار بنانے کی جدوجہد کی، کم از کم دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے گذشتہ چالیس برسوں کی تاریخ انھیں کارناموں سے بھری ہوئی ہے، حکومتوں کی ناانصافیوں اور ستم ظریفیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی ملت کے محاسبہ میں اسے جھنجھوڑنے اور ذمہ داریوں کا احساس دلانے میں بھی کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے، بالخصوص، پورے ملک اور عالم اسلام کیلئے بالعموم حضرت مولانا علی میاں کی ذاتِ گرامی ایک شجرۂ سایہ دار تھی، خوش نصیب تھے وہ لمحات جنھیں ان کے ساتھ گزرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور ہمارے لئے تو مقام شکر ہے کہ ان کی شخصیت کے زیر سایہ ملک و ملت کا قافلہ رواں دواں رہا۔

ایک عجیب و غریب بات یہ نظر آتی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کا کوئی بدل اور نعم البدل نہیں، جس کی ذات پر پوری ملت کا اتفاق، جس کی نظیر ماضی بعید میں دور دور تک نظر نہیں آتی، جس کی ہر بات حرفِ آخر سمجھی جاتی تھی، لیکن دینی تعلیمی کونسل کے سلسلے میں اپنی پوری مدت صدارت میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب اس کا اظہار کیا گیا ہو اور کسی مسئلہ میں اپنی شخصیت کے مقام و مرتبہ اور اپنے عہدۂ صدارت کی عظمت کو اپنے کسی موقف یا منشاء کی تائید میں استعمال کیا گیا ہو، ہر ہر موڑ پر اس نزاکت کا احساس نمایاں نظر آتا ہے، یہ مزاج و طبیعت کی خوبی اور خصوصیت بھی تھی، اور عہدہ کو امانت سمجھنے کا دینی رجحان بھی تھا، ہر موڑ پر مشورہ، ہر قدم پر دوسروں کی رائے کا احترام معاملات و مسائل کی ساری فکرمندی کے باوجود یہ فکر ساری فکروں پر غالب کہ تحریک و تنظیم میں

سب کی اہمیت اور سب کا لحاظ ضروری ہوتا ہے، بڑوں کے علاوہ چھوٹوں کے ساتھ بھی ہمیشہ شفقت ومحبت کے ساتھ یہی سلوک، یہی رویہ، یہی انداز، غور کرنیکی بات یہ ہے کہ یہ انداز اس شخصیت کا تھا جس کا ایک جملہ سب کیلئے مقدم تھا، لیکن حضرت مولانا کے طرز زندگی میں دل شکنی کا تصور بھی نہیں تھا، دوسروں سے مشورہ اور دوسروں کی رائے کا احترام اسی جذبہ کی بنا پر تھا، دینی تعلیمی کونسل کے سلسلے میں جو کاغذات محفوظ ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا تنظیم وتحریک کے فروغ واستحکام کے علاوہ مالیات کی فراہمی کیلئے بھی فکر مند رہتے تھے، پہلے دستور اور ضوابط کی پابندی کا نظام بھی مضبوط تھا جیسا کہ عرض کیا گیا، صدر کونسل کی حیثیت سے خود حضرت مولانا بھی ضابطہ کا لحاظ فرماتے تھے، قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم خود تحریک کے بانی اور جنرل سکریٹری تھے، لیکن پوری زندگی انھوں نے ضابطہ کی پاسداری کا خیال رکھا اور کبھی اس کی خلاف ورزی کے سلسلے میں کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملا، بزرگوں کے اسی اخلاص کی بدولت برکت ورحمت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

دینی تعلیمی کونسل نے پرائمری سطح تک ابتدائی تعلیم کا ایک مربوط نظام تیار کیا ہے، اس کا اپنا نصاب تعلیم ہے، اپنی کتابیں ہیں، دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم اور ان کی تعلیم کا اردو میڈیم میں مکمل کورس مرتب کیا گیا ہے، اس تحریک نے دینی اور دنیاوی تعلیم کے دروازے کھلے رکھے ہیں، ایک غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ مکاتب میں زیر تعلیم طلباء عصری علوم سے محروم رہ جاتے ہیں، یہ خلاف واقعہ ہے، کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچے پانچویں درجہ تک دین کی اہم اور بنیادی باتیں حاصل کرلیں، اردو لکھنا، پڑھنا انھیں آجائے، قرآن پاک ختم کرلیں اور یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا ایک ملی تشخص ہے، اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے کسی بڑے دینی مدرسہ میں جائیں یا کسی سرکاری یا پرائیوٹ اسکول میں عصری تعلیم حاصل کریں، سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں بڑی سطح سے بلند آہنگی کے ساتھ ایک بات کہی تھی جو ان کے فکر اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کیلئے آج تک دہرائی جاتی ہے:۔

"ہم ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کے داہنے ہاتھ میں قرآن، بائیں ہاتھ میں سائنس اور فلسفہ اور اس کی پیشانی پر کلمۂ طیبہ کا تاج چمک رہا ہو"۔

دینی تعلیمی کونسل نے سرسید کے اس خیال کو جلا بخشی ہے، یہ تصور پایۂ تکمیل تک کیسے پہونچے گا اگر اس کی ابتداء میں اس کا لحاظ نہ رکھا جائے، آغاز سفر میں مستقبل کا خاکہ مرتب نہ کیا جائے تو آسودگی میسر نہیں آسکتی ہے، اس تحریک میں نظم وضبط، مکاتب کا الحاق، اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کا قیام، تنظیم کا استحکام اور ایک باہمی ربط واتحاد کی ضرورت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس سے اجتماعیت کی طاقت اور اس کے فیوض وبرکات نمودار ہوتی ہیں، تاریخ نے گذشتہ چالیس برسوں کی جد وجہد کو اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے، سنجیدہ، خاموش اور ثبت اندازِ فکر اور خدمات کا جو شاندار ریکارڈ ہے اس کے ہر صفحہ وسطر میں حضرت مولانا علی میاں کی شخصیت جلوہ گر ہے، اس مدت میں حکومتوں کے فیصلوں اور ان کے بنائے ہوئے نصاب ونظامِ تعلیم نے جو انقلاب برپا کرنا چاہا، اس کی بروقت مدافعت نے طوفانوں کا رخ موڑ دیا اور ملّتِ اسلامیہ بڑے حادثات سے محفوظ رہ گئی، مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درجہ ۶ میں داخلہ کی آسانی، کرپلانی کمیٹی کی رپوٹ، پایوال کمیٹی کی رپوٹ، ۵۹ء کا خطرناک نصاب تعلیم جس میں پوجا پاٹ کو لازم کیا گیا تھا، ان پہاڑوں کو راہ سے ہٹانے کیلئے دینی تعلیمی کونسل نے تیشۂ فرہاد کا کام کیا ہے، جن نازک ادوار سے گزر کر ہم یہاں تک پہونچے ہیں ان کی ہمیں خبر بھی نہیں ہے، قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم جھوم جھوم کر اکثر یہ شعر پڑھتے تھے ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حضرت مولانا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس شعر کو اپنے ذوق وشوق کا ترجمان بناتے تھے ؎

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

حکومت کی درسی کتابوں میں مسلمانوں کی دینی غیرت وحمیت اور ان کی اسلامی فکر کے برعکس اسباق کی شمولیت، ان کی بروقت نشاندہی اور ان کے خلاف آئینی اور دستوری جدوجہد اور اس سلسلے میں کامیاب کوششوں کے مظہر کے طور پر ظفر احمد صدیقی مرحوم اور دوبارہ حبیب اللہ اعظمی صاحب نے دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے کتابوں کا جو جائزہ پیش کیا اس کی گونج اسمبلی اور پارلیمنٹ تک سنائی دی اور یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکا۔

ایک اہم مسئلہ ۱۹۸۹ء میں مینم ویجز ایکٹ - MINIMUM.WAGE - کا سامنے آیا جس میں مدارس ومکاتب کیلئے اپنے قیام وجواز کیلئے لائسنس لینے کی پابندی لگائی گئی تھی، دینی تعلیمی کونسل نے یکم و ۲ جون ۸۹ء کو ندوۃ العلماء میں عربی مدارس ومکاتب کا ایک کل ہند کنونشن منعقد کیا، مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے اس کی صدارت فرمائی تھی، جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے افتتاح کیا تھا، یہ پہلا موقع تھا جب حضرت مولانا علی میاں صدر کونسل ہونے کے باوجود مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور اسی حیثیت سے پورے ملک کے سامنے وہ خطبۂ استقبالیہ پیش کیا گیا تھا، اس کنونشن کی اہمیت کے پیشِ نظر اسکا دعوت نامہ بھی پہلی مرتبہ حضرت مولانا کی طرف سے جاری ہوا تھا۔

کسی تعلیمی مسئلہ پر مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع کم دیکھنے میں آیا، اس دور کے اخبارات سے فضا و ماحول اور مسلمانوں کی گرم جوشی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، حضرت مولاناؒ نے فرمایا:۔

"میں آپ کا اس قدیم علمی وتعلیمی شہر لکھنؤ میں مسلمانانِ شہر، محبانِ علم اور دینی تعلیمی کونسل کے ارکان، کارکنوں اور داعیوں کی طرف سے پرخلوص طریقہ پر استقبال کرتا ہوں آپ ایک اہم اور نازک ملت اسلامیہ ہندیہ کے علم ودین سے ربط وتعلق اور ملی تشخص کے دوام وبقا یا (خدانخواستہ) زوال وفنا کے ایک فیصلہ کن مرحلہ پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ذمہ دارانِ حکومت صحیح معنیٰ میں حقیقت پسند اور محبِ وطن ہوں

تو ان کو ہر ایسی کوشش اور ہر ایسے ادارہ کو نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دینی چاہیئے بلکہ اس کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرنی چاہیئے جو ملک میں علم وخواندگی اور ثقافت وتہذیب کی اشاعت وترقی اور ان کی توسیع میں مدد دے۔

ہم اپنا جمہوری، مذہبی اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے اور اپنی پسند اور صوابدید کے مطابق ان کو چلائے ہم خالص حب الوطنی اور ہندوستان کیلئے اس کو باعثِ فخر سمجھنے کی بناء پر بھی یہ کہتے ہیں کہ تعلیم وتربیت اور ثقافت وتہذیب کے پھیلانے میں ایثار وقربانی کی اس روایت کو جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرۂ امتیاز رہا ہے، باقی رہنا چاہیئے۔

حضرت مولانا علی میاں متفقہ طور پر چالیس برس تک دینی تعلیمی کونسل کے صدر رہے، اس کے قیام کے ابتدائی دنوں میں انتہائی نازک اور تشویشناک دور وہ تھا جب حکومت نے اسکولوں میں یوجا پاٹ کو شامل کر دیا تھا، اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، دوبارہ اسی طرح کا ایک نازک مرحلہ ۱۹۹۶ء میں پیش آیا جب حکومت اتر پردیش نے نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ اسکولوں میں وندے ماترم کو نافذ کیا اور بھارت ماتا کی تصویر پر پھول چڑھانا لازمی قرار دیدیا گیا، کلپ یوجنا کے نام سے ایک پوری تعلیمی اسکیم کا خاکہ تیار ہوا اور بڑے تیور کے ساتھ اس کی تعمیل کا جی۔او بھی ہو گیا، یہ اندازہ نہیں تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے اب پھر یہ مسئلہ اپنی خطرناکی اور شدت کے ساتھ آجائے گا، اقبال نے کہا تھا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

دینی تعلیمی کونسل نے حسب روایت قدیم سب سے پہلے اس مسئلہ کو اٹھایا اور پوری طاقت سے اس کی مخالفت کا اعلان کیا گیا، اس کی غیر دستوری اور غیر آئینی حیثیت کو نمایاں کیا گیا،

جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب نے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے علاوہ دوسرے ذمہ دار اداروں کو متوجہ کیا، پوری ریاست اتر پردیش میں اسکے خلاف ایک فضا بنا دی گئی، لیکن طریقہ کار ہمیشہ کی طرح وہی رہا کہ مطالبہ دستور ہند کی روشنی میں کیا جاتا رہا، غیر جذباتی انداز میں سنجیدہ استدلال کا ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا، دینی تعلیمی کونسل نے اس موضوع پر نہایت اہم اور مفید لٹریچر تیار کیا ۲۶، ۲۷ اپریل ۱۹۹۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کنیڈی ہال میں دینی تعلیمی کونسل کا ریاستی کنونشن ہوا جس میں حضرت مولانا علی میاں اپنی بیماری کے باوجود تشریف لے گئے اور اپنا خطبۂ صدارت خود پڑھا، صدر کونسل کی حیثیت سے یہ حضرت مولانا کا آخری خطبہ ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا :۔

"یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لیجانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محبِ وطن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے"۔

اسی سلسلے میں ایک موقع پر ندوۃ العلماء میں صحافیوں کی ایک بڑی تعداد کے سامنے حضرت مولانا نے ایک جرأتمندانہ اور مومنانہ اعلان کر کے پورے ملک کو چونکا دیا، مسلمانوں میں جوش و جذبہ کا اضافہ ہوا، حکومت جو ابھی تک متوجہ نہیں ہو رہی تھی اور اس اسکیم کو نافذ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی اچانک اس کے رویہ میں تبدیلی آئی اور فضا کا رنگ و رخ یکسر بدل گیا، مولانا نے اپنے انٹرویو میں کہا :۔

"اگر یہ صورت حال باقی رہتی ہے اور حکومت نے وندے ماترم اور پھول چڑھانے کا غیر اسلامی فیصلہ تبدیل نہ کیا تو ایسے تمام اسکولوں سے مسلمان اپنے بچوں کو نکال لیں گے ہمارے لئے تعلیم سے زیادہ عقیدہ اور دین کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے"۔

اس پوری صورتِ حال کو دینی تعلیمی کونسل نے اپنی رپورٹ (مرتبہ راقم سطور) اور مضامین و مراسلات میں محفوظ کر دیا ہے، اسی درمیان ایک غیر متوقع اور غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ حرکت یہ کی گئی کہ حضرت مولانا کی عدم موجودگی میں رائے بریلی میں حضرت کی قیام گاہ پر چھاپہ ڈالا گیا،

اس واقعہ کی گونج پوری دنیا میں سنائی دی، مولانا کا اعلانِ حق گونج رہا تھا اس میں اس واقعہ کا اضافہ ہوا تو حکومت خود بوکھلا گئی، تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ حکمراں جماعت کے ذمہ داران مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت اور ندامت کا اظہار کرنے لگے اور اسی کیفیت میں چند روز کے اندر حکومت نے وندے ماترم کا حکم اور وہ پوری اسکیم واپس لینے کا اعلان کر دیا، مولانا نے اس پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ آئندہ اس طرح کی حرکتوں سے اجتناب کیا جائے گا

دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے حضرت مولاناؒ کی آخری تقریر

شدید بیماری سے کچھ افاقہ ہوا تو خود دریافت فرماتے تھے کہ جلسہ کب ہوگا؟ دینی تعلیمی کونسل کا کیا حال ہے؟ ہر لمحہ فکرمندی کا اظہار ہوتا تھا، اسی حالت میں ۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ء کو ندوۃ العلماء کے سلیمانیہ ہال میں کونسل کا ایک جلسہ خود حضرت مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا، جسم کمزور، زبان میں ہلکی لکنت، آواز لرزیدہ، لیکن انداز بیان میں وہی چمک وہی شان وہی پیغام، مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دینی تعلیم ان کے وجود و بقا اور اعتبار و وقار کیلئے ضروری ہے، اسلام نے تعلیم کا رشتہ توحید کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان خود بھی اس پر قائم رہیں اور آئندہ نسلوں تک اسے منتقل کرنے کی فکر کریں۔

اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے وجود و بقا اور ارتقاء کیلئے مشروط فیصلہ ہے، الحمدللہ ہندوستانی مسلمانوں نے سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کیا ہے، انھیں فریضہ کی ادائیگی کے طور پر اس کو انجام دینا چاہیئے اور دینی تعلیمی کونسل نے اس مدت میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ یقیناً اللہ کے یہاں قبول ہوں گے، تمام تنظیموں اور تحریکوں اور مسلم دانشوروں کو اس کی قدر کرنی چاہیئے اور اسکے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔

حکومت کی تعلیمی پالیسی کی بنا پر مسلمانوں کے اندر جو اضطراب کی لہر دوڑ گئی تھی صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق اور دینی تعلیمی کونسل کی سنجیدہ اور آئینی حکمتِ عملی سے اس پر قابو پایا جا سکا، اگر ذہن و فکر میں یہ تصور اور تاثر باقی رہا تو مستقبل میں کامیابیوں سے ہمکنار رہوں گے۔"

دینی تعلیمی کونسل سے حضرت مولانا کا ایک روحانی تعلق تھا جس کا مظاہرہ بالکل آخر میں اس وقت ہوا جب دبئی کی طرف سے ایک عظیم الشان ایوارڈ ملا اور اس میں سے ایک لاکھ کی خطیر رقم حضرت مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کو بھی ہدیہ کے طور پر عنایت فرمائی۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت مولانا نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت قبول فرمائی تھی۔ پورے چالیس برسوں تک مربیانہ سرپرستی اور رہنمائی کا طویل سلسلہ جاری رہا اور بالآخر حکمتِ خداوندی اور مشیت کی کارفرمائی کا ظہور ہوا، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو علم و معرفت اور رشد و ہدایت کا سورج جمعہ کے روز، رمضان کے مہینے میں، روزہ کی حالت اور پوری طرح نماز کی تیاری میں مصروف اور خود اپنی زبان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت کی آیت قرآنی پڑھتے ہوئے غروب ہو گیا،

ع پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تقویت کا سامان پیدا کیا، حضرت مولانا محمد رابع ندوی صاحب نے دینی تعلیمی کونسل کی صدارت قبول فرمائی، نسبت باقی رہ گئی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو سہارا مل گیا، نصف صدی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قابلِ احترام اور بزرگ اساتذہ نیز طلبۂ عزیز اور پورے ملک میں پھیلی ہوئی ندوی برادری سے جو مخلصانہ اور مشفقانہ تعلق قائم ہوا تھا، وہ اب انشاء اللہ مولانا محمد رابع صاحب کے توسط سے قائم رہے گا، ہم حضرت مولانا علی میاں کی شخصیت سے محروم ہو گئے، لیکن ان کے حلقہ اور سلسلہ کی سرپرستی ہمیں حاصل رہے گی اور ہم اس سے فیضیاب ہوتے رہیں گے، ندوۃ العلماء اور دینی تعلیمی کونسل ہمارے حضرتؒ کے قلب و نظر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان اداروں کو سرسبزی و شادابی نصیب فرمائے، دونوں کی رہنمائی اس

وقت بھی قدرت کی طرف سے اسی خانوادۂ علمی کے سپرد کی گئی ہے۔

حضرت مولاناؒ نے قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا تھا وہ اِس وقت اُن کی ذاتِ گرامی سے محروم ہوجانے کے بعد خراجِ عقیدت کے طور پر خود حضرت مولانا کیلئے پیش کیا جاسکتا ہے:۔

" دینی تعلیمی کونسل ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے، جس کی انہوں نے اپنے خون جگر سے آبیاری کی، اور جس کی افادیت واہمیت نہ صرف روز بروز بڑھے گی اور شدت سے محسوس کی جائیگی، اب جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو ہمارا اورزیادہ فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں، اور اسکو ترقی دینے کی کوشش کریں کہ یہ ان کی عزیز ترین یادگار رہے، اس سے ان کی روح کو حقیقی شادمانی ہوگی، دوسرے یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور اس کے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کا دینی مستقبل اور ان کی آئندہ نسلوں کا ایمان اور ان کے اسلامی عقائد اور انکی ثقافت وتہذیب سے وابستگی خطرہ میں ہے، میری تمام دردمند مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، اسکی شاخوں اور ضلعی مرکزوں کو وسیع کرنے اور اس کے قائم کردہ مکاتب کو جس میں لاکھوں بچے زیر تعلیم ہیں مضبوط ومنظم کرنے کر فکر کریں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اور

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

از۔ مولانا رضوان احمد ندوی — سب ایڈیٹر نقیب پٹنہ، بہار

مسلم پرسنل لا ملت اسلامیہ کی ریڑھ کی ہڈی (BACK. BONE) کی حیثیت اور جسم و روح کا سا تعلق رکھتا ہے، اگر ان قوانین میں تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں، یا ان کی تشریح و توضیح میں خود رائی کی جائے تو ملت کا مزاج، اس کا خاندانی نظام اور معاشرتی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گا، اور اس کا ملی تشخص اور مذہبی حیثیت کالعدم ہو جائے گی، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی عالم انسانیت میں انقلابات آئے تو ان انقلابات نے تہذیب و تمدن کی روح میں تبدیلی پیدا کر دی اور جیسے جیسے حکومتوں میں شخصی رجحان کا غلبہ ہوا ویسے ویسے سیاسی اقتدار کیلئے ارباب سیاست نے قوموں اور ملتوں کے شخصی قوانین کے دائرے کو محدود کرنا شروع کر دیا، جس سے مسلم پرسنل لا کو خطرہ لاحق ہو گیا اور خاص کر ایسے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں رہتے ہیں، انکی مذہبی آزادی اور آئینی حقوق و مفادات پر کاری ضرب پڑی، ہندستان کے اندر انگریزوں کے عہد حکومت میں بھی یہی سب کچھ ہوا، ان کے دور اقتدار میں اسلام کے اجتماعی قوانین غیر متحرک ہو کر رہ گئے، اس نے قانون شریعت کو اس کی محدود شکل میں، یعنی شریعت اپلی کیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کے کچھ عائلی قوانین کو تحفظ دیا، جس میں اس نے یہ

وضاحت کی کہ نکاح، خلع (طلاق، ایلاء، ظہار، فسخ نکاح) وراثت، نفقہ، مہر، ولایت، حضانت اوقاف وغیرہ مسائل مسلم پرسنل لاء کے تابع ہوں گے اور بس، غالباً اسی لئے اس عہد میں ہندو مسلم معاملات ان کی شریعت اور دھرم شاستر کے مطابق حل کئے جاتے تھے، پھر جب ملک انگریزوں کے قبضہ سے آزاد ہوا تو اگرچہ آزاد ہندستان میں دستور کی دفعہ (۲۵) اور (۲۹) کے ذریعہ مسلم پرسنل لاء کو قانونی تحفظ دیا گیا، لیکن دستور میں بعض ایسی دفعات شامل کی گئیں، جن سے مسلم پرسنل لاء پر ضرب پڑتی تھی، یعنی دستور کے رہنما اصول کی دفعہ (۴۴) میں یہ کہا گیا ہے کہ حکومت کو چاہئے کہ سارے ہندستان کیلئے ایک مشترکہ کوڈ نافذ کرے، گویا یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی گئی، اس کے بعد سے ہی مسلم پرسنل لاء پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے، سیاسی لیڈروں اور حکومت کے بعض ذمہ داروں اور بازیگروں کی طرف سے مسلم پرسنل لاء میں ترمیم کا مسئلہ بار بار اٹھایا جانے لگا اور یہ معاملہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بل پاس ہوا اور اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے یہ فتنہ کھڑا کیا کہ "ہندو قوانین جو جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی" گویا دستور ہند میں مسلم پرسنل لاء کو جو تحفظ دیا گیا تھا اس شوشہ کے ذریعہ اس کو ختم کر کے مسلمانوں کو عام انسانی خواہشات کے تابع بنا دینے کا منصوبہ تیار کیا جانے لگا، حالانکہ یہ اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ بعض تجدد پسند دانشور مسلمانوں کے پرسنل لاء کو دیگر مذاہب کے پرسنل لاء کی طرح ایک تھیوری یا کوئی خاندانی روایات سمجھتے ہیں، انھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں کا پرسنل لاء دوسرے اقوام وملل کے پرسنل لاء کے مقابلہ میں کوئی اوہام یا روایتی مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کے قوانین کی بنیاد وحی والہام پر مبنی ہے، قرآن وحدیث اس کا سرچشمہ ہے جو انسانی تہذیب وتمدن کا مصلح ہے اور جو مصلح ہو وہ اصلاح پذیر نہیں ہوسکتا، اسی لئے جسٹس محمود صاحب نے لکھا ہے کہ "مسلم قانون کو دین ومذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا"۔

بہر حال جب فسطائی ذہنیت نے ملک میں ایسے نازک حالات پیدا کر دیئے تو ہندستان کے باشعور و حساس علماءِ دین، قوم و ملت کے رہنما، مسلم قانون داں اور اصحاب فکر و نظر نے مسلم پرسنل لاء کے تحفظ و بقا کی تحریک چلانی شروع کی، سب سے پہلے ملت کے ارباب فضل و کمال اور عمائدین کی ایک نمائندہ مجلس ایشیا کے دینی و مرکزی ادارہ دارالعلوم دیوبند میں ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ بمبئی میں مسلم پرسنل لاء کے نام سے ایک کنونشن بلایا جائے اور مسئلہ کی نزاکت اور صورتِ حال کی سنگینی سے عام مسلمانوں کو بھی واقف کرادیا جائے، چنانچہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی فعال قیادت میں علماءِ کرام کا ایک وفد ممبئی پہونچا جہاں وہ اجلاس کی تیاریوں میں مصروف عمل ہو گیا، پھر ان بزرگوں کی مساعیِ جمیلہ کے نتیجہ میں مختلف مکاتب فکر و خیال کے علماء و دانشور، تنظیموں اور اداروں کے نمائندوں کا ایک عظیم الشان اور تاریخ ساز اجلاس ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بحیرۂ عرب کے ساحل ممبئی میں منعقد ہوا جس میں متعدد قرار داد اور تجاویز پاس ہوئیں، پھر اسی کنونشن کے نتیجہ میں "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے قیام کا فیصلہ ہوا۔

اس بورڈ کے قیام سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان جو عرصۂ دراز سے ایک مشترکہ قیادت اور لیڈرشپ کیلئے ترستے چلے آرہے تھے ان کی حقیقی تسکین اور دل جوئی کیلئے یہ بورڈ ان کیلئے دل کی آواز بن گیا، بلکہ صدیوں سے مسلک و مشرب کے جو فاصلے تھے وہ قربت میں بدل گئے اور ان کے درمیان اتحاد و یک جہتی کی فضا بن گئی، پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ایک تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا، بعد میں اس کے بنیادی ڈھانچوں کو مربوط کرنے، دائرہ کار کو مرتب کرنے اور دستور اساسی کو منظور کرنے کیلئے ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۷۳ء میں بورڈ کا دوسرا اجلاس حیدرآباد میں ہوا، جس میں ہر طبقہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک ۱۵۱ اکاون افراد کی ایک مجلس بنائی گئی اس میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو صدر اور تحریک کے روحِ رواں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کو بورڈ کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، اس کے بعد بورڈ کا یہ کارواں کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا رہا، چاہے وہ قانونِ تبنیت کا مسئلہ ہو یا جبری نسبندی کا اس نے قابل لحاظ کامیابی حاصل کی، بورڈ کا یہ سفر

جاری تھا کہ اچانک ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے محرک اور صدر حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی اور قبرستانِ قاسمی میں ابدی نیند سو گئے، طاب حیا و طاب میتاً، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گیارہ سالہ عہدِ صدارت نے اپنی بساط لپیٹ لی، اس عظیم سانحہ سے بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی (المتوفی ۱۹۹۱ء) کا قلب وجگر بے حد متأثر ہوا چنانچہ انہوں نے ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو بورڈ کا سالانہ اجلاس مدراس میں طلب فرمایا اور اس منصبِ جلیل کیلئے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام کی تجویز پیش کی، مجمعِ عام نے اس نام کی تجویز پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور ہر طبقہ و جماعت اور مسلک کے عمائدین اور اربابِ بصیرت نے پرزور انداز میں تائید وحمایت کی، اس طرح اتفاق رائے سے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو بورڈ کا دوسرا صدر منتخب کرلیا گیا (مگر یاد رہے کہ بورڈ کے تیسرے اجلاس رانچی ۱۵،۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں حیدرآباد کے بعض ارکان بورڈ مولانا سلیمان سکندر صاحب وغیرہ نے حضرت قاری صاحبؒ کی موجودگی میں صدر بورڈ کیلئے حضرت مولانا علی میاں ندوی کا نام پیش کیا تھا، اس پر مولانا نے بڑا حکیمانہ جواب دیا تھا کہ "جب دریا میں طوفان ہو اور کشتی بھنور میں ہو، تو کشتی کا ملاح نہیں بدلا جاتا،

بہرحال پھر بعد کے حالات اور زمانے کے تغیرات سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے عائلی قوانین کے تحفظ، مسلم پرسنل لاء کے داخلی اور خارجی حملوں کے سدِّباب اور بورڈ کی قیادت وسیادت کیلئے جس قائد کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھرپور نوازا تھا، فراستِ ایمانی، حکمتِ عملی، جوہر شناسی، بصیرت وژرف نگاہی، دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کے اعتبار سے معاصرین علماء میں ممتاز شخصیت کے حامل تھے وہ وقت کے تمام نازک مسائل کو حکمت وتدبیر کے ساتھ حل کرنیکی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے، اسی زمانہ میں بعض سیاسی جماعتوں اور انتہا پسند پارٹیوں کی طرف سے ملک کے جمہوری ڈھانچوں میں تبدیلی کرنے اور یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کی تحریک چلائی گئی، مسلمان مایوسی اور احساس کمتری کا شکار ہونے لگے، حضرت صدر محترم نے مسلم پرسنل لا بورڈ کا ساتواں اجلاس ۶ ر۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو شہر کلکتہ میں طلب فرمایا اور علماء وقائدین کے ایک بڑے

مجمع میں اپنے خطبۂ صدارت کے اندر پوری جرأت اور پورے اعتماد کے ساتھ بورڈ کے موقف کو صاف صاف لفظوں میں بیان کیا انہوں نے فرمایا کہ :۔

"ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے، کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت نظام تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اسکا اسطرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندستان کا دستور اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے"۔ (ماخوذ از خطبۂ صدارت کلکتہ ۱۹۸۵ء)

مسلمان بھلے ہی عمل میں کمزور ہو، لیکن وہ مذہبی قدروں پر یقین رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ذہنی وفکری ارتداد عملی وفعلی ارتداد سے بڑھ کر ہے، چنانچہ حضرت مولانا نے مسلمانوں کے اس اعتماد ویقین کی بھرپور ترجمانی کی اور اپنے عزم وارادہ کا اظہار بورڈ کے مختلف اجلاسوں میں کیا دسویں اجلاس دہلی ۱۹۹۱ء۔ بارہویں اجلاس بورڈ احمد آباد ۱۹۹۵ء اور تیرہویں اجلاس ممبئی ۱۹۹۹ء کے خطبۂ صدارت میں مذکورہ بالا جملوں کو دہرایا، انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اسلام کے عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لاء کی خالص دینی وشرعی حیثیت اور اس کے امتیازی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا کہ :۔ ہم قانونِ شریعت میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، مگر جہاں انھوں نے اربابِ اقتدار کو اس حقیقت سے آگاہ کیا، وہیں بذاتِ خود مسلمانوں کو بھی قانونِ شریعت پر عمل کرنے کی تاکید کی، انہوں نے کلکتہ کے اجلاس بورڈ کے موقعہ پر ۵ رلاکھ کے مجمع عام کو مسلمانوں کو ان کی دینی غیرت اور ایمانی جوش وجذبہ کو ابھارتے ہوئے فرمایا کہ :۔

"جب ہم اہلِ حکومت اور برادرانِ وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے شکایت کریں گے، ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑیں گے

اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے"۔ (از تقریر ۷ راپریل ۱۹۸۵ء شہید مینار کلکتہ)

جب جب ملک کے اکثریتی فرقوں یا عدالتوں نے پرسنل لاء میں مداخلت اور یونیفارم سول کوڈ کو نافذ کرنیکا ارادہ کیا، حضرت صدر محترم نے اس چیلنج کا بھرپور جواب دیا، ایک دفعہ انہوں نے بورڈ کی مجلس عاملہ میں بہت سخت لہجے میں فرمایا کہ :-

"ملک کا سیاسی مستقبل نہایت اندیشناک ہے، محض فرائض کا نام دین نہیں ہے، بلکہ شعائر اسلامی وقوانین کا تحفظ بھی دین کا اہم شعبہ ہے، اس لئے ہمارا یہ سفر ابھی جاری رہے گا، ہر دور میں ادارے اور تحریکیں اٹھی ہیں، مسلم پرسنل لاء بورڈ بھی ایک اہم تحریک ہے، اسلئے ہمارا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے"۔ (ماخوذ از رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ ۸ رمئی ۱۹۹۱ء لکھنؤ)

بورڈ کے صدر منتخب ہونیکے کچھ عرصہ بعد یعنی ۲۲ راپریل ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ (۱۲۵) کا سہارا لیکر شاہ بانو مقدمہ میں مسلم مطلقہ عورت کو تاحیات یا نکاح ثانی شوہر پر نفقہ لازم قرار دینے کا انتہائی جارحانہ فیصلہ دے دیا، یہ فیصلہ قانونِ شریعت کے بالکل مخالف تھا، حضرت صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور جنرل سکریٹری بورڈ مولانا سید منت اللہ رحمانی کی راتوں کی نیند اڑ گئی، قلب و دماغ بے چین ہو گئے، اور اس کے خلاف سخت اور مسلسل صدائے احتجاج بلند کیا، بورڈ کے علماء و قائدین نے ان دونوں حضرات کی رفاقت و رہنمائی میں پورے ملک میں منظم تحریک چلائی، مسلمانوں کے اجتماعات میں نفقہ قانونِ اسلامی کی وضاحت کی اور سپریم کورٹ کے فیصلوں پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا، حضرت صدر محترم نے ۲ رفروری کو وزیر اعظم ہند اور حکومت کے دوسرے سیاسی و اعلیٰ عہدیداروں سے گفت و شنید کی، کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی برسرِ اقتدار پارٹی کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور صورتِ حال کی نزاکت، اس قانون کی نامعقولیت اور قانونِ شریعت کی حکمت و انفرادیت سے روشناس کرایا، آخر کار آپ کی مدبرانہ قیادت

ورہنمائی اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی مذہبی وسیاسی بصیرت اور اقدامی صلاحیت کے نتیجہ میں حکومت ہند نے ۶ رمئی ۱۹۸۶ء میں قانون حقوق مسلم مطلقہ ۱۹۸۶ پاس کرکے سپریم کورٹ کے فیصلے کو رد کر دیا، جس کی مثالیں ملک کی آئینی وجمہوری زندگی میں کم ملتی ہیں، اس مسئلے میں کامیابی کی سب سے بڑی وجہ حضرت صدر محترم کی دانشمندانہ وجرأتمندانہ قیادت، مولانا سید منت اللہ رحمانی کی دوراندیشی، اصابتِ رائے اور معزز اراکین بورڈ کی بلند حوصلگی اور صبر آزما جدوجہد اور قربانیاں ہیں۔

شریعت اسلامی، شعائرِ دین اور عائلی قوانین پر جب بھی فرقہ پرست طاقتوں نے ناروا حملے کئے حضرت صدر محترم بحیثیت صدر بورڈ اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کیلئے سینہ سپر ہوگئے، ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کا دن آزاد ہندستان کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین دن ہے جس وقت کہ یہاں کی فرقہ پرست جماعتوں اور انتہا پسند تنظیموں نے مذہبی تعصب اور جوشِ جنون میں ہندستان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا اور بڑے پیمانے پر ملک میں خونی فسادات کرائے، فرقہ وارانہ جنون کی آگ میں ملک جل رہا تھا، مسلمان، مایوسی، اضطراب اور بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، ان کی نگاہیں بورڈ کی طرف اٹھنے لگیں، ایسے مایوس کن حالات میں حضرت صدر محترم نے مسلمانوں کے قدموں کو جمایا اور انہیں زندہ ملت کی حیثیت سے رہنے اور حوصلہ وہمت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کی، پھر ۹ رجنوری ۱۹۹۳ء کے اجلاسِ عاملہ دہلی میں بابری مسجد کی شہادت پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے ایک تاریخی اور مؤثر تقریر کی تھی، جس میں بابری مسجد کی بازیابی کیلئے آخری دم تک جدوجہد کرنے کا عزم فرمایا تھا، اور یہی ہوا کہ اس کے بعد ۵ راپریل ۱۹۹۳ء کو بورڈ کے ایک مؤقر وفد کی قیادت کرتے ہوئے وزیراعظم سے ملاقات کی اور ایک واضح اور مفصل میمورنڈم پیش کیا، چنانچہ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ پر چل رہے بابری مسجد کے حقیت کے مقدمہ میں بورڈ نے قانونی امداد وتعاون کا فیصلہ کیا جو اب تک جاری ہے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا نے بار بار اربابِ حکومت کو صاف لفظوں میں کہا کہ :۔

"ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانونِ شریعت، اور اپنی پوری مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نکتہ سے بھی دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں"۔ (خطبۂ صدارت ممبئی ۱۹۹۹ء)

ایک زمانہ میں بابری مسجد کے قضیہ کے تصفیہ کیلئے ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں سے بھی گفتگو کرنے کی بات چلی تھی، اس موقعہ پر حضرت مولانا نے اپنی ذاتی رائے یہ ظاہر کی تھی کہ حکومت خود مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے تحت لیلے اور اسکے تحفظ اور فضا کو ہموار اور درست رکھنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کردے جس میں ہندوؤں کی طرف سے جنوب کے دو شنکراچاریہ اور دو مسلمان مذہبی شخصیتوں کو رکھا جائے، مگر حکومت نے اس مسئلہ کو سیاسی تناظر میں اسقدر الجھا کر رکھدیا کہ اس سے اس کی بدنیتی ظاہر ہونے لگی، بہرحال بورڈ کا یہ شروع سے موقف رہا ہے کہ وہ مسجد ہے اور قیامت تک مسجد رہے گی، ناجائز طور پر مورتیوں کو رکھ دینے اور ظلم وجبر سے پوجا جاری رکھنے سے مسجد کا مسجد ہونا ختم نہیں ہوتا۔ (قرارداد بورڈ ۹ جنوری ۱۹۹۳ء)

جب پہلی مرتبہ مرکز میں بی جے پی کی حکومت بنی تو اقلیتی فرقوں میں سراسیمگی پیدا ہونے لگی، انکے دلوں میں مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کے خطرات پیدا ہوگئے، حضرت مولانا نے جو قائدانہ اور عالمانہ خطاب فرمایا وہ آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے، انہوں نے ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء کی مجلس عاملہ میں کہا کہ:۔

"موجودہ حالات میں ہمیں مایوس اور شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں، اس حقیقت کو ہم پیش نظر رکھیں کہ اسلام اس ملک میں یونہی نہیں آیا، بلکہ تقدیر الٰہی کے ساتھ آیا ہے، بلکہ اس ملک میں اسلام کو بھیجا گیا، اللہ نے اپنی رحمت، تائید اور اپنی نصرت کے ساتھ اسلام کو بھیجا ہے، یہ دین یہاں سے ختم نہیں ہوگا"۔ (ماخوذ از کارروائی رجسٹر مجلس عاملہ بورڈ ۲۵ اپریل ۱۹۹۸ء دہلی)

پھر ایک دفعہ لکھنؤ کی مجلس عاملہ میں بہت کرب وتڑپ کے ساتھ فرمایا کہ :۔

"اس وقت ہندستان میں دعوتِ اسلامی کو نقصان پہونچانے اور گمراہی کی طرف لیجانیوالی

طاقتیں بہت سرگرم عمل ہیں اور ہندستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوشش ہو رہی ہے، لہٰذا ہمارے ارکان حالات کے اتار چڑھاؤ پر اپنی نگاہ رکھیں اور مایوس نہ ہوں"۔

(ماخوذ از کارروائی رجسٹر مجلس عاملہ ۲۲ نومبر ۹۵ء)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے عہد صدارت میں بورڈ کے طریقۂ کار اور دائرۂ عمل میں بڑی وسعت ہوئی، اصلاح معاشرہ کی تحریک ہندگیر پیمانے پر چلائی گئی، خاص کر ۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء سے ۳۰ نومبر ۹۵ء تک، ملک کے بڑے بڑے شہروں میں "تحفظ شریعت ہفتہ" منایا گیا جس سے مسلمانوں میں اسلامی بیداری آئی، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عائلی مسائل کے حل کے لئے نظام قضا کے قیام پر زور دیا گیا اور اس کیلئے رائے عامہ ہموار کی گئی، اس جد وجہد کے نتیجہ میں ملک کے بڑے اور اہم شہروں میں جیسے جنوبی دہلی، تھانہ (ممبئی)، آکولہ، اندور وغیرہ میں دارالقضا کا قیام عمل میں آیا، ایک عرصہ سے ایک ایسے قانون فقہ اسلامی کی تدوین و ترتیب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس کے ذریعہ ملک عدالتیں اور قانون داں حضرات اس سے استفادہ کر سکیں، چنانچہ حضرت صدر محترم کی سرپرستی اور حضرت امیر شریعت بہار واڑیسہ مولانا سید منت اللہ رحمانی کی رہنمائی میں بورڈ کے ممتاز فقہائے کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور تدوین کا کام کیا گیا، بحمد اللہ اسوقت وہ مرتب شدہ حالات میں موجود ہے، اس کی طباعت و اشاعت کا نظم کیا جارہا ہے، حضرت صدر محترم نے اپنا عالمانہ اور فاضلانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کر کے اس کمیٹی کے کنوینر کے حوالہ کر دیا ہے، مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس کی طباعت سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، دہلی میں مرکزی دفتر کیلئے ایک کشادہ فلیٹ بھی حضرت کے ایماء پر خرید لیا گیا ہے۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے سترہ سال تک بورڈ کی قیادت و صدارت کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور اس عرصہ میں برصغیر ہند و پاک میں اٹھنے والے تمام فتنوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کیا، انہوں نے ۸ سال تک مولانا سید منت اللہ رحمانی کی جنرل سکریٹری شپ کے زمانہ میں اور ۹ سال تک موجودہ جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب کے عہد میں مسلم پرسنل بورڈ کی صدارت کی،

ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ذہنی و فکری ہم آہنگی اور تعاون سے انھیں بہت تقویت ملی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کی قیادت سے بورڈ میں جتنا اعتماد و وقار پیدا ہوا، ملک کی تاریخ میں اتنا اعتماد کسی اور جماعت کو حاصل نہیں ہوا، حالیہ دنوں میں بورڈ کا تیرہواں اجلاس ممبئی میں منعقد ہوا، صدر محترم اپنی شدید علالت اور ضعف و پیرانہ سالی کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، اس کے باوجود اجلاس میں اتفاق رائے سے آپ ہی کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، بعض ارکان نے تو یہاں تک کہا کہ آپ کی ذات اور شخصیت سے بورڈ کا وقار قائم ہے، بورڈ کے اس افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی قاضی شریعت نے فرمایا تھا کہ:۔

"بورڈ کے موجودہ صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی ذات والا صفات تمام عالم اسلام کیلئے عموماً اور مسلمانانِ ہند کیلئے خصوصاً بہت بڑی نعمتِ خداوندی ہے، جو اوّل دن سے اس کارواں کے سالاروں میں رہے ہیں اور حضرت قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ ہی کی قیادت میں کامیابی کیساتھ ہم یہ سفر طے کر رہے ہیں، شاہ بانو کیس اور بابری مسجد جیسے اہم مسائل میں ان کی مدبرانہ سرپرستی نے ہمیں صحیح سمت عطا کی اور اس وقت نہ صرف مسلمانان ہند، بلکہ تمام عالم اسلام کیلئے وہ ایک بہت بڑی ضرورت ہیں"۔ (ماخوذ از خطبۂ افتتاحیہ ص ۱۲ تیرہواں اجلاس بورڈ ۲۸، ۲۹، ۳۰ اکتوبر ۹۹ء ممبئی)

حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی فکری اور حکیمانہ قیادت سے مسلم پرسنل لاء بورڈ کو نئے افق اور نئی وسعتیں عطا ہوئیں، یہ بورڈ کی ہی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا قائد ملا جس نے تمام مسلک و مشرب اور فکر و خیال کے علماء و دانشوروں کو نظم و اتحاد کے ساتھ ایک دھاگے میں پروئے رکھا اور ملت اسلامیہ کے دلوں میں اپنا وقار و اعتماد قائم رکھا، مگر افسوس صد افسوس کہ! ملتِ اسلامیہ کی عظمت و حرمت پر مرمٹنے کا جذبۂ صادق رکھنے والا یہ مردِ مومن ۳۱ دسمبر ۹۹ء ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو اس وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملا

جب کہ اس صدی کا آخری سورج نصف النہار کو پہونچ چکا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک طرف ماہ و سال کے پیمانے سے ایک عہد کا خاتمہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف علم و فضل کا چراغ اور فکر و نظر کا ایک عہد اور ایک دور اپنے اختتام کو پہونچ چکا تھا، اللہ تعالیٰ حضرتؒ کی دینی و علمی، ملی و سماجی خدمات کو قبول فرمائے اور پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اللہ پاک ان کی قبر پر انوارِ رحمت کی بارش فرمائے اور اخروی نعمتوں سے مالا مال کرے، نیز مسلمانوں کی اس اجتماعی تنظیم کو انکا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

□□□

(بقیہ منصب نبوت - ایک اجمالی تبصرہ)

تک انسانی حرکتوں کا سلسلہ جاری رہے گا اس وقت تک یہ مردِ خدا اور دل کا مسلسل پاکیزگیِ اخلاق اور خوبیِ کردار کا سبق دیتا رہے گا، اب ان کے حق میں سب سے بڑا خراجِ عقیدت یہی ہے کہ ان کی تالیفات و تصنیفات کو عام کیا جائے اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ

اور اخوان المسلمین

مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری
(استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم اسلامیہ بستی)

متنوع اور رنگا رنگ اوصاف کا اجتماع موصوف کی جامعیت کی علامت ہے۔ بعض طبیعتیں مفکرانہ اور عالمانہ ہوتی ہیں لیکن زاہدانہ اور عابدانہ نہیں ہوتیں، اور بعض طبائع مفکر بھی ہوتی ہیں اور زاہدانہ اور عابدانہ بھی لیکن مجاہدانہ نہیں ہوتیں، اگر کسی طبیعت میں فکر و نظر، علم و عمل زہد و عبادت اور دعوت و جہاد سب یکجا ہو جائیں تو بلاشبہ وہ طبیعت توفیق الٰہی کی بہترین شاہکار ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی نرم مزاجی اور نرم گفتاری کا مشاہدہ کرنیوالا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے رقیق و شفیق قلب کے اندر جہاد کی چنگاری سلگتی ہوگی لیکن مصر کی اخوان المسلمین جیسی مجاہدانہ انقلابی تحریک سے ان کا والہانہ تعلق دیکھ کر یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ ؎

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

ریشم کی نرمی اور اس کے لوچ سے ظاہر بینوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ قوت اور مضبوطی سے عاری ہے لیکن تجربہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ وہ نرم و ملائم اور لچکدار ریشم اندر سے اس قدر مضبوط و مستحکم ہے کہ شمشیر براں بھی اسکو قطع نہیں کر سکتی۔

ان کی ریاء و نمود سے بیگانہ زبان و بیان نے جانبازی و سرفروشی کے بلند بانگ دعوے تو نہیں کیے لیکن مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے کینہ پرور اور اذیت شعار حکومتوں کے مقابلے میں جس طرح وہ ڈٹ گئے اور ان سے حق کو منوا کر دم لیا وہ ان کی مجاہدانہ طبیعت کا بین ثبوت ہے یہ حقیقت ہے کہ امت کے متفقہ مسائل میں وہ عزیمت کا ثبوت دیتے تھے اور صلابت پکار بند رہتے تھے۔

شریعت اسلامیہ کو حکمراں دیکھنے کی ان کی شدید خواہش ہی کا یہ کرشمہ تھا کہ ان کو مصر کی اخوان المسلمین اتنی بھا گئی کہ ان کی زبان سے اس کے حق میں بے ساختہ وہ جملہ نکلا جو زبان رسالت سے حضرت علیؓ کے حق میں ارشاد ہوا تھا،" لایحبه الا مؤمن ولا یبغضه الامنافق" ان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے اور اسی کو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے۔

اخوان کے مرشد عام حضرت حسن البناء الشہیدؒ کی زیارت نہ ہونے کا ان کو عمر بھر قلق رہا۔ انھوں نے حسن البناءؒ کے قتل اور ان کی شہادت کو تاتاری حملے کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا خسارہ قرار دیا، چنانچہ حسن البناء الشہیدؒ کی ڈائری "مذکرات الدعوة والداعية" پر حضرت مولانا نے جو وقیع مقدمہ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں۔ فلما قدر لی ان ازور مصر سنة ۱۹۵۰م کانت رحمه الله قد استأثرت به ولا ازال اتحسر علی هذا الخسارة التی کتبت لی، وان محاولة القضاء علی آثار هذه الحرکة جریمة لا یوجدلها نظیر الا فی تاریخ التتارالوحوش و فی تاریخ الاضطهاد الدینی فی العالم المسیحی القدیم۔

(مذکرات الدعوة والداعية – طبع سوم)

کہا جاتا ہے کہ خاندانی رگ اپنا کرشمہ ضرور دکھاتی ہے، اس مشہور مقولہ کی تائید حدیث شریف کے اس فقرہ سے بھی ہوتی ہے "عرق نزعها" لہذا اگر یہ کہا جائے کہ سید احمدؒ شہیدؒ کے خانوادے سے اٹھنے والے اس فرزند کا مجاہدین اسلام سے یہ والہانہ تعلق حضرت سید شہیدؒ کی صدائے بازگشت تھی تو بیجا نہ ہوگا۔

شیخ حسن البناء کو حضرت مولاناؒ نے جو غیر معمولی خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل دید ہے فرماتے ہیں:

"ان کی شخصیت تاریخ کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی تحریک و دعوت کو چلانے اور کسی عہد میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے پیدا فرماتا ہے اور اسکو قیادت کی وسیع اور متنوع صلاحیت عطا فرماتا ہے وسیع و روشن دماغ، گرم و پر محبت و دردمند دل، فصیح و بلیغ زبان، تسخیر کرنے والے اخلاق، دل آویز شخصیت یہ ان

کے عناصر ترکیبی تھے، میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو بے ساختہ حسن البناء کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے انھیں کو دیکھ کر کہا ہے۔ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

(کاروان زندگی ۳۷۷ ج ۱)

خود اخوان کی نظر میں حضرت مولانا کی کتنی وقعت تھی اس کا اندازہ اس پذیرائی سے ہوتا ہے جو حضرت مولانا کے سفر مصر کے دوران اخوان کی طرف سے کی گئی۔ اخوان کے ایک خصوصی حلقہ میں جو مولانا کی تقریر ہوئی اور بعد میں " اريدأن اتحدث إلى الاخوان " کے عنوان سے شائع ہوئی اس کو اخوان میں اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پے بہ پے اس کے تین ایڈیشن شائع، ہوئے اس قدر دانی کا مولانا نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ:

"مجھے کسی دینی وسیاسی جماعت کے متعلق اتنی فراخدلی اور عالی ظرفی کا تجربہ نہیں ہو سکا"۔

(کاروان زندگی ۳۸۷)

"اريد ان اتحدث إلى الاخوان" کے پہلے ایڈیشن پر شیخ محمد الغزالی جو اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف ہیں، انھوں نے اور دوسرے ایڈیشن کے لئے شیخ حسن البناء کے پہلے جانشین استاذ حسن الهضيبي مرشد عام نے مقدمہ لکھا، یہ بات بھی جماعتوں کی تاریخ میں خاص ندرت اور اہمیت رکھتی ہے کہ ایک ایسی کتاب پر جو تنقید و مشورہ سے خالی نہیں، جماعت کا سب سے بڑا ذمہ دار مقدمہ لکھے۔

حضرت مولاناؒ اس کے بے حد آرزومند تھے کہ مسلمان تسخیر کائنات اور تسخیر النفس و آفاق کی سمت میں عمل شروع کریں، یہی وجہ ہے کہ وہ کلام اقبالؒ کو بیحد پسند کرتے تھے، انھوں نے کلام اقبال کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سب سے بڑی چیز جو مجھے اقبال کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے،

جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر النفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت اور ابدیت پر ایمان لاتا ہے"۔

(کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۷۶)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دشمنانِ اسلام کے منصوبہ بند پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے خواص بھی احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں بقول ایک مفکر کے وہ جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے، ہوا کا رخ اسی طرف ہے دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے، پھر ہم اسکی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں، حالانکہ یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پر بہہ گیا ہے اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب آئے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے، اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام ہی میں موجود ہے، محمد ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رخ پر بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا، کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ مگر ایک تن واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دیدیا اور چند سال کی مختصر مدت میں دنیا کے رخ کو پھیر کر اور زمانے کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

اسلامی تعلیمات کے خلاف سازشوں اور پروپیگنڈوں کی ایک کڑی وہ بھی ہے جس کی آج کل کانوں میں بہت گونج ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاد کے مقدس فریضہ کو یورپ اور امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کہا جا رہا ہے، اس پروپیگنڈے سے ہمارے اہل علم اور اہل قلم اس درجہ متاثر نظر آتے ہیں کہ جہاد کا لفظ زبان پر یا قلم پر لاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

جہاد اسلامی تعلیمات کا ایک لازمی عنصر ہے وہ اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا، دراصل جہاد کا لفظ مطلق ہے اسکو اسکے اطلاق کے تناظر میں دیکھنا چاہئے، جہاد کے معنی کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم سے قتال کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ فرزندان اسلام سہل انگاری اور راحت کوشی کے بجائے سپاہیانہ زندگی اختیار کریں اور جفاکشی کو شیوہ بنائیں۔ اور ایک باحمیت سپاہی کی طرح اسلام کی حفاظت کریں اور مسلمانوں کی جان ومال اور آبرو پر درازدستی کرنے والے کو اس کے کیفر کردار تک پہونچائیں۔

حضرت مولاناؒ اس حقیقت سے کبھی غافل نہیں رہے اور جب انھوں نے اسلام کا جامع مفہوم پیش کیا تو مسلمانان عالم اور خاص کر عربوں کو مجاہدانہ زندگی اختیار کرنے کا پر زور مشورہ دیا آج کل چونکہ اس پہلو سے غفلت برتی جارہی ہے اور اس پر پردہ ڈالا جارہا ہے اس لئے میں نے دراز نفسی سے کام لیا، اب میں اپنے اس معمولی مضمون کو حضرت مولاناؒ کے ان وقیع الفاظ پر ختم کرتا ہوں جن سے ماذا خسر العالم کے صفحات مزین ہیں حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں:

"فالمهم لرجال التعليم والتربية قادة الشعوب العربية ان يربو الشبية العربية على الفروسية والحياة العسكرية و على البساطة فى المعيشة و خشونة العيش والجلادة و تحمل المشاق والمتاعب و قد كتب المربى الكبير امير المؤمنين عمر بن الخطاب إلى بعض عماله العرب وهم فى بلاد العجم "اياكم والتنعم وزّى العجم و عليكم بالشمس فانها حمام العرب تمعددوا واخشوشنوا واخشو شوا واخلولقوا واعطوا الركب أسنتهاوانزوآ نزواً وارمو الأغراض وقد قال النبى صلى الله عله و سلم ارموا بنى اسماعيل فان اباكم كان رامياً وقال الاان القوة الرمى الا ان القوة المرمى" (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين ص۳۰۵-۳۰۶)

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو ضائع کر دیا

خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل خارج ہو گئی جو ایک بہت بڑا نقصان اور میدان جنگ میں ہزیمت اور کمزوری کا بہت اہم سبب ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جو ان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہو گئی، جسم کمزور ہو گئے، لوگ ناز و نعم میں زندگی گزارنے لگے، لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کر دیا اور ان کھیلوں کو اختیار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے تعلیم و تربیت کے رہنماؤں کے لئے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، عزیمت اور مصائب پر صبر و استقامت کی اہلیت پیدا کریں۔

امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ عجمی ممالک میں اپنے عرب عمال کو لکھتے ہیں کہ تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دور دور رہنا، دھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں کا حمام ہے، جفاکشی، سادہ زندگی، صبر و تحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے عادی رہو، گھوڑے پر جست لگا کر بے تکلف بیٹھنے کی مشق رہنی چاہئے، نشانے درست ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے! اے اہل رب تیر اندازی کی مشق رکھو اس لئے کہ تمھارے جد امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام تیر انداز تھے۔

ایک جگہ ارشاد ہے یاد رکھو جس قوت کے تیار رکھنے کی قرآن مجید میں تاکید ہے وہ تیر اندازی ہے، وہ تیر اندازی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

☆☆☆

پیام انسانیت کے علمبردار

ڈاکٹر شمس تبریز خان
(ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

ہندوستان زمانۂ قدیم سے مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، اس لئے یہاں کے دانشوروں کی فکر میں مشترکہ انسانی اقدار اور تہذیبی وسماجی اصولوں کو اپنانے پر زور دیا گیا ہے۔ ویدک نظام میں بھی انسانی سماج کو چار ذاتوں میں تقسیم کرتے ہوئے بھی ان میں اشتراک عمل اور تقسیم کار کا اصول اپنانے اور سماجی ہم آہنگی کی امکانی کوشش کی گئی جو بعد میں عدم توازن اور طبقاتی ومفاداتی کشمکش کا شکار ہو گئی۔

پھر مہاتما گاندھی اور مہاویر جی نے بنیادی انسانی سچائیوں پر زور دیا مسلمانوں کے ہندوستان آنے بعد اسلام کی انسانی تعلیمات کی تاثیر کے نتیجے میں بھگتی تحریک وجود میں آئی اور اس کے شاعروں اور مفکروں نے رسم ورواج اور مذہب کی تقلید جامد سے آزاد ہو کر عشق وفنائیت، خداپرستی وبندگی اور انسانی دوستی پر زور دیا اور نانک وکبیر، رامانج، چیتنیہ، میرابائی، رحیم اور رس خان نے اپنے اپنے انداز سے انسانیت کا پرچم بلند کیا۔

ہندوستانی مذاہب کے وتہذیب کے مختلف دھاروں میں بھی مشرق کی روایتی انسان دوستی اور انسان نوازی کے رجحانات موجِ تہہ نشیں کی طرح متحرک وموجود رہے ہیں چنانچہ امن دوستی و عافیت پسندی، کشادہ قلبی ورواداری، حلم وتحمل، غریب نوازی ویتیم پروری، فقیروں، محتاجوں، بیواؤں، بے کسوں اور مصیبت زدوں سے ہمدردی، مروّت ورعایت، رحم دلی، اور خدا ترسی کے جذبات وخیالات کے ساتھ دوسرے مذاہب کے احترام، مذہبی دل آزاری سے گریز وپرہیز، ذہنی وعلمی گنجائش وسمائی اور دوسری انسانی واخلاقی قدریں صدیوں سے ہندوستانی سماج کے فعال ونمایاں عوامل وعناصر رہے ہیں اور سنتوں، رشیوں، پیروں، فقیروں، علماء وفضلاء، مشائخ وصوفیاء کی انسانی تعلیمات

اور مثالی طرز حیات نے ہندوستان کی عوامی زندگی کو خاص طور سے متاثر کیا ہے اور یہاں کے فنون لطیفہ شعر وادب اور فکر وفلسفہ میں "انسانیت" ایک نمایاں رجحان کی طرح جلوہ گر رہی ہے۔ اور یہ ہندوستانی تہذیب کا وہ اعزاز وامتیاز ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر امن وانسانیت کی تحریکوں کو روشنی ورہنمائی فراہم کر سکتی ہے۔

انگریزی عہد میں لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت کبھی کبھی ہندو مسلم فسادات ہوئے اور فرقہ پرست فتنہ پرور اور سماج دشمن عناصر کی سازشوں اور انتظامیہ کی نااہلی وکوتاہی اور بعض دوسرے پیچیدہ اسباب وعوامل کے نتیجے میں فسادات کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ جو ہندوستان کی انسان دوستی کی تاریخ کی پیشانی پر بدنما داغ دھبے بن کر ابھرا، جس سے مسلمانوں میں بدگمانی پیدا ہوئی۔ اور ان کی نفسیات میں منفی رجحانات پرورش پانے لگے۔ جو کسی بھی ملک وقوم کے لئے باعث شرم اور اس کی بدنامی کا باعث ہو سکتے تھے۔

ایسے نازک وپیچیدہ، شک وشبہ، بدگمانی وبے اعتمادی اور نفرت وعداوت کی فضا میں مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کے ساتھ جہاں مولانا حفظ الرحمٰن اور ڈاکٹر سید محمود ہندو مسلم اتحاد اور امن وانسانیت کے لئے سرگرم عمل ہوئے۔ وہیں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی "پیام انسانیت" کی مستقل اور فعال تحریک قائم کی جو ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر رحمت حق سے وابستہ ہوگئے۔ حضرت مولاناؒ بنیادی طور پر ایک بڑے عالم ومعلم، اردو عربی کے صاحب طرز انشاء پرداز، ایک ممتاز ومنفرد مورخ وسیرت نگار، ایک روشن ضمیر صوفی وبزرگ، اور اسلام کے ایک بین الاقوامی داعی وترجمان تھے۔ ایک ذمہ دار شہری، ایک درد مند انسان، ایک صاحب دل اور صاحب طرز مفکر ومبصر، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے ممتاز علمی ودینی خانوادے سے وابستہ ہونے کے سبب ہندوستانی عوام کی اخلاق کی رہنمائی اور ہندوستان کے ذہن وضمیر کی بیداری، اہل سیاست کی ہدایت وتنبیہ، ملک وقوم کی بہی خواہی، اور حق گوئی کے انسانی واسلامی فریضہ کے تقاضے کے تحت انھیں عوامی رہنمائی کے لئے میدان میں اترنا پڑا۔ اور پیام انسانیت کا علم اٹھانا پڑا اور حالات کی ناساز

گاری اخلاقی انحطاط اور انسانی قدروں کے زوال، ملک کے مستقبل کی فکر اور کاروان انسانیت کو صحیح سمت سفر دینے کے جذبہ واحساس نے ایک گوشہ نشیں صوفی وعالم ایک مصروف ومشغول محقق ومصنف اور ایک بڑے تعلیمی ادارے "ندوۃ العلماء" کے علاوہ بہت سے عالمی اداروں سے تعلق رکھنے والے مفکر ودانش ور کو عوامی زندگی اپنانے اور انسانیت کی دہائی دینے پر مجبور کر دیا۔

تحریک پیام انسانیت کے علاوہ بھی مولانا علی میاں کی تقریر وتحریر کا بنیادی موضوع انسانوں کی صلاح واصلاح، تعمیر انسانیت اور ایک بہتر انسانی معاشرے اور سماج کی تشکیل ہی رہا ہے۔ اور پیمبرانہ انداز سے انسانیت کی فلاح اور انسانی اقدار کا فروغ ہی ان کی فکر ونظر کا محور رہا ہے۔ ان کی تصانیف کے کچھ عنوانات پر نظر ڈالئے تو اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ اگر وہ براہ راست کسی انسانی موضوع پر نہ بھی ہوں لیکن ان کا بالواسطہ تعلق اسی سے ہوگا مثلاً "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" "انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی وتعمیری کردار" "تحفۂ انسانیت" "تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات" "مذہب وتمدن"، "نبی رحمتؐ" "محسن عالمؐ" "انسانیت کے محسن اعظمؐ ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے۔ انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار، "پیام انسانیت"؛ "مقام انسانیت" "دنیا میں آنے والے انسان چمن کے پھول یا کانٹے" وغیرہ۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پیام انسانیت کی یہ تحریک کسی خوف زدہ اور مرعوب ذہنیت کی پیداوار نہ تھی بلکہ ملک وقوم کی خیر خواہی وخیر سگالی پر مبنی ایک مثبت واصلاحی تعمیری تحریک تھی۔ جو احتجاج وچیلنج کے بجائے اخلاقی اپیل، وجدانی دعوت، ذہن وضمیر کو جگانے اور سوئے ہوئے انسانی واخلاقی احساس وشعور کو بیدار کرنے ظالم کا ہاتھ پکڑنے اور مظلوم کو سہارا دینے سے عبارت تھی۔ اس لئے اس میں مسلمانوں کے علاوہ امن دوست اور انصاف پسند غیر مسلم حضرات بھی بکثرت شریک ہوتے تھے۔ اور بعض علاقوں میں اس کے داعی اور استقبال کرنے والوں میں آگے آگے رہتے تھے ۱۹۶۴ء کے بعد کے پیام انسانیت کے دوروں اور جلسوں میں مولانا اور ان کے رفقاء کا ایسا استقبال ہوتا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے ایسے نمونے سامنے آتے تھے جن سے تحریک خلافت کے زمانۂ اتحاد کی

دلکش یادیں تازہ ہو گئیں۔ اور ماضی حال بن گیا اس تحریک کی مقبولیت کا اندازہ حضرت مولانا کے انتقال پر ان تعزیتی پیغامات سے بھی ہوتا ہے جو وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ اور دوسرے سیاسی لیڈروں اور اخباروں کے ذریعہ بھیجے گئے ہیں اور جن میں پیام انسانیت کو خاص طور سے سراہا گیا ہے۔

مولانا نے آزادیٔ ہند کے بعد ہی سے مخلوط اجتماعات میں غیر مسلم تعلیم یافتہ حضرات سے انسانی واخلاقی موضوعات پر خطاب کرنا اور انسانی واخلاقی بنیادوں پر کردار سازی اور ملک میں جمہوریت، انسانیت اور اخوت ومساوات پر مبنی سماج کی تعمیر کی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا، بعد میں ۱۹۷۴ء میں اس تحریک نے "پیام انسانیت" کا نام اپنایا۔

مولانا نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریک پیام انسانیت کے پس منظر اور اسباب ومحرکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ اقدام اس خیال پر مبنی تھا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو بہر حال اس ملک پر حاوی اور اثر انداز ہے اور رہے گی اور جو نہ صرف اسلام کے عقائد وحقائق ودعوت سے ناآشنا ہے۔ مسلمانوں کے معتقدات ان کی زندگی کی بنیادوں اور ان کی "وسیع معنی میں" تہذیب اور ملی شخصیت سے ناواقف بلکہ متوحش ہے مزید برآں سیاسی صف آرائی پاکستان کے قیام اور کوتاہ اندیش مقررین کی اشتعال انگیزی نے اس کو مسلمانوں سے متنفر اور بدگمان بنادیا ہے۔ اس اکثریت کو نظر انداز کرنا اور اس کو کچھ سننے اور جاننے کا موقع نہ دینا اپنی ملت کے حق میں بھی خطرناک ہے اور ملک کے حق میں بھی مضر ہے یہ غلطی بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی سلطنت اور اقتدار گیا تو سب کچھ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ مسلمان اس ملک میں خلا میں ہیں یا الگ تھلگ جزیرہ میں بستے ہیں۔

لیکن غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن وضمیر تک پہونچنے کا کوئی راستہ اس وقت تک زندگی کے مشترک مسائل انسانیت واخلاق ملک کے مفاد کے تذکرے اور تمام مسائل ومصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا کچھ نہیں اور یہی طریقہ انکو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خدا داد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے

فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں تقدیر بن گئی ہے آمادہ کر سکتا ہے۔(۱)

مولاناؒ نے آگے چل کر لکھا ہے "اس تجربے اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں "پیام انسانیت" تحریک کی شکل اختیار کرلی جس کا تجربہ پچھلے تجربوں کی طرح کامیاب رہا اور اس نے اکثریت کے طبقے، انصاف پسند غیر مسلموں اور دانشوروں میں اسلام اور سیرت کے مطالعہ کا کسی درجہ میں شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا۔ ہندوستان انسانی بحران، اخلاقی انتشار، انسانی جان ومال کے عدم احترام و تحفظ، خود غرضی، دولت پرستی کے جنون کی وجہ سے جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا مہیب نقشہ پیش کرنے اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی دعوت دینے پر بعض ممتاز ہندوؤں نے یہاں تک کہا کہ آج معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس ملک کے بچانے کی فکر ہم سے زیادہ ہے"۔(۲)

مولاناؒ نے پیام انسانیت کو عوام وخواص میں مقبول اور مؤثر بنانے کیلئے انسانی نفسیات ومزاج کی پوری رعایت کی اور اسے متاثر کرنے اور دل ودماغ تک رسائی کے لئے تمام انسانی، اخلاقی، فکری وجذباتی اور اصولی اپیلوں سے کام لیا اور اپنی بات کو فکر انگیز اور دلنشیں مثالوں اور حکایتوں سے آراستہ کیا جس سے ان کی بات دلوں کو چھوتی، دماغوں میں اترتی اور انسانی ضمیر ووجدان کو بیدار کردیتی ہے انھوں نے پیام انسانیت کی اکثر تقریروں اور تحریروں میں رسول اللہ ﷺ کی پیش کی ہوئی اس مثال کو دہرایا کہ:

"ایک کشتی کے سوار اگر دوسرے کو کشتی میں سوراخ کرنے سے نہیں روکتے تو بالآخر سبھی ڈوب جائیں گے۔"

مولانا ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں مولانا آزاد کا یہ قول اکثر اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے کہ:

"اگر کوئی فرشتہ قطب مینار سے آواز دے کہ ہندو مسلم اگر اتحاد سے ہاتھ اٹھالیں تو انہیں آزادی مل جائے گی، تو میں ہندو مسلم اتحاد کے بجائے آزادی سے ہاتھ اٹھالوں گا کہ غلامی سے صرف ملک کا نقصان ہوگا مگر ہندو مسلم اختلاف سے پوری انسانیت کو نقصان پہونچے گا۔"

مولاناؒ اپنی تقریروں میں کسی بزرگ کا یہ قول دہراتے تھے کہ "اگر کانٹے کے جواب میں سبھی کانٹے بچھانے لگیں تو ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے، اس لئے کانٹوں کے جواب میں پھول

بچانے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہر طرف پھول ہی پھول ہوں"۔

فسادات کے مواقع پر وہ اہل ملک کے سامنے یہ چبھتا ہوا سوال رکھتے تھے کہ کوئی "کاریگر اور صنعت کار اپنی تخلیق کی بربادی کو گوارا نہیں کرتا تو کیا خالق دو جہاں اپنی افضل ترین مخلوق کے خون ناحق اور اس کے قتل سے راضی ہوگا"؟

فسادات میں بے قصور اور معصوم لوگوں کی تباہی و بربادی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کوئی مسافر جو پردیس سے کما کر، کچھ پیسے بچا کر بڑے ارمانوں کے ساتھ اپنے شہر میں آیا تھا کہ برسوں بعد گھر جاؤں گا، بوڑھی ماں کی باچھیں کھل جائیں گی، بیوی خوش ہوگی، بچے پاؤں سے لپٹ جائیں گے، میں بمبئی سے تحفے لے کر آیا ہوں وہ سامنے رکھوں گا، یہ سارے ارمان اس کے دل کے دل ہی میں رہے اور ایک ظالم نے اس کو دوسرے فرقے کا آدمی دیکھ کر اس کا کام تمام کر دیا"۔(۳)

مولانا نے ایک پرانی ہندوستانی کہانی سے کام لیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ہمارا ملک ہندستان ایک وسیع و عظیم ملک ہے، یہاں کم سے کم ایسے تین پودے تھے جن کا باقی رہنا ضروری تھا اور ان کے ختم کر دینے سے اس ملک اور رقبہ کے تناسب سے تین بڑے زہریلے سانپ نکل آئے ایک عدم تشدد (Nonviolence) کا پودا دوسرا لامذہبیت (Secularism) کا پودا، تیسرا جمہوریت (Democracy) کا پودا۔"(۴)

مولاناؒ نے اپنی سوانح کی ساتوں جلدوں میں پیام انسانیت کی تقریروں کی روداد لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع ان کے دل سے لگا ہوا تھا اور اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہتے تھے اسلئے سارے ہندوستانیوں کی طرف سے انہیں بہترین خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کی "پیام انسانیت" کی تحریک کو زندہ اور فعال رکھا جائے جو صرف برصغیر ہی کے لئے ضروری و مفید نہیں بلکہ اس کی افادیت پوری دنیائے انسانیت اور امن عالم کی تحریکات کے لئے بھی ہے۔ مولانا علی میاںؒ نے نفرت و عداوت کے جن طوفانوں اور اندھیروں میں اپنا چراغ انسانیت جلا رکھا تھا اسے دیکھتے ہوئے بہ ترمیم یہ کہا جا سکتا ہے۔

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش، حق نے جس کو دیے تھے انداز خسروانہ

مولاناؒ کا دورۂ ایران

فرقۂ امامیہ کے بارے میں موقف

اور..... مخلصانہ پیغام!

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مولاناؒ سید ابوالحسن علی ندویؒ کا دورۂ ایران ۱۱ر جون ۱۹۷۳ء مطابق ۹ر جمادی الاول ۱۳۹۳ھ سے لے کر ۲۰ر جون ۱۹۷۳ء مطابق ۱۸ر جمادی الاول ۱۳۹۳ھ تک دس (۱۰) دنوں پر مشتمل رہا، ان دس دنوں میں مولانا نے جو قدیم تاریخی آثار دیکھے، جن ممتاز علمی و دینی شخصیات سے ملے، جن تعلیمی اداروں میں گئے، اور ان کی سرگرمیوں اور جد و جہد کو قریب سے دیکھا، استقبالیہ اور خیر مقدمی تقریبات میں فکر و نظر کا تبادلہ ہوا۔ مفکرین و دانشوران قوم سے جو نشست و برخاست رہی اور ایک بصیرت مند داعی اور جہاندیدہ سیاح کے ذوق و نظر سے جو وقت گذارا اس نے ان کی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل کی، مگر بنیادی طور پر مولاناؒ نے اہل ایران کے سامنے جس داعیانہ کردار، مخلصانہ و معلمانہ رنگ، اور برادرانہ و حکیمانہ شان سے اپنے کو پیش کیا پھر ان سے جو توقعات وابستہ کیں وہ تعمیری فکر اور مثبت دعوتی کاز کا نیا میدان مہیا کرتا ہے۔

مولاناؒ باشندگان ایران کی حمیت، ان کے جذبۂ اخوت، اسلامی اتحاد کی خاطر ان کی کوششیں اسلامی آثار قدیمہ کی حفاظت، عربی زبان سے ربط و تعلق، دینی و مذہبی کتب کی اشاعت، قرآن مجید کی عمدہ طباعت، اسلام دشمن طاقتوں اور ان کی سازشوں سے ان کی بڑھی ہوئی زود حسی، قادیانیت و بہائیت سے نفرت..... پھر ان کا حسن اخلاق، ان کی شیریں زبانی، ان کی مہمان نوازی، کو سراہتے ہیں مگر

یہیں پر ان کی اپنی مرکزی دینی شخصیات سے حد سے بڑھی ہوئی عقیدت و محبت بلکہ ان کے افراط و غلو کی طرف نشاندہی بھی کرتے ہیں اور ایک کامیاب حکیم و معالج اور بصیرت مند داعی کی طرح سے بصیرت افروز تنقید فرماتے ہیں:

"ایران کے دورۂ قیام میں ہم نے مسجدوں کی بہ نسبت زیارت گاہوں کو زیادہ معمور، پر رونق اور زائرین سے آباد دیکھا، جس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو ان مزاروں سے غیر معمولی لگاؤ اور قلبی تعلق ہے جب ایک سیاح سیدنا امام علی رضاؑ کے مزار پر حاضر ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی مزار پر نہیں بلکہ حرم میں ہے۔ جو حجاج سے بھرا ہوا ہے، جہاں آہ و بکا کی صدائیں ہر طرف بلند ہیں..... یہی حال تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قم میں سیدہ معصومہ کے مقبرہ کا ہے..... لیکن مقابر و مزارات کے مقابلہ میں ایران مسجدوں کی حالت عبرت ناک ہے۔ ان میں نہ مقابر و مزارات کی طرح سے بھیڑ نظر آتی ہے اور نہ وہ جوش و جذبہ اور قلبی تعلق نظر آتا ہے جو ان مزارات میں دیکھنے میں آتا ہے"۔(۱)

پھر مولانا لطیف مگر دل کو اپیل کرنے والے پیرایۂ بیان میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارا احساس یہ ہے کہ عین ممکن تھا کہ مسجدیں نمازیوں سے زیادہ معمور نظر آتیں اور تسبیح و تلاوت کی آواز سے گونجتیں، اور مقابر و مزارات کے مقابلہ میں یہاں زیادہ آبادی اور زندگی پائی جاتی"۔(۲)

فرقہ اثنا عشریہ کا اپنی مرکزی شخصیتوں (ائمہ اثنا عشریہ) سے حد سے بڑھی ہوئی شیفتگی و شغف اور اور ان کے مقابر و مزارت سے بے جا عقیدت و غلو پر تبصرہ کرتے ہوئے جب مولانا فکر گہرائی میں جاتے ہیں تو انھیں بجا طور پر امامت کا عقیدہ نبوت کے عقیدہ کا حریف نظر آتا ہے، عقل سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضرت ائمہ اہل بیت ہمیشہ سے تاریکی میں مینارۂ نور و ہدایت و رہنمائی کے امام رہے ہیں اس میں کسی صحیح العقیدہ مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہل بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق اور اہل بیت سے حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے"۔

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ ۱۰۲ (۲) ایضاً ۱۰۳۔

ہو سکتا ہے ہمارے اثنا عشری بھائیوں میں یہ رد عمل اہل سنت کے بعض علماء اور پر جوش حضرات کے رویہ اور اہل بیت کے حقوق کے اعتراف میں کوتاہی سے ہوا ہو، لیکن یہ بات رد عمل سے کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے، محبت و عقیدت، جوش و جذبہ اور تقدیس و تعظیم کا جو ہالہ اس روحانی مرکز کے اردگرد بن گیا ہے، اور اس کی مدح و توصیف میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنادے اگر ایسا ہوا تو پوری زندگی کا دھارا ایک ایسے مرکز کی طرف ہو جائیگا جو افضل الانبیاء خاتم النبیین رسول اکرم ﷺ کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھے گا"۔(۱)

پھر اتحاد اسلامی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اثنا عشریہ علماء و مفکرین کی توجہ اس اصل اور بنیادی مسئلہ کی سمت مبذول کراتے ہیں جس نے بجا طور پر ان کے اور اہل سنت کے مابین اونچی دیوار کھڑی کردی ہے، میری مراد صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفاء ثلاثہ پر جرح و تنقید اور سب و شتم کا وہ عقیدہ ہے جو شیعہ حضرات کی دعوت و دینداری کے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہے، مولانا فرماتے ہیں:

"اگر ہم مختلف مسلک کے لوگوں کو قریب کرنے کے لئے خلوص دل سے کوشش کرنا چاہتے ہیں تو یہ کوشش ٹھوس اور فطری بنیادوں پر ہونی چاہئے"(۲)

اور وہ ٹھوس اور فطری بنیاد مولانا کے الفاظ میں:

"اگر اثنا عشریہ حضرات خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے قریب آئیں اور صاف دل سے متحد ہو کر ایک مرکز پر جمع ہوں تو انہیں صحابہ کرام اور امہات المؤمنین کے بارے میں اپنے طرز فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی اس لئے کہ افراد اور جماعتوں کی محبوب شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائیگا اس وقت تک یک جہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی"(۳)

باہمی اتحاد و یگانگت اور اخوت اسلامی کی ٹھوس بنیادیں تلاش کرتے ہوئے مولانا اپنے دعوتی مزاج کو چھپا نہیں پاتے اور حکیمانہ و ناصحانہ انداز میں اپنا مدعا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ متعصب سے متعصب انسان بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے، فرماتے ہیں:

"اس جذباتی پہلو سے قطع نظر اس مسئلہ کی بہت بڑی تبلیغی اہمیت اور علمی قدر و قیمت ہے، لوگ

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص: ۱۰۴ (۲) ایضاً ص: ۱۱۰ (۳) ایضاً ص: ۱۰۷

ہمیشہ دعوت کی صداقت اور کسی مذہب کی خوبیوں کا فیصلہ اس سے کرتے ہیں کہ اس دعوت نے کیسے اخلاقی نمونے اور عملی مثالیں پیش کیں اس دعوت نے اپنے ابتدائی دور میں کس طرح کی نسل تیار کی اور آدم گری و مردم سازی کا کیسا کمال دکھایا، صاحب دعوت کو اپنی دعوت و تربیت میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی"(۱)

حضرت مولاناؒ کی نگاہ میں صحابہ کرام کے محاسن و کمالات کا اعتراف، ان کے کارناموں کی دعوتی و تربیتی اہمیت کا تذکرہ، ان کی وفاداری ان کی باہمی محبت والفت کے تابناک نقوش سے روشنی لینا اور ان سے عقیدت و شیفتگی کا اظہار کرنا دعوت و تبلیغ کی ضرورت بھی ہے اور ایمان واحسان شناسی کا تقاضا بھی، مگر اس سلسلہ میں اثنا عشری بھائیوں کی طرف سے صحابہ کرامؓ جیسی محبوب، محترم بے مثال، اور مرکزی شخصیتوں پر طنز و تشنیع اور بے سروپا الزامات عائد کرنے کا جو موقف اپنایا گیا ہے اسے مولاناؒ کی عقل و منطق اور ان کا دینی مزاج و منہاج کسی طرح قبول نہیں کرتا چنانچہ اسے ایک سوالیہ نشان بنا کر یوں تحریر فرماتے ہیں:

"اس موقع پر لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ جب دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دورِ عروج میں کوئی دیرپا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کر سکی اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے ابتدائی میں اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے تو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان کے اندر ٹھوس تزکیہ کی صلاحیت ہے اور وہ انسانیت کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہنچا سکتی ہے۔"(۲)

مولاناؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں جو عوامل کار فرما رہے اور آپ نے فطرتاً جو مزاج پایا تھا اس میں بحث و مناظرہ قیل و قال اور جدلیاتی مناقشوں کے لئے گنجائش بہت کم تھی، تاہم جب مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" پر مقدمہ لکھنے کے لئے اشہب قلم کو مہمیز دیا تو آپ کا معتدل و متوازن فکر سامنے آیا، پھر یہی مقدمہ ایک مستقل رسالہ "دین اسلام اور مسلمین اولین کی دو متضاد تصویریں، عقائد اہل سنت اور عقائد فرقہ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ" کی تیاری کا سبب بن گیا۔ یہ رسالہ مولانا کی سلامت طبع، ان کی بے نفسی و خدا ترسی ان کا خیر خواہانہ جذبۂ دعوت

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص:۱۰۸ (۲) ایضاً ص:۱۰۹

ان کی زبان و قلم کی طہارت، تحقیق و جستجو اور موضوعیت کا اعلیٰ نمونہ اور شاہکار بن گیا زبان و قلم کی شرافت و طہارت کو کہیں داغدار نہیں ہونے دیا، اثبات حق کے لئے متکلمانہ و مناظرانہ روش نہیں اپنائی بلکہ دلائل و براہین کی گہرائی میں اتر کر قلب و وجدان کے نازک تاروں کو چھیڑا جذبات کو اپیل کرنے والے عناصر کی خوشبو دل میں جاگزیں کر دینا چاہی اور اخلاص کی طاقت سے روح کو تڑپانے کی کوشش کی پھر ایک داعی و مبلغ کی زبان سے دو متضاد تصویریں دکھائیں مگر اپنی رائے کو جبراً کسی پر نہیں لادا بلکہ فیصلہ قاری کی عقل سلیم پر چھوڑ دیا فرماتے ہیں:

"اب ہر وہ شخص جس کو اللہ نے عقل سلیم انصاف کا مادہ اور انسانی تاریخ سے واقفیت کا موقعہ عطا کیا ہے آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سی تصویر ایک ایسے دین کیلئے موزوں اور قابل قبول ہو سکتی ہے جو ساری دنیا کے لئے رحمت و ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے"(۱)

فرقہ اثنا عشریہ کے دل و دماغ اور فکر و عقیدہ میں صحابہ کرامؓ اور تلامذہ رسولؐ کے سلسلہ میں صدیوں سے جو گرہیں پڑی ہیں، ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہیں مولانا نے عقل سلیم کے بند دروازوں کو کھولنے کے لئے جو طریقہ اپنایا ہے وہ مؤثر بھی ہے ایمان افروز بھی اور فکر انگیز بھی آپ نے حضرت علیؓ کی وہ عین شہادت پیش کر دی جو انہوں نے ان گزرے ہوئے رفقائے کار کے متعلق دی جو سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ آپؓ کی یہ تاریخی شہادت صرف چار جلیل القدر صحابہ حضرت سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، مقداد بن الاسودؓ اور عمار بن یاسرؓ ہی کے لئے خاص ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"وہ درخت ہرگز ثمر بار اور شاداب نہیں کہا جا سکتا جو اپنی جوانی اور موسم بہار (عہد نبوت) میں شیریں پھل نہیں دے سکا اور عطر بیز شگوفے نہیں کھلا سکا'(۲)

"اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے اپنے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صراط مستقیم پر اپنے متبعین کو چھوڑا تھا اس میں گنتی کے چار آدمی اس پر قائم رہے تو ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ اس دین و دعوت کے اندر نفوس انسانی کے تزکیہ اور تہذیب و اخلاق کی صلاحیت ہے اور وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہنچا سکتی ہے"(۳)

(۱) مقدمہ ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت ص: ۱۰ (۲) دو متضاد تصویریں ص: ۱۲ (۳) ایضاً ص ۹۰ مقدمہ ایرانی انقلاب ص: ۱۱

مولانا کے زور قلم نے پہلے اسلامی معاشرہ کا حسین و دلآویز نقشہ کھینچا ہے، اس کے مزاج و مذاق پر روشنی ڈالی ہے، آغوش نبوت، درسگاہ محمدی اور قرآنی تربیت یافتہ برگزیدہ انسانوں کا دلکش مرقع دکھایا ہے، ان کی پاکیزگی، ان کی بلند ہمتی، ان کی ایمانی پختگی، ان کا زہد و استغناء، ان کی بے نفسی و خدا ترسی، ان کا پختہ یقین اور ان کا گہرا علم، ان کی شجاعت، ان کی مروت، ان کا شوق شہادت ان کا ذوق عبادت ان کی دنیائے بے رغبتی پھر ان کا حسن اخلاق اور ان کی عدل پروری ان کی طرز حکمرانی غرضیکہ ان کا وہ ظاہری و باطنی سراپا پیش کر دکھایا ہے کہ ہر فرد اپنی جگہ نبوت کا ایک شاہکار اور انسانیت کے لئے باعث عزو افتخار نظر آتا ہے۔

خصوصیت سے خلفائے ثلاثہ کے ساتھ حضرت علیؓ کی زندگی کے طرز عمل ان کی باہمی محبت، اکرام و احترام اور حقوق کی ادائیگی کو اچھی طرح مبرہن کیا ہے، پھر اس حسین و دلکش تصویر کا موازنہ اس قبیح اور مکروہ تصویر سے کیا ہے جسے فرقہ اثنا عشریہ نے پیش کیا ہے لیکن مولانا کی یہ پیش کش و تصویر گری مناظرانہ و معاندانہ نہیں بلکہ علمانہ اور ناصحانہ ہے پھر عقل و وجدان کو اپیل کرنے والا اسلوب اور مقصدیت و موضوعیت (Objectivety) کا رچاؤ ہے مولانا فرماتے ہیں:

"لیکن اس کے برخلاف فرقہ امامیہ عشریہ اس معاشرہ اور اس عہد کی ایک دوسری تصویر پیش کرتا ہے جو ایک طرف سید الانبیاء کی کوششوں کی ایسی ناکامی اور صحبت و تربیت کی ایسی بے اثری کا اظہار کرتی ہے جو شاید دنیا کے معلم و مربی کے حصہ میں بھی نہیں آئی ..... بلکہ انسانوں کی زود فراموشی، طوطا چشمی، بے وفائی، حق پوشی، نفسانیت، حب جاہ اور اپنے اغراض دنیہ کے لئے ہر طرح کی کوششوں، سازشوں تحریفات افتراءات سے کام لینے کو جائز سمجھنے کی مکروہ تصویر پیش کرتی ہے۔

ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ کوششوں کا نتیجہ صرف تین ہستیاں اور بعض روایات کے مطابق چار تھیں، جو آپ کی وفات کے بعد بھی اسلام پر قائم رہیں، باقی سب نے (معاذاللہ) آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا، اور آپ کی صحبت و تربیت کو دنیا کے سامنے ناکام ثابت کیا، فرقہ اثنا عشریہ کی معتبر کتاب جسکو وہ اصح الکتب مانتے ہیں اصح الکتب کے کتاب الروضہ میں امام باقر کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

"لوگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ارتداد اختیار کر لیا اس سے صرف تین آدمی مستثنیٰ ہیں راوی کہتا ہے، میں نے عرض کیا، وہ تین کون ہیں۔ فرمایا: مقداد بن اسودؓ، ابوذر غفاریؓ و سلمان فارسیؓ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان پر ہوں"(۱)

حضرت مولانا علامہ نقی الفمی (جو "تقریب بین المذاہب الاسلامیہ" کے لئے تیس ۳۰ سال سے کام کر رہے تھے) کی مجلس میں خطاب کرتے ہوئے اور اپنے خطاب میں تمثیل کے بحر ناپیدا کنار میں اتر کر حکمت کے موتی لٹاتے ہوئے (جسکی ایک ایک سطر آب زر سے لکھ کر آویزاں کئے جانے کے قابل ہے) فرماتے ہیں:

"ہمارے یہاں اردو کی ایک مثل ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی میں اس میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف دو ہاتھ بھی کافی نہیں، ان میں خلوص، عزم اور سنجیدگی بھی ہونی چاہئے، اگر کسی ہاتھ میں ڈھیلا پن اور سستی ہوگی تو تالی نہیں بج سکتی۔

تقریب بین المذاہب کوئی مشینی عمل نہیں، زبان سے زیادہ اس کا تعلق دل سے ہے اور خارجی مسئلہ سے زیادہ اس کا متعلق اندرونی مسئلہ سے ہے، ابھی کسی ایسے گوند کی ایجاد نہیں ہو سکی جس سے کاغذ کی طرح دل بھی جڑ جائیں اس لئے یہ خواہش اور جدوجہد دل سے اٹھنی چاہئے اور اس میں اتنی روانی اور اُبال ہونا چاہئے کہ دل اس کی قوت اور حرارت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے اس کے لئے آپس میں مفاہمت کرنی ہوگی، کچھ چیزوں سے دست بردار ہونا اور کچھ کسر وانکسار سے کام لینا پڑے گا، لیکن ایک بار جب ہمارے دل اسکو قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گے تو پھر محبت واعتماد کے سیل رواں کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکے گی اس لئے کہ محبت اپنی راہ کی ہر رکاوٹ اور بغض وعداوت کی ہر کدورت کو بہالے جاتی ہے"(۲)

مگر آیت اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب کے لئے جب تقریب بین المذاہب اور اتحاد اسلامی کے وسیع امکانات پیدا ہو گئے تو بدقسمتی سے ان امکانات سے نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ توقعات اور آثار و قرائن کے بالکل برخلاف تاریخ کے وہی نزاعی اوراق الٹے گئے اور ایک طرفہ انداز میں فرقہ امامیہ کے ان ہی عقائد کی پرزور تبلیغ کی گئی جن کی غالیانہ اشاعت پہلے بھی ہوتی رہی، حضرات صحابہ کرام اور بالخصوص خلفائے ثلاثہ کو جرح و تنقید اور سب وشتم کا نشانہ بنایا گیا، مولاناؒ، خمینی صاحب

(۱) فروع کافی کتاب الروضہ جلد سوم ص:۱۱۵ دو متضاد تصویریں ص:۴۷ (۲) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص:۱۱۱

کی تصنیفات جو انقلاب ایران کی کامیابی کے بعد ایک پروپیگنڈہ کے طور پر خوب پھیلائی گئیں کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"لیکن توقعات اور آثار قرائن کے بالکل برخلاف ..... ان کی کتاب "الحکومۃ الاسلامیۃ" میں امامت اور ائمہ کے بارے میں وہی خیالات ظاہر کئے گئے جو ان کو مقام الوصیت تک پہنچاتے ہیں۔ اور رسل اور ملائکہ سے افضل ثابت کرتے ہیں۔ اور یہ کہ کائنات تکوینی طور پر ان کے تابع فرمان اور زیر اقتدار ہے، اسی طرح ان کی فارسی کتاب "کشف الاسرار" میں صحابہ رسول ﷺ بالخصوص خلفائے ثلاثہؓ کے متعلق جرح و تنقید ہی نہیں سب و شتم کے وہ الفاظ آئے ہیں جو کسی بڑی سے بڑی ضال و مضل، فاسق و فاجر زائغ و مزیغ، انتہائی بدکردار اور سازشی جماعت کیلئے آسکتے ہیں"(۱)

عموماً ہمارے دینی حلقوں میں محدود دینداری کے تصور سے ذہنوں کی جو ساخت بنتی ہے اور فکر و نظر میں جو تنگ دامانی پیدا ہوتی ہے اس میں مدمقابل کے لئے مثبت سوچ کا دائرہ اتنا ہی تنگ ہوتا ہے جتنی کشادگی منفی سوچ کے لئے ہوتی ہے، مولانا کی فکر و نظر میں جو آفاقیت تھی، انہیں مناظرانہ ذہنیت سے طبعی طور پر جو نفور تھا پھر ملی درد اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خاطر جس درد و تڑپ میں وہ زندگی بھر بے قرار رہے اس نے مولانا کی فکر میں دعوت و عزیمت کی روح، اتحاد اسلامی کی بے پناہ خواہش، اور انداز نگارش میں خیر خواہانہ و حکیمانہ جذبات کی رو دوڑا دی تھی..... مولانا ایران کی سیر و سیاحت سے شادکام ہوتے ہیں، یوں عرصہ دراز سے پرورش پانے والے ایک آرزو کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہاں کے ذوق لطیف اور وہاں کی حسن طبیعت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ معرفت و آگہی اور فلسفہ و تصوف کی سرزمین کی زیارت کرتے ہیں، مگر اس زندہ دل ایران، اور اسکی سدا بہار فطرت کی رعنائیوں میں کھوتے نہیں بلکہ جہاں کہیں ہوتے ہیں اس حقیقت کے سرے کی تلاش و جستجو میں ہوتے ہیں، جس نے ایران کو علم، تصوف، فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے بام عروج پر پہنچایا تھا، مولانا کی نگاہوں میں چونکہ ایران کا تابناک ماضی گردش کر رہا تھا، حال کے انحطاط و زوال کا مشاہدہ کر رہے تھے، قوموں کے عروج و زوال پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے مستقبل سے متعلق پیشین گوئیاں بھی کر سکتے تھے مگر نہیں وہ تو ایرانی باشندوں کی

(۱) مقدمہ ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت ص: ۱۳

دینی حمیت کو جگانا چاہتے تھے، ان کے حال و ماضی میں ایک مضبوط اور حکمانہ ربط پیدا کر کے ان سے ان کے شاندار ماضی کو دہرانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ خلوص و اپنائیت، اور امید و رجاء سے بھرپور زبان اور مشفقانہ و برادرانہ لب و لہجہ میں فرماتے ہیں:

"ایرانی بھائیوں سے رخصت ہونے سے پہلے ہم ان کے سامنے ایک ایسا سوال رکھنا چاہتے ہیں جو بہت سے دماغوں میں ابھر تا رہا ہے، وہ سوال یہ ہے کہ آخر ایران جیسے زرخیز و مردم خیز ملک میں باکمال انسان پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے..... فلسفہ و تاریخ اور قوموں کے عروج و انقلاب سے اس سوال کا گہرا تعلق ہے، حقیقت تک رسائی اور علمی تحقیق کیلئے اس سوال کا تشفی بخش جواب ضروری ہے، ہم یہ جواب اُسی ایران سے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس نے اپنی علمی اور ادبی صلاحیت و ذہانت سے ایک عرصہ تک پوری دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا، اسکو اس اہم اور نازک سوال کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اور اپنی گزشتہ شاندار تاریخ کو اسے پھر دہرانا چاہئے، یہ بات ایران، عالم اسلام بلکہ انسانی دنیا کے مفاد میں ہے۔"(۱)

☆☆☆

دعوت الی اللہ کی عظمت و فضیلت

کتب تفسیر میں حضرت حسن رضؓ سے یہ روایت درج ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے وہ دنیا میں اللہ اور اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب کا خلیفہ و جانشین ہے۔

(تفسیر قرطبی جلد دوم)

سبحان اللہ! یہ کتنا بڑا اعزاز ہے جو ایک مسلمان کو امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور دعوت الی الخیر سے حاصل ہوتا ہے۔ بہ یک وقت اللہ، رسول اللہ، کتاب اللہ کی خلافت و نیابت، مسلمان جس قدر بھی اس اعزاز و اکرام کو حاصل کرنے کیلئے محنت کریں کم ہے۔

(۱) دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص: ۱۱۵

بزرگ اور معاصر شخصیات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نظر میں

مولانا عبدالعلی فاروقی
دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری۔ لکھنؤ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہشت پہل شخصیت کے جس نمایاں اور اہم وصف کی طرف راقم الحروف کو اشارہ کرنا ہے، اس کے بارے میں اربابِ فکر و دانش اور علم نفسیات کے ماہرین کے اس متفقہ کا فیصلہ کا پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ :۔

"کسی اہم اور قابلِ ذکر آدمی کیلئے سب سے دشوار کام اپنے کسی معاصر کا اعتراف اور اس کے بارے میں منصفانہ رائے دینا ہے"۔

تاریخِ عالم اس بات کی گواہ ہے کہ "حجاب معاصرت" کی کارفرمائی ہر دور اور ہر طبقہ میں اسطرح جاری و ساری رہی ہے کہ شخصیات کے تحفظ کیلئے "معاصرانہ چشمک" کی ایک مستقل پناہ گاہ کو ایک فطری مجبوری سمجھ کر قبول کیا گیا۔

اس پس منظر میں جب ہم حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی اپنے معاصرین کے بارے میں دی ہوئی آراء کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بے ساختہ مولانا کی سلامتِ فکر اور وسعتِ قلب کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ ایک ایسی قد آور شخصیت کا نام تھا جن کے فضل وکمال کے اعتراف میں عرب وعجم سب متفق ہیں وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنھیں ان کے اساتذہ، مشائخ اور بزرگوں کا اعتماد حاصل ہوا اور بات دور "قحط الرجال" کی نہیں، بلکہ اس وقت بھی جبکہ اس ملک میں علم وادب سلوک ومعرفت اور تحریر وخطابت کی کہکشاں سجی ہوئی تھی، مولانا علی میاں کا نام محبت واحترام کے ساتھ لیا جاتا تھا ـــــ عروج واقبال کا یہ ترقی پذیر سفر نصف صدی سے زائد عرصہ تک جاری رہا لیکن توفیقِ الٰہی نے اس پورے عرصہ میں مولانا کو جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہیں دیا اور وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کی "شناخت" کے ہنر سے آشنا رہے "اعزازات واعترافات" کی یلغار نے ان کی آنکھوں کو چکاچوند نہیں کیا، اور وہ "دلِ بینا" کی روشنی میں اپنے سفر کی منزلیں طے کرتے رہے ـــــ اور یہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔

جہاں تک "بزرگ شخصیات" کا معاملہ ہے تو انھیں ہم دو خانوں میں رکھ سکتے ہیں، ایک وہ جو اسلاف میں کی بزرگ شخصیات ہیں اور دوسری مولانا کے معاصرین کی بزرگ شخصیات۔

نفسیاتی اور عملی حقیقت یہ ہے کہ اسلاف کی بزرگ شخصیات کے ساتھ انصاف کرنا، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کے سلسلہ میں "اظہار عقیدت" کرنا بہت آسان بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بھی، اس لئے یہ کام مولانا کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی کیا اور مولانا نے بھی کیا ـــــ اور بہت خوب کیا، مولانا کی اوّلین اردو تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" ہی ہے، جو اپنے بزرگ اسلاف کے سلسلہ میں مولانا کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

پھر "تاریخ دعوت وعزیمت" کے طویل سلسلہ سے اس نقطۂ نظر کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے جس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ کہنے کی حاجت نہیں رہ جاتی کہ مولانا کی نظر میں ان کے بزرگ اسلاف کا کیا مقام تھا؟ ـــــ البتہ اپنی معاصر شخصیات کے سلسلہ میں (جن میں بزرگ، ہم پایہ اور خورد ہر طرح کی شخصیات شامل ہیں) مولانا کا نقطۂ نظر ہمارا موضوع ہے اور ظاہر ہے کہ اس زمرہ میں وہی شخصیات آئیں گی جنھیں مولانا نے پایا، دیکھا اور برتا ـــــ اور پھر ان شخصیات کے سلسلہ میں

مولانا کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کیلئے ان کے برتنے کو اس لئے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ مولانا اپنے ملک کے ایک جلیل القدر عالم، عربی زبان و ادب کے سب سے بڑے ماہر، ایک بہت بڑی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل دینی درسگاہ کے سربراہِ اعلیٰ اور دوسری بہت سی قابلِ افتخار حیثیتوں کے حامل ہونے کیساتھ ساتھ ہی احسان و تصوّف کی اصطلاح میں "شیخِ وقت" بھی تھے۔

اور یہ بات کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں، بلکہ اس سے مولانا کا "امتیاز و تخصص" بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے شیخ اور مرشد کامل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے "سندِ فراغ" پانے اور "اجازت بیعت" ملنے کے بعد طالبینِ اصلاح کو "اپنے حلقۂ ارادت" میں داخل کرتے رہنے کے باوجود، وہ اپنے کو "مرشد" سے زیادہ "مسترشد" ہی سمجھ کر متعدد "معاصر شیوخ" کی خدمت میں "طالبانہ و نیاز مندانہ" طریقہ پر حاضری دیتے رہے، کسی کے ملفوظات جمع کر کے ان کی اشاعت کی، کسی کے مقام و مرتبہ کا احساس دلا کر اپنے قریبی اہلِ تعلق کو داخلِ سلسلہ کرایا اور کسی کے فضائل و مناقب بیان کر کے خلق خدا کو ان سے مستفید ہونے کی دعوت دی ——

مولانا کے ان معاصر "اہلِ دل اور خاصانِ خدا" کے مقامات کا حال تو کوئی پاک باطن اور صاحبِ دل ہی بتا سکتا ہے، راقم الحروف جیسے بے بضاعت اور تہی دامن کی کیا مجال کہ اس سلسلے میں لب کشائی کر سکے، لیکن مولانا کی محبوبیت و مقبولیت کے پیشِ نظر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے ان معاصرین میں سے ہر ایک کو "ہر اعتبار" سے مولانا پر فوقیت حاصل نہیں تھی، اور یہ یقیناً مولانا کی وسعت قلبی، بلکہ بے نفسی ہی کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے اپنے تمام "معاصر شیوخ" کا نہ صرف اعتراف کیا، بلکہ ان میں سے اکثر کو اپنے سے برتر و بہتر باور کرایا، جبکہ اس حقیقت کے اظہار میں کچھ حرج نہیں کہ ان میں سے بعض کے تعارف یا وسعت تعارف کا ذریعہ مولانا ہی بنے ——

ایک شیخ وقت کا اپنے معاصر تمام شیوخ کے سلسلہ میں یہ "برتاؤ" اپنے معاصرین کے سلسلہ میں اسکے عمومی نقطۂ نظر کو سمجھنے کا مؤثر اور طاقتور ذریعہ ہے۔

اس کے علاوہ خاص اسی موضوع پر مولانا کی ایک بہت دلچسپ، پر اثر اور چشم کشا کتاب

"پرانے چراغ" کے نام سے ہے، جس میں مصنف نے اپنے سامنے ہی اس فانی دنیا سے رخصت ہوجانے والے اپنے کچھ معاصرین کو اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں "اپنی نظر" سے دیکھ کر ان کا تذکرہ لکھا ہے، ان معاصرین میں بزرگ، علماء، مشاہیر، گم نام، اساتذہ، مشائخ، سیاسی رہنما، احباب خورد اور اعزہ ہر قسم کی شخصیات شامل ہیں۔

کتاب کا موضوع اور اس کا سبب تصنیف خود مصنف نے یوں بیان کیا ہے:۔

"پرانے چراغ کی تصنیف کا محرک چند محبوب و محترم شخصیتوں کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات، روابط و تعلقات کا اظہار ان کے احساسات و اثرات کا اعتراف اور ان کو تاریخی طور پر محفوظ کر دینے کا جذبہ تھا، اس کو نفسیاتی کمزوری کہیئے یا خوبی کہ اس بارے میں مصنف کچھ زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، اس کو اپنے ماضی، بیتے ہوئے دن، برتے ہوئے اشخاص، بچھڑے ہوئے بزرگوں اور احباب اور گذرے ہوئے واقعات و حالات سے کچھ زیادہ دلچسپی اور لگاؤ ہے، اقبال نے اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ صرف ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ حسبِ حال ہے۔

ے میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو!

(پرانے چراغ حصہ دوم ص۶)

اس کتاب میں جہاں ایک طرف حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا عبدالشکور فاروقی، مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری جیسے علماء و مشائخ اور مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر اور مولانا ماہر القادری جیسے ادیبوں و انشا پردازوں اور مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی اور ڈاکٹر سید محمود جیسے سیاسی و ملی رہنماؤں اور مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مرادآبادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

اور مولانا عبدالسلام قدوائی جیسے احباب کا تذکرہ ہے ——— وہیں دوسری طرف امۃ اللہ تسنیم مولانا محمد الحسنی، مولانا محمد طلحہ حسنی، مولانا ابوالخیر اور مولانا اسحٰق جلیس جیسے عزیزوں اور خوردوں کا بھی تذکرہ ہے، پھر گمنام یا کم نام شخصیتوں میں مولانا شاہ حلیم عطا سلونوی، مولانا حکیم حسن مثنیٰ امروہوی سید صدیق حسن آئی، سی، ایس اور الحاج محمد خلیل نہٹوری کا ذکر بھی ضروری تفصیلات کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے ——— کتاب میں تذکرہ ان کے علاوہ دیگر شخصیات کا بھی ہے، لیکن درج بالا ناموں ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کی نظر میں اپنے معاصرین کا کیا مقام اور ان کی طرف اعتنا کرنے کا انھیں کس قدر اہتمام تھا۔

ظاہر ہے کہ ان معاصرین میں مختلف مرتبوں، مختلف صلاحیتوں، مختلف میدانوں، مختلف رشتوں اور مختلف عمروں کے لوگ تھے، جنھیں مولانا نے "اپنی نظر" سے دیکھا، جانچا اور پرکھا ——— اور جس کو انھوں نے جو پایا اور سمجھا تھا اسے بیان کر دیا ہے ——— لیکن سب کے سلسلہ میں جو ایک مشترک عمل مولانا کا ظاہر ہوا اس کا نام "اعتراف" ہے، اس اعتراف کا ایک انداز تو یہ ہے :-

"میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی، جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور سے نیاز حاصل ہوا میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا، پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے تعلق پیدا ہوا۔ دوسرا موڑ اس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہونچایا، اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا، خدا شناسی، اور خدا رسی، راہ یابی اور راست روی تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس

پیدا ہوا، اور ہم عامیوں کیلئے یہی بڑی دولت و نعمت ہے، بلکہ بعض حقیقت شناسوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے"۔ (پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۳۴)

اسی طرح ایک مولوی ـــــ اور مولانا علی میاں جیسے "گاڑھے مولوی" کے قلم سے اپنے ایک معاصر شاعر ـــــ اور وہ بھی جگر مرادآبادی جیسے "سراپا شاعر" کیلئے یہ "اعتراف" صاحب قلم کے سلسلہ میں کیا ظاہر کرتا ہے؟ ـــــ یہ بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں :۔

"ایک مرتبہ مولانا منظور صاحب کو ایک ہزار کا نوٹ ندوہ کیلئے دیا، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت بڑا دل دیا اور حوصلہ مند طبیعت عطا فرمائی ہے، اور ان کو لینے سے زیادہ دینے میں مسرت حاصل ہوتی ہے، مجھے اس کی آرزو ہی رہی کہ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوتا، لیکن کبھی اس کی نوبت نہیں آئی، ایک مرتبہ ان کی کریم النفسی اور اخلاقی بلندی نے مجھے اور شرمندہ کیا، بلکہ سبق دیا اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اخلاقی حیثیت سے بہت سے ان لوگوں سے بلند ہیں جو دوسروں کو اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی اخلاقی حس بڑی لطیف ہے، قصہ یہ پیش آیا کہ جگر صاحب ۱۹۵۳ء میں گونڈہ سے حج کے لئے روانہ ہوئے ان کی اہلیہ محترمہ بھی ساتھ تھیں، مجھے بھی بمبئی تک ایک دوست کو پہنچانے جانا تھا، لکھنؤ سے میرا ان کا ساتھ ہو گیا، ہم اور وہ سکنڈ کلاس میں تھے، ہمارے وہ عزیز جو میرے شاگرد بھی ہیں کسی کے حج بدل میں جا رہے تھے، اور چونکہ ان کا سفر ان کے مصارف پر ہو رہا تھا، اس لئے وہ تھرڈ کلاس میں تھے، مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا، وہ دو ایک بار کچھ ضرورت معلوم کرنے کیلئے ہمارے درجہ میں آئے، جب وہ چلے گئے تو جگر صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ صاحب آپ کے ساتھ ہیں اور ان کا آپ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں، میں ان کا ٹکٹ سکنڈ میں تبدیل کرا دیتا ہوں، آپ کو راحت ہوگی اور میرا احساس بھی جاتا رہے گا، یہ سن کر مجھے بڑی غیرت آئی کہ یہ تو میرے کرنے کا کام تھا، لیکن جگر صاحب

نے اس کا بالکل موقعہ نہیں دیا، اور بمبئی تک ٹکٹ کا جو فرق تھا انھوں نے اس کو ادا کر دیا"۔ (پرانے چراغ حصہ اوّل ص ۳۷۲-۳۷۱)

عربی زبان و ادب کے اداشناس بلکہ ماہر و شناور اور عربی الاصل ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے والے مولانا علی میاں کا اپنے جواں سال عزیز، بلکہ اپنے "ساختہ و پرداختہ" بھتیجے مولانا محمد الحسنیؒ کے "اعتراف" کا یہ انداز بھی قابلِ توجہ ہے کہ :۔

"ان کا ذہنی ارتقاء تیزی کے ساتھ جاری رہا، عمر و مطالعہ کے ساتھ جو حالات مشرقِ وسطیٰ میں پیش آرہے تھے، ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اور اس سے بڑھ کر ان کے قلم کی طاقت اور جوشِ تحریر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سچی بات ہے وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے، ان میں فطری طور پر (اور کسی حد تک یہ بات موروثی بھی ہے کہ بھائی صاحب مقرر نہ تھے اور ان کی کم سخنی خاندان اور حلقہ میں ضرب المثل ہے) خطابت کا مادہ نہ تھا، خطابت کی یہ طاقت بھی زبان سے قلم ہی کی طرف منتقل ہو گئی، اور ان کی عربی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی اور آمد و روانی ایسی پیدا ہو گئی جو آتش نوا اور شعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اور ان کی تقریروں کا خاصہ ہے۔

(پرانے چراغ حصہ دوم ص ۳۷۸-۳۷۷)

اور یہ بھی کہ :۔

"شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گذرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانبداری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوشِ تحریر و زورِ قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ نوادر کی روانی اس کے جوشِ دروں کا نتیجہ ہوتی ہے"۔

(حوالۂ مذکورہ ص ۳۹۸)

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس غرض سے پیش کی گئیں کہ اپنے معاصرین کے سلسلہ میں مولانا کے عمومی رویہ کا اندازہ کیا جاسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی بڑائی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے خود اپنے کو کبھی "بڑا" نہیں سمجھا، اسی لئے انھیں اپنے معاصرین کی تمام خوبیاں نظر آگئیں، جنھیں انھوں نے چھانٹ چھانٹ کر بیان کر دیا ـــــ اور احتیاط کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کے متعدد معاصر مولانا ہی کی عنایت و توجہ، وسعتِ قلب اور اعزاز و اعتراف کی وجہ سے "بڑوں" میں شمار ہونے لگے۔

شخصیات کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ ہر شخص دوسرے کو "اپنی نظر" سے دیکھتا ہے ـــــ اور معاصرین کے سلسلہ میں مولانا کی "اپنی نظر" یقینی طور پر ان کی سوچی سمجھی نظر تھی، جس سے ان کی عالی ظرفی اور کریم النفسی کا حال بھی عیاں ہوتا ہے۔

"میرا تعلق اس خاندان سے ہے جو شرک و بدعات کے معاملہ میں سر بکف رہا ہے اور جو اس معاملے میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے۔ میرا نسبی اور روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے ہے جنہوں نے اس ملک میں احیاء توحید و سنت کی دعوت کا علم بلند کیا اور اس کے لئے جان کی بازی لگادی۔ مجھے یہ پوری تاریخ ورثہ ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں۔ میری تمام تحریریں میری حقیر وکاوشیں اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت اس کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

حضرت مولانا علی میاںؒ

اور

دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد اسجد قاسمی، ندوی، استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی

"اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید و سنت پر اپنی توجہ مرکوز کی (اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اسکو عزیز ہے) دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر، تیسری خصوصیت تعلق باللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان و احتساب کا جذبہ، چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش، یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے، اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیوبندیت ناقص، فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں۔" (۱)

یہ اس عالمانہ اور دردمندانہ تقریر کے الفاظ ہیں جو ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے تاریخ ساز اجلاس صد سالہ منعقدہ ۱۹۸۰ء میں لاکھوں انسانوں کے مجمع عام میں فرمائی اور جو بجا طور پر یادگار افادیت کی حامل اور مولانا کے علم و بصیرت کا شاہکار تھی۔

حضرت مولانا کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے کس قدر گہرا اور اٹوٹ تھا اسے خود مولانا کی زبان میں پڑھئے، مولانا نے ۱۲ر اگست ۱۹۷۲ء کی شب کو دارالعلوم کی دارالحدیث کے وسیع ہال میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

"میں اس سعادت و توفیق پر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زندگی میں طالبعلمانہ اور نیازمندانہ حاضری اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی میں اس کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی امیدیں رکھتا ہوں، میں اس بات پر جتنا فخر کروں کم ہے، لیکن میری نیازمندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع اور طویل ہے، کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درسگاہِ عالی مقام سے رہا ہے، یہاں کی زمین ان لوگوں کے آنسوؤں سے نم اور یہاں کی فضا ان کی دعاؤں اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی جو قافلہ بنا کر اس سرزمین سے گزرے (اشارہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحی بڈھانویؒ وغیرہم کی طرف ہے)"۔ (۲)

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ کا دارالعلوم دیوبند سے تعلق محض شاگردانہ ہی نہیں بلکہ عقیدتمندانہ تھا، دارالعلوم کے اکابر و اساتذہ سے انھوں نے کسبِ فیض فرمایا تھا، اور ان سے گہری محبت فرماتے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ سے تو گویا انھیں عشق تھا، خود حضرت مدنی کو مولانا سے بڑا لگاؤ تھا اور بڑی شفقت فرماتے تھے، مولانا مدنی سے تعلق کی ابتداء تو اسی وقت سے ہوگئی تھی، جب ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ میں مولانا کا گھر حضرت مدنی کی مستقل قیام گاہ بن گیا اور ہر سفر میں حضرت مدنیؒ نے وہیں قیام فرمانا شروع کر دیا، وہاں کی گفتگو، مجلسیں، حضرت مدنیؒ کی عادات و معمولات، مزاجی خصوصیات، رہن سہن اور تقویٰ نے مولانا علی میاںؒ کو گرویدہ بنالیا پھر جب مولانا نے ۱۹۳۲ء میں حضرت مدنی سے استفادہ کیلئے دیوبند جاکر چار ماہ قیام فرمایا، تو

تقریباً مہینہ بھر حضرت مدنیؒ ہی کے دولت کدہ پر قیام رہا، بعد میں مولانا خود اصرار کرکے دوسرے کمرہ میں منتقل ہوئے، حضرت مدنی نے بڑی مشکل سے اجازت مرحمت فرمائی، پھر بھی صبح کی چائے میں حاضری ضروری قرار دیدی، مولانا، حضرت مدنی کے درس بخاری و ترمذی میں پابندی سے شریک ہوتے رہے اور حضرت مدنی کے علمی استحضار، قوتِ تدریس، شان محدثیت اور مبسوط و مضبوط استدلالی خطاب سے بے حد متأثر رہے۔

مولانا علی میاں کے بقول انھیں تفسیرِ قرآن کے مطالعہ سے بڑا شغف تھا اور قرآن میں ان کا بڑا جی لگتا تھا، یہ خود ان کی پاکیزگیٔ قلب و نظر اور سلامت دل و نگاہ کی روشن دلیل ہے، اس تفسیری مطالعہ میں جو اشکالات درپیش ہوتے اسے حل کرنے کیلئے مولانا نے دیوبند کے دورانِ قیام حضرت مدنی سے خاص وقت مانگا، حضرت مدنی نے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت متعین فرمایا، چنانچہ مولانا کچھ ہفتوں تک استفادہ کیا، اگرچہ حضرت مدنی کی بے پناہ مصروفیات و مشغولیات کی وجہ سے یہ سلسلہ مستقل نہ رہ سکا، پھر بھی جتنا استفادہ ہوا اس سے حضرت مدنی کے تدبر قرآن کا جوہر سامنے آیا۔

مولاناؒ نے متعدد جگہوں پر لکھا اور بار بار مجلسوں میں یہ فرمایا کہ ان کے دیوبند کے قیام کی یہ برکت تھی کہ انگریزوں سے بے انتہا نفرت پیدا ہوگئی، جس میں مرور ایام سے شدت پیدا ہوتی گئی اور اس نفرت میں دیوبند کے ماحول اور حضرت مدنی کی صحبت اور مطالعہ پھر آخر میں بچشم خود یورپ و امریکہ کے اسفار میں مشاہدہ کو خاص دخل تھا۔

مولانا، حضرت مدنی سے اپنے والہانہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" دیوبند کے قیام میں میرے لئے دلبستگی کا واحد ذریعہ مولانا (حضرت مدنی) کی ذاتِ گرامی تھی، میری ذہنی و تعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کی درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہِ التفات ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا

مزہ لیتا رہا"۔(۳)

دارالعلوم سے آنے کے بعد مولانا کا تعلق دن بدن حضرت مدنی سے مستحکم ہوتا گیا، مولانا مدنی بارہا لکھنؤ تشریف لائے، خود مولانا علی میاںؒ نے وقتاً فوقتاً دیوبند حاضری دی، حضرت مدنی کے انتقال سے ایک ہفتہ قبل بھی عیادت کیلئے تشریف لے گئے، مولانا نے انھیں بڑے قریب سے اور سفر وحضر، رضا وغضب، مشغولیت وفراغت اور جلوت وخلوت کے مختلف حالات میں دیکھا اور ان کے اخلاص واخلاق اور ان کی سیرت کی مرکزی صفت اور کمالات کے مرکزی نقطہ عزیمت وحمیت کے ہمیشہ قائل رہے، حمیت وعزیمت کی دو بے مثال خصوصیات مولانا کے نزدیک حضرت مدنی کا امتیاز تھیں، مولانا ہر وقت اس کے گرویدہ رہے اور اس میں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی تردد پیدا نہ ہوا، مولانا نے حضرت مدنی کے سیاسی نظریات وخیالات سے اختلاف کی گنجائش کے امکان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"جو چیز ہر شک وشبہ اور ہر بحث ونزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے وہ انکی بلند سیرت، پاکیزہ شخصیت، بے غرض جدوجہد، بے داغ زندگی اور مکارمِ اخلاق ہیں جنھوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا، جب بھی مولانا کو دیکھا انسانیت وآدمیت، شرافت وسیادت اور اخلاق وکردار کی بڑی بلندی پر پایا، اور اسی چیز نے مولانا کی بلندی کا نقش دل ودماغ پر ایسا قائم کیا کہ جب کبھی ذہن وذوق نے ان کے کسی سیاسی خیال یا کسی علمی تحقیق ورجحان کا پورا پورا ساتھ دینے سے معذرت کی اور دماغ اس کو قبول نہ کر سکا، ان کی انسانی واخلاقی بلندی اور ان کی شخصیت کی دلآویزی آڑے آئی اور دیکھا تو عقیدت ومحبت میں کوئی کمی نہ تھی"۔(۴)

مولانا کے خیال میں حضرت مدنی صف اوّل کے قائدین میں تنہا وہ ایک شخص تھے جنھوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہ کی، حتیٰ کہ انھیں صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے جب پدم بھوشن کا سب سے بڑا اعزازی خطاب دیا گیا تو انھوں نے

صاف معذرت کر دی، مولانا مدنی رحمۃ اللہ کا یہ استغنا اور اخلاص ایک قابل فخر و تقلید واقعہ ہے۔

حضرت مولانا علی میاں نے بھی اپنے محبوب استاذ حضرت مدنیؒ کی پوری تقلید فرمائی اور جب ۱۹۹۲ء کے آغاز میں اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی طرف سے اسی اعزازی خطاب کو قبول کرنے کی گذارش کی گئی تو مولانا نے صاف معذرت کر دی، اس سے قبل چندر شیکھر نے بھی اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں یہ پیشکش کی تھی جس سے مولانا نے معذرت فرمالی تھی (۵)

مولانا نے "مکاتیب شیخ الاسلام" جلد دوم کے مقدمہ میں اور اپنے متعدد مضامین میں حضرت مدنی کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے فرمایا ہے،

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

حضرت مدنی کا ذکر طویل ہو گیا اپنے ناقص مطالعہ کی روشنی میں میں یہ بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا علی میاں کا بذاتہٖ اصلی اور مضبوط ترین تعلق دارالعلوم دیوبند سے حضرت مدنی کے توسط سے شروع ہوا اور روز بروز یہ تعلق بڑھتا اور پھیلتا گیا۔

حضرت مدنی کے علاوہ مولانا شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ سے فقہ میں خصوصی استفادہ کیا اور ملا علی قاریؒ کی مشہور کتاب شرح نقایہ کے درس میں شریک ہوئے اور اس درس سے مولانا کو بڑا فائدہ پہونچا، مولانا کے بقول شیخ الادب اسی وقت سے بڑی شفقت فرماتے تھے جو تا آخر قائم رہی، مولانا کی بلند پایہ تصنیف "مختارات" طبع ہو کر آئی تو شیخ الادبؒ نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حاضرین مجلس سے بڑے بلند الفاظ میں کتاب کا تعارف و تعریف فرمائی اسی طرح جب "القراءۃ الراشدہ" کے حصے شیخ الادب کے پاس پہونچے تو انہوں نے مولانا کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ کے پاس ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں مصنف کی بے حد تعریف و ستائش اور دعائیں بھی تھیں۔

دارالعلوم ہی میں رہتے ہوئے وہاں کے استاذ تجوید و قراءت قاری اصغر علی صاحب مرحوم سے مولانا نے روایتِ حفص کے مطابق تجوید کا درس لیا، زمانۂ قیام دیوبند میں حضرت الامام

علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے تو مولانا ان کی مجلس میں حاضر ہوئے، دو تین بار یہ حاضری ہوئی اور شاہ صاحب کی علمی و تحقیقی مجلس سے مستفید بھی ہوئے اور متأثر بھی۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا کو دارالعلوم کی جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ اجلاس میں مدعو کیا گیا، دعوت نامہ کے ساتھ حضرت مدنی اور حضرت شیخ الادب کا تائیدی و سفارشی خط بھی آیا جو مولانا سے ان حضرات اکابر کے بے پایاں تعلق کو واضح کرتا ہے، مولانا تشریف لے گئے اور نہایت وقیع اور مؤثر مقالہ پیش کیا جو "طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں" کے نام سے مستقل طبع ہوا، پھر دوبارہ ۱۹۷۲ء میں منتظمین دارالعلوم کی خواہش اور فرمائش پر مولانا نے طلبۂ دارالعلوم سے خطاب فرمایا جو "عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" کے نام سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا ۱۹۶۲ء سے تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ممبر رہے اور ان کی بلند پایہ آراء و افکار سے استفادہ کیا جاتا رہا، اس سے قبل مولانا، علامہ سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد اصلاح نصاب کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے تھے، پھر اپنے برادر بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ (جو خود ممبر شوریٰ تھے) کے وصال کے بعد آپ کو شوریٰ کا ممبر نامزد کیا گیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ سے بھی حضرت مولانا کا گہرا تعلق تھا، جس کا اظہار مولانا نے خود متعدد بار فرمایا۔

۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے اجلاس صد سالہ میں عالم عرب کے ممتاز و مقتدر علماء و اعیان کو دعوت دینے اور آمادۂ شرکت کرنے کی ذمہ داری مولانا پر ڈالی گئی اور اجلاس کے سلسلہ میں شوریٰ کی میٹنگ میں یہ طے کیا گیا کہ مولانا سعودیہ عربیہ کے سربراہ شاہ خالد کو خط لکھیں اور یہ استدعا کریں کہ وہ اپنا کوئی نمائندہ اس اجلاس میں بھیجیں، مولانا نے یہ خدمت انجام دی اور اپنے مکتوب میں دارالعلوم کا تعارف، اس کی اصلاحی مساعی، علوم دینیہ و عقائد صحیحہ کی نشر و اشاعت

اور ردّ شرک و بدعات کے سلسلہ میں پرزور اقدامات کا نہایت مؤثر الفاظ میں ذکر کیا اور نمائندہ کے طور پر کسی عالی مرتبہ عالم اور وزیر سلطنت کو بھیجنے کی استدعا کی، شاہ خالد نے مکتوب موصول ہونے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن ترکی (سعودیہ عرب کی مشہور شخصیت) کا انتخاب بطور نمائندہ بھیجنے کیلئے کیا، جنھیں مولانا کے اشارہ پر پہلے اجلاس کا صدر بنایا گیا، مولانا نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ کوئی ایسی واحد، مقتدر اور بین الاقوامی شخصیت سامنے نہیں ہے جس کو اوّل سے آخر تک اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا جائے اور کوئی اس پر اعتراض نہ کرسکے اس لئے مناسب ہے کہ ہر اجلاس کا علاحدہ صدر ہو، یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کے مطابق عمل بھی ہوا۔

اجلاسِ صد سالہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ انسانوں کا ایک جنگل تھا اور میدانِ عرفات کا ایک ہلکا سا نقشہ جو اصلاً دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی خدمت، خلوص اور مقبولیت کا ثمرہ تھا۔ مولانا کو عربی میں تقریر کرنے کیلئے کہا گیا تھا، لیکن عربی سے نابلد لاکھوں افراد کے مجمع میں عربی میں خطاب مولانا کو ایک مصنوعی اور نمائشی عمل نظر آیا، جس کے لئے ان کا ضمیر آمادہ نہ ہوسکا چنانچہ مولانا نے اردو میں خطاب کیا، یہ خطاب جوشِ بیان اور علمیت کے لحاظ سے بے مثال تھا اور اسے اجلاس کا حاصل وخلاصہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اسکا ایک اہم اقتباس اس مقالہ کے آغاز میں گزر چکا ہے، تقریر کے دوران اور اس کے بعد سامعین پر بڑا گہرا اثر نظر آیا، اسلئے کہ یہ ان کے دل کی بات تھی اور اس سے ان کی روح کی تشنگی ختم ہوئی، مولانا نے دیوبند کے مسلک اور وہاں کے فضلا و منتسبین کی ہیئتِ ترکیبی اور مسلک وشعار کی جو ترجمانی فرمائی وہ بے کم وکاست درست اور مبنی برحقیقت تھی، اور مولانا کی تقریر کے معاً بعد مولانا مفتی محمود (سابق وزیر اعلیٰ صوبۂ سرحد پاکستان) نے اپنے مختصر خطاب میں مولانا کی تقریر سے پورا اتفاق ظاہر کیا اور تائید کی۔

مولانا کے اس خطاب کا یہ اقتباس کتنا دلکش، روح پرور اور مؤثر ہے:۔

"حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنیؒ اپنے اپنے خاص طرز اور اسلوب سے اسی کیلئے ہمیشہ سوزاں اور لرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن وسنت کو سینے سے لگائے رکھیں اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید وسنت پر زور دیں، دیوبند کا یہی پیغام ہے اور اس کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے سرمایۂ ملت کو بچانے کی کوشش کی اور اختلافی مسائل کو عوام کے سامنے نہیں لائے، یہ دیوبند وارث ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا اور اگر کوئی نہیں سمجھتا تو اسے سمجھنا چاہیئے، یہ میرا مقام نہیں ہے، لیکن میں کہتا ہوں، اور حضرت مجدد الف ثانی کے وارث ہیں حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مقتدر بزرگوں میں سے کسی کو بھی اس میں کلام نہیں کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ کا گلستان اور ان کا مکتبِ فکر ہے جو دیوبند کی شکل میں اسوقت سامنے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں صحیح العقیدہ درسگاہیں ہیں وہ شاہ ولی اللہ کی شمعِ فروزاں اور اسی کی تجلیات ہیں"۔ (۶)

اجلاس صد سالہ کے بعد جو ہنگامے دارالعلوم میں کھڑے ہوئے، اور دارالعلوم کا وقار اور تقدس جس قدر مجروح ہوا، وہ تاریخ دارالعلوم کا ایک تاریک باب ہے جس کے اظہار وبیان سے الفاظ قاصر ہیں، بعض سلیم الطبع فاضل اصحاب شوریٰ کے ساتھ حضرت مولانا نے اپنے طور پر اختلاف کو رفع کرنے، متحارب گروپوں میں اتحاد پیدا کرنے اور تقسیم وہنگامہ وشر سے حفاظت کیلئے انفراداً واجتماعاً قابلِ قدر کوششیں فرمائیں، ایسی تجاویز بھی رکھیں جو امکانی حد تک دونوں فریقوں کیلئے قابلِ قبول ہوں، اس میں یہ کوشش اور خواہش بھی تھی جو خالص اخلاقی اور بے غرضانہ تھی کہ حضرت قاری صاحبؒ (جو بانی دارالعلوم کے پوتے اور وارث ہونے کے ساتھ اس وقت کے طبقۂ علماء میں بے نظیر وبے بدل وقار وامتیاز کے مالک تھے اور نصف صدی سے زائد مدت تک انھوں نے دارالعلوم کی بے لوث خدمت کی اور اس حقیقت کا اظہار نہ کرنا مداہنت ہے کہ ان

کے دور میں دارالعلوم اپنے بام عروج اور ترقی و شہرت کے مدارج عالیہ کو پہونچا) اس دنیا سے اس حالت میں نہ جائیں کہ ان کو دارالعلوم (جس کی انھوں نے ایک عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی ہے) سے جدائی کا داغ لگا ہو — لیکن افسوس ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور مولانا کے بقول "اس سلسلہ میں اسی گروہ نے تعاون نہیں کیا، جس کو قاری صاحبؒ کا وقار ان کا سکون خاطر اور دارالعلوم سے ان کا ارتباط سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے تھا اور اسکو اپنے ہر مفاد و تأثر پر ترجیح دینی چاہئے تھی بالآخر جس کا خطرہ تھا وہی پیش آیا۔" (۷)

اس سلسلہ کی روایات اتنی متضاد ہیں کہ اب شاید حق و ناحق کا فیصلہ آخرت ہی میں ہوسکے گا، بہرحال جو نوشتۂ تقدیر تھا وہ ہوکر رہا وکان امراللہ قدراً مقدوراً۔ حضرت قاری صاحبؒ کے ساتھ اساتذہ و طلبہ کا جو طبقہ دارالعلوم سے باہر آیا اس نے وقف دارالعلوم کے نام سے الگ ادارہ قائم کر لیا، بحمداللہ دونوں ادارے ہنوز مصروفِ عمل ہیں۔

حضرت مولانا کا دونوں اداروں سے ربط و تعلق تھا، البتہ دیوبند کی حاضری خود مولانا کی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوتی جارہی تھی، اکتوبر ۱۹۸۶ء میں دارالعلوم میں ختم نبوت کے موضوع پر ایک عظیم کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس میں عالم عرب کے بعض علماء شریک ہوئے، حضرت مولانا بھی تشریف لے گئے اور افتتاحی اجلاس میں ختم نبوت اور قادیانیت کے تعلق سے بڑا پرمغز خطاب فرمایا نیز رد قادیانیت و فرقِ باطلہ کے سلسلہ میں دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی گرانقدر خدمات کو سراہا اور واضح کیا۔

اپنے اساتذۂ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دیوبند کے دیگر اکابر سے مولانا کا بڑا گہرا ربط تھا، خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانویؒ (جو بلاشبہ حلقہ دیوبند کے بیحد ممتاز، بلکہ قابلِ صد افتخار عالم و مصلح ہیں) سے مولانا کو بے حد عقیدت تھی، خود حضرت تھانوی مولانا سے بڑی محبت و شفقت اور قدر و نوازش کا معاملہ فرماتے تھے، اس کا اظہار اس مکتوب گرامی سے ہوتا ہے جو مولانا کے نام حضرت تھانویؒ نے تحریر فرمایا اور اس میں مولانا کو "مجمع الکمالات" کے الفاظ سے

مخاطب فرمایا، حضرت تھانویؒ کے بارے میں یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ وہ کتنی محتاط اور معتدل شخصیت کے مالک تھے، پھر بھی انھوں نے مولانا کو جو اس وقت کل ۱۹ سال کے تھے اسطرح کے بلند پایہ الفاظ سے مخاطب فرمایا جو خود حضرت تھانوی کی فراست وبصیرت اور مولانا علی میاںؒ کے کمال وفضل کی دلیل ہے، اس مکتوب پر مولانا نے جو تبصرہ کیا وہ ان کے تواضع کی دلیل ہے "اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ۔ کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید" (۸)

مولانا کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" جب حضرت تھانویؒ کے پاس پہونچی تو حضرت تھانویؒ نے بڑی مسرّت کا اظہار کیا اور بار بار اس کا مطالعہ فرماتے رہے۔

دیگر اکابر دیوبند میں شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ، امام اہلِ سنّت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ اور اپنے بزرگ ومعاصر علماء سے مولانا کے گہرے روابط اور ان کے مولانا سے تعلقات، محبت اور اعتماد کی تفصیلات بڑی طویل ہیں جو اس مختصر مقالہ میں نہیں سما سکتیں۔

بعض کوتاہ قامت اور کینہ پرور افراد مولانا کے بارے میں اس طرح کے تأثرات ظاہر کر رہے ہیں کہ مولانا کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے برائے نام تھا، اور اس میں کسی قلبی عقیدت ومحبت کو نہیں ظاہری مروّت ورواداری اور حالات کے تقاضوں کو بڑا دخل تھا۔

دراصل یہ مولانا کی شخصیت اور وقار کو مجروح کرنے اور ان کی زندگی کے ایک اہم اور روشن باب کو چھپانے کی ناپاک کوشش ہے، مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے اور انکی مجلسوں میں شریک رہنے والے افراد بخوبی واقف ہیں کہ انھیں دارالعلوم سے کتنا جذباتی تعلق تھا، حضرت مدنیؒ کے ذکر میں انھیں کتنی لذّت ملتی تھی اور کتنا لطف آتا تھا اور دارالعلوم کی ترقی کی انھیں کتنی فکر رہا کرتی تھی۔

مولانا نے جب بھی ہندوستان کے مدارس اور دینی وملّی خدمات کا تذکرہ کیا، ہر موقعہ پر

سب سے پہلے دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کا ذکر کیا ہے پھر مظاہر علوم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ذکر کیا یہ ان کے دل کی صدا تھی جو وہ دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کو ہر جگہ نمایاں کرکے پیش فرماتے تھے، وہ حقیقت پسند تھے اور دارالعلوم کو اپنا مادرِ علمی سمجھتے اور ظاہر کرتے تھے، دارالعلوم کا تعارف انھوں نے اپنی کتابوں خصوصاً "القراءۃ الراشدہ حصہ سوم" "الصراع بین الفکرۃ الإسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" "المسلمون فی الہند" "الدعوۃ الإسلامیۃ فی الہند وتطوراتہا" وغیرہ میں بڑے بلند لفظوں میں فرمایا ہے، اجلاس صد سالہ کے موقع پر "مرکز العلم والثقافۃ الإسلامیۃ فی الہند دارالعلوم دیوبند" کے عنوان سے ایک مختصر کتابچہ بھی مولانا کا طبع ہوا اور تقسیم کیا گیا تھا اس کے علاوہ مولانا نے متعدد عربی اور اردو مضامین میں دارالعلوم کا ذکر کیا ہے۔

ہند و پاک کے بعض گمراہ طبقوں نے جب جماعتی مفادات، شخصی مصالح اور ایک خاص مشرب وطریقہ کار کو فائدہ پہونچانے کیلئے مدارس واکابر، دینی تحریکات ومراکز اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کا کام بڑے شد ومد سے شروع کر دیا تو مولانا نے اس کی تردید کیلئے ایک مقالہ "اضواء" کے نام سے عربی میں تحریر فرمایا، جس کا اردو ترجمہ "بصائر" کے نام سے طبع ہوا، اس میں ہندوستان کے مدارس وتحریکات اور اکابر کا ایک مختصر سا خاکہ بڑے بلیغ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، اس میں دیوبند اور اکابر دیوبند کا تذکرہ بڑے اچھے انداز میں آیا ہے نیز ان کی ناقابلِ فراموش دینی وعلمی خدمات کا بھی ذکر آیا ہے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے پیغام اور اس کے افکار کی تبلیغ وترویج میں دارالعلوم کے اس فرزند وعقیدت مند اور حضرت مدنی کے اس شاگرد از جند کا حصہ بھی کسی سے کم نہیں ہے، دارالعلوم کے ابناء اور ان کی طویل ترین اور وسیع ترین زرّیں خدمات اور دارالعلوم کے مشن کو عام کرنے اور اسے مادی ومعنوی ترقیات سے مالا مال کرنے کے تئیں ان کی مساعی اور بے لوث کوششوں کی جب بھی تاریخ مرتب کیجائے گی، حضرت مولانا علی میاںؒ کا نام ان میں سرِ فہرست

ہوگا۔

ہم اس مضمون کا خاتمہ مولانا ہی کے اس جملہ پر کرتے ہیں جو مولانا نے طلبۂ دارالعلوم کو خطاب کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء میں فرمایا تھا اور اس سے بڑھ کر کسی اور جملہ سے اس بے پایاں تعلق کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، مولانا نے فرمایا تھا:۔

"میں آپ سے انھیں الفاظ میں جو کبھی زبان نبوت سے حضرات انصار و اہل مدینہ کیلئے نکلے تھے کہہ سکتا ہوں کہ "المحیا محیاکم والممات مماتکم" جینا بھی تمہارے ساتھ ہے اور مرنا بھی تمہارے ساتھ، خدا میری یہ دعا اور آرزو پوری کرے۔" (۹)

◆◆◆

حواشی

۱۔ زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو ــــ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۲۳ مکتبہ حراء لکھنؤ

۲۔ پاجا سراغ زندگی ــــــــ " ص ۲۶، ۱۲۵ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

۳۔ پرانے چراغ جلد اوّل ــــــــ " ص ۱۰۲ مکتبہ فردوس لکھنؤ

۴۔ ایضاً ــــــــ " ص ۱۱۰-۱۰۹ "

۵۔ کاروانِ زندگی جلد پنجم ــــــــ " ص ۶۶ مکتبہ اسلام لکھنؤ

۶۔ زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو ــــــــ " ص ۲۱ مکتبہ حراء لکھنؤ

۷۔ کاروانِ زندگی جلد دوم ــــــــ " ص ۱۴-۳۱۳ مکتبہ اسلام لکھنؤ

۸۔ پرانے چراغ " اوّل ــــــــ " ص ۲۴-۱۲۳ مکتبہ فردوس لکھنؤ

۹۔ پاجا سراغ زندگی ــــــــ " ص ۱۲۶ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

نوٹ

اس مضمون کی ترتیب میں پرانے چراغ، کاروان زندگی اور مولانا کے دیگر رسائل کو سامنے رکھا گیا ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی ؛ استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی (یوپی)

تحریک ندوۃ العلماء نے جدت وقدامت، رسوخ عقیدہ اور عصری تقاضوں، دین ودنیا اور قدیم صالح وجدید نافع کے درمیان جیسا توازن واعتدال اور خوشگوار امتزاج قائم رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، اس نے اپنے ان اساسی مقاصد کی جس ہوشمندی اور بیدار مغزی، ثبات واستقامت اور حسن وخوبی کے ساتھ خدمت کی وہ عالم اسلام کی تاریخ کا ایک یادگار اور شاندار باب ہے، جسے اسلامی تعلیم وثقافت کی تاریخ میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس نے دینی علوم کے پہلو بہ پہلو عصری علوم سے استفادہ، تصنیف وصحافت، عصری درسگاہوں کی مناسب رفاقت، عالم اسلام وعالم عرب سے اٹوٹ اور پائیدار علمی وثقافتی روابط اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو بے مثال نقوش قائم کئے ہیں، وہ ہمارا سرمایۂ افتخار واعزاز اور عالم اسلام کیلئے قابل تقلید وتائید ہیں، رفع نزاع باہمی اور اتحاد بین المسلمین کے میدان میں یہ تحریک ہمیشہ تیز گام اور سبک رفتار رہی ہے، تحریک ندوہ کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی وثقافتی میدان میں رونما ہوا، وہ یہ کہ اس نے اپنی روشن دماغی، عالی فکری، حالات کی نباضی اور مزاج شناسی کے

جوہر گراں مایہ سے نصاب و نظام تعلیم و درس میں مناسب تبدیلیوں کا سلسلہ مسلسل اور مستقل جاری رکھا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں لگی رہی۔(۱)

یہی وہ عظیم اور بے مثال تحریک ہے جس کے منتسبین، تلامذہ اور قابلِ صد افتخار فرزندوں میں ہمارے ممدوح حضرت مولانا علی میاںؒ کا نام نامی بے حد نمایاں اور آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

ندوۃ العلماء ہی مولانا کی اصل تربیت گاہ و درس گاہ اور سرگرمیوں کا حقیقی مرکز ہے جہاں سے مولانا کا علمی، ادبی اور دعوتی سفر شروع ہوا، اور پھر وہیں ختم بھی ہوا، یہیں سے مولانا کو پرواز کا شعور و سلیقہ ملا اور پھر نصف صدی سے زائد عرصہ تک مولانا نے اپنی علمی و دعوتی تابانیوں سے ہزاروں کو منور کیا اور نہ جانے کتنوں کی علمی تشنگی بجھائی اور انھیں جینے کے سلیقوں اور طریقوں سے روشناس کرایا، ندوۃ العلماء سے مولانا کا تعلق بڑا قدیم رہا ہے، مولانا کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اور برادرِ بزرگ جناب مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے ندوۃ العلماء کی جو خدمات انجام دیں وہ واضح اور عیاں ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ندوہ کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ کے درس حدیث میں باضابطہ شریک ہوئے اور صحیحین کے ساتھ ساتھ سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی بھی پڑھی، پورے دو سال ان کی صحبت میں گزارے اور حدیث میں خصوصی استفادہ کیا، ان کے درسِ بیضاوی میں بھی شریک ہوئے، مشہور فقیہ مولانا شبلی جیراجپوریؒ سے فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں، یہ آپ کی طالبعلمی کا دور ہے، پھر دوسرا دور ۱۹۳۴ء میں شروع ہوتا ہے جب مولانا ندوۃ العلماء میں استاذ منتخب ہوئے اور تفسیر، حدیث ادب عربی کے اسباق کے ساتھ کبھی کبھار تاریخ و منطق کے کچھ اسباق مولانا سے متعلق رہے، یہ ندوہ سے باضابطہ تعلق کا دور ہے۔

اس زمانہ میں مولانا کو اچھے اور ادب و علم کا ذوق رکھنے والے معاصر رفقاء کی معیت اور

مصاحبت ملی، اس کے ساتھ ادبی سرگرمیاں بڑے زور و شور سے جاری رہیں، مولانا نے ندوہ کی اس وقت کی فضا اور ماحول کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے :-

"افسوس ہے کہ اسوقت دارالعلوم میں کوئی دینی و دعوتی فضا موجود نہ تھی، اور اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ خود ہم اساتذہ کا ذوق و ذہن جن کا طلبہ پر اثر تھا، دعوتی نہیں بنا تھا، ہم میں سے جو لوگ دینی ذوق رکھتے بھی تھے اور خوش اوقات اور پابند معمولات تھے ان میں بھی تعدیہ کی صلاحیت اور طلبہ میں دینی و اصلاحی جذبہ پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی، ساری فضا پر علمی و ادبی، تحریری و تقریری ذوق سایہ فگن تھا"۔

مولانا نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ :-

- اس وقت کے طلبہ میں شرافت و ذہانت، سنجیدگی و شائستگی، خودداری، بڑوں کا پاس و لحاظ اور اساتذہ کا ادب، گھٹیا اور مبتذل باتوں سے احتراز، چھوٹے بڑے کا لحاظ جیسی خوبیوں کے ساتھ ہی کسی قدر آزادروی، دینی تساہلی اور اسکول و کالج کے طلبہ کی نقل کا جذبہ تھا، مرور ایام سے یہ ماحول ختم ہوتا گیا اور دینی رنگ چڑھتا گیا"۔ (۲)

تدریس کے اس دور میں ندوہ کے بعض اساتذہ کے ہمراہ مولانا کو علامہ سید سلیمان ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء سے فلسفۂ قدیم سے متعلق استفادہ کا موقع ملا، اور سید صاحب کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہوئے (۳)

مولانا کا مسلسل اور مستقل تدریس کا سلسلہ تو غالباً ایک دہائی سے زیادہ نہ رہ سکا، البتہ آگے چل کر کسی نہ کسی انداز میں یہ تعلق باقی رہا، صحیح بخاری کا درس بھی کچھ دنوں دیا اور پھر ایک طویل عرصہ تک فضیلت کے اخیر سال کے طلبہ کو متعدد موضوعات و کتب کا درس ایک عشرہ سے زائد وقت تک دینے کا معمول تھا، یہ کام عموماً رائے بریلی میں مولانا کی قیام گاہ پر انتہائی پرسکون اور نیک ماحول میں انجام پاتا تھا، طلبہ مولانا کی ضیافت و شفقت کے سائے تلے اپنا وہ مختصر سا وقت گزارتے اور جب واپس آتے تو یہ احساس رہتا کہ تشنگی ابھی بھی نہیں ہے اور ابھی سیرابی نہیں ہو سکی ہے،

ایک عرصہ تک اس مختصر سے قیام کی برکتیں اور لذتیں محسوس ہوتیں اور اس کی یادیں دیر تک دل میں چٹکی لیتی رہتیں۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء کے بیچ میں مولانا نے عربی ادب کا ایک جدید اور اسلامی نصاب تعلیم تیار فرمایا اور اس میں مختارات، قصص النبیین، القراءۃ الراشدہ وغیرہ کتابیں تحریر فرمائیں جو بے حد مقبول اور داخلِ درس ہوئیں۔

۱۹۴۸ء میں مولانا کو ندوہ کی مجلس انتظامی کا رکن متعین کیا گیا، پھر ۱۹۴۹ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحریک وتجویز پر مولانا نائب معتمد تعلیم منتخب ہوئے، اور پھر ۱۹۵۴ء میں سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد مولانا ندوہ کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق کا تیسرا سب سے مضبوط اور اہم دور ۱۹۶۱ء سے شروع ہوتا ہے، جب مولانا کے برادر بزرگ اور مربی ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کی وفات کے بعد مولانا کو ندوۃ العلماء کا ناظم متعین کیا گیا، جس پر مولانا تاحیات قائم رہے، اپنی آنکھوں کی مستقل بیماری کی وجہ سے مولانا نے بارہا یہ سمجھ کر کہ ندوۃ کی خدمت کا حق ان سے مکمل ادا نہیں ہو رہا ہے استعفا دینا چاہا، لیکن یہ استعفا منظور نہ کیا گیا۔

مئی ۱۹۷۰ء میں ندوۃ العلماء میں اسٹرائک کا واقعہ پیش آیا جو مولانا کے دورِ نظامت میں اس نوعیت کا پہلا اور آخری واقعہ تھا، اسٹرائک نے سنگین شکل اختیار کرلی، معاملہ اور آگے بڑھ سکتا تھا، پولیس کی آمد اور رفقاء کی مدد سے مسئلہ قابو میں آگیا، یہ اسٹرائک گرمی کی چھٹی پر اور امتحان کے التواء کے بنیادی مطالبہ پر ہوئی تھی، جبکہ امتحان قریب تھا اور اس کے بعد تعطیل ہونی تھی اور گرمی کی چھٹی بھی یونیورسٹیوں میں اس وقت تک شروع نہ ہوئی تھی، اس لئے یہ مطالبہ سراسر بے بنیاد تھا، مولانا کے بقول اس واقعہ نے ان کے دل و دماغ اور اعصاب کو جھنجھوڑا، مولانا کے رفقاء میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ سابق ناظم دار المصنفین اور مولانا عمران خان ندویؒ سابق مہتمم ندوۃ العلماء نے بڑی اخلاقی مدد کی اور تسکین وتسلی کا سامان کیا، مولانا محمد رابع ندویؒ

حال ناظم ندوۃ العلماء نے بھی بڑی مستعدی و بیدار مغزی سے معاملہ کو سلجھانے میں انتظامیہ کا تعاون کیا[۲]، اس کے بعد پھر کبھی اس نوعیت کا واقعہ پیش نہیں آیا۔

مولانا کا دورِ نظامت ندوۃ العلماء کا عہد زریں اور دورِ عروج و کمال ہے، جس میں ندوہ بین الاقوامی شہرت کا ادارہ بن گیا اور اس کا وقار بڑھتا چلا گیا، عالم عربی سے پہلی بار اتنا گہرا رابطہ پیدا ہوا۔

خود مولانا کی پاکیزگیٔ نفس و قلب اور عفت ضمیر و نگاہ، اندر کے تقویٰ اور خداداد مقبولیت مرکزیت، مرجعیت، گراں مایہ تصانیف اور دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے عرب و عجم کا یکساں تعلق و اکرام اور محبت و مودت سے ندوہ کو جتنے معنوی و روحانی اور مادی فائدے پہونچے ان کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کی جاسکتیں۔

اس حقیقت کے اظہار میں کسی تردید کی گنجائش نہیں کہ مولانا کی سربراہی نے ندوۃ العلماء کو حیاتِ نو اور نشأۃِ ثانیہ بخشی ہے، بانیِ ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے ندوہ کی تاسیس علوم دینیہ و عصریہ کے ایسے جامع افراد تیار کرنے کیلئے فرمائی تھی جو دعوت اسلامی کا کام بڑے وسیع پیمانہ پر کرسکیں، یہ بڑا ہی عظیم مقصد تھا، مگر حالات کی ستم ظریفی کہ ندوہ کا دینی رنگ دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگا اور ادب و لٹریچر اور تاریخ سے شغف روز افزوں ہوتا گیا، اس افسوسناک صورتحال کے ازالہ میں حضرت مولانا علی میاں کی پرخلوص کوششیں بے انتہا نمایاں ہیں، مولانا نے ندوہ کو اس کی تاسیس کی مستحکم اساسوں پر دوبارہ بحال ہی نہیں کیا، بلکہ ندوہ کے ماحول کو دینی اور اصلاحی قالب میں بھی ڈھالا، دین کو اصل و اساس اور ادب و تاریخ کو تابع و وسیلہ کا درجہ دیا، اور علماء کی ایسی ٹیم تیار کی جو دینی اور علمی لحاظ سے بلند پایہ ثابت ہوئی اور مولانا کے افکار و اسلوب کی وارث و امین ثابت ہوئی اور تاہنوز انھیں خطوط و نقوش پر خدمتِ دین میں مصروفِ عمل ہے، اصلاحی اور دینی ماحول کے لحاظ سے اگر ندوہ کے ماضی سے اس کے حال اور مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے اور یہ فرق ہر اس شخص

کو بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے جو ندوہ کے ماضی سے واقف ہے۔

مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے جب ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے اجلاسِ صدسالہ کے موقع پر ہندوستان کی حاضری میں ندوۃ کی زیارت کی تو اپنا تأثر یوں قلمبند فرمایا:۔

"ندوہ کی علمی و دینی فضا دیکھ کر بڑی امیدیں قائم ہوئیں اور حوصلہ بڑھا، ندوہ بقول اکبر مرحوم مسلمانوں کی زبانِ ہوشمند تو ہمیشہ سے تھا، لیکن دلِ دردمند کی جو کسر بیان کی جاتی تھی وہ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب مدظلہم نے پوری فرمادی ہے، خاص طور پر حضرت مولانا علی میاں مدظلہم العالی کی فکر و بصیرت، جہد و عمل اور سوز و گداز کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہم نے اس ادارہ کو حیاتِ نو بخشدی ہے۔"(۵)

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں مولانا کا دور ایک روشن باب ہے، مولانا ہی کی قیادت میں ندوہ کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء نے دھوم مچادی، عرب علماء کے متعدد وفود اور عالمی مرتبت علماء اتنی بڑی تعداد میں شاید ہندوستان میں پہلی بار جمع ہوئے جس کا شرف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوا، اس کا سہرا اصلاً حضرت مولانا ہی کے سر بندھتا ہے، اس کے علاوہ خود ہندوستان کے مختلف الخیال و الفکر علماء اور دانشوروں کے جس عظیم مجمع نے اس جشن میں شرکت کی اس سے اس اجلاس کی اہمیت اور دوررس اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اجلاس کا نقشہ مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنے ادیبانہ و ساحرانہ اسلوب میں یوں کھینچا ہے:۔

"اس تحتی برّاعظم کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب علم و فضل اور جمال و کمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی، تنہا جامعاتِ اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے اور دلفریب منظر پیش کررہے تھے وہ تاریخ کی ایک ایسی امانت ہے جس کو کوئی مؤرخ اور وقائع نگار نظر انداز نہیں کرسکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ ڈائس نہیں، عالم اسلام کا حسین و جمیل

گلدستہ ہے، جس میں اس کے وسیع قلمرو سے ہر رنگ کے پھول اکٹھا کر کے بہت خوبصورتی اور خوش ذوقی کے ساتھ سجادیئے گئے ہیں"۔ (۶)

عرب وفود کی اتنے بڑے پیمانہ پر شرکت کی وجہ سے یہ فضا بھی بعض افراد کی طرف سے بنائی جارہی تھی کہ اس سے ندوہ کے مالی استحکام کا فائدہ اٹھایا جائے گا، جس کیلئے اس سے بہتر موقع ہاتھ آنا مشکل ہے، لیکن ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے پہلے ہی یہ طے کرلیا تھا کہ اس میں کہیں چندہ کا نام نہ آئے گا، اور مادی فائدہ اٹھانے کے خیال کو قریب نہیں آنے دیا جائے گا، چنانچہ اس خیال کی تردید کیلئے مولانا نے ایک مؤثر تقریر کی جس میں صاف صاف کہا کہ:۔

"کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں ؛ غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن ؛ کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

یہ سونے کی سب چڑیاں اڑجائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے مدرسے آپ ہی کے چار چار، آٹھ آٹھ آنے پر چل رہے ہیں، آپ کے چار آنے اور آٹھ آنے ہم کو زیادہ عزیز ہیں، اسلئے کہ آپ ایثار کر کے دیتے ہیں، آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو اسلئے بلایا ہے کہ ہم اپنا دامن بھرلیں"۔ (۷)

مولانا کی یہ روش تا زندگی باقی رہی، متعدد بار بہت سے عرب امراء اور حکام نے ندوہ کے سالانہ مصارف تنہا برداشت کرنے کی اجازت چاہی جن میں حاکم شارجہ سلطان محمد القاسمی سرفہرست ہیں، مگر مولانا کو ان کی یہ خواہش کبھی قبول اور منظور نہ ہوسکی۔

ندوہ کے جشن تعلیمی کی اتنی زبردست کامیابی میں سب سے اہم اور مرکزی رول حضرت مولاناؒ ہی کا ہے، صدر اجلاس شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ اور دیگر علماء و اعیان عرب نے مولانا اور ندوہ کے سلسلہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا وہ بے کم و کاست درست ہیں اور ان سے مولانا کی محبوبیت اخلاص اور جوش عمل کے ساتھ ساتھ فکرِ ندوۃ العلماء کے اعتدال، ہمہ گیری، جامعیت اور مقبولیت

کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جشن کے موقع پر حضرت مولانا کے سلسلہ میں استاذ گرامی قدر حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی ایڈیٹر "البعث الاسلامی" و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے عربی کے ایک مضمون میں جن تأثرات کا اظہار کیا تھا وہ بلاشبہ مطابق واقعہ تھے، ہم اس کے چند اجزاء یہاں نقل کرتے ہیں:(۸)

"اس جشن تعلیمی میں سب سے بنیادی اور حقیقی چیز جو کارفرما ہے وہ ہمارے استاذ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پہلو میں حرکت کرتا ہوا دردمند دل ہے، اگر ان کی عبقریت امتیازی شخصیت، وسیع و عمیق مطالعہ، عقلِ سلیم، فہم راسخ، عالی اسلامی افکار، اور اس سے آگے بڑھ کر ان کا طاقتور اور مثالی ایمان، اسلام اور مسلمانوں کے مسائل و مشاکل کے حل سے دلچسپی، اخلاص، بے پایاں محبتِ خداوندی، رسولؐ سے عشق و شیفتگی اور فنائیت جیسے بلند و بیش قیمت اوصاف نہ ہوتے تو اس جشن کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت نہ ہوتی اور نہ ہی تعلیم و تربیت کی تاریخ میں اس کا کوئی دوررس اثر اس ملک میں خصوصاً اور عالمِ اسلامی میں عموماً سامنے آسکتا تھا۔

اتنی عظیم، مخلص، بلند مرتبت اور کامل شخصیت کا وجود صرف ندوۃ العلماء اور ہندوستان ہی کی خوش بختی اور سعادت نہیں ہے، بلکہ حضرت مولانا کا وجود علم و تہذیب اور تعلیم و تربیت کی پوری تاریخ کیلئے باعث سعادت ہے اور علماء و داعیان کی تاریخ میں ایک روشن اور زرّیں باب کا اضافہ ہے، موجودہ دنیا کو ایسے اصحاب فضل و کمال کی آج سخت ضرورت ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اس کے بعد نومبر ۱۹۹۷ء میں ندوۃ العلماء کے احاطہ ہی میں مولانا کی سربراہی میں قادیانیت کے خلاف ایک عالمی کانفرس منعقد ہوئی، اس میں بھی عالمِ عرب کے علماء و داعیان کا ایک بڑا طبقہ شریک ہوا، مختلف ممالک کے وفود آئے، اس کانفرس میں بھی مرکزی کردار حضرت مولانا ہی کا تھا، اس

موقع پر امام حرم مکی شیخ محمد بن عبداللہ سبیل نے اپنے خطاب میں مولانا کے کارناموں کا ذکر فرمایا اور ندوۃ العلماء کی علمی و دینی طویل و وسیع خدمات کو سراہا، جن سے مولانا کے فضل و کمال اور ندوہ کی عالمی مقبولیت کا ہلکا سا خاکہ سامنے آتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں جب حکومتِ ہند کے اشارے پر دہلی کے انٹلی جنس بیورو، مقامی پولیس اور پی، اے، سی نے رات کے سناٹے میں ندوہ پر چھاپہ مارا اور بے گناہ طلبہ کو گرفتار کیا، فائرنگ کی، تو اسکے ردِ عمل میں ملک اور بیرون ملک ایک کہرام مچ گیا، اور ہر طرف سے صدائے مذمت و احتجاج بلند ہوئی اور اس طرح کی باتیں کہی جانے لگیں، کہ اگر مولانا علی میاں کے ندوہ کو آئی، ایس، آئی کا اڈہ قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر اب ہندوستان کا کوئی مدرسہ اور مسلم ادارہ محفوظ نہیں، بہر حال حکومت کو بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ دراصل ہند و پاک اور عالم عربی کے افراد کے مولانا سے قلبی تعلق اور لگاؤ نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء سے گہرے ربط کی واضح دلیل تھی۔

دنیا کے کونہ کونہ تک ندوہ کا تعارف، ایک کثیر اور بھاری تعداد کی ہر سال فراغت، دینی و دعوتی ماحول، کامیاب تعمیری ترقیات، مختلف شعبوں کا قیام اور ان کو فعال بنانے کی پوری کوشش، غیر ملکی طلبہ کی کثرت اور ان کیلئے الگ کورس کا نظام، اخلاص اور علمی مہارت و اختصاص پیدا کرنیکی کوشش مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی تاسیس، متعدد موضوعات پر کانفرنسوں اور سمیناروں کا انعقاد مکتبہ میں کتابوں اور مراجع کا بے انتہا اضافہ، طلبہ و اساتذہ کیلئے تمام تر سہولیات (جو اس ناچیز کے علم میں ہندوستان کے کسی اور دینی ادارہ میں بڑی مشکل سے مل سکتی ہیں) مولانا کے دور نظامت کی کچھ خاص جھلکیاں ہیں۔

حضرت مولانا تحریک ندوہ کے سب سے بڑے ترجمان ثابت ہوئے، عرب و عجم جہاں جہاں گئے اپنا یہی پیام پہونچایا جو بڑا مؤثر ثابت ہوا۔

اس کیلئے مولانا نے مستقل رسالے تحریر فرمائے، مضامین و مقالات لکھے اور پوری وضاحت سے ندوہ کا تعارف کرایا اور اس کے مقاصد واضح کئے۔

اس ناچیز کو خود ندوہ میں دو سال کا عرصہ گذارنے اور مولانا سے تلمذ کا شرف نصیب ہوا ہے اس عرصہ میں مولانا کو بسا اوقات بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ ندوہ کا پیغام و فکر مولانا کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، ان کے دل میں ندوہ کا عشق بسا ہوا ہے اور ان کا ہر عمل اور ہر ادا اسی جامعیت و اعتدال اور توازن کے جوہر سے مالا مال ہے جو اصلاً ندوہ کی تاسیس کے مقاصد ہیں، اور جنھیں عام کرنے اور پھیلانے میں مولانا نے اپنی پوری زندگی لگا دی اور ساری توانائیاں صرف کر دیں، اور خون جگر سے اس گلستان کی آبیاری کرتے رہے۔

علم و عمل، دین و دنیا، صلاح و تقویٰ، عصری تقاضوں، قدیم و جدید کی پوری جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا کے خطوط اور نقوش کے مطابق ویسے ہی افراد و رجال تیار کرنے کی ضرورت موجودہ دور میں شدت سے بڑھتی جا رہی ہے، مولانا کے تلامذہ اور معتمدین یہ خدمت ندوۃ العلماء اور اس کے ملحق اداروں کے ذریعہ پوری قوت و جوش اور عزم و اخلاص کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ یہ فکر عام کیجائے اور جہاں اس نہج پر کام شروع نہیں ہوا ہے بلا تاخیر شروع کیا جائے اور اس میں کسی مصلحت و انتظار کو روا نہ رکھا جائے۔

ے اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

ooo

حواشی:-

۱۔ تاریخ ندوۃ جلد دوم مرتبہ:- مولانا شمس تبریز خاں (دیباچہ سے مختصراً ماخوذ ہے)
۲۔ کاروانِ زندگی اول ص۱۵۲ و ص۱۵۵ سے مختصراً ماخوذ ہے
۳۔ پرانے چراغ اول ص۲۵ سے ماخوذ
۴۔ کاروان زندگی دوم ص۵۱ و ص۵۲
۵۔ جہانِ دیدہ ص۵۳۴
۶۔ رودادِ چمن ص۷۹ و ص۸۰
۶۔ کاروان زندگی ص۱۹۲ و ص۱۹۳ جلد دوم
۷۔ ماخوذ از علماء و مفکرون عرفتہم جلد اول ص۱۲۲

(اس مضمون کی ترتیب میں کاروانِ زندگی کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے)

حضرت مولانا علی میاںؒ
اور
دارالعلوم الاسلامیہ

مولانا ظہیر انوار قاسمی ✽ ناظم دارالعلوم الاسلامیہ بستی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اصلاً ایک فاضل استاذ اور مثالی معلم تھے ان کی ابتدائی زندگی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اونچے درجات میں درس و تدریس میں گزری اور بعد میں کبھی حجۃ اللہ البالغہ کبھی قرآن مجید اور کبھی اپنی کسی کتاب کا درس دیا کرتے تھے، جب ان کی قیادت میں "رابطۂ ادب اسلامی" کا قیام ہوا تو انھوں نے قرآن مجید کے دعوتی اور ادبی پہلوؤں پر ندوۃ العلماء کے مخصوص طلبہ و اساتذہ کے سامنے توسیعی خطبات پیش کئے جو کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

درس و تدریس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں انتظامی صلاحیت بھی عطا کی تھی جس کے سبب وہ چالیس سال تک ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ رہے اور دارالعلوم کو علمی و معنوی وسعت کے ساتھ اسے ظاہری و تعمیری توسیع سے بھی ہمکنار کردیا، چنانچہ کئی نئے ہاسٹل تعمیر ہوئے، نیا مہمان خانہ بنایا گیا، مسجد کی توسیع کی گئی، مختلف درسگاہیں اور دفاتر قائم ہوئے، اور ایک عظیم الشان کتب خانے کا قیام عمل میں آیا۔

حضرت مولانا نے تحریک ندوۃ العلماء کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں ایک اور مفید قدم اٹھایا اور ملک کے مختلف شہروں میں دارالعلوم کی شاخیں قائم کی گئیں اور دیگر مدارس کا ندوۃ العلماء سے الحاق

کیا گیا، اور ان میں ندوۃ العلماء کا مرتبہ نصاب تعلیم رائج کیا گیا، اسی کے ساتھ دیوبند اور درس نظامی سے مربوط مدارس سے بھی روابط قائم کئے گئے اور وہاں نئے نصاب کی کچھ کتابیں داخل کی گئیں۔

اکابر دیوبند نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ اور بقاء کیلئے توسیع مدارس و مکاتب کی جو اہمیت محسوس کی تھی اسمیں حضرت مولانا بھی ان کے ہم خیال تھے اسی لئے وہ بڑی کشادہ دلی کے ساتھ نئے مدارس و مساجد کے قیام میں تعاون اور اس کے بانیوں کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور اسے تعاون علی البر والتقویٰ کی تعمیل سمجھتے تھے۔

چنانچہ جب وہ مدرسہ امدادیہ مراد آباد تشریف لائے اور اس کے مہتمم حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہٗ کی علمی و تعلیمی و انتظامی سرگرمیوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوئے تو انھیں دینی تعلیمی کونسل کا رکن بنایا اور مشرقی اضلاع میں مزید مدارس و مکاتب کے قیام کی افادیت بتائی جس کا خیال خود حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب کو بھی تھا، اس ہم خیالی اور ہم مذاقی کے نتیجے میں جب ۱۹۸۰ء میں بستی شہر میں دارالعلوم الاسلامیہ کے نام سے دینی تعلیم کے ایک عظیم ادارے کا قیام عمل میں آیا تو اسے شروع ہی سے حضرت مولانا کا تعاون اور انکی سرپرستی حاصل ہوگئی اور وہ اس کی تعمیر و ترقی کے ہر مرحلے پر نہ صرف اس کیلئے دعاگو رہے، بلکہ عملی تعاون فرمایا فجزاہُ اللہُ تعالیٰ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ وَاَکْرَمَ مَثْوَاہُ۔

حضرت مولانا کو دارالعلوم کے صدر و بانی حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہٗ کی طرف سے دارالعلوم الاسلامیہ کی کسی تقریب میں مدعو کیا گیا تو آپ نے اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور ممکن ہوا تو اس میں شرکت فرمائی اور معائنے میں حوصلہ افزاء کلمات لکھے اور ان مشکل مراحل میں دستگیری کی جب پہلے برادرانِ وطن کی طرف سے دارالعلوم کے خلاف محاذ آرائی کی گئی اور اس کی رقمیں منجمد کرادی گئیں اور دوسری بار جب بریلوی برادرانِ ملت نے دارالعلوم الاسلامیہ کی طرف سے تعمیر کردہ مسجد پر ناجائز قبضہ کیلئے فتنہ و فساد برپا کیا اور مقدمہ بازی کی۔

ان مسائل و مراحل میں حضرت مولانا بہت فکر مند رہے اور کارکنانِ دارالعلوم کی ہمت بندھاتے رہے، ۱۹۸۰ء میں جب دارالعلوم الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو حضرت مولانا نے حضرت مولانا محمد باقر حسین

صاحب مدظلہ کے نام اپنے مکتوب گرامی میں اس طرح اظہار مسرت فرمایا :۔

"آپ کے خط سے پہلے اس مدرسہ کے قیام کی اطلاع مل چکی تھی اور بڑی مسرت ہوئی تھی، اس کی ترقی و کامیابی کیلئے دعاگو ہوں، جہاں تک اس کی سرپرستی کا تعلق ہے مجھے اس سے مسرت ہوئی، مگر میری صحت اور مختلف مصالح کا تقاضا ہے کہ میں کسی مدرسہ کی سرپرستی قبول نہ کروں ..... امید ہے کہ آپ اس کا کچھ خیال نہ کریں گے، ویسے اس مدرسہ کے کام اور اس کی ترقی سے مجھے حد درجہ مسرت ہوگی، آپ برابر مطلع کرتے رہیں اللہ تعالیٰ اس کو ترقیات سے نوازے اور ایسے مخلص و بے لوث خادم عطا فرمائے جو اس کی خدمت کو عبادت سمجھ کر انجام دیں کہ اس سے کام میں برکت ہوتی ہے"۔

(مکتوب ۱۶ رمئی ۱۹۸۰ء)

۲۷ رفروری ۱۹۸۳ء کو بستی میں دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں شرکت کیلئے حضرت مولانا تشریف لائے اور دارالعلوم الاسلامیہ کے ایک پروگرام میں (جس میں طلبہ و اساتذہ اور معززین شہر بڑی تعداد میں شریک تھے) بہت اہم تقریر فرمائی جو "خدمت دین و علم کے دائمی و ابدی امکانات" کے عنوان سے شائع کی گئی، پھر شب میں خیر انٹر کالج میں بھی خطاب فرمایا جس کا عنوان تھا "دین و ایمان کو جسم و جان پر ترجیح دینا ایمانی تقاضا ہے" ان دونوں تقریروں کو مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم الاسلامیہ نے مرتب کرکے "دین و علم کی خدمت اور ایمانی تقاضے کی اہمیت" کے عنوان سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

پھر ۲ ررجب ۱۴۱۴ھ / ۱۶ ردسمبر ۱۹۹۳ء کو دینی تعلیمی کونسل کا اجلاس دارالعلوم الاسلامیہ میں منعقد ہوا اور حضرت مولانا نے اس میں شرکت فرمائی، اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تجویز کے مطابق "علاقائی اصلاح معاشرہ کانفرنس" ۳۱ رمارچ ۱۹۹۵ء کو دارالعلوم الاسلامیہ میں منعقد ہوئی اور حضرت مولانا نے ندوۃ العلماء کے متعدد اساتذہ کے ایک وفد کے ساتھ اس میں شرکت کی اور خطاب فرمایا، حضرت مولانا نے اس کا ذکر "کاروانِ زندگی (۶/۶۳) میں کیا ہے :۔

تحریک پیام انسانیت کے مختلف دوروں اور پروگراموں میں بھی حضرت مولانا نے حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب کو اپنے ساتھ رکھا، چنانچہ وہ مرادآباد، رام پور، مظفر نگر، پھلت، میرٹھ علی گڑھ کے دوروں میں ان کے ساتھ رہے، ۲۷ر فروری ۱۹۸۳ء کے معائنے میں حضرت مولانا نے دارالعلوم الاسلامیہ کے بارے میں یہ اظہار خیال کیا، جو ان کی دلی مسرت اور اطمینان اور ادارے سے بڑی توقعات کا آئینہ دار ہے، حضرت مولانا نے لکھا تھا :-

"یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ صرف تین سال کی مختصر مدت میں اس ادارے نے غیر معمولی ترقی کی ہے، اساتذہ وطلبہ کی خاصی تعداد مصروف عمل نظر آئی ..... چند گھنٹوں کی حاضری سے محسوس ہوا کہ یہاں کے منتظمین واساتذہ محنت، اخلاص اور یکجہتی سے اس ادارہ کی تعمیر و ترقی میں منہمک ہیں ..... اس علاقہ میں ایک مرکزی اسلامی درسگاہ کی ضرورت تھی، ہماری دعا ہے کہ یہ ضرورت اس ادارہ سے پوری ہو اور یہاں سے اسلام کے داعی اور مجاہد پیدا ہوں۔

اہلِ خیر سے امید ہے کہ اس دینی درسگاہ کی ہر طرح سے اعانت اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے" (۳ر رجب ۱۴۰۳ھ)

حضرت مولانا کو دارالعلوم الاسلامیہ اور اس کے انتظام کاروں خصوصاً حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہٗ سے جو تعلق خاطر تھا اور دارالعلوم الاسلامیہ سے ان کو جو بڑی توقعات تھیں انکا مظہر انکا آخری معائنہ ہے جسمیں انھوں نے بڑی صراحت وتفصیل سے اپنے گرانقدر خیالات وتاثرات کا اظہار فرمایا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے :-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد :-

دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے راقم سطور عرصہ سے واقف ہے اور اس کے ذمہ داران بالخصوص مولانا محمد باقر حسین صاحب سے پرانے روابط ہیں اور جو مرادآباد میں بھی اور بستی

اور لکھنؤ میں بھی شرف ملاقات بخشتے رہے، لیکن اس مرتبہ (۲ رجب ۱۴۱۴ھ) ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء کو دینی تعلیمی کونسل (انجمن تعلیماتِ دین بستی) کے اجلاس میں حاضر ہونے کے موقعہ پر دارالعلوم الاسلامیہ کو جس ترقی، وسعت نظم وانتظام کی بلند سطح پر دیکھا اور اس کی ترقی و توسیع کے جو مظاہر اور نمونے دیکھے ان کا تصور ہی نہ تھا، دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلا کہ یہ تو ایک جامعہ (یونیورسٹی) معلوم ہوتا ہے، ایک عظیم جلسہ کے انتظام اور مہمانوں کو راحت وسہولت پہونچانے کے جو نمونے اور تجربے سامنے آئے ان سے ذمہ دارانِ مدرسہ اور بالخصوص مولانا باقر صاحب اور ان کے متعلقین و معاونین کی کارکردگی اور صلاحیت و محنت کا اندازہ ہوا، دارالعلوم اپنے ذمہ داروں کی بیدار مغزی، معاونین کے اخلاص اور اپنے مقام (ضلع بستی) کے اہلِ دین اور اہل اثر کے تعاون کی بناء پر ایک اور بلند و ممتاز مستقبل کی خبر دیتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادارہ نہ صرف بستی، نہ صرف اتر پردیش بلکہ ہندوستان کے ممتاز مدارس اور مقامات تعلیم وتربیت میں ممتاز مقام حاصل کرلے گا اللہ تعالیٰ اس کے اسباب مہیا فرمائے اور کارکنانِ مدرسہ اور ان کے معاونین کو زیادہ سے زیادہ اس میں تعاون کی توفیق عطا فرمائے، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

۲ رجب ۱۴۱۴ھ — ابوالحسن علی ندوی

۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء — (ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مدرسہ امدادیہ مرادآباد سے بھی حضرت مولانا کو بڑا تعلق تھا چنانچہ اس کے مہتمم حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہ کی دعوت پر بار بار مرادآباد تشریف لے گئے اور مدرسہ امدادیہ کے زیر اہتمام شہر کے مختلف مقامات پر منعقد ہونیوالے بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا اور پیام انسانیت کے جلسوں سے بھی مدرسہ امدادیہ اور ٹاؤن ہال مرادآباد میں خطاب کیا، جن میں خاص طور پر آپکے رفیق اور پیام انسانیت کے مؤثر اور طاقتور ترجمان مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم ہمراہ تھے۔ یہ حضرت مولانا کی عالی ظرفی تھی کہ ان اسفار میں کرایہ تک قبول نہیں فرمایا اپنی جیبِ خاص سے اپنے

اور اپنے رفقائے سفر کے مصارف ادا کئے۔

دارالعلوم الاسلامیہ (بستی) اور اس کے کارکنوں سے حضرت مولاناؒ کے دیرینہ تعلقات اور انکے متعلق ان کے قیمتی خیالات واحساسات عنداللہ وعندالناس ایک بڑی قوی شہادت کا درجہ رکھتے ہیں، جن سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت مولانا کے ان احساسات کے مطابق ان کی توقعات پر پورا اترنے کی توفیق عطا کرے۔ اسی کے ساتھ ہمیں امید ہے کہ حضرت مولانا کے جانشین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ دار حضرات دارالعلوم الاسلامیہ کو حضرت مولانا کی شفقت ومحبت کا ایک مظہر سمجھ کر اس پر اپنی نظر عنایت اور دیرینہ تعلقات قائم رکھیں گے۔

مرکزی اسلامی درسگاہ

چند گھنٹوں کی حاضری سے محسوس ہوا کہ یہاں کے منتظمین واساتذہ محنت واخلاص اور یکسوئی سے اس ادارہ کی تعمیر وترقی میں منہمک ہیں اس علاقہ میں جو حضرت مولانا سید جعفر علی صاحبؒ خلیفہ اجلؒ، مجاہد کبیر، شہید اسلام حضرت سید احمد شہیدؒ کی تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں کی جولان گاہ تھا ایک مرکزی اسلامی درسگاہ کی ضرورت تھی، ہماری دعا ہے کہ یہ ضرورت اس ادارہ سے پوری ہو اور یہاں سے اسلام کے داعی اور مجاہد پیدا ہوں۔

اہل خیر سے امید ہے کہ اس دینی درسگاہ کی ہر طرح سے اعانت اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

(حضرت مولانا) سید ابوالحسن علی ندوی (دامت برکاتہم)
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲ رجب ۱۴۰۳ھ

حضرت مولانا اور مسلم مجلس مشاورت

از: مولانا فیروز اختر ندوی
(استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شخصیت ہی کچھ ایسی عالمی، آفاقی، ہمہ گیر، ہشت پہل اور جامع کمالات تھی کہ لاکھوں صفحات حضرت مولاناؒ کے ذکر جمیل سے روشن ہوگئے، ذکر و تذکرہ کا ایک سیل بیکراں جو ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ - مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو رواں ہوا تو آج تک اس کی روانی میں کچھ کمی نہیں آئی، لکھنے والے لکھ رہے ہیں، شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی جارہی ہے، رسائل و مجلات کے نمبر پر نمبر نکل رہے ہیں لیکن جس قدر بھی لکھا جائے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

کا شکوہ و گلہ ہر لکھنے والے کو ضرور دامن گیر ہو جاتا ہے ؎

الٰہی کیا بھرا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

کتنا بڑا دل اور کیسا روشن وسیع دماغ تھا کہ اس کا ذکر جس قدر بھی پھیلا کر کیا جائے، آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دراصل حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کا دل اس مرد مؤمن کا دل تھا کہ جس کے سامنے پہاڑوں کی بلندیاں، سمندروں کی گہرائیاں اور زمین و آسمان کی بیکرانیاں بھی ہیچ تھیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں کسی بھی انسان پر خصوصاً کسی مسلمان پر کچھ بھی ظلم کی سازش رچی جاتی، اس کے استحصال کی منصوبہ بندی ہوتی یا شکم پروری و مادہ پرستی، خود غرضی و مصلحت اندیشی اور مادی قوت اور

ہوس اقتدار کی گرم بازاری ہوتی، ہر موقعہ پر مولاناؒ تڑپ اٹھتے اور پھر کبھی پردہ کے پیچھے سے اور کبھی اسٹیج پر آکر اس ظلم اور خود غرضی کے خلاف ایسی بے لاگ صدا بلند کرتے جس کی گونج سڑک اور بازار سے لیکر ایوان خانوں اور ارباب اقتدار کے عالیشان محلوں تک سنائی دیتی، پھر اس طرح قافلۂ انسانیت کی رہبری کرتے کہ کیا دوست اور کیا دشمن، سب ہی آپ کو اپنا قائد تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے اور مولاناؒ وہ کردار ادا کرتے جو خود حضرت مولاناؒ نے شیخ حسن البنا شہیدؒ کے بارے میں کہا تھا کہ: "پردہ کے پیچھے سے آنے والا یہ شخص قافلہ والوں کو ہاتھ دکھاتا ہے، ٹرین کے سامنے خطرہ کی جھنڈی ہلاتا ہے، اصلاح حال اور انسانیت کے عام رجحان اور اس کے انجام، امت مسلمہ کے مقام اور اس کی اصل ذمہ داری کے بارے میں از سر نو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، اس امت کو اس کا پیغام یاد دلاتا ہے، وہ بگڑے ہوئے حالات، اخلاقی پستی، گمراہ کن عقائد، جاہلی رسوم و عادات، شکم پروری و ہوس پرستی اور قوت و طاقت کے سامنے سر افگندگی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، وہ ایک صاف ستھری زندگی، ایک نیک چلن اور انصاف پسند معاشرہ اور نئے اور پختہ ایمان کی دعوت دیتا ہے، وہ ایسے اسلام کی دعوت دیتا ہے جس کی جڑیں مضبوط اور زندگی کے تمام شعبوں میں پیوست ہوں، یہ شیر دل شخص بڑی بلندی سے عقابی روح کے ساتھ ایسی بلند اور گونجتی ہوئی آواز لگاتا ہے کہ قافلہ میں کھلبلی مچ جاتی ہے، اس سے جذبات و احساسات میں ایسا کیف و سرور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو نظر انداز کر کے اور اس کو نا قابل التفات سمجھ کر اپنی رفتار کا جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔"(۱)

حضرت مولانا کی زندگی میں اس طرح کی رہبری و رہنمائی کی پچاسوں مثالیں ملتی ہیں، لیکن اس مختصر تذکرہ میں ہمیں حضرت مولاناؒ کے اس عظیم کارنامہ کا ذکر کرنا ہے جس سے خود حضرت مولانا کے بقول: "میری (حضرت مولاناؒ) زندگی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو مجھے اپنے گوشۂ عزلت سے نکال کر اجتماعی و ملی خدمت کے میدان میں لے آیا اور جس نے مجھے مسلمانوں کے مسائل سے بہت قریب..... بنا دیا۔"(۲)

یہ عظیم کارنامہ کیا ہے؟ خود مولاناؒ کی زبان میں: "یہ وہ تاریخی بلکہ تاریخ ساز کنونشن تھا جو

۸-۹/اگست ۱۹۶۴ء کو کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقد ہوا اور جس میں "مسلم مجلس مشاورت" کی بنیاد پڑی۔"(۳)

"مسلم مجلس مشاورت" کی اہمیت اور اس کے کام کی وقعت اور وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے ان حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا جو اس کے قیام کے محرک تھے، حضرت مولاناؒ پرانے چراغ جلد اول میں ڈاکٹر سید محمودؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "دسمبر ۱۹۶۳ء میں اور جنوری ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد ہوا پھر مارچ اور اپریل ۱۹۶۴ء میں مشرقی ہندوستان کی اس صنعتی پٹی میں جس میں رانچی، جمشید پور اور راوڑکیلا واقع ہیں، ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت نہایت بھیانک فرقہ وارانہ فساد کی ایک لہر چلی جس میں مسلمان اقلیت وحشیانہ مظالم کا شکار ہوئی، کارخانوں میں کام کرنے والے مسلمان مزدور، امن پسند شہری آبادی، معصوم بچے اور کمزور بے دست وپا عورتیں ایسی بربریت کا نشانہ بنیں جس کی مثال اس سے پہلے کے فسادات میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، یہ فرقہ وارانہ نفرت واشتعال کی ایک ایسی ہسٹریائی کیفیت تھی، جس میں طالب علموں نے طالب علموں کو، استادوں نے استادوں کو، پیشہ ور لوگوں نے اپنے ہم پیشہ ساتھیوں اور کمیونسٹوں نے اپنے کمیونسٹ ساتھیوں کو مارا جو محض نسلی طور پر مسلمان تھے، اس نے ایک بار پھر مسلمانوں کو اس ملک میں اپنے مستقبل پر غور کرنے پر مجبور کردیا اور قیادت کے خلاء کے احساس کو شدت کے ساتھ ابھار دیا"۔(۴)

بھلا ایسے نازک موقع پر مولاناؒ اپنی تعلیمی وتصنیفی زندگی میں مشغول رہنے کو کیسے جائز قرار دے سکتے تھے کہ اس وقت کا سب سے بڑا فریضہ مظلوموں کی دادرسی اور ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا تھا، حضرت مولاناؒ خود فرماتے ہیں کہ: "ان حالات میں نہ کسی تعمیری کام کی گنجائش کی ضرورت ہے اور نہ کسی تعلیمی وتصنیفی مشغلہ کا جواز۔ وقت کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ انسانیت دشمنی کی اس لہر کو روکا جائے جو انسانیت اور ملک کی ہر چیز کو چیلنج کررہی ہے"۔(۵)

چنانچہ آپ اپنے رفیق محترم حضرت مولانا منظور نعمانیؒ صاحب کے ساتھ میدان عمل میں

آگئے، شروع میں رائے یہ قرار پائی کہ اکثریتی فرقہ سے جو لوگ گاندھی جی کے طرز فکر کے حامل ہیں ان کو اپنے ساتھ لے کر چلا جائے کہ اس کے بغیر ہندو مسلم بھائی چارگی کی فضا قائم کرنا مشکل ہے، اس سلسلہ میں ان حضرات نے ونوبا بھاوے جی اور جے پرکاش نرائن کے پاس گئے اور ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت اس مسئلہ پر اپنی اولین توجہ مرکوز کریں، لیکن ان حضرات کی طرف سے خاطر خواہ ہمت افزائی اور اشتراک عمل وتعاون کے اثرات بہت کم نظر آنے کے بعد ملت کے قائدین اور دردمندوں نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں ہی کو آگے بڑھکر اسی کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں لینا چاہئے، اسی جذبے اور مقصد کے تحت حضرت مولاناؒ آگے بڑھے اور اس تحریک کے بانیوں اور صف اول کے قائدین میں شامل ہوگئے پھر کیا تھا؟ ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم تحریک کا یہ کارواں چل پڑا اور ہر طرف سے یہ صدا آنے لگی "ہوتا ہے جادہ پیماں پھر کارواں ہمارا"۔ آزاد ہندوستانی تاریخ لکھتے وقت کوئی مؤرخ اس تحریک کو فراموش کیا نظر انداز بھی نہیں کرسکتا ہے۔

حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ حضرت مولاناؒ کو اپنے گوشۂ عزلت سے باہر آکر اس تحریک کے جھنڈے تلے کھلی گاڑیوں پر سوار ہو کر قوم کو للکارنے اور انسانیت کی طرف بلانے کا خوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا، ان دوروں کے درمیان آپ کا اندازِ خطاب کیا تھا؟ اور کس طرح شعلہ جوالہ بنکر صوبہ صوبہ، ضلع ضلع اور قریہ قریہ کا آپ سفر کر رہے تھے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت مولاناؒ کی تقریر کا وہ اقتباس پڑھ لینا کافی ہوگا جو جمشید پور ٹاٹا جیسے صنعتی شہر میں فرمایا تھا، جہاں آپ کی تقریر کے وقت اتنا بڑا مجمع ہندو مسلمانوں کا جمع تھا کہ "جہاں تک نظر کام کرتی میدان آدمیوں سے بھر ہوا تھا" (۶) اور جس کی صدارت ٹاٹا کمپنی کے منیجر کر رہے تھے، حضرت مولانا نے جمشید پور کی صنعتی مرکزیت کو (جس میں لوہا خاص کردار ادا کرتا ہے) موضوع بنا کر انسانوں کی پستی اور انسانیت کی ناکامی کا ذکر فرمایا اور کہا "اگر اس آہن خام کے زبان ہوتی..... تو وہ انسان پر اپنی برتری ثابت کرتا اور اس کی بے عنوانیوں اور لوہے کے مصنوعات کے غلط استعمال کو یاد دلا کر اس کو شرماتا اور کہتا کہ ہم کو ہمارے خالق نے اس لئے نہیں پیدا کیا تھا اور ہم پر ان کارخانوں میں اس لئے محنتیں صرف نہیں ہوئیں کہ ہم سے

انسان کا جو اشرف المخلوقات ہے، گلا کاٹا جائے، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، ان پڑھے لکھے انسانوں کا قصور ہے جو ہم سے حفاظت کے بجائے ہلاکت کا، تعمیر کے بجائے تخریب کا اور تہذیب کے بجائے غارتگری کا کام لیتے ہیں"۔(۷)

ان تقریروں کا اثر تھا کہ پورے ملک ہندوستان نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، پورے ملک میں اس کے شاندار کامیاب دورے ہوئے اور مسلمانوں کے لئے اس کو فال نیک سمجھا گیا، لیکن مسلم تحریکات کا یہ ایک انتہائی افسوسناک پہلو ہے کہ اس قسم کی وفاقی تنظیمیں اور تحریکات اختلافات کے شکار ہو جاتے ہیں اور جماعتی عصبیت اور خود غرضی بہت جلد مشترک بلند مقاصد پر غالب آجاتی ہے، کچھ اس طرح کا حال اس عظیم تحریک کا بھی ہوا کہ اس کا آغاز تاریخ ساز تھا اور انجام ایک تاریخی داستان کی شکل میں نمودار ہوا، ہندوستانی مسلمانوں کی اس عظیم تاریخی تحریک کے تار و پود کس طرح بکھر گئے، "مسلم مجلس مشاورت" کا شیرازہ کیونکر درہم برہم کر دیا گیا، اس کا تعلق تاریخ تحریکات سے ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(۱) پرانے چراغ حصہ سوم ص۔۱۵

(۲) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۳۹۰

(۳) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۳۸۹

(۴) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۳۹۱

(۵) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۳۹۱

(۶) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۴۰۱

(۷) پرانے چراغ حصہ اول ص۔۴۰۲

☆☆☆

حضرت مولانا علی میاںؒ
مشاہیرِ برصغیر کی نظر میں

مولوی محمد احمد بستوی ؛ شریک شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مخلص داعیان، زاہد علماء، بلند قامت مفکرین، اسلامی ادباء، زبان و قلم کے دھنی حضرات کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے، جن کے تصور سے نہ صرف موجودہ زمانہ کے افلاس کے احساس میں کمی آتی تھی، بلکہ انکے صرف وجود ہی سے اس پرفتن زمانہ میں تسلی اور ڈھارس کا احساس ہوتا تھا۔

مولانا کی شخصیت متنوع خصوصیات وکمالات کی جامع تھی جن میں کوئی دوسرا ان کا سہیم وشریک نظر نہیں آتا۔

دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ محض کتابیں پڑھ لینے سے کسی کو علم حقیقی کے ثمرات حاصل نہیں ہوتے بلکہ اس کیلئے "پیش مردے کاملے پامال شو" پر عمل کی ضرورت ہے، مولانا کو بھی اللہ تعالیٰ نے جو رتبۂ بلند نصیب فرمایا وہ ان کی ذہانت وذکاوت اور علمی استعداد سے زیادہ اکابر کے فیضِ صحبت اور بزرگانِ دین کے فیضِ نظر کا ثمرہ تھا۔

اپنے زمانہ کے تقریباً تمام ہی اکابرین سے کسبِ فیض اور ان کا منظورِ نظر رہنا، مولانا کی وہ خصوصیت وانفرادیت ہے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور یہ سعادت محض توفیقِ ایزدی ہی کی بنا پر آپ کے حصہ میں آئی۔

ے این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہم ذیل میں چند مشاہیر و اکابر کی آراء اور ان کی نظر میں آپ کے مقام و مرتبہ کا ذکر کرتے ہیں جن سے یہ واضح ہوگا کہ مولانا اپنے اکابر کی نگاہ میں کس بلند مرتبہ و مقام کے حامل تھے، اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان پانچ اکابر سے مولانا کا تعلق انتہائی گہرا تھا، اور انہوں نے مولانا کی تربیت میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

(۱) حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ (متوفی ۱۹۴۳ء) سے ادنیٰ سی واقفیت رکھنے والا بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوگا کہ وہ اعتقادات میں سلفِ صالحین کی روش پر، علوم میں عبقریت کے حامل، عمل میں اکابر کا نمونہ، اتباعِ سنت میں ممتاز، تزکیہ و تجلیہ کی مسافتیں طے کئے ہوئے، اور امانت، دیانت، تقویٰ و تورع احتیاط و ثقاہت کے پیکر تھے۔

مولانا مرحوم نے جب بذریعہ خط حضرت تھانوی سے خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی تو اس کے جواب میں حضرت تھانوی نے تحریر فرمایا کہ:۔

"سر آنکھوں پر تشریف لائیں، لیکن صرف ملاقات کی نیت سے نہ اعتقاداً نہ انتقاداً ظاہراً" (۱)

اسی طرح ایک مکتوب گرامی میں حضرت تھانوی نے مولانا کو "مجمع الکمالات" جیسے بلند پایہ الفاظ سے مخاطب کیا ہے، اس مکتوب کو نقل کرنے کے بعد خود مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس گرامی نامہ پر ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ کی تاریخ ہے جو ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے (یعنی مولانا کی عمر اس وقت صرف ۱۹ سال تھی)، اس شفقت نامہ پر اسکے سوا اور کیا عرض کیا جائے کہ:۔

ع کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید (۲)

ہمارے اکابر میں حضرت تھانوی بہت ہی زیادہ محتاط اور معتدل تھے، تحریر، تقریر، معاملات وغیرہ تمام امور میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، ان کا ایک انیس ۱۹ سالہ نوجوان عالم دین کو "مجمع الکمالات" لکھنا بہت ہی اعزاز وافتخار کی بات ہے، اور خود حضرت تھانوی کے کمالِ فراست کی دلیل ہے کہ ان کو مولانا کی پیشانی کا نور اور انکی ہوشمندی وزیرکی کا ادراک کتنا پہلے ہی ہو گیا تھا۔

اسی طرح مولانا نے اپنی تھانہ بھون حاضری کا ایک واقعہ قلمبند فرمایا ہے کہ :-

"ظہر کی اذان سے کچھ قبل خانقاہ میں حاضری ہوئی، پھر اذان ونماز کے بعد مجلس شروع ہوئی، جس میں خواص شریک تھے اس میں میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا ڈیسک پر نظر پڑی تو دیکھا کہ "سیرت سید احمد شہیدؒ" وہاں رکھی تھی، اسکو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کیلئے موجود ہے اس کی موجودگی سے اجنبیت کے احساس میں بڑی کمی ہوئی، مولانا خطوط کے جواب دینے میں مصروف تھے، چند منٹ کے بعد خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: خواجہ صاحب! ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے، آئے نہیں؟ یہ سن کر میں خود آگے بڑھا اور عرض کیا کہ: میں حاضر ہوں، فرمایا کہ: آپ نے بتایا نہیں آئیے، مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا، میں نے عرض کیا کہ: حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ: اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، مکرر کئی لفظ فرمائے، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ: میں نے تو آج آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا، تاکہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا جو اس نوعمر وگمنام آنے والے کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔" (۳)

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت تھانوی کی نظر میں مولانا کی کیا وقعت اور قدر و منزلت تھی، واقعی

ع قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

(۲) شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۱۵۷ھ) علم و عرفان، سلوک و معرفت، مہمان نوازی، خورد نوازی، زہد و عبادت، تقویٰ و استغنا، اور بہت سے اوصافِ جمیلہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، مگر "عزیمت و حمیت" دو صفتیں آپکی زندگی میں کلیدی حیثیت کی حامل تھیں۔

مولانا کو حضرت سے کافی مناسبت اور لگاؤ تھا، حضرت مدنی بھی مولانا سے انتہائی شفقت و مؤدت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مدنی نے مولانا کو دیوبند کے زمانۂ قیام میں ایک ماہ تک اپنے ہی گھر رکھا، پھر خود مولانا ہی کے اصرار پر دوسری جگہ منتقل کر دیا، مگر پھر بھی صبح کی چائے میں حاضری کی پابندی کی شرط لگا دی، مولانا کے بارے میں حضرت مدنی کیا جذبات و تاثرات رکھتے تھے اور کس بلند مقام پر فائز سمجھتے تھے اس کا کچھ اشارہ ان کے ان دو مکتوبات کی روشنی میں ملتا ہے۔

۱۳۶۹ھ و ۱۳۷۰ھ میں مولانا نے حجاز، مصر، سوڈان، دمشق وغیرہ کا ایک طویل دعوتی سفر کیا اس موقع پر مولانا کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم نے اس مقدس سفر اور دعوتی کوششوں کی اطلاع اپنے شیخ حضرت مدنی کو ایک خط میں دی، تاکہ وہ آپ کے حق میں دعاءِ خیر فرمائیں، اس کے جواب میں حضرت نے جو مکتوب گرامی ارسال فرمایا، اس کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"اس کو میں اپنے حق میں ایک بشارت اور تبرک سمجھتا ہوں"۔

مکتوب گرامی میں حضرت لکھتے ہیں:۔

"مولوی علی میاں صاحب کی خبریں رؤساء تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات

سے معلوم ہوتی رہتی تھیں، مگر آپ کی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور مزید اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاقِ شر بنائے اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہٗ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیا کا علم بردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے"۔ آمین (۴)

یہ مکتوب ۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ کا ہے، حضرت مدنی نے مولانا کے حق میں جو دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے تھے، ہم بلا خوف تردید اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ مولانا کے حق میں حرف بحرف مقبول ہوئے۔

طلبۂ دارالعلوم دیوبند کی ایک انجمن سجاد لائبریری کے زیر انتظام ۱۹۵۴ء میں ایک اجلاس منعقد ہوا، اس میں مولانا کو دعوت خطاب دی گئی، تو طلبہ کی دعوت کے ساتھ حضرت مدنی نے بھی ایک سفارشی خط تحریر فرمایا، جس سے حضرت مدنی کی نگاہ میں مولانا کی قدر و منزلت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، حضرت لکھتے ہیں :۔ "امیدوار ہوں کہ ان کی تمناؤں کو قبولیت سے نوازدیں"۔ (۵)

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

(۳) حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (متوفی ۱۹۶۲ء) کو عشق الٰہی، محبت قرآن و رسول، بے نفسی و فنائیت، زہد و توکل اور جود و سخا، حقیقت پسندی اور حالاتِ زمانہ سے باخبری، اسلام کی فکر مندی اور مسلمانوں کیلئے دل سوزی میں نمایاں مقام حاصل تھا۔

مولانا کو حضرت ہی سے اجازت و خلافت کا شرف حاصل تھا آپ کے معاصر مولانا محمد منظور نعمانی (متوفی ۱۹۹۷ء) بھی حضرت رائے پوری کے خلیفہ و مجاز تھے، وہ لکھتے ہیں :۔

"موصوف (مولانا علی میاں) کی ان کی خداداد صفات اور خصوصیات کی وجہ سے جن کی اللہ کے ہاں اور اس کے مقبول بندوں کے ہاں بھی زیادہ قدر و قیمت ہے، حضرت کے ہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا، وہ اس ناچیز کیلئے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک و غبطہ کا باعث بھی بنا رہا، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"۔ (۶)

یہ ایک معاصر کی چشم کشا، مبنی بر حقیقت شہادت ہے جو پیر و مرشد کی نگاہ میں ان کے ایک مسترشد کے مقام بلند کا غماز ہے۔

مولانا نے اپنے روحانی مربی و مرشد حضرت رائے پوری کے خلعتِ خلافت سے نوازنے کے واقعہ کو خود ہی رقم فرمایا ہے کہ :-

"حضرت نے اپریل ۱۹۴۸ء میں سفر لکھنؤ کے موقع پر وطن مألوف دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو بھی شرف بخشا، ایک دن بے سان و گمان شاہ علم اللہ اور سید صاحبؒ کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا : میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں۔" (۷)

ایک شیخ و مرشد کا اپنے مسترشد کو اس انداز پر خلافت دینا اس کے بلند مقام پر فائز ہونے کی واضح شہادت ہے۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں ایک مجلس مذاکرات اسلامی منعقد ہوئی، اس موقع پر شدت سے قادیانیت سے متعلق ایک عربی کتاب کی ضرورت محسوس کی گئی، حضرت رائے پوری کو جب اسکا علم ہوا تو مولانا کا نام لیکر فرمایا کہ : وہ آئیں گے تو ہم ان سے چمٹ جائیں گے کہ یہ کام کر کے جاؤ۔" (۸)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت رائے پوری اپنے اس مسترشد سے کس درجہ قلبی محبت و شفقت اور کتنا تعلق و اعتماد رکھتے تھے، چنانچہ حضرت ہی کے حکم و ایماء پر مولانا نے بڑی محنت سے "القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ والاسلام" کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی، کچھ عرصہ بعد مزید اضافہ کے ساتھ یہ کتاب "القادیانی والقادنیہ" کے نام سے طبع ہوئی۔

مولانا کی معرکۃ الآراء کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کی جلد اوّل کے مطالعہ کے بعد حضرت رائے پوری نے لکھا کہ : "یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ قبول فرمائیں کیا عرض کروں، ایسا ذوق معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ اندازہ ہمیں کو ہے۔" (۹)

۲۸ر نومبر ۱۹۵۶ء میں ایک مکتوب گرامی میں مولانا کو مخاطب فرماتے ہوئے مولانا روم کے وہ اشعار تحریر فرمائے جو انہوں نے حضرت شمس تبریز کے اشتیاق میں کہے تھے اور فرماتے کہ آپ کی آمد سے میری کٹیا (خانقاہ) ایسے روشن ہو گئی جیسے شمس تبریز کے آنے سے مولانا رومؒ کے آستانہ میں بہار آ گئی تھی۔(۱۰)

ایسے خوش نصیب مسترشدین کی فہرست بہت ہی مختصر ہو گی جن کو اپنے مرشدین کی یہ بھرپور توجہ، شفقت و محبت نصیب ہوئی ہو۔

(۴) دینی حمیت و غیرت، اتباع سنت کا جذبہ، رعایت حقوق، حسن اخلاق، تواضع و انکسار، استقامت و انابت الی اللہ، امت کیلئے درد و بے قراری، دعوت و تبلیغ کی راہ میں جہد و مشقت جماعت تبلیغ کے بانی، عظیم داعی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (متوفی ۱۹۴۴ء) کے نمایاں اوصاف ہیں۔

مولانا کو انکے منظور نظر رہنے کا بھی شرف حاصل ہے، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا کی چند خصوصیات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"ان خصوصیات کے علاوہ خوش نصیب مؤلف (مولانا علی میاںؒ) کو اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی کچھ اور خاص صلاحیتیں بھی حاصل ہیں، جن کا جوہر تو غالباً ان کی فطرت میں پہلے سے موجود تھا، لیکن ان کا نشو و نما میرے خیال میں مولانا محمد الیاس کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ساتھ قلبی تعلق سے ہی ہوا ہے"۔(۱۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ سے تعلق خاطر اور قلبی لگاؤ تھا، خود حضرت بھی مولانا پر بہت شفقت و مودت فرماتے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اور آپ کی تبلیغی و دعوتی خدمات کے بڑے ہی معترف اور قدر داں رہتے، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت مولانا کے ان مکاتیب سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے مولانا موصوف کے نام تحریر فرمائے ہیں، چنانچہ ایک مکتوب میں مخدوم و محترم کے القاب سے مخاطب کرنیکے

بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

" آں محترم کی توجہاتِ عالیہ سے تبلیغ کو جس قدر نفع پہونچا ہے، اب تک لگنے والوں میں سے کسی سے نہیں پہونچا"۔ (۱۲)

یہ ایک عظیم داعی، عالم ربانی کی طرف سے مولانا کے اسلوبِ دعوت اور طریق تبلیغ کے مؤثر ہونے اور لائقِ تقلید واتباع ہونے کی عظیم سند ہے، جو ہر کسی کے حصہ میں کہاں ؟ بلکہ بہت سے اربابِ علم وفضل، کتابی معلومات اور فنی تحقیقات کے شناور بھی اس جوہر بے بہا سے تہی دست وتہی دامن نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا کاندھلویؒ کے دل میں مولانا کی جو محبت واعتماد اور اس درِ بے بہا کی جو قدر ومنزلت تھی اس کی ایک واضح علامت حضرت کے وہ طویل مکتوبات اور بلند پایہ القاب وآداب ہیں جو انہوں نے دعوت اور اپنے پیام کی تشریح کے سلسلہ میں مولانا کے نام تحریر فرمائے ہیں۔

ایک خط میں مولانا ممدوح کو یوں مخاطب بناتے ہیں :۔

" مخدوم ومکرم، معظم ومحترم، سلالۂ خاندانِ نبوت۔

اقامنا اللہ وایاکم لاعلاء کلمتہ واحیاء سنن نبیہ"۔ (۱۳)

ایک طویل مکتوب میں مولانا کو اپنی امیدوں اور تمناؤں کی ودیعت گاہ قرار دیا ہے۔ (۱۴)

اسی مکتوب کا ایک اقتباس ہم بجنسہٖ نقل کرتے ہیں جس سے قارئین خود ہی تعین کرلیں گے کہ حضرت مولانا کی نگاہ میں مولانا کا کیا مقام ورتبہ تھا، تحریر فرماتے ہیں :۔

" میرا ضمیر شہادت دے رہا ہے کہ یہ کام دراصل آپ جیسے اہل اور خاندانِ نبوت ہی کے کرنے کا ہے، آپ کے قلوب سے جس قدر اس کے لئے شرح صدر کے ساتھ استقامت ظہور میں آتی چلی جائے گی، اسی قدر گویا اس کے درست ہونے کی امیدیں صحیح ہوتی چلی آئیں گی، جب تک آپ جیسے باشرحِ صدر اس میں استقامت کو نہیں پہنچیں گے، نااہلوں میں اس کی ناکامی یقینی ہے"۔ (۱۵)

مولانا اور رئیس التبلیغ کے مابین جو والہانہ تعلق اور بے پناہ عقیدت و محبت تھی وہ اس حدیث کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے " ورجلان تحابا فی اللہ اجتمعا علیہ وتفرقا علیہ"۔

ایک موقع پر مولانا الیاس صاحبؒ نے مولانا سے فرمایا: مولانا میں آپ کا شکریہ اور تعریف کیا کروں، تعریف محبت کا اوچھا پن ہے۔" (۱۶)

(۵) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ (متوفی ۱۹۸۲ء) علمی و عرفانی، ربانی و رحمانی خصائل و شمائل کے حامل تھے اور نہایت اعلیٰ علم دوست اور تقویٰ شعار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، علم حدیث میں آپ کی نہایت گراں قدر خدمات ہیں، علوئے استغناء و علوئے ہمت، سوز و گداز و محبت، دینی حمیت اور مسلکِ حق کی حفاظت کا اہتمام، دینی کوششوں اور علمی کاموں کی قدر دانی، علمی ذوق، اصابتِ رائے، تواضع اور اکرام ضیف وغیرہ آپ کے ممتاز اوصاف ہیں۔

مولانا کو حضرت شیخ سے طویل عرصہ تک ملاقات و نیاز کا شرف حاصل رہا ہے، مولانا خود حضرت شیخ سے اپنے تعلقات کا اظہار ان متواضعانہ الفاظ میں کرتے ہیں کہ:۔

"ناچیز مصنف کو حضرت شیخ کی خدمت میں ۱۹۴۰ء کی ابتداء سے نیاز حاصل ہے ان کی اس کے حال پر جو شفقت و عنایت خصوصی رہی ہے اور اپنے گرامی ناموں میں جس طرح اس کا اظہار فرمایا ہے اس کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتا کہ:۔ ؎ بہرِ تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقتِ نازکچھ جنبش ترے ابرو میں تھی" (۱۷)

مولانا کو حضرت شیخ سے بہت زیادہ ربط و تعلق تھا، جس میں شیخ کی جامعیت اور علمی مناسبت نے چار چاند لگا دئے تھے اور حضرت شیخ بھی مولانا پر بے پایاں شفقت اور اعتماد فرماتے تھے اسی شفقت و اعتماد کا نتیجہ تھا اور شیخ کی نگاہ میں مولانا کے علمی کمال و رسوخ کی دلیل بھی کہ حضرت شیخ نے اپنی تمام عربی تصانیف اور جن کتابوں کی انہوں نے تحقیق و تکمیل فرمائی تھی،

ان پر مولانا سے باصرار مقدمہ لکھوایا، مولانا کو حضرت شیخ سے بہت ہی زیادہ ذہنی مناسبت تھی، مولانا کو ایک مکتوب میں حضرت شیخ لکھتے ہیں :۔

"دعاؤں میں نہ مکہ میں دریغ ہوا نہ مدینہ پاک میں اور یہ بھی یاد نہیں کہ کسی دن آپ کے صلاۃ وسلام میں تخلف ہوا ہو، اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ دل بستگی جتنی آپ سے ہے اتنی کسی سے بھی نہیں رہی۔" (۱۸)

حضرت شیخ کو مولانا سے بہت انس اور لگاؤ تھا، چنانچہ ۶۴ء کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔ "آپ کے تعلق کو میں اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔" (۱۹)

حضرت شیخ نے مولانا کو "مجموعۂ حسنات" بھی لکھا ہے۔ (۲۰)

فروری ۱۹۸۲ء میں مولانا کے خواہر زادۂ عزیز مولانا محمد ثانی حسنی مرحوم کا حادثۂ جانکاہ پیش آیا، جس نے مولانا کے دل و دماغ کو مجروح اور اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھدیا، حضرت شیخ نے اس موقعہ پر (اپنی وفات سے صرف تین ماہ قبل) جو اہم تعزیتی مکتوب تحریر فرمایا وہ ایک یادگار تاریخی مکتوب ہے، جس سے حضرت کی حاضر دماغی، حافظہ کے صحیح طور پر کام کرنے، پیکرِ صبر و رضا ہونے، اسی کے ساتھ شدتِ تعلق و مناسبت کا پورا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا کی مشاہیر برصغیر کی نظر میں کیا قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ تھا، اس کا کسی قدر اندازہ ان چند اکابر و مشاہیر کی مولانا کے بارے میں مذکورہ آراء و خیالات سے ہو سکتا ہے اور دولۂ دل بیچنے والی شخصیات سے آپ کے بھرپور استفادہ اور عشق و اخلاص کی دوکانوں سے دل کھول کر خریداری کرنے کے روشن باب سے کچھ پردہ ہٹ سکتا ہے، جن سے بہت سے عوام کیا بلکہ خواص بھی نابلد اور ناآشنا نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ ان اکابر کے سچے جانشین اور وارث و امین تھے، ان کے حادثۂ ارتحال سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا اور ایک بساط تہہ ہوگئی۔

ایک فاضل مضمون نگار کی زبان میں :۔

"حضرت مولانا علی میاں نے ایک ایسا خلا چھوڑ دیا جس کا پر ہونا بظاہر ناممکن ہے جس دن ان کی میت زیب دوش تھی، اس کے ساتھ علم و فن، تاریخ و ادب، انشاء و نگارش، سلوک و معرفت، ریاضت و عبادت، دعوت و تحریک بہت کچھ رخصت ہو گئے اور اب صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے ؎

سرود رفتہ باز آید کہ نآید
نسیمے از حجاز آید کہ نآید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نآید" (۲۱)

♥♥♥

حواشی :-

(۱) پرانے چراغ اوّل ص۱۲۱ (۲) ایضاً ص۱۲۴ (۳) ایضاً مختصراً ص۱۲۹ (۴) کاروانِ زندگی اوّل ص۳۹۴ (۵) ایضاً ص۴۰۲ (۶) مقدمہ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ ص۲۲ (۷) کاروان زندگی اوّل ص۳۵۴ (۸) سوانح حضرت رائے پوریؒ ص۲۹۸ (۹) کاروانِ زندگی اوّل ص۴۱۴ (۱۰) ایضاً، و مولانا علی میاں اکابر و مشاہیر کی نظر میں ص۹۲ (۱۱) مقدمہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت ص۳۷ (۱۲) مکاتیب مولانا الیاس صاحبؒ ص۸۱ (۱۳) ایضاً ص۸ (۱۴) ایضاً ص۱۷ (۱۵) ایضاً ص۲۱ (۱۶) کاروانِ زندگی اوّل ص۲۸۶ (۱۷) مقدمہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ ص۱۵ (۱۸) کاروانِ زندگی اوّل ص۴۴۲ (۱۹) مولانا علی میاں اکابر و مشاہیر امت کی نظر میں ص۱۳۵ (۲۰) علماء مظاہر علوم سہارنپور ص۲۷۸ (۲۱) لالہ و گل ص۲۵۳ ۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ

کا شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

کے ساتھ رشتۂ عقیدت و تعلق

محمد عفان قاسمی

(متعلم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ عالم اسلام کی ان ممتاز اور عبقری شخصیات میں سے تھے جن کی مثال خال خال ہی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو عوام و خواص کے درمیان جو بے پناہ مقبولیت عطاء فرمائی تھی وہ ان کی پاکیزہ شخصیت کی آئینہ دار ہے، خاندانی شرافت، علم و عمل کا حسین سنگم، تواضع و انکساری، اخلاق فاضلہ، دینی غیرت و حمیت، زہد و استغناء یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں، جنھوں نے مولانا کو بلندیوں کے بام عروج پر پہنچایا اور وقت کے تمام مشاہیر کی نگاہوں میں قابل قدر بنادیا، ذالك فضل الله يوتيه من يشاء، مولانا کی زندگی پر مختلف پہلوؤں سے لکھا جاچکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا، خود مولانا نے کاروان زندگی کے نام سے ۷ر جلدوں میں اپنی آپ بیتی لکھ کر آنے والے مؤرخین کے لئے بہترین سرمایہ چھوڑا ہے جس کے حوالہ کے بغیر مولانا کا تذکرہ نامکمل رہیگا۔

مجھے تو اس مضمون میں خانوادہ مدنی کے ایک ادنی فرد ہونے کی حیثیت سے اس عقیدت و محبت کی ایک جھلک پیش کرنی ہے جو مولانا کو حضرت مدنیؒ اور ان کے خانوادہ کے ساتھ تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس خصوصی ربط و تعلق کو بھی ذکر کرنا ہے جو حضرت مدنی علیہ الرحمہ کو مولاناؒ اور ان کے خانوادہ کے ساتھ تھا۔

حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا مولانا کے ساتھ خصوصی تعلق:- حضرت مولانا مرحوم چونکہ

خانوادہ سید احمد شہیدؒ کے دریکتا و فرد فرید تھے اور حضرت سید احمد شہید نور اللہ مرقدہ سے تمام اکابر دیوبند بالخصوص سلسلہ رشیدی کے مشائخ کو انتہائی والہانہ عقیدت و تعلق تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کو بھی اپنے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور اپنے شیخ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ کے طرح حضرت سید صاحب سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ آپ کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے جو سید صاحب اور ان کی تحریک سے متعلق ہے ملاحظہ فرمائیں (نقش حیات ج:۲ص:۱۱تا۲۹) اور یہ ربط و تعلق کیوں نہ ہو؟ جب کہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا قلب بھی جذبۂ جہاد سے اس طرح سرشار تھا جس طرح سید صاحب کا قلب جذبۂ جہاد سے معمور تھا سید صاحبؒ جس تحریک جہاد کے ہراول دستے کے قائد تھے حضرت مدنیؒ اسی بزم رفتہ کے آخری رکن رکین اور اسی قافلہ جہاد کے آخری جرنیل تھے۔ تکیہ کلاں (رائے بریلی) میں حضرت سید صاحبؒ کی وہ تاریخی و بابرکت مسجد جس کی پختہ تعمیر ۱۰۸۳ھ شاہ علم اللہ نے کی تھی حضرت مدنیؒ کی محبوب جگہ تھی اور آپ فرمایا کرتے تھے "کہ میرا یہاں چلہ گزارنے کو جی چاہتا ہے" اس لئے کہ سید صاحبؒ کے زمانہ میں یہی مسجد مدرسہ بھی تھا خانقاہ بھی تھی جہاد کی تربیت گاہ بھی اور جماعت مجاہدین کی قیام گاہ بھی۔

حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا لکھنؤ میں قیام:- حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (برادر بزرگ مولانا علی میاں صاحبؒ) دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور بیعت وارادت کا تعلق حضرت مدنی ہی سے تھا، آپ جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تو ڈاکٹر صاحبؒ ہی کے گھر میں قیام فرماتے تھے (کاروان زندگی ج۱ص ۱۲۴) میں مولانا مرحوم اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "بھائی صاحب (ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ) نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرلیا تھا، مولانا کو بھائی صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہوگیا کہ لکھنؤ میں (جہاں مختلف سیاسی اجتماعات و تقریبات کی وجہ سے ان کا بکثرت تشریف لانا ہوتا تھا) ان کے مکان کو مستقل قیام گاہ بنالیا اس معمول اور وضعداری میں سخت سے سخت حالات میں بھی فرق نہیں آیا" ایسا بھی ہوا ہے کہ سلیم پور ہاؤس یا شاہی بارہ دری کے شاندار ایوان کے

جلسے اور مباحثوں میں گھنٹوں شریک رہے اور کھانا ہمارے "شیرازی" دستر خوان پر کھایا خواہ کتنی دیر لگ جائے، مسلم پارلی منٹری بورڈ کے زمانہ میں کسی حلقہ انتخاب میں تشریف لے گئے، دیر رات گئے تشریف لائے معلوم ہوا کہ ابھی کھانا نہیں کھایا، ماحضر تناول فرمایا اور استراحت کی، اس گھر کی یہی ادا (سادگی) آپ کو پسند تھی اگر کبھی کوئی تکلف کیا تو شکایت فرمائی۔ (پرانے چراغ ج:۱، ص:۹۷)

ڈاکٹر صاحب کا حضرت کے ساتھ تعلق:- ڈاکٹر صاحب اولاً حضرت شیخ الہند سے بیعت ہونا چاہتے تھے مگر بیعت نہ ہو سکے اس کے بعد ان کے حقیقی جانشین حضرت شیخ الاسلامؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا اور یہ تعلق اتنا مضبوط اور پختہ ہوا جس کو بقول مولانا علیہ الرحمہ کے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہے جنہوں نے مولانا کے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں مولانا کے مسرت وانبساط اور ڈاکٹر صاحب کے صدق واخلاص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (حیات عبدالحی ص:۲۷۳) اور اس درجہ کا تعلق تھا کہ مولانا مرحوم لکھتے ہیں کہ مولانا مدنیؒ نے جب اس دنیا سے رحلت فرمائی اس خبر سے ڈاکٹر صاحب کے دل پر بڑا اثر ہوا اور ان کی طبیعت مستقل طور پر مضمحل اور افسردہ رہنے لگی۔ (حیات عبدالحی ص ۳۸۵)

حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا ایک اہم مکتوب:- ۱۹۵۱ء میں مولانا علی میاںؒ کا مصر کا ایک سفر ہوا تھا دعوتی کوششوں کے سلسلے میں ہوا تھا اس سفر کی تفصیل ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے حضرت مدنیؒ کے پاس لکھ کر بھیجی حضرت نے اس کا جو جواب لکھا ہے وہ اگر ایک طرف حضرت کی دور اندیشی اور دور رس نگاہوں کی غمازی کرتا ہے تو دوسری طرف مولانا مرحوم کی عظیم شخصیت کی طرف بھی واضح اشارہ کرتا ہے حضرت کا وہ مکتوب جو ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے نام ہے کاروان زندگی ج ۱ ص ۳۹۴ کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے۔

محترم المقام زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔

مولوی علی میاں صاحبؒ کی خبریں رؤساء تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات سے معلوم ہوتی رہی تھیں مگر آپ کی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور مزید اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ سے، دعاء ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے اور حضرت سید صاحب شہیدؒ کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت عالیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدینہ سے مالا مال کرے، آمین۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۱۵ر ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

حضرت مدنیؒ کے یہ دعائیہ کلمات بارگاہ الٰہی میں کس درجہ قبول ہوئے اس کا فیصلہ وہ حضرات بخوبی کر سکتے ہیں، جنہوں نے مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھا ہو۔

حضرت مدنیؒ سے اپنے تعلق و محبت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا کہ جب ہم پہلی مرتبہ سفر حج کے لئے گئے تو حضرت مدنیؒ نے از راہ شفقت و عنایت ایک تعارفی خط اپنے بھتیجے مولانا سید حبیب محمود صاحب کے نام لکھا، حضرت کے برادر خورد مولانا سید محمود صاحب نے بڑے ہی اعزاز و اکرام کا معاملہ فرمایا اور مدرسہ علوم شرعیہ کا پورا مکان ہمارے حوالہ کر دیا۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں طلبہ دارالعلوم دیوبند نے سجاد لائبریری کے جلسہ میں مولانا مرحوم کو مدعو کرنا چاہا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ کہیں مولانا معذرت نہ کر دیں حضرت مدنیؒ سے ایک سفارشی مکتوب لکھوایا جس پر حضرت شیخ الادبؒ کے بھی تائیدی دستخط ہیں "مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ جب وہ مکتوب میرے پاس پہونچا تو میرے لئے انکار کی گنجائش باقی نہ رہی اگرچہ صحت کی خرابی پروگرام میں شرکت سے مانع تھی"۔

راقم سطور نے ایک مرتبہ اسی خط کے حوالہ سے مولانا سے عرض کیا کہ پھر کوئی ایسا پروگرام رکھ لیا جائے اور آپ خطاب کے لئے تشریف لے آئیں تو ہمارے لئے بڑی سعادت کی بات ہوگی، فرمایا کہ جی ہاں طبیعت تو چاہتی ہے اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس انتظامی کا میں رکن بھی ہوں اور پابندی سے اس کی دعوت بھی آتی ہے مگر خرابی صحت و ضعف کی وجہ سے ہمت نہیں کر پاتا۔

مولانا مرحوم کا حضرت مدنیؒ اور ان کے خانوادہ کے ساتھ خصوصی تعلق :-

مولاناؒ کو حضرت مدنیؒ کے خانوادہ کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا مشاہدہ تو احقر نے خود کیا ہے، راقم سطور کی جب پہلی مرتبہ مولانا سے ملاقات ہوئی تبھی آپ نے محبت و شفقت اور خرد نوازی کا وہ بے مثال معاملہ فرمایا جس کا میں پہلے تصور نہیں کر سکتا تھا۔ پوری مجلس میں حضرت مدنی کا انتہائی عقیدت مندانہ انداز میں تذکرہ فرماتے رہے، اپنے دیوبند قیام کی تفصیل، حضرت مدنیؒ کا لکھنؤ تشریف لانا اور نزہۃ الخواطر کی طباعت کی سلسلہ میں زور ڈالنا وغیرہ۔

واپسی کے وقت جب ملاقات کی تو فرمایا کہ آپ جب بھی یہاں آئیں ہمارے ہی مہمان بن کر رہیں کیا معلوم تھا کہ آئندہ یہ شفقت بھرے جملے دوبارہ سننے کو بھی نہیں ملیں گے۔

ایک تقریب کے موقع پر راقم سطور کی والدہ محترمہ اور خالہ مرحومہ مولاناؒ کے وطن "تکیہ" گئیں مولانا کو کوئی سفر درپیش تھا اس لئے اہل خانہ کو یہ تاکید فرما کر گئے کہ دیکھو یہ میری بہنیں ہیں ان کا خاص خیال رکھنا ان کو کسی طرح کی تکلیف یا پریشانی نہ ہونی چاہئے۔

مولانا مرحوم کے لئے متاثر کن شخصیت :- جن اہل علم و باکمال شخصیات سے مولانا متاثر ہوئے ان میں ایک اہم شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہے، مولانا نے اپنی تحریروں میں حضرت مدنیؒ کے لئے جو عقیدت مندانہ جملے استعمال فرمائے ہیں وہ اس پر شاہد ہیں۔

جب ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کے لئے حضرت مدنیؒ لکھنؤ تشریف لائے تو پہلی مرتبہ مولانا نے حضرت مدنیؒ کی زیارت کی تھی اس کے بعد وقفہ وقفہ سے حضرت مدنیؒ لکھنؤ تشریف لاتے اور مولاناؒ ہی کے گھر قیام فرماتے جس کی بناء پر مولانا فرماتے ہیں کہ "حضرت کو بہت قریب سے دیکھنے اور گھر کا سب سے چھوٹا باشعور فرد ہونے کی وجہ سے خدمت کرنے کا موقع ملا، باطنی کمال اور روحانی مرتبے کا ادراک نہ اس وقت تھا نہ اب ہے لیکن اتنا یاد ہے کہ مولانا کے آنے سے گھر میں ایک خاص رونق و برکت محسوس ہوتی تھی جس کو "نورانیت" سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ سادے

کھانے میں بھی (جس کے لئے مولانا کی بڑی تاکید تھی اور اگر کوئی تکلف کی چیز پکتی تھی تو احتجاج فرماتے تھے) عجیب لذت وذائقہ محسوس ہوتا تھا مولانا بھی مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے اور جیسا کہ ایک مرتبہ بھابھی صاحبہ (والدہ عزیز سید محمد حسنی مرحوم) نے ذکر کیا کہ مولانا نے بھائی صاحب کو میرا خاص خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، یہ پہلی دینی وروحانی شخصیت تھی جس سے میں متعارف و متاثر ہوا اور الحمد للہ بعد میں اس میں اضافہ ہی ہوا اور وہ عقیدت و محبت ابھی تک قائم ہے، مجھے یاد ہے کہ یہ تاثر مولانا کی تقریروں یا دوسرے کمالات کی بناء پر نہیں تھا جن کا اندازہ اس وقت میرے لئے مشکل تھا، ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھینچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا بعد میں جب کچھ عرصہ تک تلمذ اور صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں اضافہ واستحکام پیدا ہوا"۔

(کاروان زندگی ج:۱ص:۱۲۴)

مولانا مرحوم کے دیوبند تشریف آوری کا سبب:- شعبان ۱۴۱۸ھ میں راقم سطور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا دوران گفتگو احقر نے دریافت کیا کہ کن اسباب کی بناء پر آنجناب دیوبند تشریف لے گئے اور دیوبند میں کہاں اور کتنے دن قیام پزیر رہے، مولانا نے تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا اور فرمایا کہ ہمارے گھر کا ہر ہر فرد حضرت مدنیؒ کا معتقد تھا یہاں تک کہ خواتین بھی حضرت مدنیؒ ہی سے بیعت تھیں اور ہمارے گھر کا ماحول یہ تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دن حضرت مدنیؒ کی صحبت میں گزارنا اور آپ کے درس حدیث میں شریک ہونا تقریباً ضروری سمجھا جاتا تھا، مجھے بھی بھائی صاحب نے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا اور میں ربیع الاول یا ربیع الثانی ۵۱ھ میں دیوبند حاضر ہوا اور مولانا ہی کے مہمان خانہ میں قیام کیا اور بخاری وترمذی کے درس میں باقاعدہ شریک ہوتا رہا، کچھ دنوں بعد بھائی صاحب کا خط آیا کہ جب تم طویل قیام کر رہے ہو تو اپنا الگ انتظام کرو میں نے حضرت مدنیؒ سے اس کی اجازت چاہی تو آپ کو ناگواری ہوئی لیکن پھر اجازت دے دی اور فرمایا کہ صبح کی چائے (ناشتہ) ہمارے ہی ساتھ ہوا کرے گا، میں مولانا کے مکان سے منتقل ہو کر احاطہ دارالشفاء کے ایک

کمرے میں ٹھہر گیا جو مکان سے متصل ہی تھا اس طرح تقریباً ۴/ماہ دیوبند میں قیام رہا۔ کاروان زندگی میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں "دارالعلوم کے اس ۴/ماہ کے قیام میں میری دل بستگی کا سامان اور میرے انس و عقیدت کا مرکز مولانا مدنیؒ کی ذات تھی اور اصل مناسبت انہیں سے تھی مجھے یاد ہے کہ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے "کہئے مولوی علی میاں صاحب آج اخبار میں آپ نے کیا پڑھا؟" تو مجھے دن بھر اس کا مزہ آتا رہتا اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا بقول شاعر۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

(کاروان زندگی ج:۱ص ۱۳۰)

مولانا کا ایک اہم مضمون:- مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں قیام کے سلسلہ میں ۱۴۱/۴۲ھ میں ایک تاثراتی مضمون عربی زبان میں "صلتی بمولانا حسین احمد المدنی صفحة من صفحات حیاتی" (مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے میرا تعارف و تعلق اپنی تاریخ کا ایک ورق) کے عنوان سے لکھا تھا۔

مضمون کے آخری پیرگراف کا ترجمہ جس میں حضرت مدنیؒ کی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا گیا ہے جو مولانا کے قلب و دماغ پر مرتسم ہوئے تھے مقدمہ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۴۸-۴۹ کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے۔

"مولانا (حضرت مدنیؒ) سے بحمد اللہ میرا ربط و تعلق قائم ہے اور مجھے ان کے انفاس و مجالس سے استفادہ کے مواقع وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں، مجھے ان کے ساتھ سفر میں رہنے کا اتفاق ہوا تو انسانی زندگی کا ایک اہم گوشہ بھی سامنے آگیا اور میں نے ان کی مبارک زندگی کا نیا ورق بھی مطالعہ کیا، انسان اکثر سفر میں اس سے مختلف نظر آتا ہے لیکن میں نے ان کو سفر میں ویسا ہی پایا جیسا وہ گھر میں نظر آتے ہیں بلکہ کچھ بڑھا ہی ہوا، پاکیزہ اخلاق، محتاط و خوددار،

بلند ہمت وعالی حوصلہ ایسے جفاکش کہ گھبرانا واکتانا جانتے نہیں، ایسے جواں ہمت کہ سستی اور کسل مندی کے پاس نہیں جاتے، بیدار ہوں تو طاعت اور کام میں مشغول، آرام فرمانا، کھانا تناول فرمانا سب بقدر ضرورت ان کی زندگی مسلسل جدوجہد اور سرتاپا قربانی ومجاہدہ ہے۔

حضرت مدنیؒ کا درس حدیث:- مولانا مرحوم حضرت کے درس حدیث سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں کہ ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی اور مسئلہ کا مالہ وماعلیہ ائمہ کے اختلاف ومذاہب اور ان کے دلائل وماخذ متن واسناد رجال کی بحثیں برجستہ ان سب پر۔ مولانا کی قرأت حدیث مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی روحانی و پرسکنیت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے اور گویا اس وقت بھی بالسند المتصل إلی امیر المومنین فی الحدیث کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے (پرانے چراغ ج ۱ ص ۹۹) حضرت مدنیؒ کے درس حدیث سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ تفسیر میں اگر کہیں اشکال پیش آتا تو مولانا حضرت سے دریافت کرتے جس کے لئے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت متعین تھا مگر مولانا فرماتے ہیں کہ تھوڑے ہی جمعے میرے حصے میں آئے اس لئے کہ حضرت مدنیؒ جمعہ کو اکثر سفر میں رہتے تھے۔

مولاناؒ کی عقیدت سے لبریز ایک اور تحریر:- مولانا مرحوم (مقدمہ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۴۵-۴۶) حضرت مدنیؒ کے فضائل وکمالات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مولانا (حضرت مدنیؒ) کو بہت سے لوگ ایک عالم اور محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما و مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا ہے لیکن میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں جنہوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے۔ ایک عزیمت دوسرے حمیت، عزیمت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آپ نے علماء واہل درس کے حلقہ سے باہر قدم نکالا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی جو وقت کا اہم مسئلہ تھا اور عین انگریزی حکومت کے عروج کے زمانے میں اعلان حق کر کے کلمۃ حق عند

سلطان جائر کے افضل جہاد کا شرف حاصل کیا، مالٹا میں اسیری کے دن گزارے اور ہندوستان کے جیلوں میں برسوں رہ کر سنت یوسفی ادا کی اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے یہاں تک کہ آپ کا مقصد پورا ہوا آگے تحریر فرماتے ہیں، حمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کہ انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جد و جہد میں یہی روح کام کر رہی تھی اور یہی آپ کو سدا جوان مستعد و سرگرم رکھے ہوئے تھے اور اسی نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش سے پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے اور الفاظ نہیں بلکہ شرارے ہیں جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں۔

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، نبی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا وہ خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبداللہ ﷺ کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا۔

عجب کیا گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
دوا نائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

طہران میں آیت اللہ العظمیٰ مرزا خلیل کمرئی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں ایرانیوں سے خطاب۔

لَہْوَ الْحَدِیْث

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَہْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ "ایسا معلوم ہوتا ہے صرف نام لینا رہ گیا وی ڈی او اور ٹی وی کا جو قرآن کو کہ عربی میں اترا ہے۔ اس میں انگریزی کا نغمہ کیسے آتا۔ یہ بات عقل کے خلاف ہوئی میکی صاف قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جو کتاب اتری اس میں ٹی وی اور وی ڈی او کا ذکر ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے: مَنْ یَّشْتَرِیْ لَہْوَ الْحَدِیْثِ لہو الحدیث کے معنی ہیں باتوں کا کھیل۔

یہ وی ڈی او۔ یہ ریکارڈ سب لہو الحدیث ہے، آج سے چودہ سو برس پہلے اس قرآن اللہ کی کتاب نے کہہ دیا، جب یہ سب چیزیں پیدا کیا ہو تیں۔ کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اور کسی کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔ اس وقت کہہ دیا کہ بہت سے لوگ ہیں کہ لہو الحدیث خریدتے ہیں۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

حضرت مولانا علی میاںؒ

اقبالؒ کا مرد مؤمن

مولانا محمد اسجد قاسمی، ندوی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

برِ صغیر کے شعراء اور مفکرین میں علامہ اقبالؒ کا نام اور کلام بیحد نمایاں اور سر فہرست ہے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے نزدیک اقبالؒ اور ان کا کلام اپنی معنویت اور تاثیر و اسلامیت کے لحاظ سے ممتاز ہے، مولانا بدو شعور کے بعد ہی سے اقبالؒ کے پیغام و فکر سے متأثر ہوئے، اور زمانۂ طالب علمی میں مولاناؒ نے اقبالؒ کی نظم "چاند" کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، اپنے لاہور کے پہلے سفر جون ۱۹۲۹ء میں مولانا نے پندرہ ۱۵ سال کی عمر میں علامہ اقبالؒ سے ملاقات کی، مولاناؒ کا تعارف آپ کے والد ماجد مصنف "گل رعنا" کے حوالہ سے کرایا گیا، مولاناؒ نے اپنا ترجمہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں پیش کیا، علامہ نے اسے پسند کیا اور سراہا اور بعض عرب شعراء کے متعلق کچھ سوالات مولاناؒ کی معلومات کا اندازہ کرنے کے لئے پوچھے، اس ملاقات میں مولاناؒ اقبالؒ کے تواضع، سادگی اور بے تکلفی کی خصوصیات سے متأثر ہو کر لوٹے۔

اقبالؒ کے کلام کی بلندی اور تاثیر کا اصل جوہر مولاناؒ کے سامنے اس وقت آیا جب انھوں نے ۱۹۳۵ء کے بعد سے اقبالؒ کے شعری مجموعوں "ضرب کلیم" "بال جبریل" "اسرار خودی" "رموز بے خودی" مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، پیام مشرق، جاوید نامہ اور زبور عجم" کا مطالعہ کیا، مولاناؒ کے ذہن و دماغ نے ان کا وہ اثر قبول کیا جو ادب و شعر اور فکر کے میدان میں کسی اور کا نہ تھا، مولاناؒ کے بقول اقبالؒ سے متأثر ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ معاصر اہل قلم و اہل علم کی علمی تحقیقات و فتوحات اور پیش رفت اور مواد و معلومات کے ماخذ انھیں معلوم تھے اور کم و بیش اس پر نظر

تھی، اور اندازہ تھا کہ محنت و مطالعہ اور کہنہ مشقی سے وہ منزل حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن اقبالؒ کے افکار وخیالات اور ان کے سوز و ساز کا سرچشمہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔ مولاناؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں، اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے، انسان بہت خود بیں و خود پسند واقع ہوا ہے، اسکی محبت اور نفرت، تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اسکی ذات ہی ہوتی ہے، اس لئے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اسکی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے، میں بھی اپنے کو اس کلیہ سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلام اقبالؒ کو عام طور پر اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے، وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے، سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے، میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔"(۱)

"علامہ اقبالؒ سے مولاناؒ کی دوسری ملاقات نومبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اقبال اس وقت اپنی طویل علالت کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گئے تھے، پھر بھی وہ بڑے نشاط سے ملے، دیر تک مجلس رہی اور مختلف علمی، فکری اور ادبی موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، ان کا خادم بار بار زیادہ بات کرنے سے منع کرتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ مانی دوران گفتگو جاہلی اشعار کی سچائی اور جوش کا ذکر بھی علامہؒ نے کیا اور

حماسہ کے کچھ اشعار سنائے، انھوں نے ہندوستان کی تجدیدی واصلاحی تاریخ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اورنگ زیب عالمگیرؒ کی خدمات کو بہت سراہا اور یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر یہ خدمات نہ ہوتیں تو ہندوستانی تہذیب اور فلسفۂ اسلام کو نگل جاتا، اقبال نے بعض صوفیہ کی فکری بے اعتدالی اور افراط پر نقد بھی کیا اور وجد و سماع سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی، اسی مجلس میں (جو آخری ثابت ہوئی) مولاناؒ نے ان سے ان کے کلام کے عربی ترجمہ کی اجازت بھی چاہی جو انھوں نے بخوشی منظور کرلی، مولانا اس ملاقات کی تفصیلات و تاثرات کا ذکر "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں کیا جو متعدد رسالوں میں طبع ہوا۔

مولانا اقبالؒ کے فکر و فن کے گہرے عقیدت مند تھے، وہ اقبال کو تعلیم جدید کا اس صدی کا سب سے بہتر نمونہ اور جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا کرتے تھے، تہذیبِ مغرب کے کمزور پہلوؤں پر اقبالؒ کی نگاہ دوررس سے مولاناؒ بہت متاثر تھے، مولانا کی کتابوں، مضامین اور خطبات میں شعر اقبال اور فکر کا حوالہ اور اقتباس ہر جگہ ضرور ملتا ہے۔ یہ اقبال کے پیغام ایمان و محبت و عالی حوصلگی اور عشق رسول ﷺ سے مولاناؒ کی فکری ہم آہنگی اور توافق کی دلیل ہے، اقبال نے اسلامی قیادت و شرف کی بحالی کے لئے جو کوشش کی اور وطن پرستی اور قومیت کی جس طرح دھجیاں بکھیریں، مولانا اس میں اقبال کے پورے مؤید اور معاون نظر آتے ہیں، مولانا بجا طور پر اقبالیات کے ماہرین اور رمز شناسوں کی اگلی صف میں جگہ پانے کے اہل ہیں۔

اقبال کی اس عقیدت میں کہیں بھی مولانا سید دامن اعتدال نہیں چھوٹا ہے، وہ اقبال کو معصوم اور مقدس نہیں مانتے، نہ ہی ان کی مدح سرائی اور ان کے کلام سے استناد میں حد افراط کو پہونچے نظر آتے ہیں، مولانا کے بقول اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی بعض ایسی تعبیریں بھی اقبالؒ کے یہاں ہیں جن سے اتفاق مشکل ہے، بہت سے ایسے خیالات و افکار بھی ہیں جن کی تاویل و توجیہ اور اہل سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے، مولانا اس کے قائل کبھی نہیں رہے کہ اسلام کو اقبال سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہونچا ہی نہیں، بلکہ مولاناؒ

"زندگی کے ہر دور میں اس کے قائل رہے کہ اقبالؒ اسلامیات کے مخلص طالب علم تھے اور اپنے مقتدر معاصرین سے وہ برابر استفادہ کرتے رہے، ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنھیں دور کرنے کا انھیں موقعہ نہیں ملا، مولانا اس حقیقت پر یقین رکھتے تھے کہ اقبال وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے، مولانا لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ پیغام محمدی کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام اور اسکی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی ہے، اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے، اس معاملہ میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انھیں اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے، میں پھر کہتا ہوں کہ انھیں میں نے اولوالعزمی، محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا، اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینی شروع کیں احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعتِ اسلامی کی رو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔"(۲)

عرب ممالک میں ٹیگور کی مقبولیت اور اقبالؒ کی گم نامی مولاناؒ کو بیحد کھٹکتی تھی، وہ اس صورتحال کو اپنی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ وہ اقبال کو متعارف نہیں کرا سکے، عربی اخبارات و رسائل میں ٹیگور کے سلسلہ میں تعریفی مضامین دیکھ کر مولاناؒ کے دل میں اقبال کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہو جاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض و امانت سمجھنے لگتے، ۱۹۵۰ء میں مولاناؒ نے اپنے طویل سفر حجاز و مصر و شام میں اقبال اور ان کے فکر و فن سے متعلق چند مقالات لکھے اور انھیں مصر کے دارالعلوم اور قاہرہ یونیورسٹی میں پڑھا، ۱۹۵۶ء میں ایک اور مقالہ سفر شام میں دمشق میں "محمد اقبالؒ فی مدینۃ الرسول، اقبال درِ دولت پر" کے عنوان سے دمشق ریڈیو پر نشر ہوا، کلام اقبال کے ترجمہ پر مولاناؒ کی طبیعت پوری طرح آمادہ نہیں ہو رہی تھی، جن حضرات نے یہ کام کیا تھا ان کی ناکامی اور تاثیر کا فقدان سامنے آچکا

تھا، اس دوران دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں وہاں کے مشہور ادیب شیخ علی طنطاویؒ کا ایک کھلا خط طبع ہوا جس میں انھوں نے مولانا کو شعر اقبال کے ترجمہ کی دعوت بڑے مؤثر انداز میں دی، اس پیشکش کا جواب مولانا نے بڑی گرمجوشی سے دیا اور اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کا ایک ہی نشست میں ترجمہ کر ڈالا، اس کے بعد مستقل کئی مقالات لکھے (جن میں شعر اقبال کے اہم مضامین کی ترجمانی آگئی ہے، لفظ بہ لفظ ترجمہ خود مولاناؒ کو پسند نہ تھا) جن سب کا مجموعہ "روائع اقبال" کے نام سے منظر عام پر آیا اور بیحد مقبول و معروف ہوا، اسکا اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے نام سے مشہور عالم و ادیب مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں (جو خود دبستان اقبال کے ایک لائق طالب علم اور تربیت یافتہ ہیں) کے قلم گہربار سے سامنے آیا جو بے حد مؤثر اور مشہور ہوا، "روائع اقبال" مولاناؒ کی اہم تصانیف میں ہے۔ یہ منظوم ترجمہ نہیں لیکن اسکی فصاحت و ادبیت اتنی مسحور کن ہے کہ اسے شعر منثور کہا جاسکتا ہے، کتاب کا اردو ترجمہ بھی مترجم کی ادبیت اور قابلیت کا مظہر ہے، عربی کی ساری خوبیاں ترجمہ میں منتقل ہوگئی ہیں اور ترجمہ اپنی سلاست کی وجہ سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، اقبالیات کے ماہرین نے مولانا کو اس کتاب پر بڑی داد دی، علامہ اقبالؒ کے صاحبزادۂ گرامی ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے تاثرات یوں ظاہر کئے کہ "آپ نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جیسے اغلباً اقبال محسوس کرتے یا چاہتے تھے، (۳) روزنامہ جنگ کراچی دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں ایک تبصرہ میں یہ ذکر تھا کہ "اقبالیات پر مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ جیسی ثقہ علمی و دینی شخصیت کا قلم اٹھانا بجائے خود تاریخ ادب کا بڑا واقعہ ہے، مولانا نے اصل کتاب عربی زبان میں تصنیف کر کے عالم اسلام کے اتحاد کے نقیب اقبال کو دنیائے عرب میں ایک نئے انداز سے متعارف کرانے کی سعی جمیل کی ہے" (۴) مشہور ادیب و مصنف و شاعر مولانا ماہر القادریؒ مرحوم نے اپنے ماہنامہ "فاران" مئی ۱۹۷۱ء میں جو تبصرہ فرمایا وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ لکھتے ہیں:

"مولانا علی میاں نے علامہ اقبالؒ کی نظموں اور شعروں کے انتخاب میں بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے، انھوں نے اس خریطۂ جواہر سے سب سے زیادہ تابناک لعل و گہر چنے ہیں، فاضل مصنف نے جس حسن نزاکت اور دیدہ وری کے ساتھ اشعار اقبال کی تشریح و ترجمانی کی ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی

جائے کم ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کار فرما ہے۔ ترجمہ انتہائی سلیس اور شگفتہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔۔۔

"اقبال پر بڑی اچھی کتابیں آئی ہیں مگر یہ کتاب اس مجاہد عالم کی لکھی ہوئی ہے جو اقبال کے "مرد مؤمن" کا مصداق ہے، اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نقوش اقبال" میں خود اقبال کی فکر اور روح اس طرح گھل مل گئی ہیں جیسے پھول میں خوشبو اور ستاروں میں روشنی"۔(۵)

ایک مرد مؤمن اور انسان کامل کے بارے میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ مرحوم جن شعری تاثرات و جذبات کی تفسیر و تشریح مولاناؒ نے اپنی شہرۂ آفاق عربی تصنیف "روائع اقبال" میں فرمائی ہے اور جس کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر شمس تبریز خاں صاحب نے "نقوش اقبال" کے نام سے بڑی شستہ اور سلیس زبان میں کیا ہے وہ سب بے کم و کاست مولانا کی قد آور شخصیت کی قامت پر راست آتے ہیں، ہم بلا تبصرہ انھیں جوں کا توں نقل کر دیتے ہیں۔

"اقبالؒ اس مسلم نوجوان کی تمنا کرتے ہیں جسکی جوانی بے داغ اور جسکی ضرب کاری ہو، جو جنگ میں شیر و پلنگ اور صلح میں حریر و پرنیان ہو، جو رزم و بزم دونوں کا حق ادا کرے، جو "نرم دم گفتگو گرم دم جستجو" کی مثال اور صلح و جنگ میں مثالی شخصیت کا مالک ہو، جسکی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں، جو فقر میں غنی اور امیری میں فقیر ہو، بوقت تنگدستی خوددار و غیور اور بوقت فراخ کریم و حلیم ہو، جو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہو، جو حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح تند و گرم ہو، کبھی وہ شبنم ہو جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پہونچتی ہے، اور کبھی وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں، اگر اسکی راہ میں کہستاں و سنگستان آئیں تو سیل تند رو اور اگر محبت کا شبستان سامنے ہو تو "جوئے نغمہ خواں" بن جائے، جو صدیقؓ کا ایمانی جلال علیؓ مرتضیٰ کی قوت و فتوت، ابوذرؓ کا فقر و استغناء اور سلمانؓ کا صدق و صفا رکھتا ہو، جسکا یقین بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہو، جو مؤمنانہ حکمت و فراست کا آئینہ دار اور ہمت مردانہ کا علمبردار ہو، جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتا ہو، جو ستاروں پر کمند ڈال سکتا اور نوامیس فطرت کو مسخیر بنا سکتا ہو، جو اپنی رفعت و عظمت میں فرشتوں کے لئے بھی باعث رشک ہو، جسکا وجود دنیا میں کفر و باطل کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو، جسکی قیمت پوری کائنات نہ بن سکے

اور جسے اس کے خالق و مالک کے سوا کوئی نہ خرید سکے، جس کے مقاصد جلیلہ اسے زندگی کی سطحیت اور زیب و زینت سے بلند تر کر چکے ہوں، جو چنگ و رنگ اور نغمہ و آہنگ کے فریب سے نکل چکا ہو اور تہذیب جدید کے بلبل و طاؤس کی تقلید سے یہ کہہ کر انکار کر چکا ہو کہ ع بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ!"(۶)

"ایک مرد مؤمن مختلف اور متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے، جو اسکی طبعی رنگا رنگی اور تنوع پسند کی آئینہ دار ہوتی ہے، اور وہ مختلف و متضاد صفات دراصل اللہ تعالیٰ کے صفات و احوال کے مظاہر ہیں، اور ایک "مسلم" اللہ کی ان صفات کا مظہر ہوتا ہے، مثلاً کشادہ قلبی، عفو درگذر اور حلم و بردباری میں وہ خدا کی صفت "غفار" کا پرتو ہے، اور اسی طرح دین حق کے بارے میں شدت، کفر و باطل پر غصہ و غضب میں اسکی صفت "قہار" کا مظہر ہے، اور پاکدامنی پاک نفسی صفت "قدوس" کی آئینہ دار ہے، ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق و صفات کا اپنے آپ کو پرتو نہ بنالے۔ ؎

قہاری ، غفاری ، و قدوسی ، جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں (۷)

"اقبالؒ" کے اس مرد مؤمن اور مسلم مثالی کو اس کے ایمان کی قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت دنیا کے ان سارے انسانوں سے جو شک و ریب میں مبتلا ہیں ممتاز کر دیتی ہے، اور اسی طرح وہ بزدل انسانوں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت و مردانگی اور روحانی قوت سے ممتاز ہے، ایک مسلم کی توحید خالص اسے بندۂ انسان مال و زر سے علیحدہ کر دیتی ہے، اسکی آفاقیت و انسانیت، وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے، وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے، جس کے ماتحت وہ زندگی گذارتا ہے، زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آجائے، لیکن اس کے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بدلتا ہے، اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے "کشجرة طیبة أصلها ثابت و فرعها فی السماء" اسکی مثال ایسے پاک درخت کی ہے جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں،

اقبال کہتا ہے۔ ؎

فقط پر کار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز (۸)

"اقبال کا مرد مؤمن زندہ جاوید ہے اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے، اور اس کی زندگی ایک زندئے جاوید مقصد کیلئے گزرتی ہے۔ ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل (۹)

"اقبال کی نگاہ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں بلکہ اسکی نگاہ کہیں اور پہونچتی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف مرد مؤمن ہے، عالم کا وجود اس کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے" یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کیلئے وجود میں آئے ہیں، وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے، اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے۔ ؎

عالم ہے فقط مؤمن جانباز کی میراث
مؤمن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے (۱۰)

"اقبال کا خیال ہے کہ ایک مؤمن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کی فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا ہے،" وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رخ پھیر دے عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج کا رخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل اور ارادہ کے تابع ہو جائے اسلئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کیلئے ایک زندہ پیام رکھتا ہے جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے، اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے، اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے، دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے، اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اسکا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کیلئے کسی طرح یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانہ کے آگے ہتھیار ڈالدے اور اپنے آپ کو غلط

سماج کے سپرد کردے، بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانہ کے خلافِ علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے یہاںتک کہ کامیابی وکامرانی اس کے قدموں میں آگئے، اقبال کے نزدیک "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریۂ زندگی ایک مردِ مؤمن کے لئے کسی طرح صحیح نہیں، وہ کہتا ہے:۔

حدیث کم نظراں ہے "تو بازمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ ساز و تو بازماہ ستیز (۱۱)

"اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک مسلم ربانی کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اسکا ملک و وطن ہے، اس میں مشرق و مغرب کی کوئی تقسیم نہیں:۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اسکا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند (۱۲)

ایک بندۂ مؤمن اور انسان کامل کیلئے علامہ اقبالؒ کے یہ جذبات ہیں، ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ اگر اقبال زندہ ہوتے تو یقیناً انھیں مولاناؒ کی شخصیت و کردار میں وہ بندۂ مؤمن مل جاتا جس کی انھیں تڑپ اور جستجو تھی، بلاشبہ مولانا اقبال کے "بندۂ مؤمن" کے معیار پر کھرے اترتے ہیں، "وذلك فضل الله يؤته من يشاء "ان کمالات اور خوبیوں پر اس کے سوا کچھ اور تبصرہ نہیں ہو سکتا جو ایک عرب شاعر نے اپنے شعر میں کیا ہے:۔

ولولا بدائع صنع الله ما نبتت تلك الفضائل فى لحم ولا عصب

حواشی:۔

۱۔ نقوش اقبال ص ۳۳، ۳۴
۲۔ ایضاً ص ۴۰، ۴۱، ۴۲ مختصراً
۳۔ ایضاً ص ۱۰
۴۔ ایضاً ص ۱۵ مختصراً
۵۔ ایضاً ص ۱۴
۶۔ ایضاً ص ۱۰۱، ۱۰۲
۷۔ ایضاً ص ۱۲۷
۸۔ ایضاً ص ۱۱۸، ۱۱۹
۹۔ ایضاً ص ۱۲۰، ۱۲۱
۱۰۔ ایضاً ص ۱۲۱
۱۱۔ ایضاً ص ۱۲۲
۱۲۔ ایضاً ص ۱۲۶

(اس مضمون کی ترتیب میں "کاروان زندگی اول نقوش اقبال، اسلامیت و مغربیت، کی" سے استفادہ کیا گیا ہے

☆☆☆

(۵)

تأثرات و ملاحظات

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر

صبر و ضبط کی تلقین

از: محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب حقی، خلیفۂ اجل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

ہم سب کے بزرگ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت سے ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، ظاہر ہیکہ یہ موقع کس قدر غم اور صدمہ کا ہے اور صدمہ بھی کسی فردِ واحد یا کسی ایک ادارہ کا نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ کا ہے، اسلئے سبھی اہلِ ایمان کی تسلی کیلئے حضرت مولانا علی میاں ندوی کی وفات پر ۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ بعد نماز جمعہ مسجد حقی میں محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم نے جو کچھ بیان فرمایا، اسکو آں مخدوم دامت برکاتہم کی نظر ثانی کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، تاکہ غمگین دلوں کی تسلی اور صبر و سکون کا ذریعہ بنے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اور آں مخدوم کا سایۂ عاطفت امت پر تادیر قائم رکھے۔ آمین

(نز:۔ مرتب: احقر فہیم احمد نگینوی نائب مفتی مدرسہ اشرف المدارس۔ ہردوئی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یاایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ، ان اللہ مع الصابرین، وقال تعالیٰ: لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔

یہ قرآن پاک کی دو آیتیں ہیں اور حدیث پاک کا بھی مضمون ہے کہ مومن ہر حال میں کامیاب ہے، کیونکہ ہر انسان کو دو حالتیں پیش آتی ہیں یا تو طبیعت کے موافق حالت پیش آئے گی یا طبیعت کے خلاف۔

ایک شخص صبح ہی گھر سے نکلا اور چار پانچ باتیں اس کے ذہن میں ہیں، اب یا تو اس طرح ہوگا جس طرح وہ چاہتا تھا، یا نہیں، اگر اسی طرح ہوجائے جس طرح وہ چاہتا تھا، تو حدیثِ پاک کا مضمون ہے کہ: مومن اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے اور اس کا شکر کرتا ہے اور جیسا چاہتا تھا اگر

ویسا نہیں ہوا۔ کچھ باتیں تو طبیعت کے موافق ہوتیں اور کچھ خلاف۔ جب بھی مومن اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔

"قدم مجذوب کے رکتے نہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں"

البتہ دونوں کی حمد کے کلمات الگ الگ ہیں جب طبیعت کے موافق معاملہ پیش آئے تو اس موقع پر حمد اس طرح کرتا ہے۔

الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات ، ترجمہ: شکر ہے اللہ کا جس کے فضل سے اچھے کاموں کی تکمیل ہوتی ہے ۔ اور جب طبیعت کے خلاف معاملہ پیش آئے تو اس طرح حمد کرتا ہے۔

الحمد للہ علی کل حال ، ترجمہ: شکر ہے اللہ کا ہر حال میں۔

بہر حال دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اور ہر حال میں مومن کامیاب ہے۔

اسی کو حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے الفاظ میں کہا ہے۔

کبھی نظر میں جمال تیرا، کبھی نظر میں جلال تیرا
بس اب ہے اور خیال تیرا، کسی کا اس میں گذر نہیں ہے

اور اسی کے ذیل میں یہ شعر بھی ہے، " قدم مجذوب کے رکتے نہیں ہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں"

طبیعت کے موافق حالات پیش آئے، شکر کیا، آگے بڑھ گئے۔ طبیعت کے ناموافق حالات پیش آئے، صبر کیا آگے بڑھ گئے۔

قدم مجذوب کے رکتے نہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں
رفیق اک اک جدا منزل بمنزل ہوتا جاتا ہے

کوئی ساتھی تو بے صبری سے گرتا ہے اور کوئی ناشکری سے۔ طبیعت کے مخالف واقعہ پیش آنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ صدمہ ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں پیش آتی ہیں۔

صدمہ کے اسباب

جب طبیعت کے خلاف واقعہ پیش آئے تو یہ سوچو کہ ان للہ ما اخذ۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہم سے لیا وہ اسی کا تھا۔ کوئی چیز ہمارے پاس تھی، چلی گئی، کوئی جانور ہمارا تھا، اسکی موت ہوگئی۔ کوئی سامان تھا چوری ہوگیا۔ کوئی ہمارے عزیز و دوست تھے، ان کی رحلت ہوگئی۔ یہی صورتیں عام طور سے طبیعت کے مخالف پیش آنے کی ہوتی ہیں۔

اس پر صدمہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس سے ہمارا تعلق تھا، ہماری چیز چلی گئی۔ ہمیں دوسروں کے یہاں چوریوں کی اطلاعات ملتی ہیں، کسی کی سائیکل، کسی کی موٹر، کسی کا اور کچھ گیا۔ ان پر کوئی صدمہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی کسی کی رحلت کی اطلاع ملتی ہے، اس پر صدمہ نہیں ہوتا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس سے ہمارا تعلق نہیں تھا۔

دوسرے صدمہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے ہماری چیز گئی۔ تم تو اس کے مالک نہیں تھے۔ مثلاً تم سفر حج کو جاتے وقت اپنی کار اپنی کوٹھی کسی کے حوالہ کر گئے تھے۔ اب دو مہینہ بعد آنے کا وقت قریب ہوا تم نے کہلا بھیجا، فلاں تاریخ تک ہم آنے والے ہیں خالی کر دو۔ وہ نفع اٹھا رہا تھا آرام مل رہا تھا اس سے اس کو تکلیف تو ہوگی مگر ہنسی خوشی خالی کرنے کو تیار ہو جائے گا کہ دو مہینہ ہی آرام اٹھانے کا موقع دیا۔

تخفیفِ غم کا طریقہ

اسی لئے میرے عزیزو، دوستو! جب کبھی کوئی بات پیش آئے تو اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ یہ سوچو! تم اس کے مالک تو ہو نہیں تمہارے پاس امانت ہے، عاریۃً چیز دی گئی ہے۔ مالک کو حق ہے، جب چاہے اپنی چیز کو لیلے۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمتیں جو ہم کو ملی ہوئی ہیں۔ ان کو بھی سوچا کرو اور ان پر بھی نظر رکھو، اس سے بھی غم اور صدمہ میں کمی ہو جائے گی۔ جیسے شفیق والدین بچہ کا آپریشن کراتے ہیں، بچہ کو تکلیف ہوتی ہے تو اس کو تسلی دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں۔ فکر نہ کر، انشاء اللہ جلدی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ ہم لوگ تو موجود ہیں۔ ایسے موقعوں پر اسی لئے یہ حدیث پاک کا مضمون سنایا جا رہا ہے۔

ایک خبر ملی ہے جو ہم سب کے لئے قابل افسوس ہے۔ ان سے دنیا واقف ہے، لوگوں کو ان سے محبت کا، عظمت کا تعلق ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ دو تین دن قبل لکھنؤ سے تکیہ تشریف لے گئے تھے، وہاں پر آج جمعہ سے قبل جب کہ لوگ مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے، ادھر ان کی رحلت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ظاہر ہے کہ یہ ہم سب کے لئے صدمہ کا باعث ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو صدمہ صحابہ کرام ؓ نے اٹھایا تھا، اس کے برابر تو کوئی غم نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ کی چیز تھی، امانت تھی، اس نے لے لی، باقی جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔

راضی بر قضاء

اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں کی رحلت ہو جاتی اور فلاں رہتا، تو فرمایا نہیں ہر ایک کے لئے ہم نے وقت مقرر کر دیا ہے، لہٰذا تم اپنے لئے خیر کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی، اور حکیم کے ہر کام میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔

مجذوب صاحب نے اسی کا ترجمہ کیا ہے۔

مالک ہے جو چاہے کرے تصرف — کیا وجہ کسی بھی فکر کی ہے
بیٹھا ہوں مطمئن کہ یا رب — حاکم بھی ہے تو حکیم بھی ہے

اور یہ اطلاع ملی ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ وہیں تکیہ میں ہوگی جہاں مولانا کا قیام ہوتا تھا۔

دو اہم ہدایات

میرے عزیزو! اخیر میں ایک بات اور عرض کر دوں، ہمارے اندر دو دینی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، ایک تدفین میں تاخیر کرنا، سنت طریقہ جو ہماری دینی کتابوں میں لکھا ہے یہ ہے کہ اگر کسی کا صبح کے وقت انتقال ہو اور جمعہ مانع میں ایک بجے ہوتا ہے اور قبرستان ایسی جگہ ہے کہ دفن کر کے ساڑھے بارہ بجے تک آجائیں گے جمعہ نہیں چھوٹے گا تو تدفین کے لئے جمعہ کا انتظار کرنا جائز نہیں۔ ویجهز الميت صبيحة يوم الجمعة يكره تاخير الصلوٰة عليه، ليصلي عليه الجمع العظيم بعد صلوٰة الجمعة۔ (طحطاوی ص۳۳۲)۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جس بستی اور جس شہر میں انتقال ہو وہیں دفن کرنا چاہئے ويستحب الدفن في محل مات به۔ (مراقی مع طحطاوی ص۳۳۷)

اصل حکم سنت طریقہ ہے۔ کسی کا عمل حجت نہیں، جن اکابر کی نقل میت ہوئی، بعد کے لوگوں نے کیا، وہ تو زندگی بھر سنت کی تعلیم و تلقین کرتے رہے۔ حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لاہور میں رحلت ہوئی، انھوں نے وصیت و تاکید کی تھی کہ دیکھو مجھے یہیں دفن کرنا، لیکن جو کچھ ہوا بعد کے لوگوں نے کیا۔ اپنے بڑوں کا عمل دیکھو، بس باتیں بتلا دی گئیں، کچھ پڑھ کر تلاوت کر کے ثواب پہونچائیں اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعاء کریں، اصل چیز یہی ہے۔

آخرت کی تیاری کیجئے

عادت اللہ یہی رہی ہے کہ ساری امت نے اپنے بڑوں کا صدمہ اٹھایا ہے۔ ہر علاقہ میں کوئی نہ کوئی تو بڑا عالم ہوتا ہے، سب کا نمبر آتا ہے جانے کا، اور آیا ہی ہے دنیا میں جانے کے لئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے بزرگ تھے، پھر صحابہ کرامؓ کی شان

☆☆☆ علی میاںؒ ☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

علی میاںؒ مرحوم نہیں، ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمت دین وملت کے لئے مدتوں اس خاکدان کو زندہ وسر سبز رکھیں۔ سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم وفضل میں، سنجیدگی فکر میں، اخلاص میں، اخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت وطاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل، رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور بھی لوگوں سے میں واقف ہوں۔ باپ اور بھائی کا کیا کہنا، دونوں نور علیٰ نور پاک صاف، طاہر ومطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) اس سے بنے ہوئے۔ دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر وقابل فخر۔ یہ اس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!

ندوہ دیوبند ماشاء اللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا، اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور انہی میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق وروحانیت کا سبق لیا۔ ذکاوت وفطانت کے پتلے پہلے سے تھے، چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت تحصیل کرلی۔ اور عربی ادب وانشاء میں تو ہندوستان اور عالم اسلام میں نام پیدا کرلیا ہے۔ خود اردو شعر وادب کا اعلیٰ مذاق رکھے ہوئے۔ شامی ومصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کرلی۔ تقریر وحکایت میں ملکہ، روانی تحریر سے بھی زائد۔ میری طرح کاہل اور جامد نہیں، ندوے کے سے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں، اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ۔ ابھی یہاں ابھی وہاں، اور مقالات وتصانیف ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹاکھٹ نکلتی چلی آرہی ہیں۔ اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ کسی حد تک ترکی میں بھی۔ زندگی قابل داد بھی، قابل رشک بھی!

خود مجھے اپنے معاملے میں "بخل" یا تواضع بیجا کی شکایت البتہ ہے۔ ایک بار نہیں شاید دو

ایک بار، اور اشارتاً و کنایتاً نہیں منہ پھوڑ کر پوچھا کہ حضرت شاندار مصطلحات تصوف کا مفہوم کچھ تو ہم نیاز مندوں پر کھولیے اور "تنازل ستہ" کے چہرے سے نقاب زرا سرکائیے "توجہ باطن" سے قلب کو گرمائیے۔ کچھ جواب نہ ملا تجاہل سا کر کے ٹال گئے۔۔۔ ایسا تجاہل جو دانستہ تغافل سے کم نہیں!

اتنے کام مختلف قسم کے اپنے سر لے رکھے ہیں کہ کوئی ان کی مفصل فہرست ہی بنالے تو یہی ایک کمال ہے۔ مختصر یہ کے سیاسیات ملی اور کلام، تاریخ امت اور سوانح اکابر، اسرار شریعت پر تو خاصا کام کر چکے ہیں، بلکہ مبتدیوں کی حد تک تو عربی ادب و انشا میں بھی۔

میں اپنے وصیت نامہ میں لکھے جاتا ہوں

کہ میرے وقت موعود کے آجانے پر پہلے تلاش ان ہی کی کی جائے اور اگر یہ مل جائیں تو جنازہ پڑھانے کے حق دار نمبر اول یہی ہیں۔ (وصیت پوری ہو کر رہی)

دنیا انہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے ہم لوگوں کی زبانوں پر خالی "علی میاں" ہیں، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز۔ (معاصرین)

(بقیہ ص ۵۸۷) دیکھو ایک ایک اور پھر صلی اللہ علیہ وسلم تو سب کے لئے ان ساری چیزوں کو سوچا جائے اور آخرت کی فکر و تیاری کی جائے۔

آخرت کی فکر کرنی ہے ضرور — جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور
زندگی ایک دن گذرنی ہے ضرور — قبر میں میت اترنی ہے ضرور

اللہ تعالیٰ ان باتوں کو قبول فرمائے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولاناؒ اور کچھ ذاتی تاثرات

مولانا محمد ولی صاحب رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر

زندگی اس طرح گذری ہے کہ دن تاریخ تو دور کی بات، سنہ وسال بھی یاد نہیں رہتے، جو گذری گذر گئی، وقت گذر جاتا ہے اور گذر جانا وقت کا مقدر ہے۔ اپنا نامہ اعمال کبھی نہیں لکھا، جن لوگوں کو اپنے وقت اور اپنی قیمت واہمیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے وہ ڈائری لکھتے ہیں، میرے پاس اہم واقعات کے نوٹس بھی نہیں ہیں۔ اس لئے اللہ کی مدد اور حافظہ کا یارا ہے ویسے اللہ کا کرم ہے کہ جو حافظہ کی گرفت میں آگیا اسکی رہائی آسان نہیں ہوتی۔

یاد آتا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات ۵۹ء میں ہوئی تھی۔ برسوں برس پر پھیلے ہوئے حقائق واقعات چھوٹے بڑے، تلخ وشیریں، گفتنی ناگفتنی کو سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ کم وبیش چالیس برس کی واقفیت، تیس سال کے روابط، بیس سال کا قرب اور کاموں میں میری عزیزانہ اور خادمانہ شرکت، پچھلے دس سال کا براہ راست عملی رابطہ اور دور قریب سے کاموں میں کچھ نہ کچھ ساتھ، نہ یہ مدت تھوڑی ہے نہ تجربے مختصر۔۔ اس عرصہ میں بہت سے نرم گرم مرحلے آئے، قرب وبعد کی منزلیں بھی گذریں، آج ماضی کے جھروکوں میں جھانکتا ہوں۔ تو بہت سے نقوش مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں، انہیں لفظوں کا جامہ پہنادیا جائے تو خاصی کتاب تیار ہو جائیگی، چالیس سال کو کتنا ہی مختصر لکھئے چالیس صفحات تو چاہئیں، یہ تو داستان ہوگی۔ کچھ زیب داستان کو ملالیجئے، تو پھر تحریر کی طوالت مخل بھی ہوگی مملل بھی!

اسے جھیل بھی لیں تو بھی ان واقعات کا تذکرہ واحد متکلم کی شناخت بن جاتا ہے۔ جو واحد غائب کے پردہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ عقلمندوں کی پختہ رائے ہے کہ "حصول کامیابی"

اور "رفع درجات" کا یہ عمدہ نسخہ ہے۔ میرا احساس ہے کہ "ذکر اپنا" "در حدیث دیگراں" بات اچھی تو ہے لطیف نہیں!۔۔۔ ویسے کسی مرکزی شخصیت کے متعلق لکھنے والے کی ذاتی واقفیت، مشاہدات اور محسوسات کو قلم کی گرفت میں لایا جائے تو ہوگی کام کی چیز۔۔۔ مگر سامعین اور قارئین کی چیں بجبینی کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں، ایسے مضامین مفید ہوتے ہیں۔ مگر ہر فائدہ مند چیز پسندیدہ بھی ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ اگر تھوڑی سی حکمت و تدبیر کو راہ دیجائے، اور درد تنہا کو غم زمانہ جیسی چیز بنادیا جائے تو بھی دل سے دھواں اٹھے گا کہ ؎

ہم نے بے فائدہ چھیڑی غم ایام کی بات
کون بیکار یہاں ہے کہ سنے کام کی بات

حضرت مولانا کا اصل مشن اسلام کو سمجھانا تھا۔ زبان کے ذریعہ، قلم کے ذریعہ، نشان قدم کے ذریعہ! وہ اسلام کے ترجمان اور بزرگوں کے طرز و انداز کے عملی شارح تھے، اسلام کی تعلیم و تفہیم، تشریح و تبلیغ کیلئے انہوں نے ہزاروں صفحات لکھے، ان گنت تقریریں کیں۔ مختصر مجلسوں میں لوگوں کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کو بزرگوں کی صحبت میں تپا کر، گرما کر ایسے سانچہ میں ڈھال لیا، جو دوسروں کیلئے نمونہ تھی۔

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری، آگہی و بے خبری، سیرابی و تشنہ لبی، چوکسی و سست روی، نہ ہر شخص میں برابر ہوتی ہے اور نہ ہر ایک مرحلہ میں یکساں ہوا کرتی ہے، الگ الگ موقعوں پر علٰحدہ اوصاف کا مناسب اور متواجن ظہور بزرگوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان مرحلوں کے لئے شئون کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ شئون دوسروں کے لئے قیمتی مواقع ہوتے ہیں۔ بزرگوں سے جو چیزیں لینے کی ہوتی ہیں لینے والے لے لیتے ہیں، اسی لئے بزرگوں نے کسب فیض پر بڑا زور دیا ہے۔ فائدہ اٹھانے کا ارادہ اور اسکی صلاحیت ضروری ہے۔ چاہے یہ فطری ہو یا حاصل کرلیجائے،۔۔۔ سورج کی روشنی اور چاند کی ضیاء پاشی تو سب کیلئے ہے مگر آنکھیں کھولنی ہونگی۔ اسکی ذمہ داری سورج اور چاند پر نہیں۔ انسان پر ہے، روشنی کا حصول اور فیضان کا قبول فرد کی اپنی ہمت اور صلاحیت پر موقوف ہے۔

بزرگوں کی زندگی کے بہت سے گوشے ان کے شئون ہیں۔ لوگوں کیلئے انہیں اپنی اصلاح اور صلاح کا خزینہ ہوا کرتا ہے۔ حضرت مولانا کی تحریر تقریر اور ان کی زندگی کا مطالعہ اس جہت سے کیا جائے، تو بڑا فائدہ ہوگا۔ اس مطالہ کی قریب تر مشاہدہ گاہ ذاتی زندگی کے واقعات و تجربات ہیں، جن پر غور کیا جائے تو بڑے کام کے جوہر ملتے جائیں گے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب سے نیاز مندی کا شرف مجھے بھی حاصل رہا ہے، بہت سی یادیں ہیں جو دل کی امانت ہیں، جنکا دل میں ہی رہنا اچھا ہے، بہت سی باتیں ہیں، جنہیں دوسروں تک پہونچایا جاسکتا ہے، وضو سے ملی ٹھنڈک صرف اپنے لئے ہوتی ہے۔ اسکے نتیجہ میں جو استعداد پیدا ہوتی ہے۔ اس سے دوسرں کو فائدہ پہونچایا جاسکتا ہے۔۔۔

یاد آتا ہے، ۵۹ء کی بات ہوگی، حضرت مولانا اچانک گرمی کی ایک دوپہر مین خانقاہ رحمانی، مونگیر تشریف لائے، ہم لوگ بے خبر تھے، والد ماجد (۱) نے فرمایا آپ نے خبر نہ کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ جھا جھا کا پروگرام تھا، اتنا قریب آکر خانقاہ حاضری نہ دیتا تو اپنے آپ پر زیادتی ہوتی۔ یہ ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے، ندوہ، خانقاہ رحمانی، جامعہ رحمانی سب حضرت مونگیری کے لگائے باغ ہیں۔ یہاں ہم سبھوں کو عزیزانہ اور عقید تمندانہ آنا چاہئے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے قیام رہا ہوگا، کھانا بھی کھایا، خانقاہی دستر خوان پر کیا ملتا، مگر جو تھا، حاضر تھا، حضرت مولانا نے صبر و شکر کے ساتھ اسے جھیلا نہیں، ذوق و شوق کے ساتھ کھایا، پھر کتب خانہ رحمانیہ کی عمارت گھوم پھر کر دیکھی، اپنے والد ماجد (۲) کی بعض کتابوں کے بارے میں دریافت کیا، وہ کتب خانہ کی زینت تھیں، ان کے انبساط میں اضافہ ہوا، کتب خانہ رحمانیہ کوئی بہت بڑا کتب خانہ نہیں ہے، مگر عربی فارسی اسلامیات کا قابل لحاظ ذخیرہ اسمیں موجود ہے، اوپر کتب خانہ کا جاذب نظر ہال ہے، اور نیچے حوض، پانی سے بھرا، سامنے مسجد، علم بھی عمل بھی، وضو بھی نماز بھی اذان بھی، ایمان کی پہچان بھی! حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ (۳) نے یہ خاکہ سنا تھا تو

---

(۱) امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی رحمتہ اللہ علیہ (۱۹۱۲ء۔۱۹۹۱ء) (۲) حضرت مولانا حکیم عبدالحئی حسنی صاحب رحمتہ اللہ علیہ (۳) حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ (۱۸۹۲ء۔۱۹۵۶ء)

بے ساختہ فرمایا تھا، حنت تجری من تحتھا الانھار۔۔۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے فرمایا: کتب خانے بہت دیکھے ہیں، کتب خانہ رحمانیہ کی وضع دیکھنے والی ہے، لگتا ہے کہ ضرورتوں کو سامنے رکھکر ہال کا نقشہ بنایا گیا ہے۔

یہ یادگار لمحہ گذر گیا۔۔ حضرت مولانا واپس ہو گئے، مگر یادیں تازہ ہیں،۔۔۔ سادگی، بے تکلفی، اور بزرگوں سے تعلق اور عقیدت کا یہ نقش حضرت مولانا کی شخصیت کے ساتھ میرے دل میں گھر کر گیا۔

۱۹۶۱ء میں ایک طالب علم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنئو میں داخل ہوا، اس کی طالب علمی کے ذوق کو ندوہ میں جلا ملی اور اتنی خوشگوار طالب علمانہ یادیں ندوہ سے وابستہ ہو گئیں کہ جب وہ ندوہ کا رخ کرتا ہے۔ احساس کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اور یادوں کا کارواں ٹھہری. نگاہوں کے سامنے سے گذرنے لگتا ہے۔ اور طالب علمانہ زندگی میں تازگی آنے لگتی ہے اسے ایسا لگتا ہے ندوہ کی عمارتوں کی اینٹیں کچھ بتا رہی ہیں۔ ندوہ کے ذرے کچھ کہہ رہے ہیں۔ حضرت مولانا مہمان خانہ میں سامنے کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔۔۔

چالیس سال پرانا نقش اتنا تازہ ہے جیسے کل کا ہو یہ نقش۔۔ بالکل تازہ، حافظہ کی سلوٹوں کی گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے اور وہ طالب علم محسوس کرتا ہے کہ طالب علمی کی چہل اور جوانی کی ہمک خواب گراں سے انگڑائی لے رہی ہے،۔۔۔ آج وہی طالب علم شام زندگی کا مسافر آپ کے سامنے واحد متکلم ہے۔۔۔ ہاں تو۔۔۔ چالیس سال قبل کا یہ طالب علم ندوہ پہونچا حضرت مولانا کو سلام کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں، فرمایا: بڑا اچھا ہوا آپ آگئے، ندوہ اور خانقاہ کے تعلقات اور مستحکم ہوں گے، یہ جگہ آپ کی ہے، آپ کے دادا جان (۱) کا چمن ہے، آپ کو اپنے دادا جان اور والد محترم کے کاموں کو آگے بڑھانا ہے ابھی تیاری کا مرحلہ ہے، وقت کا پورا مصرف لیجئے، اور ہم لوگوں کو خدمت کا موقعہ دیجئے،

---

(۱) قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ بانی ندوۃ العلماء لکھنئو (جولائی ۱۸۶۴ء، ستمبر ۱۹۲۷ء)

اس مہمان خانہ کے کھلے صحن میں نہ جانے کتنی بار حضرت مولانا سے شرف نیاز حاصل ہوا۔۔۔اور آج جب ندوہ پہونچا، جانی پہچانی راہوں سے بہت آشنا قدم اسی صحن کی طرف بے تابانہ بڑھ گئے، کرسیاں لگی تھیں، مگر خالی خالی، میں کھڑا ہو گیا۔ کیا کہوں دل کی کیا کیفیت ہوئی، لوگ آجا رہے تھے مصافحہ معانقہ ہو رہا تھا، لیکن ایک کسک دل میں تھی، ہر چیز ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی، ہر شئی میں کسی شئی کی کمی پا رہا تھا، احساس کو کیونکر چھپاؤں؟۔۔ حضرت مولانا نہیں ہیں تو۔

وہی میکدہ ہے مگر سونا سونا
وہی جام و مینا مگر خالی خالی

خدا ندوہ کو آباد رکھے، بڑا مرکز ہے یہ، اسکی مرکزیت سدا بہار رہے۔۔۔آج بے پناہ کمی کا احساس تھا، جو دل کو کچوٹے جا رہا تھا، ماضی کے نقوش ابھر رہے تھے، مٹ رہے تھے، چالیس سال پہلے سنے ہوئے حضرت مولانا کے الفاظ دل و دماغ میں گونج رہے تھے، "کاموں کو آگے بڑھانا ہے وقت کا مصرف لیجئے خدمت کا موقعہ دیجئے۔۔۔کتنا پیارا ہے یہ انداز، احساس ذمہ داری کو جگانے والا، کل یہ ہم عزیزوں کیلئے نصیحت تھی، آج وصیت ہے!

والد ماجدؒ نے انہیں خط لکھا کہ آپ کو مونگیر آئے بہت دن ہو گئے۔ زحمت فرمائیے، پروگرام بنا حضرت مولانا کے ہمراہ محترم مولانا محمد رابع صاحب ندوی مولانا ابو العرفان صاحب ندوی (۱) بھی خانقاہ مونگیر تشریف لائے، خانقاہ رحمانی میں استقبالیہ ہوا ٹاؤن ہال میں مشترک مجمع سے خطاب فرمایا، مونگیر میں تین دن قیام رہا۔ اس زمانہ میں "اذاھبت ریح الایمان" تیار ہو رہی تھی۔۔۔سفروں میں عقید تمندوں، شاگردوں، مریدوں کی بھیڑ میں "وقت کی حفاظت" مشکل ہوتی ہے۔ مگر حضرت مولانا نے سفر میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، مجھ سے فرمانے لگے کہ "مولوی نثار نہیں ہیں، کسی کو بلا لیجئے، میں لکھوا دوں۔ یہ لکھنے کا وقت ہے۔ اسلئے آمادگی رہتی ہے، لکھوا دیتا ہوں۔ تو وقت کا بہترین

---

(۱) مولانا ابو العرفان صاحب ندوی (م ۱۸ نومبر ۱۹۸۸ء)

مصرف ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کام میں بھی اچھا کر سکتا ہوں۔ وہ لکھانے لگے اور اس کام کیلئے جو وقت تھا اتنی دیر حسب عادت حضرت مولانا لکھاتے رہے میں ڈکٹیشن لیتا رہا۔ سفروں میں بھی اپنے وقت کی پوری حفاظت فرماتے تھے اور دوسروں کو متوجہ بھی کرتے تھے۔ "وقت ہی زندگی ہے، زندگی پیاری ہے تو وقت کی حفاظت کرنی چاہئے" املا سے فراغت ہوئی، تو فرمانے لگے، آپ اپنے اوقات کا خیال رکھتے ہیں؟ میں نے عرض کیا۔" اپنے اوقات بس گذر جاتے ہیں۔ اپنی اوقات کا خیال رکھتا ہوں"۔۔۔ حضرت مولانا نے جملہ کا لطف لیا۔ اور کل ان کے استقبال میں جو دس منٹ میں نے کہے تھے، اسکی بڑی تحسین فرمائی، یہاں تک فرمادیا کہ آپ کو زبان پر اس درجہ قدرت ہے، مجھے اندازہ نہ تھا۔ پھر مجھے متوجہ کیا، آپ بڑے عظیم دادا کے پوتے ہیں، بہت عظیم والد کا سایہ آپ پر ہے۔ آپ کے دادا نے قلم سے بڑا جہاد کیا ہے، آپ کے والد نے زبان سے بڑی خدمت کی ہے۔ اور دونوں بزرگوں نے دل کی امانت کو امت کیلئے وقف کر دیا ہے۔ آپ میں بڑی صلاحتیں ہیں، آپ کو دونوں کا امین بننا ہے۔ تحسین کر کے، تعریف کر کے، حوصلہ بڑھا کر احساس ذمہ داری پیدا کرنے کا یہ انداز حضرت مولانا کا خاص طریقہ تھا، یہ ہے تربیتی مرحلہ میں لوہے کو گرم کرنا پھر چوٹ لگانا۔

ایک بار رائے بریلی حاضر ہوا۔ میں اوپر کی منزل میں ٹھہرایا گیا، حضرت مولانا نچلی منزل میں رہا کرتے تھے۔ آخر شب کا سکون، ٹھہری فضا، میں اٹھا اور اپنے کاروبار میں لگ گیا، کچھ کھٹ کھٹ ہو ہی جاتی ہے، آواز نیچے تک پہونچ گئی، ناشتہ پر حضرت مولانا سے نیاز حاصل ہوا۔ خلاف معمول فرمانے لگے، مجھے آپکی یہ عادت پسند آئی، ان معمولات سے ہی زندگی زندگی بنتی ہے۔ پھر عجب انداز میں فرمایا "کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آد سحر گاہی" تین چار بار اس مصرع کو دہرایا، جیسے میرے دل کو اس مصرع کا امین بنانا چاہتے ہوں، پھر فرمانے لگے، آپ جانتے ہیں، مجھے آخر شب کی چائے نہیں ملتی تو میں دن میں کچھ لکھ نہیں سکتا، چائے سے حضرت مولانا کی مراد تھی تہجد اور ذکر۔۔۔

حضرت مولانا کی زندگی میں جو سوز و درد ہے، تحریروں میں جو زندگی اور کشش ہے،

تقریر میں جو تاثیر ہے، وہ اسی چائے کا نتیجہ ہے۔

خشک چوب و خشک مغز خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

زندگی بندگی کے سانچہ میں ڈھلتی ہے، تو بصارت میں بصیرت آجاتی ہے ذہانت فراست سے جاملتی ہے، خون پھینکنے والا دل نور کو پھیلانے والا دل بن جاتا ہے، اور تجلیات ربانی کا مرکز ہو جاتا ہے، پھر تحریر و تقریر میں تاثیر اور شخصیت میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قدم قدم پر اللہ کی مدد ملا کرتی ہے۔

پانچ سال قبل کی بات ہوگی دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں خلاف معمول بعد مغرب طلب فرمایا، کہنے لگے آپ نے بڑوں کا کام سنبھال لیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ یکسوئی کے ساتھ آپ خانقاہ کے کام میں لگ گئے ہیں، آپ نے وہ مسند آباد کر دی خدا آپ کو شاداب رکھے گا، مجھے آپ کے خانقاہی نظام کی بھی اطلاع ہے، بڑی دلجمعی کے ساتھ کام ہو رہا ہے، مداومت میں بڑی برکت ہے، کاموں میں تسلسل اللہ کو بھی بہت پسند ہے جو کر رہے ہیں کئے جایئے۔۔ نسبت میں بڑی طاقت ہے بزرگوں کی نسبتیں منتقل ہوتی ہیں، پھر حضرت مولانا نے حدیث کا وہ ٹکڑا دہرایا۔ احب الاعمال الی اللہ ادومہا۔

ندوہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کی میٹنگ ہو رہی تھی، میں رکن نہ تھا مگر شریک اجلاس تھا، یہ شرکت میری زندگی کی روایت بن چکی تھی، کوئی قانونی بحث آئی، کئی بڑے قانون داں موجود تھے، بحث میں میں نے حصہ لیا، حضرت مولانا کو میری گفتگو پسند آئی، انہوں نے شام کو والد ماجدؒ سے فرمائش کی کہ ولی میاں کو رکن عاملہ بنانا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ منظور نہیں کریگا۔ حضرت مولانا نے اصرار فرمایا کہ میرے کوٹہ سے انہیں نامزد کر دیجئے مونگیر میں میرے نام عزیزی مولوی نیاز احمد رحمانی کا خط ملا وہ بورڈ کے اس وقت آفس سکریٹری تھے، خط میں رکنیت کی اطلاع دی گئی تھی، میں نے معذرت لکھ بھیجی۔۔۔ والد ماجدؒ نے نہ مجھ سے کچھ کہا اور نہ میں نے اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنیکی ضرورت محسوس کی،

مہینوں کیا سال گذر گیا۔۔۔ ندوہ میں پھر عاملہ کی مجلس ہوئی۔ کوئی بحث آئی بات ذرا نازک تھی اور بحث کے دوران کچھ پر پیچ ہو گئی تھی، میں نے بحث میں حصہ لیا اور میری وہ گفتگو فیصلہ کن ثابت ہوئی۔۔۔ بعد عصر چائے پر حضرت مولانا نے والد ماجدؒ سے فرمایا کہ دیکھئے رکنیت کے لئے ولی میاں کی نامزدگی کا میرا فیصلہ کتنا درست ہے، آج کی بحث سے یہ بات اور صاف ہو گئی، انہوں نے جواباً کہا کہ ولی نے عاملہ کی رکنیت سے معذرت کر دی ہے۔

حضرت مولاناؒ نے بعد مغرب مجھے طلب فرمایا کہنے لگے آپ نے عاملہ کی رکنیت سے انکار کر دیا؟ کیا مجھے اسکا حق نہیں کہ آپ کی رائے کے خلاف آپ کے بارے میں فیصلہ کروں؟ میں نے عرض کیا، کہ "حضرت کی نظر شفقت کا ممنون ہوں۔ والد صاحب بورڈ کے جنرل سکریٹری ہیں میں عاملہ کا رکن ہونگا تو ان پر انگلی اٹھ سکتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ان پر حرف آئے لوگوں کی زبان چلیگی۔ اس وقت کوئی جواب نہیں دیگا۔ کام میں کرتا رہا ہوں آپ لوگ جب تک چاہئے، کرتا رہوں گا، مگر رکنیت سے مجھے معذور سمجھا جائے" حضرت مولانا نے فرمایا، کہ نسبی تعلق کوئی جرم یا کوئی عیب نہیں ہے، اس تعلق کا پاس و لحاظ اللہ تعالیٰ کے دربار میں بھی ہے "والحقنا بهم ذريتهم". خاندان میں کوئی کام کا فرد ہے تو اسے آگے بڑھانا چاہئے، ویسے میں نے آپ کی نامزدگی اس تعلق کی بناء پر نہیں کی، آپ کی صلاحیت کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا ہے کسی صاحب نے اعتراض کیا تو میں جواب دوں گا۔ مگر آپ کو عاملہ کی رکنیت قبول کرنی چاہئے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اور انشاء اللہ اسمیں خیر ہے۔۔۔

اپنی بات پر جم جانے کا یہ انداز میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ اور حضرت مولانا کا یہ رخ بھی سامنے آیا۔ کس کو کب، کہاں کتنا جمنا ہے، یہ تو فرد واحد کا فیصلہ ہوتا ہے، لوگ چاہتے ہیں کہ یہ بھی ووٹ سے طئے ہو۔ ہمارا دل چاہتا ہے اور بڑے بڑوں سے ہمارا خاموش مطالبہ ہوا کرتا ہے۔ کہ کام آئے ان کی صلاحیت، انکا وزن، ان کی شخصیت، انکا ماضی و حال، مگر یہ کام طئے ہو میری رائے کے مطابق۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کردی گئی، یہ کسی متنازعہ ڈھانچہ کا گرانا تھا، ایک تاریخی مسجد کی تاریخی شہادت تھی، اگر جلیانوالہ باغ کا حادثہ برٹش امپائر کی بربریت کا سمبول ہے، تو بابری مسجد کا حادثہ فرقہ پرستوں کے نشہ طاقت کا اظہار جنون ہے، اور ظلم کی ایسی مثال، جسکے دباؤ میں جمہوریت سسکتی، بلکتی، روتی نظر آتی ہے، اس حادثہ نے حضرت مولانا کو بڑا صدمہ پہونچایا۔۔وہ انسانی قدروں پر بڑا یقین رکھتے تھے، اسی لئے ملک میں جب حیوانیت نے پر نکالے انہوں نے تحریک انسانیت چلائی۔جو شخص کسی گھر کی اینٹ کھسکتی ہوئی دیکھنا برداشت نہ کرے۔اسکے سامنے خدا کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے، تو سوچئے اسکے دل پہ کیا بیتے گی۔۔حضرت مولانا کی کسک اور تڑپ محسوس کرنیوالی تھی۔۔اس حساس مرحلہ میں بھی حضرت مولانا جگر تھام کر انسانیت کے علمبردار رہے۔

یادش بخیر! بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کے مسلمانوں میں احساس شکست، مایوسی، ناامیدی اور جزبہ انتقام کی جو چنگاری دبی دبی سی تھی، وہ اتنی دبی ہوئی بھی نہ تھی کہ نہ دیکھا جاسکے، نہ سمجھا جاسکے۔۔ بورڈ کی عاملہ کے ارکان اور کچھ شخصیتوں کو ہدایت دی گئی، کہ ۶/دسمبر ۹۳ء سے قبل دہلی پہونچیں، اور چند دنوں دہلی قیام کے ارادہ سے آئیں، مرحلہ نازک، کان سب کے کھڑے، اکابر اصاغر سب پہونچ گئے، نشستیں ہوئیں، ۷ دسمبر کو نشست جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کی سرکاری قیام گاہ پر ہوئی۔یوم شہادت پر کسی نے راجدھانی اکسپریس میں دھماکے کئے اور پانچ راجدھانیوں میں بڑی احتیات کے ساتھ ایسے دھماکے ہوئے کے اس عظیم الشان شازش کے نتیجے میں پانچ آدمی بھی مرے نہیں۔۔۔آجکل آتش گیر مادے اور دھماکہ قسم کی چیزیں دیہات شہر میں اتنی عام ہیں، کہ کوئی بھی نوجوان پورے ڈبہ کو نہ سہی چوتھائی کو تو آسانی سے اڑا سکتا ہے، مگر پانچ دھماکوں کا اتنا مایوس کن نتیجہ بتاتا ہے کے یہ دھماکے "مصنوعی" قسم کے تھے، میری اس وقت بھی یہی رائے تھی، اور آج بھی میں یہی سمجھتا ہوں، کہ یہ دھماکے اس لئے کرائے گئے، تاکہ مسلم ذہنیت کی غلط تصویر ملک کے سامنے پیش کی جاسکے۔۔۔بہر حال دھماکے ہوئے، آجتک پتہ نہ چلا کہ کس نے کئے۔

۷ دسمبر کو بورڈ کی خصوصی میٹنگ میں لوگ اخباروں کے ساتھ پہونچے، اور ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کے یہ دھماکے مسلمانوں نے کئے ہیں، ان کی مذمت ہونی چاہئے، معزز ارکان نے انسانیت کے حوالے دیئے، اور بتایا کہ مسافروں کو نقصان پہونچانا انسانی قدروں اور آداب سفر کے قطعاً منافی ہے۔ انسانی قدروں کی بات آگئی، تو حضرت مولانا نے اس تجویز کی تائید فرمادی، میں اس تجویز کو قطعاً غیر ضروری سمجھ رہا تھا، اور توبہ کی یہ قسم مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ میں نے اختلاف کیا اور کہا اولاً تو یہ دھماکے مسلمانوں نے کئے نہیں، دوسرے ریلوے حادثات پر تجویز پاس کرتے رہنا بورڈ کا کام نہیں ہے۔ فوراً تجاویز کا رجسٹر پلٹنے کی بات آئی، کہا گیا کہ لاتور کے زلزلہ پر تجویز پاس ہوئی تھی میں نے عرض کیا کہ پہلے یہ دیکھئے کہ کتنے فسادات پر تجویز منظور کی گئی ہے۔ مگر میری ساری دلیل ناکام ہوتی نظر آئی، اس وقت ارکان پر انسانی قدروں کا غلبہ تھا۔ اور میری رائے یہ تھی کہ جب حیوانیت کا ننگا ناچ ہو رہا ہو، انسانی قدروں کے پیش نظر ایسی تجویز منظور کرنا بزدلی ہے، یوں بھی کمزوروں کی طرف سے معافی کا اعلان "عذر گناہ بدتر از گناہ،" جیسی چیز سمجھی جاتی ہے اسے طاقت والوں کے یہاں لگ بھگ وہی مقام دیا جاتا ہے جو سکرات کی توبہ کا خدا کے دربار میں ہے! میں نے عرض کیا کہ اگر مان لیا جائے کہ یہ دھماکے مسلانوں نے کئے ہیں، تو پھر یہ بات بھی سامنے آئیگی کہ یہ دھماکے بورڈ کی تجویز کے پیش نظر ہوئے ہیں۔۔ حاضرین چونکے اور حضرت مولانا نے مجھے مخاطب کیا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔ میں نے ادب کے ساتھ عرض کیا یہ تجویز منظور کیجا چکی ہے کہ بابری مسجد کی شہادت پر ری ایکشن ظاہر کیا جائے۔۔ ہم لوگوں نے اسکی تفصیل و تشریح تو کی نہیں تھی،۔۔ ہر شخص کو اپنے طور پر ری ایکشن ظاہر کرنیکا اختیار ہے،۔۔ ہم لوگوں نے کل کمرے میں چائے پی کر باتیں کر کے ری ایکشن ظاہر کیا، کچھ لوگوں نے کالے بلے سے بازو سجائے، کسی نے جلسہ کیا، کسی نے کچھ اور۔۔ میری یہ گذارش راجدھانی اکسپریس کے دھماکوں سے زیادہ اثردار ثابت ہوئی، اور تجویز مذمت آئی گئی ہو گئی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں ملت کا مفاد پیش نظر تھا۔ مگر میری گذارش دور تک پہونچی، درباروں تک بات چلی گئی میری الجھنوں میں

اضافہ ہوا، اور خود حضرت مولانا پر اس گفتگو کے اثرات اگلی ملاقات میں بھی میں نے محسوس کئے!

یہ مرحلہ تھا قیادت کا۔۔اور قیادت کے میدان میں ہر قائد کا اپنا طریقہ، اپنا مزاج اور اپنا انداز ہوتا ہے، کسی بھی شخص کو کسی مرحلہ میں کوئی بات قابل قبول نہ ہو، تو اس سے نہ شان قیادت متاثر ہوتی ہے، اور نہ قائد کا اخلاص و عمل مشتبہ ہو سکتا ہے، اختلاف رائے کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہئے۔۔جہاں "دماغ" جمع ہونگے وہاں اختلاف رائے ہونا فطری ہے، چمن کا حسن "یک رنگی" میں نہیں گلہائے رنگارنگ میں ہے، اسلئے اختلاف کو حسن آغاز کی حسین تمہید سمجھنا چاہئے، جسکے بعد حسن انجام کی امید ہوتی ہے!

حضرت مولانا کا اصلی میدان دعوت و تبلیغ اور تقریر و تحریر تھا، یہ وہ راہ تھی جسے انہوں نے نوجوانی میں چن لیا تھا، اور بڑی استقامت کے ساتھ وہ پوری زندگی اسی راہ پر چلتے رہے انہوں نے تحقیق برائے تحقیق کبھی نہیں کی، ان کی زبان و قلم نے سوتے دلوں کو جگایا اور جاگتے دلوں کو گرمایا اسی لئے انہوں نے بزرگوں کی سوانح لکھی دعوت و عزیمت کے سدا بہار پھولوں کا گلدستہ سجایا، یہ منتشر تھے، تو نگاہوں سے دور تھے، گلدستہ بنے تو سبھوں کی نگاہوں میں آگئے۔

ان کی شفقت و عنایت میرے حصہ میں آتی رہتی تھی اور جب بھی ندوہ یا رائے بریلی پہونچتا، ایسی شفقت و محبت، اکرام و اعزاز کا معاملہ فرماتے کہ میں شرمندہ ہو جاتا، ایک بار انہوں نے تاریخ دعوت و عزیمت کی ایک جلد یا پورا سیٹ مرحمت فرمایا، جو ان کی دعاؤں اور دستخط سے مزین تھا، بزرگوں کی سیرت ایک نئے انداز پر سامنے آئی تھی، ماضی کے واقعات اور بزرگون کے حالات انہوں نے بڑی محنت سے جمع کئے تھے، اسے پڑھ جایئے دل پر جو اثر ہوگا وہ تو ہوگا ہی، مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ حضرت مولانا نے مقدس ماضی کو پر امید مستقبل کی خاطر سجادیا ہے۔ایک موقعہ پر انہوں نے "سیرت بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری" عنایت فرمائی، اور یوں گویا ہوئے یہ ہندوستان کی عظیم علمی تحریک کی سرگذشت

کے ساتھ آپ کے دادا جان کی سوانح بھی ہے، ایک قرض تھا، جسے ہم لوگوں نے ادا کر دیا، پھر ایک لطیف جملہ ان کی زبان سے نکلا" بضاعتکم ردّت الیکم"۔

گذشتہ ستمبر (۱۹۹۹ء کی بات ہے، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس بمبئی سے پہلے ان کی خدمت میں لکھنؤ حاضر ہوا، انہوں نے کاروان زندگی" کی ایک جلد مرحمت فرمائی، جو میرے لئے بالکل تازہ تحفہ تھا، اور فرمایا" یہ ہدیہ ہے"۔۔ عرض کیا: "یہ آپ کی طرف سے ہدیہ بھی ہے ہدایت بھی!" یہ سنکر انہوں نے تبسم کیا، اور فرمایا ایسی تعریف آپ ہی کا حصہ ہے، پھر فرمایا" اس جلد میں آپ کا بھی تذکرہ ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس دفتر میں ہے،

حضرت مولانا علیل تھے، بستر پر تکیہ کے سہارے جلوہ افروز تھے دوسرے دن میری ان سے آخری تفصیلی گفتگو ہوئی، جسمیں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے انتخاب کے علاوہ مختلف امور پر مشورہ ہوا۔ میں نے اجازت چاہی عنایت و شفقت کے ساتھ اجازت دی، اس ناکارہ کیلئے بڑے بلند کلمات فرمائے، دعائیں دیں اور فرمایا یہ آپ کے دادا جان کا لگایا چمن ہے، یہاں آتے جاتے رہا کیجئے دو چار دنوں قیام کی نیت سے آیا کیجئے، آپکا ندوہ پر حق ہے اور ندوہ کا آپ پر حق ہے، اسلئے آپکا مستحکم رشتہ باقی رہنا چاہیئے،

مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے عہد لے رہے ہوں، میری زبان صرف اتنا کہہ سکی، "انشاء اللہ"۔۔ دیر تک ان کی نگاہیں مجھ پر جمی رہیں، جیسے وہ آخری نگاہ ڈال رہے ہوں۔۔۔ اور۔۔ وہ۔۔ آخری نگاہ ثابت ہوئی۔

اسلامی قدروں کے اعلیٰ ترجمان

سید شہاب الدین
سابق ممبر پارلیمنٹ وایڈیٹر "مسلم انڈیا" نئی دہلی

بیسویں صدی میں مسلم ہندوستان نے بڑے بلند پایہ عالم، شارح قرآن، مفسر، محدث، فقیہ، مبلغ اور ماہر تعلیم پیدا کئے ہیں، لیکن کوئی مسلم اسکالر ایسا نظر نہیں آتا جس کی نگاہ ہندوستانی مسلمانوں کی کلی ہیئت اجتماعیہ پر مرکوز رہی ہو اور جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں کے ایک زندہ قوم کی حیثیت سے وجود کے بارے میں فکر مند رہا ہو، برسوں سے عالمگیر سطح پر ان کی توقیر کی گئی اور انھیں غیر مسلموں کے اعلا ترین حلقوں میں مسلمانوں کے وسوسوں اور اندیشوں کا جائز ترجمان سمجھا گیا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بلاشبہ اسلام کے عظیم شارح تھے عربی زبان پر زبردست قدرت اور اپنی تقریروں اور تحریروں کی وجہ سے ان کا دائرۂ اثر برصغیر تک محدود نہیں تھا، بلکہ دور دور تک خصوصاً عرب دنیا تک پھیلا ہوا تھا۔

اسلام کی جو وضاحت اور صراحت انہوں نے کی اس میں اعتدال نمایاں ہے، انھیں کسی بھی لحاظ سے انتہا پسند نہیں کہا جا سکتا، وہ سمجھتے تھے کہ اسلام دنیا کیلئے ایک رحمت ہے اور انسانی تاریخ میں اسکا رول مثبت اور تخلیقی ہے، ایک معنی میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام مہذب بنانے والی طاقت ہے، اور اس وجہ سے جدید زمانے میں اسکی معنویت قائم ہے، تاکہ مذہبی تہذیب کے جلو میں پیدا ہونے

اردو ادب میں شاندار اور مستقل اضافے ہیں۔

آپ کے علم و فضل کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر کیا گیا، آپ رابطۂ عالم اسلامی کے تاسیسی رکن (۱۹۶۲ء) اور مدینہ یونیورسٹی کے اعلا کاؤنسل کے ممبر، فیڈریشن آف اسلامک یونیورسٹیز کی مجلس عاملہ کے رکن، آکسفورڈ یونیورسٹی کے مرکز مطالعات اسلامیہ بورڈ کے صدر بھی تھے۔ آپ نے ہندوستانی، عرب ممالک اور مغرب کی یونیورسٹیوں میں جو لکچر دئے انھیں مطالعاتِ اسلام اور زمانہ جدید میں اسلام کی معنویت کے سلسلے میں نہایت گراں قدر قرار دیا گیا، ۱۹۸۰ء میں آپ کو "فیصل انٹرنیشنل ایوارڈ" دیا گیا، اس کے بعد برونئی ایوارڈ اور متحدہ عرب امارات کا ایوارڈ ۱۹۹۹ء میں ملا۔

عالم بے بدل مولانا گوشہ نشین نہیں رہے، سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن کسی پارٹی الیکشن کی سیاست میں شریک نہیں ہوئے، ان کے معتقد ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے ۱۹۶۷ء میں جو مسلم مجلس قائم کی تھی آپ اس میں بھی شامل نہیں ہوئے، آپ آل انڈیا مسلم مشاورت (۱۹۶۴ء) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (۱۹۷۲ء) اور کل ہند تعلیمی کاونسل کے بانیوں میں تھے (۱۹۷۹ء) میں دینی کاؤنسل کے کنونشن کی صدارت کی، آپ نے اسلامی فقہ اکیڈمی اور آل انڈیا ملی کاؤنسل کی سرپرستی بھی کی۔

فرقہ وارانہ اتحاد کے فروغ کیلئے بنائی گئی تنظیم فوکس کے بانیوں میں شامل تھے، جسے بعد میں سوسائٹی برائے فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں بدل دیا گیا تھا، آپ نے سبھوں کیلئے محبت اور برادرانہ جذبات پیدا کرنے کیلئے پیام انسانیت کے نام سے ایک تحریک بھی شروع کی تھی۔

مولانا دستور ہند کی قدر کرتے تھے اور سیکولر نظام کو اسلامی تشخص کی بقا اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے خلاف عدم امتیاز کی ضمانت سمجھتے تھے، لیکن ان کی دوررس نظروں نے ہندوستان میں ضم کرنے کے تاریخی عمل اور مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے ہندو قوم پرستی کے طویل المیعاد پلان کو بھانپ لیا تھا، اسی لئے انھوں نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کے بارے میں سخت موقف اپنایا اور مقننہ یا عدلیہ کے ذریعہ کسی بھی طرح کی مداخلت کو برداشت نہیں کیا اور یوپی کے اسکولوں میں سرسوتی وندنا گانے کی شدید مخالفت کی۔

اس صدی کی آخری چوتھائی میں مسلمانوں کی زبردست سیاسی لڑائیاں ان کی رہنمائی میں لڑی گئیں، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو منسوخ کرانے کیلئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ۱۹۸۳ء میں تحریک شروع کی، کیونکہ مسلمان سمجھتے تھے، اس طرح شروعات کی گئی ہے کہ رفتہ رفتہ شریعت میں مداخلت بڑھتی جائے گی اور ان کا اسلامی تشخص مسخ ہو کر رہ جائے گا، مسلم وومن (پروٹیکشن آف رائٹس آف ڈائی ورسیز ایکٹ ۱۹۸۶ء) اس جدوجہد کا ثمرہ تھا، حالانکہ اس قانون میں ابتدا سے ہی کچھ خامیاں رہ گئی ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کو تنازعات کے ایک لامتناہی سلسلے سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

۱۹۸۶ء میں مولانا کی رضامندی سے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بابری مسجد کی بازیابی کا سوال اٹھایا، کیونکہ بابری مسجد کا تالا کھول کر ۱۹۸۶ء میں باضابطہ پوجا اور درشن شروع کرا دیا گیا تھا، اور اسے ایک مندر میں تبدیل کر دیا گیا تھا، بابری مسجد کی بازیابی کی تحریک میں آپ براہِ راست شریک نہیں تھے (بعد میں اس کی رابطہ کمیٹی اختلاف کا شکار ہو گئی اور ایک حصہ نے الگ ہو کر آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی) لیکن ہر نازک مرحلے پر آپ نے اس کی رہنمائی کی اور حکومت ہند اور ہندو نمائندوں کے ساتھ گفت وشنید میں حصہ لیا، مسجد کی شہادت کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے جسکے وہ صدر تھے اس مسئلے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مقدمہ سے متعلق تمام امور کی نگرانی کی، اپنی زندگی کی آخری دہائی میں انکی حیثیت صرف آخری مرجع کی ہو گئی تھی، مسلمانوں کے اندر اختلاف کو دور کرنے کے سلسلے میں انھیں مرکزی مقام حاصل ہو گیا تھا۔

ان کی وفات سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دور ختم ہوا اور جو خلا پیدا ہوا ہے برسوں تک اس کے پُر ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔

●●●

☆ ایک مرد درویش کی رحلت ☆

ڈاکٹر محمد یوسف نگرامی۔ جدہ

۲۳ رمضان المبارک بروز جمعہ صبح ساڑھے دس بجے حسب معمول تلاوت کر رہا تھا کہ اچانک لکھنؤ سے بذریعہ ٹیلیفون یہ اطلاع ملی کہ حضرت الاستاذ علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا" اناللہ وانا الیہ راجعون" دل ودماغ معطل ہو کر رہ گئے آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری ہو گئے۔ اسی دوران احباب اور ملنے والوں کے ٹیلیفون کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر شخص سانحہ کی صداقت معلوم کر رہا تھا۔ موت برحق ہے اور جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے یہ عمل جاری وساری ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی کے کہ انسان نے موت کے علاوہ فطرت کی ہر چیز سے سمجھوتہ کر لیا ہے علامہؒ عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے اور انہیں شدید امراض لاحق ہو گئے تھے نہ کہ یہ سانحہ متوقع تھا لیکن پھر بھی دل ودماغ اس بات کیلئے تیار نہیں تھے حضرت الاستاذ کا وجود اب اس دنیا میں نہیں رہا اور یہ قیمتی متاع دار فانی کو الوداع کہہ چکی ہے۔

علامہ کی موت سے ندوہ کا وہ نقشہ سامنے آگیا جہاں راقم سطور کا لڑکپن اور جوانی کا ایک حصہ گزرا ہے جہاں حضرت کو مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے ایک گوشے میں طویل نوافل پڑھتے دیکھا۔ انجمن الاصلاح کے جمالیہ ہال یا کتب خانہ کے وسیع وکشادہ ہال میں اردو اور کبھی عربی تقریریں کرتے ہوئے یا سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے پایا یا ندوہ کے کرکٹ یا فٹبال گراؤنڈ میں تبلیغی اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے دیکھا یا کبھی اپنے والد مرحوم مولانا محمد اویس ندوی نگرامی سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کیساتھ کسی علمی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پایا والد صاحب مرحوم حضرت شیخ کے ہم عصر اور قریبی دوستوں میں تھے اس کے علاوہ ہمارے خاندان اور حضرت کے خاندان کا تعلق بہت ہی گہرا اور دیرینہ تھا دونوں

خاندانوں کے درمیان مسلک مشرب و مقصد کی وحدت تھی۔

پھر جب میں حصول علم کیلئے قاہرہ چلا گیا اور وہاں سے سعودی عرب بسلسلہ ملازمت آیا تو یہاں سے چھٹیوں میں جب بھی لکھنؤ جانا ہوتا تو حضرت کی خدمت میں سلام کی غرض سے ضرور حاضر ہوتا تھا۔ حکم ہوتا کہ فلاں وقت کھانا ساتھ کھانا ہے یا ان کو اس وقت کہیں کا سفر درپیش ہوتا تو اپنے بھانجے مولانا محمد رابع ندوی کو مخاطب کر کے کہتے "ان کو کھانے پر بلاؤ" اور اس محبت والفت سے ملتے کہ والد صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی۔ کچھ سال قبل مولانا نے یونس بھائی کو ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے لیے رکن منتخب کیا تو میں نے ندوہ کے مہمان خانہ جاکر جہاں کہ حضرت کا قیام رہتا تھا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اس کا جواب حضرت نے جس انداز سے دیا اسے سن کر آنکھیں نم ہو گئیں اور یہ یقین ہو گیا کے ابھی اس دنیا سے اخلاق و مروت کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ جب کبھی حضرت کی خدمت میں اپنی کوئی تصنیف پیش کرتا۔ تو بڑی ہمت افزائی کرتے اور یہ کہتے کہ اگر مولانا مرحوم زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔

کچھ سال قبل میں اپنے بھائی محمد طبیب کے ساتھ طواف کے لئے مکہ معظمہ گیا ہوا تھا۔ غالباً رات کے گیارہ بجے کا عمل ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو دیکھا کے احرام کی حالت میں ہیں اور طواف کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں۔ جاکر کے ان کی خدمت میں سلام عرض کیا لیکن حضرت نے فرط محبت سے گلے لگاتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہاری کتاب پڑھی "جو کہ ایک فرقہ سے متعلق تھی" اور پاکستان سے کچھ لوگ اس فرقہ کی تاریخ جاننا چاہتے تھے۔ میں نے تمہاری کتاب کا حوالہ دے دیا ہے"

علامہ ندوی بہت بڑے مصنف اردو اور عربی کے صاحب اسلوب ادیب و مقرر اور خطیب تھے۔ عالم عرب میں برصغیر کے مسلمانوں کی پہچان تھے۔ اس کے علاوہ غیر متنازعہ شخصیت کے حامل تھے۔ کسی کانفرنس یا محفل میں ان کا وجود اس کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں سے ہٹکر وہ نہایت خلیق متواضع و منکسر المزاج انسان تھے۔ علامہ اقبال کا

عالم عرب میں صحیح تعارف ان ہی کی کتاب "روائع اقبال" سے ہوا۔ وہ اپنے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں "سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقہ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے۔ ان کی ذات اور ان کی عملی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت علمی تبحر اور علمی ذوق نقاد و مورخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی ادباء اور انشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے" حضرت الاستاذ نے مذکورہ بالا سطور میں اپنے استاذ محترم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، میرا خیال ہے کے یہ تمام باتیں خود حضرت کی شخصیت پر منطبق و صادق آتی ہیں۔ ان کی کتابوں کا اسلوب نہایت دلکش جرح و طعن سے پاک اور علمی معلومات سے بھرپور ہوتا تھا۔ کہیں بھی کسی لوچ کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ ایک طرف وہ تصوف کے بہت بڑے داعی تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ تصوف تزکیہ نفس اور رزائل اعمال سے پاکی اور اخلاق حمیدہ کی تعمیر کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی نشر و اشاعت میں تصوف کا بڑا ہاتھ رہا ہے اسی کے ساتھ مجدد الف ثانی کے نظریہ " وحدۃ الشہود" کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے صحیح عاشق ہیں اور یہ اقرار کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں کے ان کی عملی زندگی امام احمد بن حنبل ابن تیمیہ اور ابن قیم کی مرہون منت ہے۔ وہ اسلام کے سچے خادم و مبلغ تھے اور یہ تمنا رکھتے تھے کہ دنیا کی قیادت عالم اسلام کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے اسی طرح وہ مغربی تہذیب و تمدن کے بہت بڑے ناقد تھے اور اس بات کے قطعی قائل نہیں تھے کے اسلام کی شرح و تفسیر مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر دفاعی شکل میں کی جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ کا تقابل یا موازنہ سید قطب احمد امین اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات عدل وانصاف کے متقاضی نہیں ہے کیونکہ مؤخر الذکر تینوں حضرات اپنے دائرے میں کسی ایک مکتبہ فکر یا کسی ایک فن کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس علامہ ندوی کی شخصیت میں جامعیت تھی وہ

ایک عظیم مفکر، بلند پایہ مصنف، اردو اور عربی کے صاحب طرز ادیب، بہت بڑے خطیب اور عظیم داعی و مبلغ تھے۔ یعنی ان کی شخصیت مین جامعیت تھی لیکن ان سب سے ہٹ کر مولانا مرحوم میں ایک خاص بات اور تھی جو ان کو اپنے تمام ہم عصروں میں منفرد بناتی ہے اور ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے اور وہ ہے خدا شناسی، خدا رسی، راہ یابی اور راست روی خدا کے نام کی حلاوت اور مردان خدا کی محبت۔ یہ ایک ایسی صفت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کر رکھی تھی جس کے ذریعے ان کی زندگی مین ایک زبردست انقلاب آیا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے اہل اللہ کی طرف رجوع کرتے اور ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتے تاکہ اصلاح باطن کی تکمیل ہو سکے۔

یہی وہ اصل راز و سبب ہے کہ علامہؒ کی زندگی دنیاوی آلائش سے پاک تھی وہ مجسم سادگی تھے۔ ان کے اندر دنیا سے استغناء اور اسکی بے ثباتی نظر آتی ہے۔ رزق کے اس حد تک قائل تھے جو کہ ان کے جد امجد سید المرسلین محمد ﷺ نے اپنے اہل بیت کیلئے مانگا تھا۔ اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا" جو حضرات مولانا کے قریب تھے ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی اس دعا کے مطابق تھی یا نہیں؟ راقم سطور نے جب بھی مولانا مرحوم کی زیارت کی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اس دور میں نہیں ہوں بلکہ وہاں ہوں جہاں صرف قال اللہ و قال الرسول ہوتا تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو خواہ کتنا ہی بڑا مہمان موجود ہو دستر خوان تکلفات سے دور ہوتا تھا۔ بہت ہی معمولی لباس زیب تن کرتے تھے جو صرف ایک معمولی کپڑے کا کرتہ اور پائجامہ اور اور شیروانی پر مشتمل ہوتا تھا۔ فیصل ایوارڈ کیلئے ریاض بلایا گیا تو ان کی جگہ ان کے نمائندے نے منبر پر یہ اعلان کیا کہ انعام کی رقم افغان مجاہدین اور مدارس تحفیظ القرآن کیلئے وقف ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ایک مخصوص طیارہ سے مولانا کو لکھنئو سے دبئی لایا گیا تاکہ اسلام کی خدمت کے سلسلے میں امارات کے سب سے بڑے انعام سے ان کو نوازا جائے۔ مولانا اسکو ایک مبارک و غنیمت کا موقع سمجھتے ہوئے انعام کی طرف بغیر التفات کے ایک داعی اور مبلغ کی ذمہ داری نبھاتے

ہوئے نظر آئے، سلطان برونائی کا ایک وفد لکھنؤ جانے کیلئے ہندوستان پہنچا تاکہ مولانا کو اپنے ملک کے سب سے بڑے انعام سے نوازا جائے۔ وفد سیکیورٹی کے پیش نظر لکھنؤ نہیں پہنچ پایا۔ اس لئے مولانا کے اہل خانہ نے دہلی پہنچ کر انعام وصول کیا اور وہیں یہ اعلان کر دیا کہ انعام کی رقم ہندوستانی مدارس اسلامیہ کیلئے وقف ہے۔ خدارا کوئی بتائے تو صحیح ولی اس کے علاوہ اور کون ہوتا؟

مولانا کی زندگی مکمل طور پر اسلام کی نشر واشاعت کیلئے وقف تھی اور یہ ذوق و شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ انکا سونا جاگنا رہنا سہنا گفتگو ان کی تقاریر اور بلند پایہ تصانیف۔ یہ سب اس بات کی علامت تھی کہ وہ اس دنیا میں اسلام کا بول بالا چاہتے تھے اور اس نظام کو جاری وساری کرنا چاہتے تھے جس کو خاتم الانبیاء محمد ﷺ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم جاہلوں اور کوتاہ بینوں کی نظر میں آپ کی زندگی بامقصد اور بڑی کامیاب گزری اور آپ کا قلم اور زبان صرف دین اسلام کی شرح و توضیح میں لگے رہے۔

ہندوستانی مسلمان

ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں وہ اسلام کے قولین وحقیقی چشموں کتاب وسنت اور اسلام کے قولین طبردلوں کی سیرت وکردار، ان کی قربانی وایثار اور ان کی اولوالعزمی وحوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا عقیدہ وایمان، اپنا حال ومآل، اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے، مسلم اقوام یا عرب ممالک کے اُبھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کر کے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں، نہ انہوں نے ان میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دیا ہے۔ انہوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے۔ اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں تو ہم انشاء اللہ وحدت اسلامی اور شریعت اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلک زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں، ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر، اپنی اس اصول پسندی اور وفاشعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ہمیں بہت سے ان منافع ومواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی جو ہوا کے رُخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے اور ہم خلوص وفہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لئے نہ کوئی تنگی ہے اور نہ ہماری قسمت میں کوئی محرومی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

عالم اسلام کی محبوب و محترم شخصیت

پروفیسر خورشید احمد ☆☆☆☆ مدیر ترجمان القرآن لاہور

بیسویں صدی نے ملت اسلامیہ کے جسم و جان پر بہت سے تیشے چلائے اور خصوصیت سے اس کے آخری عشرے میں تو کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ایک طرف افغانستان کے جہاد میں بے پناہ قربانیاں دی گئیں فلسطین لہولہان ہے، مسجد اقصیٰ محبوس و محصور ہے بوسنیا اور کوسوا میں خون کی ندیاں بہائی گئیں، کشمیر جل رہا ہے اور شیشان میں خون مسلم کی ارزانی حد سے گزر گئی ہے تو دوسری طرف اس صدی میں اسلامی فکر کی معمار اور اسلامی احیا کی تاریخ ساز شخصیات ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ چلتے چلتے بھی بیسویں صدی ایک اور چرکا لگا گئی۔ برعظیم پاک و ہند کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی آخری نشانی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی جدا ہو گئے۔ ۲۲ رمضان المبارک بروز جمعہ، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء، نماز جمعہ سے کچھ ہی قبل تلاوت قرآن میں مصروف مولانا علی میاں ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی سے جا ملے.... انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھیں اشک بار ہیں، روح مضطرب و افسردہ ہے لیکن دل اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہے کلّ من علیھا فان .ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام فبای الآء ربکما تکذبٰن (الرحمٰن) (ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔ پس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن کمالات کو جھٹلاؤ گے؟) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ۶ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ (۵ دسمبر ۱۹۱۳ء) رائے بریلی یوپی کے ایسے معزز و محترم خانوادہ سادات میں پیدا ہوئے جو رشد و ہدایت اور دعوت و جہاد میں بڑا نام رکھتا تھا۔ مجاہد ملت حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ علی میاں کے والد اور والدہ دونوں علم و تقویٰ کے اعلیٰ مرتبہ پر تھے آپ کے والد مولانا حکیم عبدالحئی حسنی لکھنوی نزھۃ الخواطر کے مولف تھے جو پانچ ہزار نامور

ہندوستانی مسلمانوں کے تذکرے پر مبنی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اور گل رعنا بھی آپ ہی کی تالیف ہے جو اردو کے نامور شعرا کا پہلا مربوط تذکرہ ہے، مولانا عبدالحیؒ ندوۃ العلماء کے ناظم اور دینی و علمی حلقوں میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ خیر النساء حافظہ قرآن اور جن اخلاق اور تقویٰ و شرافت کا نمونہ تھیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی، والد کے انتقال کے بعد علی میاں کے مربی بنے۔ وہ دینی اور دینوی علوم کے جامع ندوہ کے فارغ التحصیل اور والد کے انتقال کے بعد اس کے ناظم تھے۔ علی میاں نے حفظ قرآن کے بعد عربی فارسی اور اردو ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر ندوہ، دیوبند اور مدرسہ قاسم العلوم لاہور (مولانا احمد علیؒ) سے علوم دینی کی تحصیل کی۔ ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریسی زندگی کا آغاز کیا ۱۹۵۱ء میں ندوہ کے دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کے ذریعے لاکھوں انسانوں تک اللہ کے دین کو پہنچانے کا فرض ادا کیا، مشرق و مغرب اور عرب و عجم میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔ عالم اسلام کے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کیے اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ہر گوشے میں سرور عالم ﷺ کے پروانوں کے دلوں میں عزت اور محبت کا مقام پیدا کیا۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا کی آلائشوں سے دامن بچائے رکھا۔ دعوت و تبلیغ کو زندگی کا مشن بنایا اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا

: من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہٗ (الاحزاب)

ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا۔

مجھے نصف صدی کے چوٹی کے اہل علم و فضل سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے لیکن علی میاںؒ ان منتخب بزرگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت سب میں منفرد تھی:

آفاق ہا گردیدہ ام — مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام — لیکن تو چیزے دیگری

مولانا علی میاںؒ سے میرا تعارف ان سے بالمشافہ ملاقات سے بہت پہلے ان کی تصانیف

کے ذریعے ہوا۔ اسلامی جمعیۃ طلبہ کے اولین دور ہی میں ان کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" پڑھی اور اس کتاب سے نہ صرف سید احمد شہید ہی سے گہرا تعلق قائم ہوا بلکہ خود مولانا علی میاں کی شخصیت بھی دل میں گھر کر گئی۔

مولانا علی میاںؒ کے بڑے عزیز دوست اور ساتھی مولانا مسعود عالم ندویؒ نے، جن سے میرا بہت ہی قریبی تعلق تھا اور جمعیۃ کے اس دور کے تمام ہی ذمہ دار، ان سے بہت گہرا ربط رکھتے تھے اور وہ بھی ہم سب پر بڑی شفقت فرماتے تھے، مولانا علی میاں کی محبت اور عظمت کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم کر دیے۔ ان کے علم و فضل انکی للّٰہیت اور کیفیت عبادت ان کی عربی دانی اور شوق دعوت و تبلیغ یہ سب دل و دماغ پر نقش ہو گئے۔ ان کی کتاب انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" جو ان کی شہرۂ آفاق عربی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا اردو ترجمہ تھا پڑھی، جس نے فکر و نظر ہی کو جلا نہ بخشی بلکہ روح کو تڑپا اور گرما بھی دیا۔ اس کے بعد مولانا علی میاں کی ہر تحریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور اس طرح دل و نگاہ میں ان کی شخصیت کا ایک خاص مقام بن گیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بعد میں نے جس شخصیت کی تحریروں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، وہ مولانا علی میاں ہی ہیں۔

مولانا علی میاں سے پہلی ملاقات ۱۹۵۴ء میں لاہور میں ہوئی۔ میں اس وقت جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا۔ بالمشافہ ملاقات میں ان کو اس ذہنی تصویر سے ہم آہنگ پایا جو ان کی کتب کے مطالعے سے بنائی تھی۔ آخری ملاقات برطانیہ میں ۱۹۹۶ء میں ہوئی جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا۔ ہمارے ساتھ خصوصی نشست بھی ہوئی اور پھر اس کے بعد نوٹنگھم میں مسجد دارالعلوم کے افتتاح کی تقریب میں، میں نے، خرم اور مناظر احسن نے شرکت کی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ درمیان کے ۴۲ برسوں میں درجنوں بار ان سے ملنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور الحمدللہ ان کی شفقت اور ان کے پیار میں اضافے ہی کا گمان رہا۔ میرے لیے تو وہ استاذ، مربی اور محسن تھے لیکن ان کی عظمت ہے کہ انہوں نے

اس طرح کا معاملہ کیا کہ لطف عام بھی لطف خاص کا مزہ دے گیا۔

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف اور دانشور، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مؤرخ اور سیرت نگار تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی ایک مبلغ ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے ان کو بیسویں صدی کے اسلامی احیا کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا۔ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر کی قوس و قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتا ہے جس میں اس دور کے کئی اہم مفکرین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں علامہ اقبالؒ کا سوز و گداز، مولانا مودودیؒ کی عقلیت اور تصور دین کی جامعیت، علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ذوق تاریخ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا محمد زکریاؒ کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے علی میاںؒ کے یہاں یہ سب ایک دوسرے کے ناقض نہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم و فن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانا علی میاں کا اصل میدان تاریخ اور دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لیے اسلاف کے نمونے کا احیا ہے۔ ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں، کبھی وہ ایک کو نمایاں کرتے ہیں اور کبھی دوسرے کو۔ پہلی تالیف سے (جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہونے والی "سیرت سید احمد شہید" تھی) آخری کتاب (تاریخ دعوت و عزیمت) تک تزکیہ اور جہاد کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے۔ ان کا ذوق اور خاندانی اور دعوتی ماحول جب ان کو "دین کی جدید تعبیر و تفہیم" کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات سے دوچار کرتا ہے، اور وہ کچھ تصور اور اسالیب کے بارے میں تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تب بھی دین اور قوت کے تعلق، احیا اور اقامت کی خواہش اور طلب، اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر

اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ "دعوت و عزیمت" کی آخری جلد میں "سیرت سید احمد شہید" کے پہلے ایڈیشن کی ان عبارتوں کو جوں کا توں رکھتے ہیں جن میں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والی سیرت سید احمد شہید (سلسلہ تاریخ دعوت و عزیمت) حصہ اول میں کتاب سے اسی مقصد کا اعادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۶ء میں رقم کیا گیا تھا یعنی "اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے، اور وہ وہی ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ آپ کے خلفائے راشدینؓ اور بعض مجددین امت نے عمل کیا۔ یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی و روحانی، مادی، سیاسی غلبے کی کوشش کرنا" (ص ۳۷) پھر "سید صاحب" کی سیرت پر اجمالی نظر کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ "نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد" اور شرعی حکومت" کا قیام اسوہ رسالت مآب کا جزو لاینفک ہے۔ دعوت اور خدمت کے تمام کام اہم اور لائق تحسین لیکن "ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں" اور "سید صاحب نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام، قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن وکاہ برآوردن" ثابت ہوں گی" (۵۰۔۵۱)۔

مولانا علی میاں کا میدان عمل سیاست نہ تھا۔ ان کی جملہ کاوشیں دین کے ہمہ گیر اور جامع تصور کی تشریح و توضیح پر مبنی ہیں اور وہ ہمیشہ ملت اسلامیہ کے عروج اور غلبے کا خواب دیکھتے رہے، یہ بات بڑی اہم ہے کہ جب ۱۹۸۰ء میں انہیں فیصل ایوارڈ ملا تو اس کے ساتھ ملنے والی رقم کا نصف انہوں جہاد افغانستان کے لئے اور نصف 'تحفیظ القرآن" کے مدارس کے لئے وقف کیا۔ ملت اسلامیہ کا کوئی بھی مسئلہ ہو، اس پر ان کا موقف ہمیشہ اسلام اور امت مسلمہ کے بہترین مفاد کے مطابق ہوتا تھا۔ بھارت کے مسلمانوں کے لئے انہوں نے دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے ساتھ مسلم پرسنل لا کے تحفظ، شاہ بانو کیس میں اسلامی

قانون کی بالادستی، اسکولوں میں ہدے ماترم کے خلاف احتجاج کی قیادت کی اور بابری مسجد کے سلسلے میں مجاہدانہ موقف اختیار کیا۔ عالم اسلام کے مسائل خواہ ان کا تعلق فلسطین سے ہو یا افغانستان سے، کشمیر سے ہو یا بوسینا سے، انہوں نے حق اور انصاف کے مطابق پوری جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بین الاقوامی پلیٹ فارم پر ہمیں بارہا ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ بھارت کی حکومت نے بار بار کوشش کی کہ کشمیر کے معاملے میں ان سے کوئی بات اپنی تائید میں کہلوائیں لیکن انہوں نے کبھی ایسا نہ کیا۔ نجی گفتگو میں ہمیشہ یہ کہا کہ کشمیر کے لوگوں کا حق ہے کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔

مولانا علی میاں کو پاکستان سے گہری محبت تھی اور نفاذ شریعت کی ہر کوشش کے وہ مؤید رہے۔ وہ زور دیتے تھے کہ اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرو۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر جو تقریر انہوں نے کی اور جن جذبات کا اظہار اپنی خود نوشت سوانح کاروان زندگی" (جلد دوم) میں کیا، وہ پڑھنے کی چیز ہے اپنی پہلی ملاقات میں جنرل ضیاء الحق کو مسجد اقصیٰ کا ماڈل پیش کیا اور جو الفاظ اس موقع پر ادا کیے وہ ان کے جذبۂ ایمانی، امت سے محبت اور حق وباطل کی کش مکش میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں ان کے تصور کے عکاس ہیں: "اس ہدیے میں (زبان حال سے) اشارہ بھی تھا کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت اور اس کا استخلاص بھی ایک صاحب ایمان، مسلم صدر مملکت کی ذمہ داری میں ہے (پرانے چراغ، حصہ سوم)۔

مولانا علی میاں کا اسلامک فاؤنڈیشن سے بڑا گہرا قلبی تعلق تھا۔ جب بھی برطانیہ تشریف لاتے، فاؤنڈیشن ضرور آتے، مولانا کی کتابوں اور تقریروں کی انگریزی میں اشاعت کی سعادت بھی فاؤنڈیشن کو حاصل ہوئی۔ ۱۹۹۶ء میں نوٹنگھم کی مسجد میں اپنے عام خطاب میں مولانا مودودیؒ اور ان کی علمی اور دینی خدمات کو بڑے موثر الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ فاؤنڈیشن کے کام کی حوصلہ افزائی فرمائی، نام لے کر خرم اور راقم کی مساعی کے لیے کلمات خیر ارشاد فرمائے اور مسلمانوں کے تمام دینی کام کرنے والوں کے درمیان اتفاق اور تعاون کی نصیحت فرمائی۔ مولانا علی میاں نے مولانا مودودی سے اپنے علمی اختلافات کا بھی

اظہار بڑے شائستہ انداز میں کیا ہے اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی بڑے کھلے دل سے کیا ہے بلکہ خود اپنے فکری سفر میں ان سے استفادے اور ان کے اثرات کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ندائے ملت" میں مولانا مودودی کی وفات پر ان کا انٹرویو دیکھنے کی چیز ہے۔

اس امر کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مولانا علی میاں صرف اردو ہی کے صاحب طرز ادیب نہ تھے بلکہ عربی زبان پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ انہیں بلاشبہ بیسویں صدی کا عربی کا سب سے اچھا غیر عرب ادیب قرار دیا جاسکتا ہے۔ عربی زبان کا شوق بچپن ہی سے تھا اقبال کی ایک نظم (چاند) کا عربی ترجمہ انھوں نے ۱۶ برس کی عمر میں کیا اور خود اقبال سے داد لی۔ ان کا پہلا عربی مضمون سید احمد شہید پر سید رشید رضا کے مشہور مجلہ "المنار" میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس وقت مولانا علی میاں کی عمر ۱۷ سال تھی۔ اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کی سعادت سب سے پہلے علی میاں کو حاصل ہوئی۔ ان کی کتاب "روائع اقبال" (جس کا اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے عنوان سے شائع ہوا ہے) اس سلسلے کی سب سے کامیاب کوشش ہے۔ عرب دنیا ان کی فصاحت اور بلاغت کا لوہا مانتی ہے۔

علی میاں کو عالم اسلام کے اہم ترین اعزازات حاصل ہوئے۔ جامعہ دمشق اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ان کو وزٹنگ پروفیسر کا مقام حاصل تھا۔ ۳۰۔ سے زائد ممالک میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت ۱۹۹۹ء میں دبئی میں ۱۹۹۸ء کی اہم ترین اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا گیا۔ رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے بانی ارکان میں سے تھے۔ مؤتمر عالم اسلامی لبنان کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مسلم مجلس مشاورت ہند کی شوریٰ کے رکن تاسیسی تھے علی میاں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے گل سر سبد ہی نہیں، پوری اسلامی امت کا سرمایہ تھے اور ان کے قلم اور زبان نے پوری دنیا کے مسلمانوں کی خدمت اور رہنمائی کی۔

مولانا علی میاں نے دعوت و تبلیغ کا کام اپنے طالب علمی ہی کے دور سے شروع کر دیا تھا۔ ندوۃ العلماء ان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے بھی ان کو

زندگی کے مختلف ادوار میں گہرا تعلق رہا۔ اخوان المسلمون اور اسلامی احیاء کی تمام ہی اہم تحریکوں سے ان کا گہرا ربط تھا۔ اسلامک فاؤنڈیشن سے بھی موصوف کو خصوصی تعلق تھا۔ خود مجھے گذشتہ ۵۰ برس سے ان کی مشفقانہ سرپرستی کا شرف حاصل رہا اور ان کی وفات کو بالکل اس طرح محسوس کرتا ہوں جس طرح اپنے والد محترم اور مشفق اساتذہ اور رہنماؤں خصوصیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی کی شفقت اور سرپرستی سے محرومی کو محسوس کیا تھا۔

میں نے مولانا مودودیؒ اور مولانا علی میاںؒ دونوں کے افکار اور کارناموں سے خوشہ چینی کی ہے لیکن دونوں کے مزاج اور اسلوب میں جو فرق تھا اسے میں کبھی کبھی اس طرح بیان کرتا ہوں کہ مولانا مودودی انسان کے دماغ کے ذریعے اس کے دل میں اترتے ہیں اور قلب پر چھا جاتے ہیں، جب کہ مولانا علی میاں دل کے راستے فکر و نظر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دور کے مسلمانوں کے ان دونوں محسنوں کو بہترین اجر سے نوازے، ان کے درجات بلند کرے اور جو شمعیں انہوں نے روشن کی ہیں، وہ ہمیشہ تابندہ رہیں۔

مولانا علی میاں نہ صرف میرے اور میری نسل کے مسلمانوں کے بلکہ پوری امت مسلمہ کے محسن تھے۔ ان کی زندگی میں سلف کے بزرگوں کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی اور وہ ایک خلق کے لئے چشمۂ نور و ہدایت تھے۔ ان کا تعلق صرف بھارت سے نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں سے تھا اور ہم سب ان کے اٹھ جانے سے اپنے آپ کو پھر سے یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ غم شدید ہے مگر اللہ کے فیصلے پر قانع ہیں اور ان کے لیئے دل کی گہرائیوں سے مغفرت اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں اور رب حقیقی سے دعا بھی کرتے ہیں کہ اس امت کو ان جیسے حق کی طرف بلانے والوں، دین کا احیا کرنے والوں سے برابر سرفراز فرماتا رہے تاکہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو جنت کے اعلیٰ ترین درجات میں جگہ دے اور ان کے تمام لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین!

حضرت مولانا علی میاںؒ

﴿سید حامد ******** چانسلر ہمدرد یونیورسٹی نئی دھلی﴾

قحط کے اثاز ہوتے ہیں تو خشک سالی طول پکڑ لیتی ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جہاں باصلاحیت افراد کی ریل پیل ہو وہاں نئے نئے نوابغ روزگار سر اٹھاتے ہیں اور جہاں باصلاحیت افراد کی کمی ہو وہاں قدآور اور عہد آفریں اشخاص اٹھتے جاتے ہیں۔ گزشتہ چھ ماہ کے اندر ہمارے دو سب سے زیادہ بلند قامت نفوس ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ایک کا نشان امتیاز علمی بصیرت تھی۔ دوسرے کا روحانی رفعت۔ حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم و مغفور نے اپنی ایک اوپر نوے سال کی زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تعمیری کام کی ایک قابل تقلید لیکن عسیر الاتباع مثال قائم کردی۔ انہوں نے اپنی معنی خیز جدوجہد کے لئے ان دو میدانوں کو چنا جن پر کسی قوم کی افرادی طاقت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ یعنی تعلیم اور صحت انہوں نے ان دونوں میدانوں میں لگن، خاموشی، سلیقہ اور یکسوئی کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دیئے، جن کا فائدہ ان شاء اللہ صدیوں تک مسلمان اٹھاتے رہیں گے، نہ صرف مسلمان بلکہ ہمارے ملک کے دوسرے باشندے بھی۔ انہوں نے نئے نئے ڈھنگ سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر اندیشی کو فروغ دیا۔

حکیم صاحبؒ کے ہم عصر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ۸۵ر سال کی عمر پائی۔ انہوں نے اپنی زندگی خلق خدا کی خدمت اور ہدایت کے لئے وقف کردی۔ اداروں کا جہاں تک تعلق ہے انہوں نے ندوۃ العلماء میں گرانقدر توسیعات کیں، اس کے تدریس

و تحقیق کو اونچا کیا اور اس کے تحت مدارس کی ایک زنجیر کے وجود میں آنے کا اہتمام کیا۔ اس کے فارغین عربی ادب سے واقفیت اور عربی زبان میں بے تکلف گفتگو کے لئے معروف تھے اور بفضلہ اب بھی ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کی اقوام و ملل اداروں کے توسط سے ترقی کرتی ہیں اور اگر کسی قوم سے ادارے قائم کرنے اور چلانے کی صلاحیت چھن جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ روبہ زوال ہے۔ لیکن انہوں نے زیادہ ادارے قائم نہیں کئے گو کہ آپ نے ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے تعلیمی اداروں کا سنگ بنیاد رکھا یا ان کا افتتاح کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی ذات اس قدر محترم تھی کہ وہ اپنے اداروں میں ان کے قدوم میمنت لزوم کو باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ان دو اکابر کے باہمی تعلقات کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ حکیم صاحب اور مولانا علی میاں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بہت انسیت تھی، بڑا احترام تھا۔ چنانچہ ہمدرد نگر کی کشادہ اور خوش نما مسجد کا سنگ بنیاد حکیم صاحب نے علی میاں سے رکھوایا تھا۔ آٹھ، نو سال ہوئے ہوں گے۔ مولانا علی میاں علیل ہوئے۔ حکیم صاحب نے بصد اصرار انہیں دلی بلایا اور مجیدیہ ہسپتال میں ان کے علاج کا خاص اہتمام کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنا علاج (جس میں ایک آپریشن بھی شامل تھا) مکمل کرا کے جائیں۔ مولانا اس پر راضی نہیں ہوئے جس کا ذکر حکیم صاحب نے کئی بار حسرت کے ساتھ کیا اس سے ان کی اس وابستگی کا اندازہ ہوتا تھا جو انہیں مولانا علی میاں سے تھی۔

ان کوہ قامت شخصیتوں کے درمیان مزید ارتباط کا وسیلہ اتفاقاً راقم السطور بن گیا۔ مولانا علی میاں کو اس کمی کا شدید احساس تھا کہ مسلمانوں کے پاس خود ان کا کوئی انگریزی اخبار نہیں ہے۔ ان کی نظر انتخاب راقم پر پڑی۔ ہر چند کہ اسے اخبار نکالنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ چندہ کی مہم پر نکلا ہر جگہ لوگوں نے اس کی فوری ضروریات اور اہمیت کا اعتراف اور اعلان کیا لیکن یہ اعتراف صرف زبانی تھا۔

گر زر طلبی سخن دریں است

(اگر روپیہ مانگتے ہو تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں)

بڑے جتن کے بعد جس میں بیرون ملک کا دورہ بھی شامل تھا جو رقم جمع ہو سکی وہ اخبار کی ضرورت کے پچاسویں حصے سے زیادہ نہ تھی۔ مجبوراً ایک ہفتہ وار رسالہ (One Nation Chronical) کے نام سے نکالا۔ وہ کامیاب نہ ہوا تو اس کی جگہ ایک پندرہ روزہ میگزین (Nation & The World One) نکالی جو آٹھ سال سے بلاناغہ نکل رہی ہے اور دوسرے عام امور کے علاوہ مسلانوں کے مسائل اور مشکلات کو منظر عام پر لاتی ہے اور اپنے قارئین کو توازن اور اعتدال اور اہل وطن کے ساتھ خیر اندیشی کی تلقین کرتی ہے۔ اخبار نکالنے کیلئے ایک ٹرسٹ (Natonal Information & Welfare) کے نام سے رجسٹرڈ کیا تھا۔ یہ دونوں اکابرین اس ٹرسٹ میں شامل تھے۔ اس کی ایک میٹنگ جامعہ ہمدرد میں ہوئی تھی ۔ٹرسٹ سے قطع نظر حکیم صاحب اور مولانا علی میاں مجھ سے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے، جس سے ان کے مابین گہرے تعلق خاطر کا پتہ چلتا تھا۔

میں لکھ چکا ہوں کہ مولانا علی میاں کی شخصیت ہندوستانی مسلمانوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ محترم تھی، آیئے تلاش کریں کی ایسی متلون مزاج، شکّی سخت گیر نکتہ چیں قوم میں ان کی غیر متزلزل مقبولیت کی وجہ کیا تھی۔ اس جستجو میں انکی شخصیت کے بہت سے دل پذیر پہلو سامنے آجائیں گے۔

مولانا کے علم و فضل اور ان کے وسیع مطالعے اور عربی زبان پر ان کی قدرت کا ایک زمانہ قائل ہے ،لیکن کیا یہ اوصاف اس گراں بہا قبول عام کے ضامن ہو سکتے ہیں، جو مولانا علی میاں کے حصہ میں آیا ،اس محبت اور عزت کے مستحق ہو سکتے ہیں جو ان کے لئے مقسوم تھی؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہوگا ہندوستانی مسلمان جو اپنے عصری رہنماؤں کی طرف سے بیشتر اور اپنے دینی علماء کی طرف سے نسبتاً کم تر زخم خوردہ رہے ہیں اور جنہیں ان کی نیت کی بابت اکثر شبہ رہا ہے، سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دینے لگے ہیں کہ ان کا رہنما ثابت قدم اور اثر ناپذیر ہو۔ ہر طمع اور ہر دینوی خوف سے بالاتر۔ جس کا تقوی ماسوا کے اثرات سے مصئون و محفوظ ہو۔ ایک عرصہ کے مشاہدہ، تجربہ اور چھان بین کے بعد وہ مولانا کے کردار کی پاکیزگی اور ان کی بیخوفی اور بے طمعی اور دلجمعی پر ایمان لے آئے۔ ان کی نیت پر شبہ ان

کے احاطہ خیال میں کبھی بھی نہ آسکا۔ انہیں ایک عرصہ سے ایسی قیادت کی حسرت تھی جو اکاؤ ہو اور بکاؤ بہر حال نہ ہو۔ مولانا علی میاں کی شخصیت نے ان کی اس حسرت کو پورا کر دیا۔ انہیں کتنا بڑا اطمینان ہوا کہ ان کے پاس ایک راہنما ایسا ہے جسے کوئی دنیاوی طاقت راہ راست سے ہٹا نہیں سکتی، ڈگا نہیں سکتی۔

لیکن علم و فضل کی طرح پارسائی اور نیک نیتی بھی اس احترام و اکرام کی توجیہہ نہیں کر سکتی جس کی بارش مولانا علی میاں پر ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ذرا سا اکتساب ذرا سا امتیاز انسانوں کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ یہ امتیاز خواہ دولت کی بنا پر، خواہ طاقت یا وجاہت کی بنا پر، خواہ (ستم بالائے ستم) علم یا پارسائی کے باعث، انسانوں کو گھمنڈی بنا دیتا ہے۔ وہ اُڑد کے آٹے کی طرح اینٹھنے لگتے ہیں سمجھتے ہیں کہ چال میں ان کی اکڑ زمین میں شگاف ڈال دے گی یا آسمانوں کو ان کی سربلندی چیر کر رکھ دے گی۔ وہ خود کو دوسرے انسانوں سے افضل اور برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہیں سے ان کا اخلاقی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ غرور کا ساتھ غصہ دیتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں ناروا اور نازیبا ہیں۔ مولانا کی ذات کو ان کی فروتنی، عاجزی، بے نفسی اور انکساری نے بہت پرکشش بنا دیا تھا۔ مذکورہ کشش میں اضافہ ان کے توازن اور اعتدال اور تواضع نے کر دیا تھا۔ لیکن مقبولیت اور محبت اور احترام کے اسباب کا تجزیہ یہاں بھی تمام نہیں ہوتا۔ ان کی شخصیت کی عمارت کے گنبد کی تشکیل اس وابستگی، خیر اندیشی اور محبت سے ہوئی تھی جو انہیں بنی نوع انسان کے ساتھ تھی۔ جو ان کے دل میں اُمڈ آتی تھی وہ انسانوں سے محبت کرتے تھے۔ ان کے لئے ان کے دل میں حقارت اور کدورت در کنار مغایرت کا گزر بھی نہیں تھا۔ جگر کی طرح ان پیغام محبت تھا جسے انہوں نے پیام انسانیت کا نام دیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے محبت مترشح ہوتی تھی۔ اسی محبت کی چمک ان کی درد مند آنکھوں سے ضوریز ہوا کرتی۔ کولرج" نے اپنے رفیق سخن "ورڈسورتھ" سے کہا تھا کہ ہم وہی پاتے ہیں جو ہم دیتے ہیں۔ جو محبت مولانا علی میاں نے انسانیت کو دی، وہ اضافے کے ساتھ انہیں واپس مل گئی۔

مولانا کی شخصیت کی پاکیزگی کا ہی یہ ایک پہلو تھا کہ کوئی چھوٹی بات کبھی ان سے سرزد نہ

ہوئی۔ خشونت نے ان کی زبان کو کبھی چھوا تک نہیں۔ تحقیر اور تذلیل کے لئے ان کی کشادہ دلی کے دروازے بند تھے۔ ان کا حسن خلق دلوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ انہیں خدا کے بندوں سے پیار تھا ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں ☆ بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو ☆ خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ان تحریکوں میں جو ہندوستان میں چلائی گئیں اس خاموش تحریک کی خاص اہمیت ہے جسے پیام انسانیت کا نام دیا گیا۔ اس کے اہم ترین مقاصد دو تھے :

۱۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر اندیشی اور ملاطفت کو فروغ دینا۔

۲۔ اس اخلاقی گراوٹ کو روکنا جس سے ہمارا وطن عزیز دوچار ہے اور اپنے اہل وطن کو لازوال انسانی قدروں کی طرف واپس لانا۔

یہ تحریک یوں تو پورے ملک کے لئے مفید تھی لیکن مسلمانوں کے لئے یہ بالخصوص منفعت بخش ثابت ہوئی۔ اس نے ایک حد تک ان کی اس روش کو درست کیا جو انہیں علیحدگی اور الگاؤ کی طرف لے جارہی تھی اور جس نے انہیں اہل ہند کے مشترک مسائل سے بیگانہ بنا رکھا تھا۔ ہمارے لئے دراصل یہ بات فخر کی ہے کہ انسانیت، محبت، انسیت، رواداری اور خیر خواہی کا یہ پیغام اہل وطن کو مسلمانوں نے دیا مجھے اس تحریک کے تین چار جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا جو دلی، ناگپور، پونہ میں منعقد ہوئے تھے۔ پہلے جلسہ کی ترتیب مجھے تفویض ہوئی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دوری حائل ہوگئی ہے وہ اس تحریک سے دور تو نہیں ہوئی لیکن اس میں کچھ کمی ضرور آگئی، وقتی طور پر ہی سہی۔ سمت سفر بہر حال صحیح تھی۔ کارواں منزل تک نہ پہنچ سکا، یہ دوسری بات ہے وہ عوامل جو بابری مسجد کی شہادت کا سبب بنے راہ میں حائل ہوگئے۔

بعض حضرات کو شاید یہ شکایت ہے کہ توازن اور اعتدال کے زیر اثر مولانا علی میاں نے دعوت میں تکلف اور احتیاط اور نرم روی سے کام لیا۔ ان کے نکتہ چیں غالباً اس تاریخی

شعور سے کترا کر نکل گئے ہیں جو مولانا کا ایک نشان امتیاز تھا۔ ان لوگوں نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ شاید نہیں لیا اور وہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر گئے کہ ہندوستان میں ابتدا ہی سے دین کی اشاعت جارحانہ اور امیرانہ انداز سے نہیں ہوئی، شاہانہ اور فقیرانہ انداز سے ہوئی تھی۔ صوفیاء کرام کی پاکیزہ شخصیتوں نے مثال بن کر دلوں کو موہ لیا تھا۔ مولانا ہمہ گیر احترام کی ایک بڑی وجہ دراصل یہ بھی تھی کہ انہوں نے فرقہ وارانہ اور عقائدانہ اختلافات سے اوپر اٹھ کر صورت حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ زندگی کی ادنیٰ قدروں سے ان کی نگاہ ایک پل کے لئے بھی نہیں ہٹی۔

شیعہ سنی اختلافات کو دور کرنے میں جو ہندوستانی مسلمانوں کے جسم کو ناسور کی طرح کھائے جارہے تھے دو عالموں نے بڑا کردار ادا کیا۔ وہ تھے مولانا کلب صادق (اور ان کے بڑے بھائی مولانا کلب عابد مرحوم و مغفور) اور مولانا علی میاں، جنگ و جدال کو ہوا دینے والوں کی کوئی کمی نہیں، نہ کوئی کمی حقیقت سے گریز کرنے والوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں اور انتہا پسندوں کی ہے۔ کمی دراصل ہے، آگ بجھانے والوں اور کدورتوں اور عداوتوں کو دور کرنے والوں کی۔ مولانا نے ہمیں ایک کثیر المذاہب ملک میں جینے کے آداب کی تعلیم دی اس جزم اور عزم کے ساتھ کہ فرقہ وارانہ مفاہمت ہمارے عقائد پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوگی۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ خوش خوش اور باعافیت زندگی گزارنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کریں۔ یہ روش دعوت میں حائل نہیں معاون ہوگی۔

مولانا ایک عرصہ تک (تاحین حیات) دینی تعلیمی کونسل کے صدر رہے۔ مجھے کانفرنس کے تین سالانہ جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ترتیب اس وضع کی بن گئی تھی کہ مولانا دینی امور اور یہ دنیادار دنیاوی امور پر گفتگو کرتا تھا۔ یہ تین جلسے بہرائچ، بنارس اور مرادآباد میں ہوئے تھے۔ یاد آتا ہے کہ بنارس میں مولانا علی میاں کی تقریر کے صالح اثرات کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمیں یہ کھٹکا ہوا تھا کہ اسی شہر میں دوسرے روز جو شعلہ بار مقرر تشریف لارہے

ہیں وہ توازن، انصاف، خیر اندیشی اور ارتباط کے ان تمام احساسات کو خاکستر کر دیں گے۔ آگ لگانا کس قدر آسان ہوتا ہے.... مہر کیف دینی تعلیم کے اس ریاست گیر نظم کو جسے عدیل عباسی صاحب مرحوم نے شروع کیا تھا، مولانا علی میاں نے ایک عرصے تک ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی اعانت سے بڑے وزن و وقار کے ساتھ چلایا۔

لیکن وہ ایک دوسرا ہی منصب تھا جس نے مولانا علی میاں کو سیاسی نقطہ نظر سے اہم بنادیا تھا۔ یہ تھی مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت۔ جس طرح دینی تعلیمی کونسل نے اتر پردیش میں مدارس کا جال بچھادینے کے علاوہ وقتاً فوقتاً اس اسلام دشمن عنصر کے خلاف موثر احتجاج بھی کیا جو ارباب عداوت عصری تعلیم کے نصاب میں داخل کر رہے تھے، کچھ اسی طرح مسلم پرسنل لا بورڈ نے پرسنل لا کے تحفظ سے آگے بڑھ کر دوسرے مسائل میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بورڈ سیاست اور انتخابات پر بھی بالواسطہ اثر انداز ہونے لگا۔ پرسنل لا بورڈ نے یہ بات واضح کر دی کہ باوجود ہزاروں انتشار کے مسلمانوں میں ابھی بھی یہ صلاحیت باقی ہے۔ کہ جب جان اور ایمان پر بن جائے تو وہ متحد ہو جائیں۔ شاہ بانوں کیس کے سلسلہ میں بظاہر بالآخر مسلمانوں کی جیت ہوئی، لیکن آگے چل کر مسلمانوں کو اس کا زبردست خسارہ اٹھانا پڑا۔ راجیو گاندھی نے ایک طرف مسلمانوں کی شادیوں کے لئے الگ قانون بنا کر مسلمانوں کو رام کر لیا تو دوسری طرف اکثریت کی تالیف قلب کی نیت سے بابری مسجد کا تالا کھلوادیا۔ بالآخر ملک بھر میں مسلم دشمنی کی فضا پیدا کر دی گئی اور بابری مسجد شہید ہو گئی۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ سودا ٹوٹے کا رہا کہ ندی کے سیلاب کو ہمنے روکا تو سمندر گھس آیا۔

مولانا علی میاں کا تعلق مجلس مشاورت سے استوار تھا۔ مسمانوں کی یہ بد قسمتی ہے کہ ایسا کارآمد فورم جسے جماعتی یا پارٹی مفادات سے بالاتر ہونا تھا، جماعتی تنازعات و مفادات کے گرداب میں پھنس کر معطل ہو گیا۔ وہ بقید حیات ہے، لیکن موثر نہیں، نہ اس کا کوئی بدل ہمیں نصیب ہوا۔

مولانا علی میاں کی شخصیت سیاست کے لئے قطع نہیں ہوئی تھی۔ انہیں یہ دیکھ کر مسلمانوں میں مخلص اور دور اندیش رہنماؤں کی کمی ہے، سیاست میں داخل ہونا پڑا، لیکن انہیں یہ وقتی مداخلت بدرجۂ مجبوری کرنا پڑی۔ اہل سیاست اور اہل صحافت کے ہتھکنڈوں کا انہیں اندازہ ہی نہ تھا۔ سیاست کی دنیا میں وہ اجنبی تھے۔ سیاسی امور میں فیصلے کرنا ان کی افتاد طبع سے بعید تھا۔ ان سے سیاسی رہنمائی کی توقع کرنا ان کے ساتھ زیادتی تھی، ان کی اقالیم زہد و پارسائی، فقر و درویشی، تاریخ و تحقیق، علم و فضل، تحریر و تقریر، اصلاح و تعمیر، عبادت و ریاضت، تصنیف و تالیف، دعوت و عزیمت، تعلیم و تدریس سے عبارت تھیں، لیکن اس احترام کے پیش نظر جو عامتہ المسلمین کے دلوں میں ان کے لئے تھا ارباب حل و عقد اور اصحاب سیاست ان کے اوراد و وظائف اور معمولات و مشاغل میں مداخلت کرتے رہتے۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ اور ہندوستان کے وزیر اعظم کئی بار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

جیسا کہ اندیشہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض طالع آزماؤں نے مولانا علی میاں کی غیر معمولی مقبولیت اور ارباب اختیار کی نگاہ میں ان کے احترام اور وقعت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کچھ نے دلی میں کچھ نے لکھنئو میں۔

یہ اشخاص یہ ظاہر کرتے تھے کہ مولانا ان کی بات سنتے ہیں لیکن بالآخر مولانا کا فقر اور ان کا تقویٰ ایک تیز روندی کی طرح اہل غرض کے خس و خاشاک کو بہالے جاتا۔ ان کی بے نفسی اور بے غرضی ہمیشہ فتح مند ہوئی۔ وہ ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ انہیں فیصل ایوارڈ کو شامل کرتے ہوئے کئی گراں قیمت ایوارڈ ملے، وہ سب کار ہائے خیر میں صرف کر دیئے گئے۔ اب تو ایسی مثالیں تصور میں بھی نہیں آتیں۔

دنیاوی اعترافات کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہاں پھر حکیم صاحب یاد آتے

ہیں۔ حکومت نے جو مرتبہ دانی سے عاری ہوتی ہے اطلاع دی کے انہیں "پدم بھوشن" کا ایوارڈ دیا جارہا ہے، سمجھتی ہوگی کے حکیم صاحب پھولے نہ سمائیں گے، اسے کیا خبر تھی کہ انہوں نے کس مشکل سے پہلے ایوارڈ "پدم شری" کو انگیز کیا ہوگا۔ دوسرے ایوارڈ نے انہیں سخت پریشانی اور مخمصہ میں مبتلا کیا ہوگا۔ اگر ایوارڈ لینے سے انکار کرتے ہیں تو اس کی غلط تعبیر کی جائے گی۔ اگر قبول کرتے ہیں تو غرض مندوں اور کم مایوں کی بھیڑ میں شامل ہو جائیں گے۔ کچھ دیر کرب کا عالم رہا بالآخر انہوں نے طے کیا کہ انکار تو نہیں کریں گے لیکن ایوارڈ لینے جائیں گے بھی نہیں۔ کچھ دنوں بعد مجھے ان کے ساتھ کسی تقریب میں راشٹرپتی بھون جانے کا اتفاق ہوا تو صدر مملکت شنکر دیال شرما صاحب نے ایوارڈ کی تقریب میں حکیم صاحب کی غیر موجودگی کا ذکر ہنستے ہوئے شکایت بھرے لہجے میں ان سے کیا۔ صلاحیت، کارنامے اور امتیازات جب ایک بلندی پر جاتے ہیں تو وہ ستائش اور اعتراف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مولانا علی میاں کے استغنا میں وہ پہلو بھی تھا جس نے حکیم صاحب کو راشٹرپتی بھون کی تقریب میں جانے سے روک دیا اور وہ پہلو بھی ہے جسے درویشی اور فقر کہتے ہیں اور جو دنیا اور اس کے مراتب کو پرکاہ سے کم سمجھتا ہے۔

مولانا علی میاں کا تقویٰ انہیں اسلام کی اساس سے ہٹنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ "نیشن اینڈ دی ورلڈ" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس میگزین کی تاسیس میں مولانا کا اشارہ شامل تھا اور وہ اسے چلانے والے ٹرسٹ کے صدر بھی تھے۔ ان کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ ایک دفعہ تسامح سے اس کے سرورق پر ایک خاتون کی تصویر شائع ہو گئی۔ جنہوں نے حجاب کا پوری طرح التزام نہیں کیا تھا۔ یہ بات مولانا علی میاں کے علم میں لائی گئی۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ وہ ٹرسٹ سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ ترگوئی، رافت، دلاسائی اور فروتنی کے باوجود دینی اور شرعی امور میں کسی مداہنت کو گوارا نہیں کرتے تھے، لیکن حسب مزاج یہ خط بھی انہوں نے تقریباً اعتذر کے انداز میں لکھا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں استعفیٰ اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ مبادا رسالہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ میں نے ان کی اصابت رائے

کو تسلیم کر لیا۔

ایک دوسرے مسئلہ میں البتہ میں شرح صدر سے محروم رہا۔ علی گڑھ کے دوسرے قیام کے دوران میں نے ملک کا دورہ کرنے اور مدارس و جامعات میں حاضری دینے کے بعد یہ مہم شروع کر دی کہ دینی مدارس میں دینی نصاب کو تمام و کمال محفوظ رکھتے ہوئے کچھ اہم عصری مضامین کو بھی شامل کر لیا جائے تاکہ :

۱. ان کے طلباء دنیا میں جو حیرت انگیز تغیرات آئے دن ہو رہے ہیں ان سے باخبر رہ سکیں۔

۲. دعوت کے فریضے کو خیر و خوبی انجام دے سکیں اور لوگوں کو سمجھا سکیں کہ اسلام زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں سے کس طرح انہیں عہدہ برا کر سکتا ہے۔

۳. وہ مدارس سے فارغ ہونے کے بعد ان عصری اداروں میں داخل ہو سکیں جن سے گزر کر روزگار کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

میں نے مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی میں داخلے کیلئے تسلیم کر لیا۔ تاہم یہ احساس برابر دامن گیر رہا کہ اس تجویز یا تحریک کو مولانا کی تائید حاصل نہیں ہے۔ غالباً وہ ایسی مداخلتوں سے مدارس کے نظم کے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔

لیکن ان کا اختلاف نہ کبھی حوصلہ شکن ہوتا تھا، نہ دلخراش، وہ تہذیب اور تالیف قلب کے اس مقام پر فائز تھے جہاں تادیب تلطف کے انداز سے کی جاتی ہے دوسرے حضرات کے ناموافق ردّ عمل کو میں نے اکثر تلخ اور جراحت ساماں پایا۔ مثلاً ایک بار میں تین طلاق کی روش کو میں دین اور عقل اور انصاف کے خلاف سمجھتا ہوں۔ میں نے اس کا اظہار ایک مضمون میں کیا تو ایک عالم دین جو مجھے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے بے حد برہم ہو گئے اور ایک دوسرے نے کرم فرما تلخ نوائی پر اتر آئے۔

مولانا نے حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور وہ مذہب کے معاملہ میں کسی ڈھیل کو گوارا نہیں کرتے تھے اور "دانشوروں" کے آوازۂ تجدید پر ان کی نگاہ شبہ آلود پڑتی تھی ؎

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید ☆ مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

مولانا کو علامہ اقبال کے ساتھ بے حد عقیدت تھی۔ ہمارے مشاہیر میں ایک بزرگ ان سے پہلے بھی گزرے ہیں جو اقبال سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ وہ ان کے ہم عصر بھی رہے۔ وہ تھے مولانا محمد علی جوہر جنہوں نے بقول خود اسلام اقبال سے سیکھا تھا۔ فرمودۂ اقبال یہ بھی تھا کہ ان مدارس کو نہ چھیڑو، وجہ یہ اسلام کے پاسبان ہیں۔

مولانا کی فکر جہاں پیما مدارس میں مقید نہ رہ سکی۔ وہ مدارس کی اہمیت کے رمز شناس تھے، لیکن وہ اس کے خلاف تھے کہ نئی نسل مدارس میں ہی تعلیم پائے۔ ایک بار باہر سے کچھ متشرع بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا ارادہ مدرسہ کھولنے کا تھا، جس کے لئے وہ مولانا علی میاں سے تاریخ لینے آئے تھے۔ جواب سن کر آپ کو حیرت ہوگی۔ فرمایا کہ آج کل زیادہ ضرورت مسلمانوں کے زیر نظر پبلک اسکولوں کی ہے، آپ پبلک اسکول کیوں نہیں کھولتے۔ اسی طرح ایک سے زیادہ بار میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء سے زیادہ امید علی گڑھ یونیورسٹی سے ہے۔ کیونکہ میں وہاں زندگی زیادہ پاتا ہوں۔ انہیں سید والا گھر سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ ہمارے علماء میں سے آپ کو کس میں وسعت نظر اور روشن خیالی اس درجہ حرارت پر ملے گی؟ ان کی یہ وسعت نظر دین کی دین تھی۔ اس بڑے عالم کی گرفت میں دین کی روح آگئی تھی۔ تفہیم اسلام میں بلاشبہ ان کا شعورِ تاریخ معاون ہوا۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے جس میں اس وقت ہم نہیں پڑیں گے۔

کئی لحاظ سے مولانا علی میاں کی شخصیت منفرد تھی۔ وہ اردو میں سوچ کر اپنے خیالات کو عربی میں نہیں ڈھالتے تھے۔ ان کی فکر کا آلہ عربی زبان تھی، اسی لئے وہ عربی میں بلا تکلف لکھتے تھے، غالباً اہل زبان کی سی قدرت اور روانی کے ساتھ۔ مذہبیات میں ان کی فطرت مائل تھی بجائے خوردبینی اور موشگافی کے، پلاننگ کی اصطلاح میں ان کا نقطہ نظر میکرو (Macro) تھا نہ کہ مائکرو (Micro)۔ وسعت ذہن اور کثرت مطالعہ نے درخت گننے کے بجائے نشوونما کے سودا عظم کے مشاہدہ پر مامور کر دیا تھا۔ ان کے تاریخی شعور نے ان

کے ذہن و نظر کو جزئیات سے دور اور برتر رکھا تھا۔ وہ اسلام کے داخلی مورخ تھے۔ انہوں نے دعوت و عزیمت کی تاریخ لکھی اور یہ تجزیہ بھی کیا کہ اسلام نے انسانی تہذیب کو کیا کیا دیا۔ اسلامی تحریک اور وسیع اسلام کے ظواہر سے صرف نظر کر کے مولانا علی میاں نے تقویٰ، تورع، دعوت تبلیغ اور توحید وفلاح واصلاح کی اس زریں لہر کی کھوج لگائی جس کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ ان کی فکر نے بہ یک وقت شریعت اور طریقت کے بازوؤں پر پرواز کی۔ شریعت کی پابندیاں ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھیں اور وراثت اور ریاضت کی، ناطریقت ان کی رگ وجاں میں پیوست ہو گئی تھی۔ انکے لہو میں گردش بھی اسی کی تھی۔

تخمینہ لگانے کے لئے تناظر درکار ہوتا ہے۔ اسلامی فکر کو علی میاں نے کیا دیا ہم اس کا تعین نہیں کر سکتے نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ مفکرین اسلام میں بالآخر ان کا مقام کیا ہوگا۔ یہ بھی ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی افتاد طبع اور زاویہ نگاہ کو انہوں نے کس حد تک متاثر کیا۔ اور پیام انسانیت کے محاذ پر جہاں وہ سارے اختلافات وامتیازات سے اوپر اٹھ گئے تھے، فرقہ وارانہ تعلقات پر کیا اور کتنا دیرپا اثر ڈالا۔ یہ لکھتے وقت ایک جلسہ کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جہاں دو پاکیزہ اور وسیع المشرب شخصیتیں مولانا علی میاں اور ڈاکٹر بشمبر ناتھ پانڈے، فرقہ وارانہ اتحاد اور تہذیب اخلاق کے لئے سرگرم تھے۔

لیکن اثرات اور باقیات کو اس قدر اہمیت کیوں دی جائے، ہمیں سر دست بارگاہ ایزدی میں دست تشکر پھیلانا چاہئے کہ ہمیں ایسے دور میں جب زیادہ تر لوگ دام ہوس میں اسیر تھے اور جو بچے تھے انہیں تنگ نظری۔ علیحدگی، کنارہ کشی اور انتہا پسندی نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے عالم باعمل، ایک صوفی صافی، ایک زاہد بے ریا، ایک درویش باصفا سے نوازا جس کا وجود اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح تھا ؎

شب تاریک دوستان خدا

می بہ تابد چو روزِ رخشندہ

(خدا کے دوستوں کو اندھیری رات روز روشن کی طرح چمکتی ہے) مولانا علی میاں کی

شخصیت بعض دوسرے علماء کی طرح اکہری نہیں تھی تہ دار تھی۔ اس میں پہلی اور بنیادی تہ خاندانی دینی ماحول اور دین کے مطالعے سے بنی تھی۔ دوسری تہ ان وسیع مطالعات پر مبنی تھی جو ماورائے دین تھے۔ تیسری تہ تاریخ کے مطالعے سے عبارت تھی چوتھی تہ ان سفروں سے ماخوذ تھی جو انہوں نے متعدد بار دوسرے ممالک اور خود اپنے وطن عزیز میں کئے تھے اور پانچویں تہ (اگر اسے تہ کہہ سکتے ہوں) عبارت تھی تصوف اور طریقت سے لیکن شخصیت کی ترکیب گنتی اور ظن و تخمین سے بالاتر ہوتی ہے۔ بہر کیف مولانا علی میاں کی شخصیت کو ان کے ورثہ۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ نے غیر معمولی تمول عطا کر دیا تھا۔ ان کی طبیعت کی رافت اور نرمی صلح جوئی اور امن پسندی اور خیر اندیشی نے انہیں اسلام کی جمالی شان کا ترجمان بنا دیا تھا۔ وہ اپنے علم و فضل، تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت کے علاوہ اس پیام انسانیت کے لئے یاد رکھے جائیں گے جنہوں نے ایک آڑے وقت میں ہندوستان کو امن و عافیت اور دائمی اخلاقی اقدار کا درس دیا۔

طفلانہ ذہنیت

اب مسلمانوں کی ذہنیت ایسی ہو گئی ہے کہ کوئی سیلاب بھی آ جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں چلو اچھا ہوا جتنی ہی پریشانی ہو ٹھیک ہے۔ کہیں آگ لگ جاتی ہے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اب ایسی ذہنیت پست ہو گئی ہے کہ اگر کرکٹ میں، ہاکی میں ملک کی ٹیم ہار جائے تو خوش ہوتے ہیں اور کسی اسلامی ملک کی ٹیم جیت جائے تو خوش ہوتے ہیں، یہ بالکل طفلانہ ذہنیت ہے، اس سے کام نہیں چلے گا۔ یہی ہمدردی آپ کو پیدا ہونی چاہئے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی ہو، دیکھئے آج ہمارے اسلاف کرام نے اس ملک کو نہ بنایا ہوتا، نہ سنوارا ہوتا تو آج ہم اس ملک کو دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

(٦)

مجلّات و جرائد کے چند اہم مضامین

آہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا محمد تقی عثمانی

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، نہ یہاں خوشی خالص ہے، نہ غم خالص، اس لئے یہاں غموں اور صدموں کا پیش آنا نہ کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ کوئی غیر معمولی چیز۔ لیکن بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری امت پر پڑتا ہے، اور ان کے عالمگیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ پچھلے مہینے (رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ) میں ایک ایسا ہی عظیم صدمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کا پیش آیا جس نے ہر اس شخص کو ہلا کر رکھ دیا جو حضرت مولاناؒ، ان کی شخصیت اور ان کی خدمات سے واقف ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے محض تصور سے دل کو ڈھارس اور روح کو یہ اطمینان نصیب ہوتا تھا کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں بفضلہ تعالیٰ ان کا سایہ رحمت پوری امت کیلئے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم و فضل کے شناوروں کی تعداد اب بھی شاید اتنی کم نہ ہو، عبادت و زہد کے پیکر بھی اتنے نایاب نہیں، لیکن ایسی شخصیات جو علم و فضل، سلامت فکر، ورع و تقویٰ اور اعتدال و توازن کی خصوصیات جمع کر لینے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں، اور جن کے دل دردمند میں عالم اسلام کے ہر گوشے کیلئے یکساں تڑپ موجود ہو، خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں، اور ان کی وفات کا خلا پُر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو انہی خصوصیات سے نوازا تھا، اور اب ان صفات کا جامع دور دور کوئی نظر نہیں آتا۔

حضرت مولاناؒ اصلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے،

لیکن اس کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ نے دار العلوم دیوبند سے بھی اکتسابِ فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی' اور اس طرح ان کی ذات میں برصغیر کے ان دونوں عظیم اداروں کے محاسن جمع فرما دیئے تھے۔ پھر علم ظاہر کے اس مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علم باطن کا بھی حصہ وافر عطا فرمایا۔ انہوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت سے فیض حاصل کیا' اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خلفہ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو اور عربی تصانیف اتنی ایمان افروز' فکر انگیز اور معلومات آفریں ہیں کہ وہ دل کو ایمان یقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج و مذاق انسان پر واضح کرتی ہیں' اور اسے افراط و تفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس جادۂ مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تحریروں میں علم و فکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز و گداز ہے جو انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں' اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں' ان پر حضرت مولاناؒ کی نظر بڑی وسیع و عمیق تھی' اور انہوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشان دہی اتنی سلامتِ فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مؤلفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کی ہمسری کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان کی تحریر و تقریر پر وہ قدرت عطا فرمائی تھی جو بہت سے عرب اہل قلم کیلئے بھی باعث رشک تھی' اس منفرد صلاحیت سے انہوں نے خدمت اسلام کا وہ عظیم الشان کام لیا جو عربی زبان و ادب کے معاصر ماہرین میں سے شاید کسی نے نہ لیا ہو۔ ان کی فصیح و بلیغ عربی تحریروں نے عربوں کو دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا' اور مغرب کی فکری یلغار سے سہمے ہوئے عرب ممالک میں دین کا پیغام اتنی خود اعتمادی' اتنے یقین اور اتنے پرجوش انداز میں پہنچایا کی آج بیشمار عرب مسلمان اپنی اسلامی بیداری کو ان کی تحریروں کا مرہون منت سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں جو اخلاص' دردمندی اور دلسوزی کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ ان کی سخت سے سخت بات کو بھی مخاطب کیلئے قابلِ قبول بنا دیتی تھی' اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیر عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ عرب ملکوں کے مقتدر حلقوں سے بھی ان کے مراسم تھے' اور وہ ان مراسم کو خدمت دین کیلئے استعمال فرماتے تھے۔ اور ان کی بدولت بہت سے منکرات کا سدباب ہوا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مولاناؒ کی قیادت نے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ یہ ادارہ در حقیقت حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمتہ اللہ علیہ نے مسلمانوں کی اہم وقتی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم فرمایا تھا' اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے ایسے اہل علم پیدا ہوں جو دینی علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت رکھتے ہوں جو ان کی دعوت کو معاصر تعلیم یافتہ حضرات میں زیادہ مؤثر بنا سکے۔ یہ ایک عظیم الشان مقصد تھا' لیکن رفتہ رفتہ اس ادارے پر تاریخ وادب اتنا غالب آتا گیا کہ اسکی دینی چھاپ ماند پڑنے لگی۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کو دوبارہ اپنے اصل مقاصد کی طرف اس حکمت اور بصیرت کے ساتھ لوٹایا کہ اس کی نمایاں خصوصیت بھی بر قرار رہی' اس کے ساتھ اس میں ٹھیٹھ اسلامی علوم کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا، اس کی مجموعی فضا پر تدین، تقوی اور انابت الی اللہ کا رنگ بھی نمایاں ہوا' اور تاریخ وادب کو دین کی دعوت اور مقاصد شریعت کا خادم بنا کر اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ ادارہ دعوت وخدمت دین کا ایک اہم مرکز بن گیا جس کی خدمات سے پورے عالم اسلام نے استفادہ کیا۔ حضرت مولاناؒ نے اپنی انتھک جدوجہد سے اس ادارے میں اپنے ہم رنگ علماء کی ایک بڑی کھیپ تیار فرمائی جو بفضلہ تعالی حضرت مولاناؒ کے انداز فکر وعمل کی امین ہے اور انہی کے طرز وانداز پر دین کے مختلف شعبوں میں گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ کثر اللہ تعالی امثالھم۔

یوں تو حضرت مولاناؒ کی تمام ہی تصانیف ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں' لیکن"

تاریخ دعوت و عزیمت" اور "دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور "عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" یہ تین کتابیں ایسی ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے خاص طور پر بہت استفادہ کیا' اور ان کے ذریعے بہت سی زندگیوں میں فکری اور عملی انقلاب رونما ہوا۔ اسکے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالے جو الگ کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ بلا کی تاثیر رکھتے ہیں۔ خاص طور پر" اسمعوها منی صریحة ایها العرب" اور "من غار حراء" اور "ردّوا لا ابا بکر لها" اور آخر میں "ترشید الصّحوة الاسلامیة" وہ مقالے ہیں جنہوں نے دلوں کو جھنجھوڑ کر انہیں فکر و عمل کی سیدھی راہ دکھائی۔

عصری ضرورتوں کا احساس ہمارے دور میں بہت سے علماء، رہنماؤں اور اہل قلم کو ہوا اور انہوں نے اخلاص کے ساتھ دین کی عصری حاجتوں کی تکمیل میں اپنی توانائیاں صرف کیں' لیکن بسا اوقات عصری حاجتوں کی فکر نے ان کو دین کی سکہ بند اور ٹھیٹھ تعبیر سے ڈگمگا کر ایسی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جو جمہور امت اور سلف صالحین کے جادہ مستقیم سے ہٹی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ کا معاملہ ان سے کہیں مختلف تھا۔ اس دور کا کوئی بھی حقیقت پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ امت مسلمہ کی عصری ضروریات کا مکمل احساس وادراک رکھتے تھے' لیکن ان ضروریات کی تکمیل انہوں نے ہمیشہ جمہور امت کے مسلم عقائد و نظریات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی' اور کسی قسم کی مرعوبیت اور معذرت خواہی کی پرچھائیں بھی ان کی تحریروں پر نہیں پڑ سکی۔

جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کا ساتھ دیا' لیکن جب ان کے طرز فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولاناؒ ان سے الگ تو ہو گئے' لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحبؒ کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انہوں نے جو قابل قدر کام کیا تھا' اسکی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور بالآخر ان کے طرز فکر و عمل پر جو عالمانہ تنقید حضرت مولاناؒ

نے " عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح " میں سپرد قلم فرمائی وہ انہی کا حق تھا۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے مولانا مودودیؒ اور ان کے طرز فکر کے حامل دوسرے اہل علم سے اپنے اختلاف کو انتہائی متانت کے ساتھ مدلل اور مستحکم انداز میں بیان فرما کر ان بنیادی نکات کی نشان دہی فرمائی جن میں ان حضرات کی سوچ قرآن و سنت کے جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی۔

حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی' دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی کوئی تکلیف یا خرابی ان کے دل میں کانٹا بن کر چبھ جاتی تھی' اور وہ مقدور بھر اس کے ازالے کیلئے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات "کاروان زندگی" کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے' اور اسکے مطالعے سے ان کی ہمہ جہتی خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی مصروف زندگی میں انہوں نے اپنی یہ سوانح کسی طرح تالیف فرمائی جس میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات اتنی جزرسی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ سچ ہے کہ جب جب اللہ تعالیٰ کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے اوقات میں بھی برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض واقعات زندگی کی داستان نہیں ہے' بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کے سامنے فکر و بصیرت کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں جن ہمہ جہتی خدمات کے لئے چنا تھا' ان کے پیش نظر وہ کسی ایک ملک کی نہیں پورے عالم اسلام کی شخصیت تھی' میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے سامنے جب کبھی حضرت مولاناؒ کا ذکر آتا تو اکثر وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ "مُوَفق من اللہ ہیں" اور جوں جوں حضرت مولانا کی خدمات سامنے آتی گئیں' حضرت والد صاحب قدس سرہ کے اس جملے کی حقانیت واضح ہوتی گئی۔ لیکن ان ہمہ جہتی خدمات اور عالمگیر مقبولیت کے باوجود حضرت مولاناؒ تواضع کے پیکر تھے' ان کے کسی انداز و ادا میں عجب و پندار کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ قبول حق کیلئے ان کا ذہن ہمیشہ کھلا ہوا تھا' اور وہ اپنے چھوٹوں سے ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے ان سے استفادہ کر رہے ہوں۔

مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت اور عنایات کا جو معاملہ تھا' اسے تعبیر کرنے کیلئے الفاظ ملنے مشکل ہیں' اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کے بعد کی بنا پر مجھے حضرت مولاناؒ سے شرف ملاقات اور حضرتؒ کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع کم ملے' لیکن الحمدللہ خط و کتابت کے ذریعے ان سے تعلق قائم رہا' میں نے اپنے بہت سے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں حضرت مولاناؒ سے رہنمائی طلب کی' اور انہوں نے ہمیشہ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ارشادات سے نوازا۔

میں ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا جب حضرت مولاناؒ کی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل ہو' میرا یہ اشتیاق سو فی صد فطری تھا کہ میرے لئے ان کی حیثیت ایک رہنما کی تھی میں اس بات کا حاجت مند تھا کہ انکی صحبت جتنی ہو سکے' میسر آئے لیکن یہ حضرت مولاناؒ کی شفقت کی انتہا تھی کہ وہ بھی محض اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر مجھے اس سعادت سے بہرہ ور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی ھند کا اجلاس بنگلور میں ہونا تھا۔ احقر نے حاضری کا فی الجملہ وعدہ کر لیا تھا' حضرت مولاناؒ کا گرامی نامہ آیا کہ میں نے تم سے ملنے کی خاطر اس سفر کا ارادہ کیا ہے۔ بعد میں اتفاق سے مجھے ایسی مجبوری پیش آگئی کہ میں وہاں نہ پہنچ سکا' اور اس وقت ان کی زیارت سے محروم رہا۔ میں اپنی نادانی سے یہ سمجھا تھا کہ حضرتؒ نے احقر کی خاطر داری کیلئے مذکورہ بالا فقرہ لکھ دیا ہوگا' لیکن بعد میں انہوں نے اپنے خطوط میں جس طرح اسپر افسوس کا اظہار فرمایا' اور صرف خطوط ہی میں' نہیں' اپنی خود نوشت سوانح میں بھی اس واقعہ کا جس طرح ذکر فرمایا ہے' وہ احقر کو غرق ندامت کرنے کیلئے کافی ہے۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۴/۱۵ ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ (۸/۹/۱۰/۱۱ جون ۱۹۹۰ء کی تاریخوں میں مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا تیسرا عالمی مذاکرہ علمی (سیمینار) بنگلور میں دارالعلوم سبیل الرشاد کے احاطہ میں منعقد ہونے والا تھا۔۔۔ میں نے رائے بریلی کے قیام میں احتیاطاً مجلس کیلئے مقالہ عربی میں تیار کر لیا تھا۔۔ مقالہ اگرچہ تیار تھا' اور بنگلور کا موسم بمبئی سے کہیں زیادہ خوشگوار و خنک بھی ہوتا ہے۔۔ اس

کے باوجود اس موقعہ پر سفر کے بارے میں بڑا تردد تھا۔ اس کی وجہ یہ احساس تھا کہ فقہ پر راقم کو وہ درجہ اختصاص اور مطالعے کی وسعت و عمق حاصل نہیں جو اس اہم مذاکرۂ علمی میں شرکت کیلئے ضروری ہے۔۔ اس لئے شرکت سے معذرت کا رجحان غالب تھا' پھر صحت و افتاد طبع کی بنا پر جن علمی مجالس میں بہت "دھوم دھام" ہوتی ہے ان میں شرکت کرنے سے بھی طبیعت گریز کرتی ہے۔ لیکن کچھ تو مولانا مجاہد الاسلام صاحب جیسے قابل احترام' قدیم اہل تعلق اور فاضل، داعی سے شرم دامن گیر تھی... پھر اس سب پر مستزاد یہ توقع تھی کہ فاضل گرامی قدر اور محب محترم مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب بھی اس مذاکرے میں شرکت کیلئے خصوصی طور پر کراچی سے تشریف لانے والے ہیں۔ بمبئی میں بھی مجھے ان کا خط ملا تھا جس میں اس سفر کی آمادگی تیاری اور ملاقات کے شوق کا ذکر تھا۔ ان کے برادر محترم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے بمبئی میں ملاقات بھی ہوئی تھی جو حیدرآباد کی ایک دعوت پر تشریف لائے تھے اور مولانا تقی عثمانی صاحب کی آمد و شرکت کے متوقع تھے۔ بہر حال ان اسباب کی بنا پر بنگلور کے سفر کا فیصلہ کر لیا گیا۔

... مولانا محمد تقی عثمانی صاحب غالباً سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے جس کی ذاتی طور پر مجھے بہت کمی محسوس ہوئی۔ غالباً ان کی عدم شرکت کی بنا پر مجھ ہی کو اس موقر مجلس مذاکرہ کا صدر فرض کر لیا گیا الخ" (کاروان زندگی ص ۲۱۸ تا ۲۲۲ ج ۴).

اللہ اکبر! تواضع و انکسار اور چھوٹوں پر شفقت و عنایت اور ان کی قدر افزائی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے' پھر بنگلور کے اس سفر میں ملاقات نہ ہو سکنے کا تأثر حضرتؒ پر اس وقت تک رہا جب تک تین ماہ بعد ان سے مکہ مکرمہ میں ملاقات نہ ہو گئی۔ اس ملاقات کا تذکرہ بھی حضرتؒ نے کاروان زندگی میں اس طرح فرمایا ہے۔

"راقم کی نگاہیں اس مؤتمر میں پاکستان کے ان مانوس و محبوب چہروں کو ڈھونڈ رہی تھیں جن سے خصوصی دینی و فکری رابطہ اور انس و محبت کا رشتہ ہے۔ اچانک جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی، حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور جسٹس افضل چیمہ صاحب پر نظر پڑی۔ یہ حضرات بھی غالباً اسی

شوق و جستجو میں تھے... یہ حضرات مغرب کے بعد ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی صاحب کے مکان پر تشریف لے آئے وہیں عشا کی نماز پڑھی کھانا نوش فرمایا اور دیر تک مجلس رہی۔ اس طرح بنگلور میں فقہی سیمینار کے موقعہ پر جو ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوا تھا' مولانا محمد تقی صاحب عثمانی سے (جو ایک مجبوری سے تشریف نہیں لا سکے تھے) نہ ملنے کی حسرت پوری ہو گئی۔ دیر تک مجلس رہی جس میں پاکستان کے حالات پر بھی تبصرہ ہوا... آخری دن مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے اچانک ملاقات ہوئی' ان سے بھی راقم کا خاص رابطہ ہے... اسی مجموعے میں اگر محترمی مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کو شامل کر لیا جائے تو جہاں تک راقم کا تعلق ہے' یہ پاکستان کے وہ معتمد ترین اور منتخب ترین افراد ہیں جن سے راقم کو خصوصی ربط و تعلق ہے' اور وہ بھی اس عاجز پر خصوصی کرم فرماتے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی راقم کے دل میں جو قدر و منزلت ہے اس سے اس کے احباب بخوبی واقف ہیں اور ان کو بھی غالباً اس کا احساس ہے۔

(کاروان زندگی ص ۳۰۴ ج ۴)

حضرتؒ کی خصوصی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی انکی کوئی نئی تالیف آتی' اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ مجھ ناکارہ کو ضرور بھجواتے' اس معاملے میں ڈاک پر اعتماد نہ تھا' اس لئے کوشش یہ فرماتے کہ کسی آنے والے کے ذریعے دستی پہنچ جائے۔ اور بعض اوقات احتیاطاً کئی آدمیوں کے ذریعے ایک ہی کتاب کے کئی نسخے بھجوا دیتے تھے۔ جب حضرتؒ کی معرکۃ الآرا تالیف "المرتضیٰ" منظر عام پر آئی تو اس کے کئی نسخے احقر کے پاس بھیجے اور حکم فرمایا کہ اسپر البلاغ میں بے لاگ تبصرہ لکھوں۔ احقر نے حکم کی تعمیل کی اور کتاب کی نمایاں خصوصیات ذکر کرنے کے ساتھ چند طالب علمانہ گذارشات بھی پیش کیں حضرتؒ نے ان گزارشات کی ایسی قدر افزائی فرمائی کہ میں پانی پانی ہو گیا۔ اس واقعے کا ذکر بھی حضرتؒ نے "کاروان زندگی" میں کیا ہے "المرتضیٰ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بعض حلقوں میں کتاب کا استقبال اور رد عمل مصنف کی توقع اور کتاب کی قدر و قیمت کے خلاف ہوا' مؤلف کتاب کو ایسے خطوط اور تنقیدی تبصرے بھی ملے جن میں سخت و تیز و تند لہجہ استعمال کیا گیا' اور چبھتی ہوئی طنزیہ زبان میں کتاب اور مؤلف کتاب کو نشانۂ تنقید و تضحیک بنایا گیا' رسائل کے تبصرے بھی عام طور پر پھیکے اور خانہ پری کا نمونہ تھے (اس کلیے میں البلاغ کراچی کا وہ منصفانہ' حقیقت پسندانہ اور فراخ دلانہ تبصرہ ایک ممتاز و مستثنیٰ حیثیت رکھتا ہے جو فاضل گرامی جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے نکلا اور رسالہ البلاغ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ کے شمارے میں شائع ہوا"۔(کاروان زندگی ص ۳۴ ج ۴)

حضرت مولاناؒ کے جو مکاتیب میرے پاس محفوظ ہیں' ان کی تعداد بھی خاصی ہے' چونکہ ان مکاتیب میں پڑھنے والے کیلئے کوئی نہ کوئی سبق ضرور موجود ہے' اسلئے میں ان میں سے چند مکاتیب البلاغ ہی میں الگ سے اشاعت کیلئے دے رہا ہوں ان میں راقم الحروف کے بارے میں جو شفقت آمیز کلمات ہیں' وہ احقر کیلئے سعادت اور فال نیک ضرور ہیں' اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائیں' لیکن انہیں پڑھ کر کوئی صاحب احقر کی حقیقی حالت کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہ ہوں' البتہ یہ مکتوب نگار کی عظمت کی دلیل ضرور ہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی کس عزت افزائی کا معاملہ فرماتے تھے۔

حضرت مولاناؒ نے میری کتاب "عیسائیت کیا ہے؟" بہت پسند فرمائی' اور اسکے عربی اور انگریزی ترجمے پر بھی زور دیا' جو الحمد اللہ انکی دعاوں سے شائع ہوا' اور عربی ترجمے کیلئے مترجم کی خدمت مین ھدیہ بھی پیش فرمایا اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا۔ آخری دور میں حضرتؒ نے میری کتاب "تکملہ فتح الملہم" پر بھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا۔

امسال دارالعلوم کراچی کی طرف سے شوال کے آخر میں فضلائے دارالعلوم کی دستاربندی کیلئے سالہا سال کے بعد ایک جلسہ منعقد کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس

موقع پر اکابر علماء کا ایک اجتماع بھی ہو جائے، اس موقع پر جن اکابر علماء کو دعوت دینے کا خیال تھا ان میں حضرت مولاناؒ کا اسم گرامی سر فہرست تھا۔ چنانچہ احقر نے جمعرات ۲۱ر رمضان المبارک کو ندوۃ العلماء مین فون کیا۔ معلوم ہوا کہ حضرتؒ رائے بریلی میں تشریف فرما ہیں، وہاں فون کیا گیا تو حضرتؒ اس وقت فون کے پاس نہیں تھے۔ فاضل گرامی جناب مولانا محمد رابع ندوی صاحب مدظلہم سے بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ الحمد للہ حضرتؒ کی صحت بہتر ہے۔ فالج کا جو اثر پچھلے دنوں ہوا تھا بفضلہ تعالیٰ وہ اب زائل ہو چکا ہے، اور حضرتؒ کمزوری کے باوجود روزے بھی رکھ رہے ہیں۔ یہ سن کر الحمد للہ، بہت اطمینان ہوا۔ جناب مولانا رابع صاحب نے میرا پیغام حضرتؒ تک پہنچانے کا وعدہ کیا، اور فرمایا کہ آپ سے حضرت کو جو محبت ہے، اس کے پیش نظر وہ اس دعوت کو ضرور اہمیت دینگے، تاہم میں نے ان سے وہ مناسب وقت معلوم کیا جس میں ان سے براہ راست بات ہو سکے۔ مولانا نے فرمایا کہ صبح دس بجے کے قریب حضرتؒ فون کے پاس ہوتے ہیں، میں نے ارادہ کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہفتہ کی صبح کو حضرتؒ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرونگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جمعہ کی رات کو میرے بھتیجے عزیزم خلیل اشرف عثمانی صاحب سلمہ نے فون پر بتایا کہ ریڈیو ٹیلی ویژن سے حضرتؒ کی وفات کی خبر نشر ہوئی ہے، دل پر بجلی سی گری، مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلانے کیلئے رمضان کا مبارک مہینہ، جمعہ کا مقدس دن، اور وہ وقت منتخب فرمایا جسمیں وہ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے۔ ان کی زندگی جتنی پاکیزہ تھی، اللہ تعالیٰ نے موت بھی ایسی ہی پاکیزہ عطا فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس واقعے پر یوں تو ہر مسلمان تعزیت کا مستحق ہے لیکن خاص طور پر حضرت کے اہل خانہ، دار العلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین اور اساتذہ، نیز حضرتؒ کے تمام متوسلین کی خدمت میں البلاغ کی طرف سے پیغام تعزیت پیش ہے۔

حضرتؒ مولانا اب دنیا میں نہیں ہیں، لیکن انہوں نے جو گرانقدر مآثر چھوڑے ہیں، وہ انشاءاللہ رہتی دنیا تک امت کی رہنمائی کرینگے۔ (بشکریہ ماہنامہ البلاغ کراچی)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

چند تاثرات و ملاحظات

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی - صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

آج جب میں "بحث و نظر" کے اداریے کی چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو دل و دماغ پر کر عجیب کیفیت طاری ہے، پچھلی صدی میں جن حادثات سے ہمیں گزرنا پڑا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا محمد میاںؒ، محدث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، اور نہ جانے کتنے اجلۂ علماء گزر گئے، اور ابھی ذاتی طور پر میرے لئے اور ماضی قریب میں پوری امت اسلامیہ ہندیہ کیلئے ایک بڑا حادثہ حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کا ہوا، اور ۱۹۹۹ء کے آخری دن ۳۱ دسمبر کو اس امت کا کارواں دن کی روشنی میں لٹ گیا، جو گئے وہ مغفور گئے، اب تو پورا ہندوستان مکہ بن گیا ہے، وہ مکہ جس میں عربی شاعر کو نہ کوئی انیس ملا تھا نہ سمیر، اب دردِ دل کی باتیں کس سے ہوں گی، شفقت کا وہ ہاتھ کون ہمارے سروں پر رکھے گا، آنکھیں ذہانت سے چمکتی ہوئیں، چہرے پر حد درجہ معصومیت اور ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ اب دیکھنے کو کہاں ملے گی، ہم جیسے چھوٹوں کیلئے بھی ہمہ دم فکر مند اور سخت سے سخت اختلاف رائے کو جھیل جانے والے اور اپنی کسی رائے پر اصرار نہ کرنے والے وہ بزرگ ہمیں کہاں ملیں گے، جنھوں نے اپنی حکمتِ عملی سے

امت کے مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کے کارواں کو بکھرنے نہیں دیا۔

کتابیں پڑھ کر طالب علمی ہی میں متأثر ہوا، خاص کر "ماذا خسر العالم" اور دوسرے خطبات کی چھوٹی چھوٹی کتابیں، جی چاہا کہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت کا خطاب ہو، فضل الرحمٰن سیوانی (مرحوم) منظور الحسن ندوی (مرحوم) ابوالہاشم اشرف اور دیگر چند دوستوں کے ساتھ مل کر ہم لوگوں نے نظم کیا، کچھ مخالفتیں بھی ہوئیں، درمیان میں بہت کچھ ہوا، لیکن میں بھول نہیں سکتا کہ اس انتہائی شعلہ بار ماحول میں مولانا کا ہمارے سروں پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنا "ایثار کیجئے ایثار کیجئے" ان جملوں کی ٹھنڈک ہم نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کی، پھر مولانا کا وہ تاریخی خطبہ جو مولانا کے علم و تجربے کا نچوڑ اور ہمیشہ ہمیش کیلئے علوم نبوت کے طلبہ کیلئے شمع راہ ہے یعنی "طالبانِ علوم نبوت کا مقام" دیوبند میں تقریر کرنا کچھ آسان نہیں تھا، لیکن دو گھنٹے کے اس طویل مقالے میں ہم لوگوں کو کوئی ایک آواز سننے کو نہیں ملی، خود میری زندگی، میری فکر اور میرے آئندہ کے کاموں پر اس مقالے کا گہرا اثر پڑا۔

اپنے سبھی خوردوں سے اس طرح محبت کرتے تھے کہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ مجھکو ہی چاہتے ہیں، یہ کچھ آسان کام نہیں ہے، لیکن بزرگوں کے لئے اسطرح کے کام آسان کر دئے جاتے ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس سے لیکر شاہ بانو کا مقدمہ، پھر بابری مسجد کا معاملہ اور اب تک اس حقیر کو حضرت کے ساتھ کچھ کام کرنے اور حضرت کے افکار و آرا سے مستفید ہونے کا موقع ملا، یہ میرے لئے تو موجب سعادت اور باعث فخر و مسرت ہے۔

۱۹۸۵ء میں پھر شاہ بانو مقدمے کی تحریک چل رہی تھی، عدلیہ نے آیات قرآنی کی تشریح و تفسیر شروع کی تھی اور اس طرح قرآن کی معنوی تحریف کا عظیم فتنہ اٹھا تھا، اس وقت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک عظیم الشان تحریک کشمیر سے کنیا کماری تک، مغرب سے مشرق تک، جنوب سے شمال تک اس طرح چلائی تھی اور امت اسلامیہ اس طرح بیدار ہوئی تھی کہ اس کی مثال شاید ہندوستان کی تاریخ میں نہ ملے، اس موقع پر جنوبی ہند کے اسفار میں اس حقیر کو حضرت کی رفاقت کی

سعادت حاصل ہوئی، اور قدم قدم پر حکمت، حسنِ تدبیر، حسنِ خطاب اور اسلام کیلئے اضطراب و بے چینی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا، شاید کالی کٹ میں صحافیوں سے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: فارسی شاعر نے کہا ہے

؎ آہستہ خرام بلکہ مخرام ؛ زیر قدمت ہزار جان ست

میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرکے اہل صحافت! آپ کو مخاطب کرتا ہوں، شاعر نے محبوب کے قدم کے نیچے ہزار جان بتائی تھی اور میں آپ کے قلم کے نیچے ہزار جان دیکھتا ہوں

زیرِ قلمت ہزار جان ست "

جب ہمارے محترم ابراہیم سلیمان سیٹھ نے (اللہ انکو صحت و عافیت عطا کرے) کیرلہ کے صحافیوں کو اس گفتگو کا انگریزی ترجمہ سمجھایا تو پوری پریس کانفرنس اچھل پڑی، لگتا تھا کہ سبھی لوگوں کے دلوں کے تار بج اٹھے، شعر سے زیادہ اور بات سے زیادہ اس مردِ کلیم کا اخلاص قلب تھا جو یہ اثر پیدا کرتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں اس پوری مدت میں کئی ایسے موڑ آئے جہاں بعض ملی مسائل میں دو رائیں ہوئیں، لیکن ہم نے اپنی رائے کے اظہار میں جہاں کوئی بے ادبی نہیں کی جو ہمارا فرض تھا، اس سے لاکھوں گنا عظیم اس دل کی وسعت، بحر بے کراں کی طرح تھی وہ یاد کیا جانا چاہئے، تو بڑے سے بڑے نازک موقعوں پر ان کے دل میں اپنے خوردوں کی طرف سے بال نہیں آیا، ان کی شفقت میں کمی نہیں آئی، لگتا تھا کہ ہر چیز کیلئے ان کے یہاں الگ خانے تھے۔

میں کیسے بھول سکتا ہوں، میری شدید علالت کے زمانے میں جب میں نظام الدین دہلی میں قیام پذیر تھا، حضرت اپنے ضعف کے باوجود تشریف لے آئے، دعاؤں سے نوازا اور پھر آخر تک ہمیشہ فکر مند رہے، خیریت پوچھتے رہے، خود دعا کرتے رہے اور لوگوں کو دعا کی طرف متوجہ کرتے رہے، بڑا دل چاہتا تھا کہ جاکر زیارت کروں، مولانا عتیق احمد صاحب سے بات ہوئی تھی خیال تھا رمضان گزرنے کے بعد خدمتِ اقدس میں حاضری دونگا، لیکن ؎

آں قدح بشکست ؛ وآں ساقی نہ ماند

اب نہ وہ صراحی ہے اور نہ جام اور نہ وہ ساقی، برسوں کھلے آسمان کے نیچے ڈھونڈا کریں گے لیکن تجھ سا کہاں سے لائیں گے۔

حماسی شاعر نے اپنے سردار قبیلہ کیلئے جو کہا تھا، ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو، لیکن ہمارے لئے تو یہ عین واقع ہے ؎

علیك سلام الله قیس بن عاصم ؛ ورحمة ما شاء أن یترحما

فما کان قیس هلکه هلك واحد ؛ ولکنه بنیان قوم تهدما

اے علیؒ! تیری موت ایک شخص کی موت نہیں، ایک خاندان کا حادثہ نہیں، تیری موت سے پوری ملت کی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں۔

اے علیؒ! بے شک یہ غم غم ذات نہیں، غم کائنات ہے، غم شخص نہیں، غم جہان ہے، اسلئے ہم اگر قبر پر روئیں تو کوئی ہمیں ملامت نہ کرے، متمم بن نویرہ کے الفاظ میں ؎

فقلت له: ان الشجی یبعث الشجی ؛ فدعنی فهذا کله قبر مالك

بہر حال انتہائی نازک لمحات میں بھی امت پر اور عام طور پر علماء پر اور حضرت کے رفقاء پر یاس طاری نہیں ہونا چاہئے، بے شک اس خلاء کا پر ہونا بہت مشکل ہے، لیکن اس امت کو قیامت تک قائم رہنا ہے، اور اس طرح کی شخصیات کا تسلسل اس قیام و بقائے سنت کی کلید ہے، پس حضرت مولانا کیلئے مغفرت اور رفع درجات کی دعا کرتے ہوئے ہم اپنی اور اس امت کی یتیمی کو اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں، جس نے "فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ" اپنے حبیب کو فرمایا ہے، ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اس امت کو فتنوں سے نجات اور سربلندی کیلئے صالح حکمت سے بھرپور اور جری قیادت کی بھیک مانگتے ہیں، ولیس ذالك علی الله بعزیز۔

(بشکریہ سہ ماہی "بحث ونظر" دہلی)

□□□

ہندوستان کی آفاقی شخصیت

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی ٭ مدیر ماہنامہ ترجمان دارالعلوم نئی دہلی

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ گئے تو ہندوستان سے مگر پاکستان، خلیجی ممالک، سعودی عرب سے مصر تک سناٹا چھا گیا ——— یہ تھی جانیوالے کی آفاقیت اور عالمی مقبولیت !!

مولانا اپنی وضع قطع میں ایک عالم آدمی تھے، مگر جب قلم اٹھا لیتے تو عالم اسلام ان کی فن کاری برجستگی، عظمت اور ذہانت سے جھوم اٹھتا تھا، بڑے بڑے اہل علم، اہل قلم ان کا قلم چوم لیتے تھے، وہ کونسا عربی عالم یا حاکم ہے جس نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" نہ پڑھی ہو اور اس ہندوستانی عربی داں کو داد نہ دی ہو۔

دنیا میں ادب برائے ادب کا رواج ہے، ادب برائے زندگی کو بھی لوگ پسند کرتے ہیں، مگر ادب برائے اسلام مولانا کا موضوع تھا اور اس موضوع پر انھوں نے بڑا کام کیا ہے، اسلامی تاریخ بھی لکھی ہے تو قوموں کا ماتم نہیں کیا ہے، انھیں پیغام دیا ہے، ان کے اندر مستقبل کی فکر پیدا کی ہے، اسلام کا شعور جگایا ہے۔

آجکل علم دین اور سیاست کا جوڑ نہیں لگتا، مگر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ علامہ عبیداللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ

جیسے علمائے نے اس خار زار کو روند کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا تشخص قائم رکھنے کیلئے ہمالیہ کی یہ چوٹی سر کی جاسکتی ہے، چنانچہ مولاناؒ نے اس میدان میں پہلے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلم مجلسِ مشاورت قائم کی اور ندوہ ہی میں اس کا پہلا اجلاس کیا تھا، پھر ملک بھر کا دورہ فرمایا اور مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے اہم ترین ادارے کی صدارت فرما کر دکھا کہ امانت و دیانت کے ساتھ بھی سیاست کی جاسکتی ہے اور اونچی کرسیوں، شاندار عمارتوں، خوش آمدانہ ناز و انداز کے بغیر بھی درویشانہ شوکت کے ساتھ اس وادی میں اس طرح بسر کیا جاسکتا ہے کہ اہل سیاست آجائیں تو ان کا ضمیر زندہ ہو جائے اور رائے بریلی کے جھونپڑے یا ندوہ کے مہمان خانے کے فرش پر ہندوستان کے وزیر اعظم کو اجازت دیجائے کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے ملک کا وقار بڑھائیں، گویا ہندوستان کے اندر ایک عالم صرف اپنی خودداری، علمیت، بے نیازی اور درویشانہ انداز سے بھی اپنا لوہا منوا سکتا ہے۔

مولاناؒ کی وسعت علمی، بے لاگ رائے اور بیباک نگاہ کا اثر تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر، مظاہر علوم سہارنپور کی مجلسِ سرپرستاں کے رکن، ندوۃ العلماء کے ناظم، رابطۂ عالم اسلامی کے بانی ممبر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سرپرست، مدینہ یونیورسٹی کے ممبر اور معلوم نہیں کتنے اداروں اور مجلسوں نیز تعلیم گاہوں کے رکن تھے۔

مولانا کی عظمت کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ انھیں مختلف ممالک سے ایوارڈ ملے اور انھوں نے کروڑوں روپئے بہ یک جنبش قلم دنیا کے مختلف اداروں پر نچھاور کر دیئے اور انھیں ابوذر غفاریؓ کی طرح یاد ہی نہیں رہا کہ رائے بریلی کے بوسیدہ مکان کی مرمت بھی کرا لیتے، آخر جب اسی آبائی مکان میں ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندوں نے آکر دیکھا کہ ایک درویش، کس بے نیازی سے گزر گیا اور عظمت اس کے قدم چومتی رہ گئی۔ اللہ اکبر!

قرآن پاک مولانا ندوی کی زندگی کا سب سے بڑا موضوع تھا، ان کا مطالعہ بہت وسیع، انکی نگاہ جدید و قدیم دونوں پر حاوی اور تاریخِ عالم پر بڑا عبور تھا، میں ایک مرتبہ ندوہ کے مہمان خانے

میں بیٹھا تھا، مجلس میں ٹیلی ویژن وغیرہ کا ذکر آگیا تو مولانا نے قرآنی موضوعات کی وسعت کیلئے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسی تمام تفریحی چیزوں کیلئے "لَهْوَ الْحَدِيْثِ" کی اصطلاح وضع کرکے اپنی منشا واضح کردی ہے" مولانا کے فرمانے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس لفظ سے ہم بار بار گزرتے ہیں اور توجہ نہیں کرتے، اور حضرت مولانا نے اس میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو جیسی تمام تفریحی خرافات کی جھلک دیکھ لی ہے، یہ ان کی ذہانت، توجہ، حاضر دماغی اور جدت طرازی کا نمونہ تھا، چنانچہ ایک کانفرنس میں تلاوت اور تفسیر کا مرحلہ درپیش تھا تو مولانا نے مشورہ دیا کہ: سورۂ یونس پڑھی جائے کیونکہ اس میں مختلف قوموں کا تذکرہ بھی ہے، تبصرہ بھی" اس سے اندازہ ہوا کہ مولانا کو قرآنی مضامین اور اس کی قدیم وجدید اصطلاح پر عبور ہے، چنانچہ جب وہ اپنی برجستہ تقریروں میں قرآنی آیات سے استدلال کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ مولانا نے عصر حاضر کو بھی سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ کی منشاء سمجھنے کی بھی پوری کوشش فرمائی ہے، اسی لئے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب الہ آبادیؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کے ذریعہ تقریر کیا کرو، اس میں ہر موضوع کیلئے مضامین میسر ہوجائیں گے۔

تقریر وتحریر خدا کے عطیات ہیں جس کو جتنا انعام دیدیں اس کے فضل وکرم کی نشانی ہے حضرت مولانا کی تقریر مسلسل برجستہ اور پرمغز ہوتی تھی، مترادفات خوب بولتے تھے ضروری مضامین کی تکرار بھی ہوتی تھی، مگر جو کچھ تھا آمد ہی آمد تھی، پرسنل لاء بورڈ کی آل انڈیا میٹنگ ہو یا رابطۂ عالم اسلامی کا اجلاس، بڑے بڑے علماء، دانشور اور فلسفی انتظار کرتے تھے کہ مولانا کیا فرماتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ میں تقریباً بیس لاکھ انسان امڈ آئے تھے، اس میں دنیائے اسلام کے نمائندے اور علماء بھی تھے، اس میں آخری تقریر حضرت مولانا کی ہوئی تو مجمع دیکھکر فرمانے لگے کہ یہ عرفات کا میدان معلوم ہوتا ہے، پھر انھوں نے علمائے اسلام، علمائے ہند اور علمائے دیوبند کو مخاطب کرکے فرمایا اور خوب فرمایا کہ یہ ملک "اکمال الامم" رہا ہے جیسا کہ حالی نے لکھا ہے، اس لئے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہاں اسلام کا تعارف کرائیں اور اپنے کردار سے

اسلامی تشخص کو قائم رکھیں اور اسے عام کریں۔

حضرت مولانا کا عظیم ترین کارنامہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نشأۃ ثانیہ ہے، پہلے وہاں کے طلبہ دارالعلوم کو "ندوہ کالج" کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے، لیکن آج کے طلبہ "دارالعلوم ندوۃ" کہتے ہیں، اور یہ تبدیلی مولانا علی میاں کی محنت سے نہیں، انکی شخصیت سے عمل میں آئی اور خوب آئی، کیونکہ جب مولانا عمران خاں صاحبؒ "ندوہ" کے مہتمم تھے تو وہاں مولانا مودودیؒ کا طوطی بول رہا تھا، مولانا علی میاں اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ دونوں حضرات زبان وقلم سے ان کے خیمہ بردار تھے، حتی کہ "الفرقان" مولانا مودودیؒ کیلئے میدان جنگ بنا ہوا تھا اور اسی ماحول میں مولانا مودودیؒ نے ان دونوں حضرات اور مولانا محفوظ الرحمٰن صاحبؒ وغیرہ کے ساتھ پنجاب میں "جماعت اسلامی" کی بنیاد رکھی، اس دور میں ندوہ کی آئیڈیل شخصیت مولانا مودودیؒ تھے۔

میں جب ۱۹۴۱ء میں نورالعلوم بہرائچ میں مدرس تھا تو یہ تینوں علمائے کرام مولانا مودودی کے خیمے میں چندروز ساتھ ساتھ وقت گزار کر آئے تھے اور ان کی ماڈرن خانگی زندگی سے دل برداشتہ تھے اور یہ بددلی اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اٹھائی تھی اور ان کیلئے وہ مثالی شخصیت تھے اور مولانا علی میاںؒ نے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور اس وقت کے دارالعلوم کے مشائخ کی صحبت پائی تھی اور وہ اسلاف کے ان نمونوں سے پوری طرح مطمئن تھے، اس لئے مولانا مودودی کی خانہ خرابی دیکھ کر قدرتاً دل برداشتہ ہوگئے اور پھر ان کی تحریک سے دھیرے دھیرے علیحدہ ہوگئے، مگر اسکی جگہ انھیں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک مل گئی اور ان کی معرفت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی خانقاہ میں رائے پور پہونچ گئے اور یہ صرف خدا کا فضل وکرم تھا کہ ان دونوں حضرات کو رائے پور کی فضا راس آگئی اور یہ اسی طرح ہوا جیسے کہ سید سلیمان ندویؒ عالم اسلام کے مشہور اسکالر، مولانا عبدالباری ندویؒ صدر فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی اور مولانا عبدالماجدؒ فلسفی جیسے قلم کار رجب علم وہنر کے باوجود روحانی تشنگی محسوس کرنے لگے تو شیخ الاسلام

حضرت مدنیؒ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خانقاہوں میں ذکر سے روحانی کیفیت حاصل کر کے ہی تسکین پا سکے، تو ان دونوں حضرات نے بھی حضرت رائے پوری کے سامنے توبہ کی اور سنت کے مطابق بیعت فرمائی اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو کر اپنے دین کی تکمیل کر کے امام غزالیؒ کی طرح مطمئن ہو گئے اور تادم حیات روحانی کیفیات کی لذت اٹھاتے ہوئے اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے برّد اللہ مضاجعہم۔

اس طرح علم تو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند نے مکمل کر دیا تھا اور دین کو مرشدِ کامل نے مکمل کر کے عظیم انسان بنا دیا تھا تو اب وہ لوہا نہیں پارس بن گئے تھے، پھول نہیں چمن بن گئے تھے اور جب حضرت مولانا ندوہ کے ناظم بنا دئے گئے تو اس وقت ان کا دین مکمل ہو چکا تھا اور وہ ندوہ کیلئے اسلام کا بہتر سے بہتر نمونہ تھے، چنانچہ وہ آہستہ آہستہ طلبہ کیلئے آئیڈیل انسان بن گئے اور عمر کے ساتھ ان کی شخصیت میں مقبولیت اور معنویت بڑھتی چلی گئی۔

میں نے اپنی طویل عمر میں جگہ جگہ دیکھا ہے کہ جب کسی ادارے میں کوئی نمونے کا انسان آجاتا ہے تو طلبہ اور مدرسین فطری طور سے اس کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور ایسا کسی دینی شخصیت کا مقناطیسی اثر ہے اور فطری انتظام ہے۔

ندوہ کو موجودہ سعادت مندی تک لانے میں جہاں تک حضرت مولانا کی شخصیت کارفرما تھی وہیں مولانا معین اللہ صاحبؒ کا خلوص، ان کی لگن اور فکر نے بھی بڑا کام کیا، چنانچہ وہ حضرت مولانا کے دست و بازو بن گئے تھے اور ندوہ کو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا کر کہاں سے کہاں پہونچا دیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

کسی ایک آدمی کا سدھار بھی مشکل ہوتا ہے، خاندان کا سدھار تو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ مشکل ہے، لیکن بغیر طاقت و قوت اور قانون و ضابطے کے کسی ادارے کو اتباعِ رسولؐ کے راستے پر لگا دینا اور اس کی روش بدل ڈالنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی کی آئیڈیل زندگی، اس کی مقناطیسی شخصیت اور اس کا بے داغ کردار لوگوں کو مرعوب کر کے اس کا وفادار

نہ بنا دے، اس لئے ہم حضرت مولانا کو اس کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان کے اس محیر العقول کارنامے کو قابلِ تقلید سمجھتے ہیں، کیونکہ تقریر و تحریر کی واہ واہ لمحاتی ہے اور کردار کی مقناطیسیت پر کوئی ادارہ کروٹ لیتا ہے تو وہ کئی صدیوں تک باقی رہے گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سے صدیقین جیسا معاملہ فرمائے اور ہم پس ماندگان کو انکے نقش قدم پر چلنا آسان کر دے۔

(آمین)

●●●

(بشکریہ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم نئی دہلی)

مدرسہ کی ذمہ داری و گراں باری

مدرسے بڑھکر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے۔ زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟

دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے۔ اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے، اس کو تو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے بہکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے۔ ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

داعی الی اللہ کی وفات

مولانا ضیاء الدین اصلاحی
مدیر ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو پچھلے برس ہی سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ یعنی اس دور کے بہت مقبول و مقدس بزرگ، دنیائے اسلام کے محبوب و محترم عالم، عرب و عجم کی سرمایۂ افتخار و نازش ذات، شرق و غرب کی مؤقر و مکرم ہستی، ہر فرقہ و مذہب کے معزز و معتمد شخص، انسانیت کے پیام رساں اور علمبردار، مسلمانوں کے راہبر و رہنما، دین و مذہب کے عاشق و شیدائی، اسلام کے داعی و نقیب، ایمان و یقین کے حامل و مبلغ، عزیمت و جہاد کے پیکر، خانۂ کعبہ کے کلید بردار، ہندوستان میں سرمائی ملت کے نگہبان، ندوۃ العلماء کے ناظم دارالمصنفین کے روح رواں، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر، رابطہ عالم اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے تاسیسی رکن، رابطۂ ادب اسلامی کے بانی و صدر، اسلامی سینٹر اکسفورڈ یونیورسٹی کے چیرمین اور ہندو بیرون ہند کے مختلف اداروں اور انجمنوں کے سربراہ اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۰/ ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس سرائے فانی کو الوداع کہا انا للہ و انا الیہ راجعون اور اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، قدردانوں، رفیقوں اور عزیزوں کو غم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر زبان حال سے یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اضاعونی و ای فتی اضاعوا　　لیوم کریھۃ و سداد ثغر

بیسویں صدی کے اختتام سے ایک برس پہلے جب شمسی سال کے ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا تو یہ الم ناک اور دل دوز خبر بجلی بن کر گری:

نعی الرکب او فی حین آبت رکابھم　　لعمری لقد جاؤ ا بشر فاوجعوا
نعوا باسق الافعال لا یخلفونہ　　تکادالجبال الصم منہ تصدع

عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالم تاب غروب ہو گیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی، اس وجود مقدس کا خاتمہ ہو گیا جس کے ذکر جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور سیاست و حکومت کے ایوان پُر شور رہتے تھے، وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہو گئی جس کے ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے میں سندان عشق تھا، وہ میر کارواں رخصت ہوا جس کا شغل ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح و مناجات کی طرح وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح تخیر زمانہ تھا اور نہ پیران کہن سال کی طرح بیگانۂ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی، اس کے فیض سے ایمان کی باد بہار چل رہی تھی، معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی، دریائے علم رواں اور دوائے دل ارزاں تھی، اس کی ذات لکھنؤ اور رائے بریلی میں فضل و کمال، محبت و معرفت، یقین و نگاہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں تھی، اس کی ہستی سیرت و خلق محمدی، شاہ علم اللہ کے زہد و ریاضت، سید احمد شہید کے جہد و جہاد اور مولانا عبدالحیٔ کے علم و دانش کا مجموعہ تھی اور اس کی ذات میں اسلاف اور اپنے بزرگ اجداد کی بہت سی روایات و خصوصیات اکٹھا ہو گئی تھیں، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت درس و تدریس، تلاش و مطالعہ تحریر و تصنیف اور دین و ملت کی راہ میں جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص۔

و لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد.

کئی روز تک گم صم رہا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، قلم اٹھانے کا یارا نہ تھا، حیص بیص میں دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، جنوری کے آخری عشرے میں مولانا مستقیم احسن نے بمبئی سے فون کیا "ابھی تک معارف نہیں پہنچا، مولانا پر مضمون کا شدید انتظار ہے" حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی اور دوسرے قدردانانِ معارف کی طرف سے بھی ماتمی تحریر کے لئے بے قراری ظاہر کی گئی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس پیہم تقاضے اور شدید اصرار نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مگر اسی اثنا میں اعظم گڈھ میں فساد کی

آگ بھڑک اٹھی جس کی زد سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ظلمات بعضها فوق بعض کا منظر تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات نہ تنہا ان کے عزیزوں اور نیاز مندوں کا حادثہ ہے اور نہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی دنیا ویران ہوئی ہے، بیشمار ادارے تنظیمیں اور انجمنیں بے رونق ہو گئی ہیں، امت مرحومہ کا سرمایۂ اعتماد جاتا رہا، عالم اسلام کا سہارا ختم ہو گیا، تباہ وخستہ حال ہندوستان کا غم خوار چلا گیا، آہ وہ پُر درد آواز خاموش ہو گئی جو نصف صدی تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، واحسرتاوہ بے قرار دل ساکت ہو گیا جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا تھا، وااسفاوہ اشک آلود آنکھیں بند ہو گئیں جو دین وملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں، ہائے اس پُر جوش سینہ کا تلاطم ختم ہو گیا جو آلام ومصائب کے پہاڑوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتا تھا، ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لئے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک قوم، ایک شخص نہیں ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعۂ صفات وکمالات تھا۔

وما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

برصغیر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، عربی کے سب سے ممتاز انشاء پرداز اور مصنف تھے۔ اس کی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا خلیل عرب کے گھر پر ہوا اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی یہیں ہوئی، طلبہ کے لئے عربی بولنا لازمی تھا، اردو بولنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں عربی اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ لگا جو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی کے یہاں آتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے مطالعہ کا مزید موقع ملا، مولانا مسعود عالم ندویؒ مرحوم کی دوستی اور رفاقت سے اس ذوق میں جلا پیدا ہوئی، مولانا کے مضامین مصر کے رسالوں میں چھپنے لگے، ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ میں ادب عربی کے اعلیٰ استاد ہو کر آئے تو یہاں عربی ادب کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان سے مولانا علی میاںؒ نے بھی فائدہ اٹھایا، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ہلالی صاحب کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ کی ادارت میں مئی ۳۲ء میں الضیاء کا اجرا ہوا، جس کے مولانا مستقل مضمون نگار تھے، یہ رسالہ تین سال بعد بند ہو گیا، اس کے ختم

سے البعث الاسلامی اور الرائد نکلے جن کے مولانا سرپرست اور نگراں تھے، عربی تحریر و تقریر سے ان کا شغف مدۃ العمر قائم رہا، ۱۹۵۶ء میں وہ دمشق یونیورسٹی کے وزیٹر پروفیسر ہوئے۔ یہاں کی المجمع العلمی کے رکن بھی تھے۔ عربی میں ان کے مضامین و کتب اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عرب ملکوں کے ہر پروگرام میں مدعو ہوتے تھے اور وہاں کے اکثر اداروں اور انجمنوں کے ممبر بھی تھے، ان سے زیادہ کسی ہندوستانی نے عرب ملکوں کا سفر نہیں کیا، ان کی اردو کتابوں کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے وہ عرب ملکوں کے موجودہ فضلاء اور اہل قلم سے کسی اعتبار سے کم پایہ نہ تھے، اپنی اسی شہرت و مقبولیت اور دینی عظمت و وجاہت کی بنا پر کلید کعبہ ان کے حوالے کی گئی تھی وکفی بہ فخرا۔

مولانا علی میاںؒ نے بیس سال کی عمر حصول تعلیم میں گزاری، ۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب کے استاد مقرر ہوئے درس تیاری، محنت اور مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اس ضمن میں ندوہ کی سفارت اس کے تعارف اور اس کے مقاصد کی اشاعت کے لئے سفر بھی کیا، ۴۰ء مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگرانی اور ان کی اور مولانا عبد السلام قدوئی ندویؒ کی ادارت میں "الندوہ" پھر جاری ہوا اور فروری ۴۲ء میں بند ہو گیا، دعوتی ذوق کی بنا پر بعد میں بھی صحافت سے دلچسپی رہی، ۴۸ء میں مولانا عبد السلام قدوائیؒ کے اشتراک سے پندرہ روزہ اخبار تعمیر نکالا اور اس کے لئے متعدد فکر انگیز مضامین لکھے، ہفتہ وار ندائے ملت کے اجراء میں بھی ان کی مساعی شامل تھی ان کی سرپرستی میں پندرہ روزہ تعمیر حیات شائع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ ان کو اپنے تدریسی دور میں عربی زبان و ادب کے نصاب کی اصلاح کا خیال ہوا، اس کے لئے مختارات، القراۃ الراشدہ اور قصص النبیین وغیرہ خود لکھیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے متعدد ریڈریں لکھوائیں، ان کو کورس کی کتابوں کی ترتیب کا خاص سلیقہ تھا ۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لئے بی۔ اے کلاس کی ایک کتاب تیار کی جس کا معاوضہ ۵۰۰/روپے ملا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے مبارک باد بھی دی انھوں نے دار لعلوم کے طلباء میں دینی روح پھونکی اور ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کی، دوسرے دینی مدارس سے اس کا ربط

بڑھایا، تبلیغ و دعوت دین کے کام سے مولانا کو زیادہ مناسبت تھی اس میں انہماک بڑھا تو تدریس سے ضابطہ کا تعلق ختم کر لیا، لیکن ندوۃ العلماء سے ان کا خاندانی و موروثی تعلق تھا، اس کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی آئندہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا تھا۔ ۴۸ء کے وسط میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۴۹ء میں انہیں معتمد بنایا گیا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد ۵۴ء میں معتمد ہوئے، ۶۱ء میں اپنے بھائی و مربی کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء بنائے گئے۔ ان کے زمانے میں اس کو عالمگیر شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی، عمارتوں میں بکثرت اضافے اور توسیع ہوئی، گوناگوں شعبے اور دفاتر قائم ہوئے، مالی حیثیت سے مستحکم ہوا، مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، پچاسی سالہ جشن منایا گیا، بین الاقوامی سمینار ہوئے، جلسے، اجتماعات اور تقریبات آئے دن کا معمول ہو گئے ہیں، غرض انھوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

لعمرك ماواری التراب فعاله ولكنما واری ثیابا واعظما

ہندوستان اور عالم اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو باعث فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور، مولانا مسعود علی ندویؒ سے عقید تمندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی و کامیابی سے خوش ہوتے وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے انتقال کے بعد ان کو مجلس عاملہ کا صدر بنایا گیا، ان کے ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے انتقال کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام و مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار کو کامیاب بنانے میں انھوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے والد بزرگوار کی کتاب "گل رعنا" اور "الثقافة الاسلامية فی الهند" کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ خود ان کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے شرع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا۔ معارف پابندی

سے پڑھتے کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت ہوتی، ابھی جلد ہی ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کون ہے تو جواب دیا معارف۔ دارالمصنفین کو مالی فائدہ بھی پہونچاتے۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ مسٹر بہوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپے دئے تو اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرادیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی "سیرت النبی" حصہ ہفتم کا مقدمہ انھوں نے لکھا تھا۔ یہ کتاب جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بہت پسند آئی، اور انھوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپے نذر کرنا چاہا تو فرمایا میں اس کا مستحق نہیں، دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں۔ چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظبی اور برونائی کی حکومتوں سے ان کو خطیر رقم ملی، اسے انھوں نے مدارس میں تقسیم کردیا، اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا۔ ان کی سفارش سے اسے رابطۂ عالم اسلامی سے ایک اچھی رقم سالانہ ملتی تھی، مگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔ تقریر و تحریر کا ملکہ خداداد تھا، اردو اور عربی دونوں کے ممتاز خطیب اور نامور مصنف تھے ان کے معاصرین میں ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے تقریریں کی ہوں اور تحریری ذخیرہ چھوڑا ہو، ان کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے اس جوہر کا صحیح استعمال کیا، ان کی ہر تقریر و تحریر کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی ہوتا، ان کی طبیعت کا سوز اور دل کی دردمندی تقریروں اور تحریروں کو اس قدر مؤثر بنادیتی تھی کہ ان کو سننے اور پڑھنے والے پر رقت طاری ہوجاتی تھی، تقریر و بیان پر معجزانہ قدرت کی وجہ سے ۴۳ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام ان پر قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس کی ذمہ داری ڈالی تو اس میں لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقۂ اعلیٰ عہدیداروں اور دین دار مسلمانوں کا بڑا مجمع ہونے لگا، اس خصوصیت کی بنا پر نوعمری ہی میں وہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کے لئے بلائے جاتے اور ندوہ کے نمائندے ہوکر اہم علمی اجتماعات میں مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کئے جاتے، ۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں شرکت کی اور ۳۸ء میں اس کے پٹنہ کے اجلاس میں شریک ہوئے ۴۲ء میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کی دعوت پر "مذہب و تمدن" کے عنوان سے مقالہ پڑھا جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا، ادب و انشاء سے فطری دلچسپی تھی، اس بانکپن ان کی ہر تقریر و تحریر

میں نظر آتا، کبر سنی کے باوجود ان کے زور واثر اور حسن بیان میں کوئی فرق نہیں آیا، سیرت سید احمد شہید، مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا، ارکان اربعہ، نبی رحمت، المرتضیٰ اور تاریخ دعوت وعزیمت وغیرہ سے اگر ان کی تلاش وتحقیق، کدوکاوش، محنت ودیدار یزی دقت آفرینی نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری تصانیف سے فکر وخیال کی بلندی، رعنائی بیان، زور قلم۔ تازگی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی تمام تصنیفات کو حسن قبول حاصل ہوا اور جو اردو میں لکھی گئیں ان کے عربی اور عربی کے اردو ترجمے ہوئے، اکثر کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ ان کی عظیم الشان دینی ودعوتی خدمات اور گوناگوں تصنیفات کی وجہ سے ۸۰ء کا فیصل ایوارڈ ملا، یہ اور اس کے بعد کے ایوارڈ سے ملنے والی ساری رقم اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کردی اور اپنے لئے ایک حبہ بھی نہ رکھا۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولاناؒ شروع سے محب وطن اور تحریک آزادی کے حامی، انگریزوں سے نفرت کے جراثیم موروثی تھے، ۸ر برس کی عمر میں وہ تحریکِ خلافت کا جوش خروش اور پھر ۳۰ر مارچ ۲۴ء کا وہ منحوس دن دیکھ چکے تھے جب انگریزوں کی سازش سے کمال اتاترک نے بیک جنبش لب اس کا خاتمہ کردیا تھا، دیوبند کے قیام اور حضرت مدنیؒ کی صحبت نے اس رنگ کو اور چوکھا کردیا تھا، اپنے تجربہ ومطالعہ سے ایک انگریز ہی کیا سارے یورپ کے الحادی ومادی نظریات کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود ان کا اور ان کے گھرانے کا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا، ۴۲ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کی تجویز منظور کی تو ان علماء کے طرز عمل کو پسند کیا جو جنگ آزادی اور استخلاص وطن کی تحریک میں شریک تھے، مگر آزادی کے بعد جب حکومت کے کارپردازوں رنگ بدلا اور مسلمان احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہونے لگے تو وہ جارحیت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، ۴۸ء میں ان کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں ایک ملی اجتماع ہوا

جس میں نشان راہ اور لائحۂ عمل تجویز ہوا، یورپ کی سیاسی و تہذیبی تاخت، عقائدی ارتداد اور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام قائم کیا، مشرکانہ عقائد اور دیومالائی تصورات کے انسداد کے لئے دینی تعلیمی کونسل کی رہنمائی کی، مسلمانوں میں نئی دینی، فکری اور جرأت مندانہ قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لئے ندائے ملت جاری کیا، ۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور رانچی کے ہولناک فسادات کی سنگینی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ تمام تعلیمی و تعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے اور اس کو مؤثر بنانے کے لئے اکثریت فرقہ کے جاں باز اور سرفروش قائدین کو بھی اس میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، اسی غرض سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی معیت میں ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن سے ملے، ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس میں سرگرم حصہ لیا، ملک کو زوال اور اخلاقی بحران سے نکالنے اور ہندو مسلم خلیج پاٹنے کے لئے "پیام انسانیت" کی تحریک چلائی، عائلی قوانین کے تحفظ کے لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی سربراہی کی۔ بابری مسجد کے انہدام پر خون کے آنسو بہائے۔ غرض ان کا بے قرار اور دردمند دل ہر نازک موڑ پر برادرانِ وطن کو درس حقیقت اور مسلمانوں کو شجاعت و عدالت کا سبق پڑھا کر اس کی تلقین کر رہا ہے کہ ؎

ع: معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

مولاناؒ ایک داعی و مصلح تھے، دعوت و عزیمت اور دینی غیرت و حمیت ان کی امتیازی شان تھی، ان کا گھرانا عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو اور ولی اللہی فکر کا حامل تھا، ان کا محلہ بازار جھاؤلال بھی صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، وہ شعائر اللہ کی توہین، دین و اخلاق اور انسانیت کی پامالی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسلام کی سربلندی، اصلاح و دعوت اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہے، ۳۵ء میں ۲۱ برس کی عمر ہی میں ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بمبئی کا سفر کیا، وہ عمر بھر مسلمانوں کو مادی تمدن کے دریا کے خلاف تیرنے اور اس کا دھارا موڑنے اور اپنے باطل افکار و خیالات اور غلط رسوم و عادات کی قربانی دینے کے لئے آمادہ کرتے رہے، ندوۃ العلماء میں معلمی کے زمانے میں ان کے ذوق و رجحان میں تبدیلی آئی، اب ان کی پرواز

مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ کسی صالح تحریک و دعوت سے وابستہ ہونے کے لئے فکر مند رہتے، اس زمانے میں وہ مولانا مودودیؒ کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور چند برس تک حلقہ لکھنؤ کی جماعت اسلامی کے ذمہ دار بھی رہے۔ پھر مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے ان کا ربط و تعلق بڑھا اور عرصہ تک اس میں مشغولیت اور سرگرمی رہی، وہ اپنی اصلاح، تربیت اور تزکیہ نفس سے بھی غافل نہ تھے، اس کے لئے مشائخ و اولیاء کی خدمت میں برابر حاضری دیتے، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے ان کے سوانح اور مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ کا تذکرہ لکھا، چند بار مولانا تھانویؒ سے بھی ملے، مولانا مدنیؒ سے برابر تعلق رکھتے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے اکثر ملتے مولانا شاہ وصی اللہؒ، مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھیؒ اور حضرت شاہ یعقوب مجددؒ کی خدمت میں بھی باریاب ہوتے، مؤخر الذکر کے ملفوظات مرتب کر کے شائع کیا، سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور اوصاف محامد میں اسلاف اور اپنے اجداد کا نمونہ اور اقبال کے مردِ مومن کا آئینہ تھے، ان کی کوئی جسمانی یادگار نہ تھی، شادی ۱۹۳۴ء میں ہوگئی تھی، اپنے برادر و خواہر زادگان کو اپنی اولاد سے زیادہ مانتے تھے، معنوی اولاد اور نیاز مندوں کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے جن کے غم و اندوہ کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا مایرضی ربنا و انا بفراقك لمحزونون۔ اللهم صبب علیه شأبیب رحمتك واغفر له برحمتك یا ارحم الراحمین۔

(بشکریہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ)

☆☆☆

آہ مینارۂ علم و تقویٰ

مولانا مجیب اللہ ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے !

انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

کسی عربی شاعر نے اپنے سربراہِ قبیلہ کے بارے میں یہ شعر کہا تھا ؎

وما کان قیس ھلکہٗ ھلک واحد

ولکنہٗ بنیان قوم قد تھدّما

اس شعر کا مصداق اس کا ممدوح رہا ہو یا نہ رہا ہو، واقعی اس شعر کی مصداق حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی ضرور تھی، یہ حادثہ کسی ایک گھر، ایک بستی، ایک شہر اور کسی ایک ملک کا نہیں، بلکہ بین الاقوامی حادثہ تھا، جس میں ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تعزیت کرنی چاہئے اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھنا چاہئے ۔

؎ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکارے میں چلاؤں ہائے دل

مولانا ادھر تیس چالیس برس سے نہ صرف اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے مینارۂ نور بنے

ہوئے تھے، بلکہ ہندوستان کی مظلوم ملت اسلامیہ کی عزت و وقار کا نشان ان کی ذات سے قائم تھا، آج وہ گہن آلود محسوس ہوتا ہے، انکی شہرت و عظمت کا آفتاب عرب و عجم کا سرحدیں پار کر چکا تھا، ان کے سامنے بڑے بڑے عہدے اور اعزازات پیش کئے گئے، مگر انہوں نے ہندوستان کی بوریہ نشینی سے جدا ہونا منظور نہیں کیا، ہندوستان کی ملت اسلامیہ اور اسکے اداروں نے بھی انکو ہر اعزاز سے نوازا، مگر انہوں نے نہ کبھی اس کی خواہش کی اور نہ اسکی طلب کے لئے کسی کے مدِ مقابل بننے کی کوشش کی، لیکن جب کبھی دین و ملت کا مسئلہ سامنے آیا تو اس کی پرواہ کئے بغیر کہ حکومت وقت کی پیشانی پر کتنے بل آئیں گے، اپنی ساری توانائی اس میں جھونک دی۔

۱۹۵۹ء میں کوٹھاری کمیشن کی رپوٹ کے بعد یوپی گورنمنٹ نے جبری تعلیم کا نفاذ کیا، جبری تعلیم کا مطلب یہ تھا کہ ۶ برس سے گیارہ برس کے ہر بچہ اور بچی کو سرکاری اسکولوں میں پڑھنا ضروری تھا، جس کی وجہ سے ہمارے بچے اور بچیاں ابتدائی دینی تعلیم سے محروم ہو رہے تھے، عدیل عباسی ایڈوکیٹ مرحوم نے مولانا سے مشورہ کیا، پھر ان کے مشورہ سے بستی میں ایک زبردست دینی تعلیمی کانفرنس ہوئی اور دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا، مولانا صدر اور عدیل عباسی صاحب جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور پورے صوبہ میں اس کے خلاف تحریک چلائی گئی اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ دین کے تحفظ کیلئے اپنے خرچ سے آزاد مکاتب قائم کریں اور چٹکی چندے سے چلائیں آج صوبہ کے ہر گاؤں میں جو مکتب نظر آرہے ہیں وہ اسی تحریک کا نتیجہ ہیں۔

اسی طرح پارلیمنٹ میں متبنّیٰ بل لایا گیا، یعنی اگر کوئی لاولد شخص کسی بچہ کو پال کر اپنا لڑکا بنالے تو وہ اس کا وارث سمجھا جائے گا، اس کے خلاف تحریک چلائی گئی، اس لئے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف تھا، اور وہ بل پاس نہ ہو سکا، اسی طرح شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ نے جو غیر شرعی فیصلہ کیا اس کے خلاف پورے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے ایک پرشور تحریک چلائی گئی اور دفعہ ایک سو پچیس ۱۲۵ میں ترمیم ہوئی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے مولانا نے پورے زمانۂ تحریک میں اس کی راہنمائی کی، اسی طرح نصاب تعلیم میں ہندو میتھالوجی کے

داخل کرنے کے خلاف مولانا نے بار بار بیانات دئے، اسی طرح ایمرجنسی کے دور میں مولانا نے جبری نسبندی کے خلاف واضح بیان دیا، جبکہ بہت سے لوگوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگی تھیں، ۱۹۶۴ء میں جبل پور کا بھیانک فساد ہوا تو مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، اس میں بھی مولانا نے نمایاں حصہ لیا، ابھی حال میں بندے ماترم کے لازمی طور پر پڑھنے کے سلسلے میں مولانا نے جو جرأت مندانہ بیان دیا اس سے حکومت کے راہنماؤں کا لہجہ و طرزِ عمل بدل گیا، غرض کہ اس طرح کے جتنے چھوٹے بڑے مسئلے پیدا ہوئے، ان سب میں مولانا کی راہنمائی برابر قائم رہی۔

علم دین کا جہاں تک تعلق ہے مولانا اس سے پورے طور پر بہرہ ور تھے، مگر انہوں نے قدیم روایت کے مطابق کسی ایک درسگاہ کی سند لینا کافی نہیں سمجھا، بلکہ قدیم علماء کی طرح ہر فن کے ماہرین کی خدمت میں رہ کر یا ان تک پہونچ کر اس کی مہارت حاصل کی، لاہور میں آزادی سے پہلے مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ فارغ طلبہ کو قرآن کا درس دیا کرتے تھے، وہاں جاکر ان سے خصوصی استفادہ کیا اس پر ان کی کتاب "قرآنی افادات" شاہدِ عدل ہے۔

اسی طرح حدیث میں درسگاہ کے علاوہ بھی اس فن کے ممتاز اساتذہ کی خدمت میں رہ کر یا جاکر فائدہ اٹھایا اس وقت ندوہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث تھے جن کو خانوادۂ ولی اللّٰہی کے سلسلے کے کئی اساتذہ سے سند حدیث حاصل تھی، اس کے علاوہ ان سے خصوصی طور پر فنی مہارت حاصل کی اور کچھ دن حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بھی شریک ہوئے، عربی ادب میں ان کو شیخ خلیل عرب اور شیخ تقی الدین ہلالی جیسے بین الاقوامی شہرت کے اساتذہ ملے، وہ خود فرماتے تھے: شیخ تقی الدین ہلالی کی خدمت میں اس طرح رہا کہ ایک ایک ہفتہ گھر (امین آباد) نہیں جاتا تھا، عربی زبان و ادب میں ندوہ کے فضلاء میں جن لوگوں نے عربوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا ان میں تین چار آدمی ممتاز تھے، ان میں مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا کا نام سرفہرست تھا، دوسرے حضرات نے بھی عربی نثر و نظم میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں، مگر مولانا نے عربی زبان میں جو وسیع یادگاریں چھوڑی ہیں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے،

انکی غالباً سب سے پہلی فکر انگیز کتاب عربی میں "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" بازار میں آئی، اس کے ذریعہ انہوں نے مغربی دنیا کو یہ بتایا کہ مسلمانوں نے دنیا کو کیا اخلاقی قدریں دیں اور ان کے زوال سے دنیا کو کیا اخلاقی نقصان ہو رہا ہے، خود مسلمانوں کو اپنے روشن ماضی کی طرف دعوت دی، اور اسی طرح اردو میں انکی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" چھپ کر آئی تو اس وقت کے سارے علماء نے تحسین فرمائی، خاص طور پر وہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لے گئے تو انہوں نے اپنے بغل میں مسند پر بٹھایا اور عزت افزائی کی، ان کی تصانیف پر لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے، مولانا اپنے علم و فضل کے ساتھ زہد و اتقا کے اس بلند مقام پر تھے کہ سعدی کی زبان میں۔

سعدیا گنگرۂ عشق بلند است و بلند
دست ہر بوالہوس آنجا بفضولے نہ رسد

مگر کنگرۂ عشق کی بلندی کے ساتھ اس کے اظہار کیلئے ان کے یہاں کوئی روایتی رکھ رکھاؤ نہیں تھا اور نہ وہ ملت کے مسائل کے سلسلے میں کسی سہل انگاری کے قائل تھے، بلکہ ملت کے مسائل کے خرخشوں میں پڑنے کو وہ عبادت اور زہد و تقویٰ کا جز سمجھتے تھے، جیسا کہ اسوۂ نبویؐ اور اسوۂ صحابہؓ سے ظاہر ہے۔

راقم الحروف کو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں یعنی نومبر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک بارہا سفر و حضر میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، پھر بھی ہم ان کے باطنی مقام کا پورا اندازہ نہیں کر پائے، بیشمار واقعات ہیں جو ان کی روحانی اور اخلاقی بلندی اور حقیقی زہد و اتقاء پر شاہد ہیں، یہاں دو چار واقعات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ۱۹۴۰ء میں مولانا نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے تبلیغی کام کا ذکر سنا تو اس کیلئے دلی کا سفر کیا اور وہاں سے واپس آکر ندوہ کے "جمالیہ ہال" میں اس کام کی اہمیت پر ایک تقریر کی اور اس پر طلبہ کو ابھارا، ان کی تقریر کے بعد پانچ یا چھ طالب علم اس کام کیلئے تیار ہوئے، چنانچہ لکھنؤ کے آس پاس کے بستیوں میں طلبہ کا ایک قافلہ جمعرات کو ملہور، جگلور

اور علی گنج وغیرہ بستیوں میں پیدل جاتا اور جمعہ کے بعد وہاں سے واپس آتا ایک دو سفر کے بعد راقم الحروف بھی اس میں شریک ہونے لگا، پہلے ہی سفر میں ظہور جانے کا اتفاق ہوا، گرمیوں کے زمانہ میں عشاء بعد ہم لوگ مسجد کے صحن میں سوئے ہوئے تھے، میری بغل میں مولانا آرام فرما رہے تھے، تین بجے رات میں استنجاء کیلئے نیند کھلی تو دیکھا مولانا اپنی جگہ پر نہیں ہیں، لوٹا لیکر کھیت کی طرف استنجاء کیلئے گیا تو دور سے کچھ رقت آمیز آواز آرہی تھی قریب گیا تو دیکھا کہ مولانا مصلی بچھا کر تہجد کی نماز ادا کر رہے ہیں اور آواز میں ایک رقت ہے، مولانا مسجد کے صحن میں بھی ایک طرف یہ نماز ادا کر سکتے تھے، مگر دو وجہ سے انہوں نے ایسا نہیں کیا، ایک یہ کہ لوگوں کی نیند میں خلل نہ پڑے، اور دوسرے یہ کہ نوافل کی روح یعنی اخفاء بھی باقی رہے، یہ بالکل اسوۂ نبوی کی تعمیل تھی، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ تہجد کے وقت جب حضورؐ نماز میں قرآن کی تلاوت فرماتے تو "لہ ازیز کازیز المرجل" یعنی آپ کے سینے سے رقت کی ایسی آواز آتی جیسے ہانڈی کے ابلنے کی آواز ہوتی ہے"۔

۱۹۷۰ء میں ندوہ میں طلبہ نے کچھ لوگوں کی شہ پر اسٹرائک کی، مولانا ناظم تھے، شاید اسی لئے ان کی ذات کو نشانہ بنایا گیا تھا، میں بھی طلبہ کا حامی تھا، چنانچہ ہنگامی طور پر مجلس انتظامیہ کی میٹنگ بلائی گئی، مجھ تک جو اطلاعات پہونچی تھیں، ان کی بنا پر میں طلبہ کا حامی تھا، اس لئے اعظم گڑھ سے ایک سخت تحریر لکھ کر ساتھ لے گیا کہ اسے مجلس انتظامیہ میں پڑھوں گا، مگر جب مجلس انتظامیہ ہوئی اور مولانا نے ایک طویل تحریر پڑھی اور اس کا پورا پس منظر بیان کیا تو مجھے پھر اپنی تحریر پڑھنے کی جرأت نہیں ہوئی، مگر جب مجلس ختم ہوئی تو اس کے بعد مجھ سے تنہائی میں مولانا نے کسی ناگواری کے بغیر فرمایا کہ، سنا ہے کہ آپ کوئی تحریر پڑھنے والے تھے مگر نہیں پڑھی، تو اب مجھے دے دیجئے تاکہ ہم لوگ اپنی خامیوں پر غور کر سکیں، اس جملہ سے خجالت و شرمندگی سے شرابور ہو گیا اور تحریر دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جامعۃ الرشاد کے ایک استاذ مولانا مختار احمد صاحب نے بتایا کہ ایک بار میں مولانا سے

ملاقات کیلئے رائے بریلی گیا، وہاں تین دن رہا جس وقت میں وہاں پہونچا تو مولانا مسجد کے صحن میں ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے ؎

اپنے رزّاق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک ؛ اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت ؛ فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

یہ اشعار مجھے بھی یاد تھے مگر مولانا فقیرانہ انداز سے بیٹھے ہوئے جس عاشقانہ انداز سے پڑھ رہے تھے اس کا قلب پر عجیب وغریب اثر پڑا، بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ ان اشعار کی پوری تصویر سامنے ہے انہوں نے بتایا کہ اس سفر میں میں نے مدینہ یونیورسٹی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے مجھ سے ایک سوال کیا — یہ بتاؤ کہ اگر تم کسی جنگل میں ہو اور تمہارے پاس ایک ہی گولی ہو، تو کیا کروگے ؟ میں نے جواب دیا، نشانہ دیکھ کر استعمال کروں گا، فرمایا کہ: ہم سب کو ایک ہی زندگی ملی ہے اس کو سمجھ بوجھ کر صرف کرنا چاہیئے، ہندوستان میں بہت کام ہے اسی میں اسے لگاؤ، ش، ق، درست کرنے کیلئے مدینہ یونیورسٹی جاکر کیا کروگے ؟

یہ واقعات اس لئے ذکر کئے گئے ہیں کہ ان سے انکی بلندی اور ان کے باطنی اور روحانی مرتبہ کا کچھ اندازہ ہوسکے، انتہائی عظمت ومحبت کے باوجود میں نے انکی بہت سی رایوں سے کئی بار اختلاف کیا ہے، مگر انہوں نے اس کا بُرا نہیں مانا —— یہ کم لوگوں کو علم ہوگا کہ: مولانا نے چالیس برس کی عمر کے بعد پورا قرآن حفظ کیا، ذکر واذکار کیساتھ قرآن پاک کی تلاوت کا زندگی بھر معمول رہا، فالج کے حملہ کے بعد زبان میں قدرے لکنت آگئی، تو دوسرے کسی حافظ سے قرآن پاک پڑھوا کر سننے کا معمول رہا، مولانا کے کاتب مولانا نثار احمد صاحب نے بتایا کہ: پوری بیماری میں نوافل اور ذکر واذکار کی ادائیگی اور تلاوتِ قرآن میں کوئی فرق نہیں آیا، اور کمزوری کی وجہ سے بار بار استنجاء کی حاجت ہوتی، ہر بار لنگی بدل کر استنجا کرتے اور تازہ وضو کرتے، جمعہ کو جس وقت وفات ہوئی اس دن بھی آپ نے اپنے خادم خاص عبدالرزّاق صاحب سے فرمایا کہ مجھے غسل کراؤ، غسل کے بعد کپڑے بدلے عطر لگوایا

عبدالرزاق صاحب سے فرمایا کہ تم بھی نہالو، میں سورۂ کہف پڑھتا ہوں، تم فارغ ہو کر مجھے مسجد میں لے چلو، مگر جب انہوں نے تلاوت شروع کی تو زبان پر سورۂ کہف کے بجائے سورۂ یٰسین آگئی، ابھی چند ہی آیت پڑھی تھی کہ زبان لڑکھڑا گئی اور ایک طرف کو جسم جھکنے لگا، لوگوں نے لٹا دیا اور چند سکنڈ کے اندر زبان بند ہو گئی اور روحِ مبارک قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خوش ہوتے ہیں تو وہ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان کی محبوبیت لوگوں کے دلوں میں ڈال دو، چنانچہ بارگاہِ الٰہی میں جس کو جتنی محبوبیت ہوتی ہے، اسی اعتبار سے بندگانِ خدا کے دلوں میں محبوبیت پیدا ہوجاتی ہے، کسی کی محبوبیت ایک بستی تک ہوتی ہے، کسی کی ایک شہر ایک ضلع تک کسی کی اور زیادہ اور کسی کی محبوبیت کا دائرہ عالمگیر ہوتا ہے، مولانا کو زندگی میں عوام اور خواص میں جو محبوبیت حاصل تھی اور وفات کے بعد جس طرح لاکھوں آدمی پروانہ وار جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے اور اخبارات میں جس عظیم پیمانہ پر تعزیت کا سلسلہ جاری رہا اور ہے وہ ان کی عالمگیر محبوبیت کا زندہ ثبوت ہے۔

اوپر مجملاً مولانا کے اعزازات کا ذکر ہوا ہے، حضرت مولانا کو اس دنیا میں جو مادی اعزازات ملے اس میں علم و فضل کے علاوہ ان کی باطنی طہارت و پاکیزگی، خاکساری و سادگی، بے نفسی اور استغناء کو بڑا دخل تھا، سب سے پہلے ان کو گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنا ممنون کرم بنانے کے لئے پدم بھوشن یا کوئی اور ایوارڈ دیا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس طرح کا ایوارڈ لینا ہمارے بزرگوں کا طریقہ نہیں رہا ہے، پھر ان کو ان کی دینی اور داعیانہ خدمات پر فیصل ایوارڈ ملا اس کا سارا پیسہ ندوہ کے علاوہ اور دوسرے دینی تعلیمی اداروں پر خرچ کر ڈالا، پھر انکی دینی و علمی عظمت کی بنیاد دبئی اور بورنئی کے ایوارڈ ملے، جس کی پوری رقم بھی انہوں نے ہندوستان کے بیشمار اداروں کو دے ڈالی، شاید ان ایوارڈوں کا ایک پیسہ بھی انہوں نے نہ اپنی ذات پر اور نہ اپنی ذات پر صرف کیا ہو، ان سب مادی اعزازات کے علاوہ آپ کو جو دینی و معنوی اعزاز ملا وہ یہ کہ کعبہ مکرمہ کی اندرونی مرمت اور صفائی کے بعد جب اس کے افتتاح کا موقع آیا، تو

نہ جانے کتنے سربراہانِ مملکت اور علماء خواص کی موجودگی میں کعبہ کے کلید بردار نے کلید کعبہ آپ کے دستِ مبارک میں دی کہ آج کعبہ کا قفل آپ کھولیں اور بارگاہ الٰہی میں موجود لوگوں کو سجدہ ریز ہونے کا موقع عنایت کریں، جس نے فتح مکہ کے موقع پر اسوۂ نبوی کی یاد تازہ کردی۔

ہم معمولی معمولی اعزازات ملنے پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات اس کے حصول کیلئے اپنے ضمیر اور دین و ملت کا سودا کر لیتے ہیں، مگر مولانا کے دل و دماغ پر ان اعزازات کا نہ تو کوئی منفی اثر پڑا اور نہ ان کی فقیرانہ زندگی پر کوئی اثر دکھائی دیا اور نہ اس کے ذریعہ کسی وجاہت حاصل کرنے کا وہم ان کے حاشیۂ خیال میں پیدا ہوا، بلکہ وہ ان اعزازات کے تذکرہ کو بھی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا کی زندگی تقریباً ایک صدی ۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء پر محیط ہے، اتنی طویل زندگی میں بچپن سے بڑھاپے تک نہ جانے کتنے نشیب و فراز آئے ہوں گے اور حسنات کے ساتھ کچھ زلّات بھی سرزد ہوئے ہوں گے، چند صفحات میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، مختصر یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بوریہ نشینی میں مسند نشینی اور فقیری میں شاہی عطا کی تھی۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

مولانا ایک اعلیٰ علمی خانوادے کے فرد تھے، مولانا کے دادا سید فخر الدین صاحبؒ کا شمار علماء میں ہوتا تھا، انہوں نے کچھ علمی یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، وہ شاعر بھی تھے اور خیالی تخلص کرتے تھے، اسی مناسبت سے انہوں نے حالی کی مسدس کے جواب میں مسدس خیالی لکھی تھی، مولانا کے والد مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ کی علمی و دینی حیثیت کا اندازہ ان کی مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے، نزہتہ الخواطر آٹھ جلدوں میں عربی میں سب سے معتبر تذکرۂ علمائے ہند ہے، عربی میں ان کی دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" ہے، ایک حدیث کا مختصر مجموعہ تہذیب الاخلاق اور گل رعنا وغیرہ کافی مشہور و معروف ہیں۔

یہ خانوادہ اس حیثیت سے بھی ممتاز ہے کہ مجموعی حیثیت سے اس خانوادہ کے بیشتر افراد نے

جدید تعلیم کے بجائے دینی علوم کے حصول ہی کو اپنا مطمح نظر بنایا اور دینی ہی کام میں لگے ہوئے ہیں، ان میں بعض ایسی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ہیں کہ وہ ملک سے باہر جاکر بڑی بڑی ملازمتیں حاصل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے بقدر کفاف رزق پر اپنے کو دینی خدمت پر لگا رکھنا پسند کیا، مولانا کے بھانجے محمد واضح رشید ندوی کا دلی ریڈیو اسٹیشن پر عربی پروگرام کے لئے ذمہ دار کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تھا مگر مولانا نے منع کر دیا اور بقدر کفاف معاوضہ پر ان کو ندوہ میں عربی ادب کی خدمت پر آمادہ کیا، اس جوع البقر کے دور میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ کوئی عام فضلاء میں نہ تھے، بلکہ عربی ادب اور اس کے ماخذ پر انکی جتنی گہری نگاہ ہے، اتنی کم لوگوں کی ہو گی، میرے علم میں پورے ہندوستان میں کم ہی خانوادے ایسے ہوں گے جس کے افراد کا رخ مجموعی حیثیت سے دینی تعلیم ہی کی طرف رہا ہو، یہ سب دین ہے مولانا کے زہد و اتقاء بے نفسی و استغناء اور آہ سحر گاہی اور خاندانی روایت کی یہ سب خصوصیات مردوں کے ساتھ خاندان کی عورتوں میں بھی پائی جاتی ہیں، جس کی تفصیل بھی لمبی ہے۔

خواجہ میر درد کی فقیرانہ زندگی پر کسی مغل شاہزادے نے تحقیر آمیز جملے کہہ دئے تھے، اس پر خواجہ صاحب نے یہ شعر کہا تھا۔

ے زنہار ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

میں سمجھتا ہوں اس فقر کی دولت کو نہ صرف مولانا نے اپنا سرمایۂ حیات سمجھا، بلکہ انکا خانوادہ بھی اسی شاہراہ پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس حیثیت کو عزت و وقار کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھے اور کبر و غرور سے محفوظ رکھے۔

ندوہ کو گو ہمیشہ ایک بین الاقوامی شہرت حاصل تھی اور بڑی بڑی شخصیتیں اس سے وابستہ رہیں مگر اس شہرت اور علمی حیثیت کے مطابق اس کا ظاہری اور داخلی ڈھانچہ ایک مدت تک نہیں تھا، مگر مولانا نے اپنے دور نظامت میں اسے داخلی طور پر بھی کافی مستحکم کیا اور ظاہری طور پر اسے

دارالعلوم کی سطح سے اوپر اٹھا کر ایک یونیورسٹی بنا دیا، ہم لوگوں کی طالبعلمی میں اس کے پاس ایک ہاسٹل اور دو چار شعبے تھے اور طلبہ کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہ تھی، مگر اس وقت اسکے پاس ۵ ۶ کئی منزلہ ہاسٹل ہیں اور طلبہ کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے اور دسیوں شعبے ہیں۔

ندوہ کا کتب خانہ ہمیشہ سے اہلِ علم کا مرکز توجہ رہا ہے مگر چند سال پہلے تک اس کی الگ کوئی عمارت نہیں تھی، مولانا نے علامہ شبلی کے نام سے لائبریری کی جو شاندار پانچ منزلہ عمارت بنوائی ہے، ملک کی بڑی لائبریریوں میں اس کا شمار ہونے لگا ہے۔

مولانا نے اپنے پیچھے تعلیمی اور تنظیمی دونوں طرح کے ندویوں کی ایک باصلاحیت ٹیم چھوڑی ہے جو انشاء اللہ ندوہ کے تعلیمی اور تنظیمی وقار کو ہمیشہ باقی رکھے گی۔

ع این سعادت بزور بازو نیست

مولانا کی طبیعت میں حد درجہ نرمی اور مروّت تھی اس سے فائدہ اٹھا کر بعض سیاسی افراد نے اپنے مفاد کے لئے آپ کے دامنِ عظمت وعصمت کو داغدار کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دامن عزت وعصمت کو داغدار ہونے سے بچا لیا اور زلّات کو حسنات سے بدل دیا۔

آخر میں ایک حسرت اور محرومی کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ رمضانِ مبارک سے ایک ہفتہ پہلے مجھ سے محبت رکھنے والے ایک معمولی پڑھے لکھے نوجوان محمد اسمٰعیل میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ میں حضرت کی زیارت کیلئے جانا چاہتا ہوں، آپ حضرت کو ایک تعارفی خط لکھ دیجئے، میں نے ایک خط لکھا جس میں ان کے تعارف کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ میں ہفتوں سے خدمت میں حاضری دینے کا ارادہ کر رہا ہوں، مگر طبیعت خراب چل رہی ہے جونہی کچھ طبیعت بحال ہوگی حاضر ہونے کی کوشش کروں گا، محمد اسمٰعیل کا بیان ہے کہ میں دو دن رہا اس درمیان میں بار بار فرمایا کہ مجیب اللہ سے کہو کہ ان کی طبیعت کچھ بھی سنبھل جائے تو لکھنؤ آکر مجھ سے ملاقات کرلیں ان کے واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد رمضان المبارک کے پہلے عشرہ میں حضرت کا بھیجا ہوا ایک انتر دیشی خط موصول ہوا جس میں ذکر تھا کہ تمہاری طبیعت جب بھی اچھی ہو جائے تو تم لکھنؤ آکر

مجھ سے ملو، میں سفر کو آج کل پر ٹالتا رہا کہ ۲۲ رمضان جمعہ کے بعد لکھنؤ سے حادثۂ وفات کی جانکاہ اطلاع ملی تو سر پیٹ کر رہ گیا، اس محرومی کا غم اور حسرت شاید وفات تک نہ جائے۔

وفات کی خبر سن کر میری کمزوری کے پیش نظر بہت سے احباب سخت سردی کی وجہ سے سفر کرنے سے منع کرتے رہے، مگر طبیعت ایک منٹ رکنے کیلئے آمادہ نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس وقت ایسی توانائی دے دی کہ فوراً رائے بریلی روانہ ہو گیا، مگر یہ بھی محرومی رہی کہ وہاں پہنچ کر اژدہام اور پولیس کی رکاوٹ کی وجہ سے تکیہ تک گاڑی نہیں پہونچ سکی، پیدل تین کلومیٹر جانے کے قابل نہیں تھا جس کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکا، جب مجمع اور گاڑیوں کا ریلا قدرے کم ہوا تو میرے رفقا جو پیدل گئے تھے وہ ۲ بجے رات آکر مجھے لے گئے تو ۲½ بجے رات کو غم و حسرت کے ساتھ مزار مبارک پر بچشم پرنم چند مٹھی مٹی ڈالنے اور فاتحہ پڑھنے کی سعادت ملی اور سویدائے قلب سے یہ دعا نکلی، اے اللہ تیری بارگاہ میں جو محبوبیت حضرت مولانا کو حاصل تھی اس فیضانِ محبوبیت کا کچھ حصہ اپنی شانِ کریمی سے مجھ تہی دست کو بھی عطا کر دے۔ (آمین)

(بشکریہ "ماہنامہ الرشاد" اعظم گڑھ)

عالم اسلام کی عظیم شخصیت

مولانا اسیر ادروی ☆☆☆☆☆☆ مدیر ترجمان الاسلام، بنارس

اسلامی ہند کی آبرو، ملت اسلامیہ ہند کا دھڑکتا ہوا دل، مسلمانان ہند کی ذہنی و فکری تحریکوں کی روح رواں، زہد و تقویٰ، اخلاص و للّٰہیت کا پیکر، دنیاوی شان و شوکت، عہدہ و منصب کو حقارت کے پاؤں سے ٹھکرا دینے والا، اسلام اور اسلامی اقدار کے تحفظ و بقاء کے لئے قلندرانہ عزم و ثبات کا آہنی مجسمہ، پاکبازوں اور اللہ والوں کی روح پرور مجلسوں کا صدر نشیں، عالمی پیمانے پر اسلامی عظمت و وقار، مسلمانوں کی عزت و سربلندی کا داعی، غریبوں کے خس پوش جھونپڑوں سے لیکر بادشاہوں کے فصیل بند محلسراؤں تک جس کی پر سوز آواز جذبات کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی تھی، اسلام اور اسلامی اقدار و ثقافت کی حفاظت کے لئے سربراہان حکومت کے غرور و پندار سے ٹکرا جانے والا جسکو ہم کبھی مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کہا کرتے تھے اور اسکی ذات پر فخر کرتے تھے آج وہ محفل ہستی سے اٹھ گیا، ہماری آنکھوں کی روشنی اور دلوں کا قرار رخصت ہو گیا، وہ عظیم مفکر، وہ عظیم اسلامی قائد و رہنما وہ عظیم ترین انسان جس نے ظلم و جبر کی دنیا میں انسانیت کا سبق سکھانے کے لئے بلا خوف دار و رسن آواز بلند کی اور بسا اوقات مغرور طاقتوں کو اسکے سامنے سر جھکانا پڑا اور سر تسلیم خم کرنا پڑا، ہماری امیدوں کا وہ چراغ بجھ گیا مخلصانہ اسلامی قیادت کا سورج غروب ہو گیا اور ہماری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اسلامی ہند تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

صدیوں سے جو گھرانہ اپنے زہد و تقویٰ، قناعت پسندی، اخلاص و للّٰہیت اور جہاد

اسلامی کے جذبے سے معمور اور مشہور تھا جو اسلام کی عظمت و سربلندی کے لئے کفن بردوش اور جان ہتھیلیوں پر رکھ کر باطل طاقت سے سرگرم پیکار رہا اور اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنا ایک پروقار مقام بنایا جس نے دنیاوی منصبوں اور نمود و نمائش کے سارے مظاہر کو اپنے گردو پیش پھٹکنے نہیں دیا اور دین کی عظمت کے لئے میدان جہاد میں جان دیدی یہاں تک کہ اپنی قبر کا نشان بھی نہیں بننے دیا مولانا علی میاں اسی گھرانے کے فرد فرید اور اسی سنہری زنجیر کی آخری کڑی تھے بڑے بڑے انعامات و اعزازات آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے انہوں نے ان کی جانب ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر ان سے صرف نظر کرتے ہوئے بے نیازانہ گذر گئے، دولت کے انبار ان کے قدموں پر ڈھیر کئے گئے مگر انہوں نے ان کو خزف ریزوں سے زیادہ کبھی وقعت نہیں دی، اپنی قلندرانہ بے نیازی کے دامن پر زر طلبی کا دھبہ تک نہیں آنے دیا، یہ بات کہنے میں بہت آسان ہے لیکن اسطرح کی کوئی دوسری مثال ان پچاس سالوں میں مشکل سے پیش کی جاسکتی ہے سربراہان حکومت نے اسکے خس پوش گھر پر حاضری دی، اور نیاز مندانہ حاضری دی مگر اس عظیم المرتبت انسان کے لئے کوئی فخر و مباہات کی بات نہیں تھی، نہ انکے خیر مقدم کے لئے کوئی اہتمام کیا نہ ان کی پذیرائی میں اپنے بلند مقام سے نیچے اترے، تاریخ میں اس طرح کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں، مولانا علی میاں انہیں نایاب یا کمیاب انسانوں میں سے تھے، یہی ذات گرامی تھی جب اسلام کے ایک قانون کی پامالی کا موقعہ آیا تو انہیں سربراہان حکومت سے اسطرح ٹکرائے جیسے ان کو پہچانتے نہ ہوں اسلامی قانون کی حفاظت کی ضمانت لیکر واپس ہوئے، سیاسی افکار اور داؤ پیچ سے ان کو کبھی کوئی سروکار نہیں رہا، ہاں اسلامی اقدار پر حرف آیا یا ان کی راہوں میں سنگ گراں حائل ہوا تو ضرور آپ نے راہ سے ہٹانے کی بھر پور جدوجہد کی لیکن سیاسی قائد کے بجائے وہ ملت کے ترجمان و وکیل بن کر حکومت کے سامنے آئے، سیاسی قائد اور لیڈر بن کر نہیں۔

مولانا علی میاں کی پوری زندگی زہد و تقویٰ، اور خلوص وللّٰہیت کے سانچے میں اس طرح ڈھلی ہوئی تھی کہ ان کا کوئی قدم خالص سیاسی مسائل کی راہ میں نہیں اٹھا اسلامی

تہذیب و ثقافت، اقدار و مسائل کے پیچیدہ ترین مسائل کو بھی وہ سیاسی اسٹیج سے سیاسی لب و لہجہ اور زبان میں پیش کرنے کے قائل نہیں تھے اس کے لئے وہ خود راہ تجویز کرتے، اور اخلاص کے ساتھ، دین کے جذبے سے جدو جہد کے میدان میں قدم رکھتے، ان کی دور رس نگاہ سیاسی جبر اور دباؤ کے مقابلہ میں بھی سنجیدگی و وقار اور صبر و ضبط کو ترجیح دیتی اور کبھی اشتعال کی راہ نہیں اپناتی، ندوہ پر نہایت جابرانہ و قاہرانہ بلکہ ظالمانہ انداز میں چھاپہ کتنی روحانی اذیت کا باعث تھا، خود مولانا مرحوم کے گھر پر بارہ بجے شب میں مسلح پولس کی یلغار اور دوش ضبط و تحمل کو چور چور کر دینے والے حادثات تھے مگر وہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئے، کوئی جذباتی بیان نہیں دیا اور نہ اشتعال بھرے لب و لہجے میں حکومت کے اس رویہ کی مزمت کی، حکومت اپنی ناکردنی پر ذلیل و رسوا ہوئی ہر انصاف پسند لیڈر نے حکومت کے رویہ کی بھر پور مذمت کی، مولانہ مرحوم کا یہ طرز عمل اس لیے تھا کے ان واقعات سے ان کا اپنا دل مجروح ہوا، ان کی اپنی ذات کو صدمہ پہونچا تھا اور اپنی ذات کے لئے انتقام لینا مومن کامل کے بلند مقام سے فروتر درجہ ہے، حضرت علیؓ میدان جہاد میں ایک دشمن اسلام کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے اور چاہا کے اس کی گردن تن سے جدا کر دیں کے اس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا حضرت علیؓ اٹھکر کھڑے ہو گئے دشمن نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے اور مرے تھوک دینے کے بعد تو اس میں تاخیر کا سوال ہی نہیں تھا لیکن تم نے مجھے چھوڑ دیا، کیوں؟ حضرت علیؓ نے کہا

تم اللہ و رسول کے دشمن تھے تمہارے قتل میں مجھے اجر و ثواب تھا اور جب تم نے مرے چہرے پر تھوک دیا تو فطرتاً مجھے غصہ آگیا اب میرا اقدام ذاتی انتقام کے لئے ہوتا اور اس کا مجھے کوئی اجر و ثواب نہیں ملتا اس لئے میں نے تم کو چھوڑ دیا مولانا مرحوم کی نسبت حضرت علیؓ ہی کی طرف ہے یہ پر خلوص جذبہ اسی راہ سے ان میں آیا ہے ان کی ہر کوشش یہی تھی کہ ان کا ہر کام اللہ کے لئے ہو، دین کے تحفظ و بقاء کے لئے ہو، یہ مومنین صادقین کا مقام ہے اور یہ رتبہ بلند ملا جسکو، مل گیا۔

مولانا مرحوم کو ایک بڑی روحانی اذیت سلفی قبیلہ کی شائع کردہ کتاب "الدیوبندیہ" سے پہونچی جس میں ان کا نام لیکر غیر مبہم لفظوں میں کافر و مشرک کہا گیا ترجمان الاسلام میں اپنی افتاد طبع کے خلاف بہت ہی گرم لب ولہجہ میں اس رویہ کی مذمت کی گئی تھی مولانا موصوف کو یہ احتجاجی بیان سنایا گیا مگر دو سن کر خاموش رہے البتہ ندوہ سے شائع ہونے والے رسالوں کے ذمہ داروں کو ہدایت کی کہ اس سلسلہ میں کچھ نہ لکھا جائے یہ مولانا مرحوم کے اخلاص وللّٰہیت کے مستند واقعات ہیں۔

ہندوستان کے مشاہیر ارباب طریقت سے ان کے والہانہ روابط تھے، ان کا دل اسلام کے درد سے بھرا ہوا تھا، انکی کتابیں دو سو سے زیادہ ہیں، ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں ان کے دل کا سوز و گداز ہویدا اور ان کا درد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے، بالخصوص وہ چھوٹے چھوٹے رسالے جو عالم اسلام اور اسلامی مملکتوں کے سربراہوں کے دل ودماغ میں دینی زندگی کی نئی روح پھونکنے کیلئے آپ نے تحریر فرمائے انکا لب ولہجہ سوز و گداز سے بھرا ہوا، الفاظ دردمندانہ اور غیر تمند انسان کی چیخ بن گئی ہیں، ان کے مخلصانہ جذبات کا تموج اپنے شباب پر ہے اور لاکھوں انسانوں کی فکر و عمل کی دنیا میں زلزلہ ڈال دینے والے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انکے اس طرح کے رسائل اور چھوٹی چھوٹی کتابیں اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں بار بار اور لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتی رہیں اور عالم اسلام میں ایک ذہنی وفکری انقلاب برپا کرنے میں اہم رول ادا کیا، خدا نے ان کی زبان ان کی تحریروں کو تاثیر کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔

مولانا علی میاں صرف ہندوستان ہی کے نہیں عالم اسلام کے لئے عصر حاضر کے جمال الدین افغانی تھے جنھوں نے پان اسلام ازم ساری دنیا کے مسلمانوں متحد ہو جاؤ کا نعرہ دیا تھا وہ عالم اسلام کی بیداری اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے داعی، نقیب اور علمبردار تھے ان کی وفات صرف ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام کا غم ہے، خدا ان کی قبر کو رحمت و مغفرت کے سدا بہار پھولوں سے بھر دے اور فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

(بشکریہ سہ ماہی ترجمان الاسلام بمبئی)

میرِ کارواں

از :- محمد اسعد قاسمی

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ / ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء جمعہ کے دن جب آفتاب نصف النہار پر پہونچ رہا تھا کہ عالمِ اسلام اور ہندوستان کا آفتاب علم و معرفت مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفاتِ حسرت آیات کے ساتھ غروب ہو رہا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ، اَلْعَیْنُ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی بِہٖ رَبُّنَا ۔

حضرت مولاناؒ کی ذاتِ گرامی اس وقت عالمِ اسلام کی نمائندہ علمی و دینی شخصیت تھی، جس سے سارا عالم اسلام اور خصوصاً ہند و پاک مستفید ہو رہے تھے۔

مولاناؒ نے عصر حاضر میں اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ دین کی سربلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کا کارنامہ جس بلند آہنگی، عزم و استقامت، فہم و فراست اور حکمت و موعظت کے ساتھ انجام دیا اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

انکی ذات جامع الصفات اور جامع الجہات تھی، چنانچہ انکی افسوسناک رحلت سے علومِ دینیہ کے مراکز و مدارس بے رونق ہو گئے، روحانیت و معرفت کی خانقاہیں ویران ہو گئیں، علم و ادب کی محفلیں سونی ہو گئیں، وعظ و ارشاد کی مجالس کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اسلامی دعوت و نشر و اشاعت کی سرگرمیاں دھیمی ہو گئیں، اور صحیح معنوں میں "مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ" کا منظر سامنے آگیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے تمام اہم دینی وعلمی، ملی واجتماعی ادارے اوران کے کارکن اپنے کو بے سہارا محسوس کررہے ہیں، ندوۃ العلماء، دارالمصنفین، مسلم پرسنل لاء بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، مسلم یونیورسٹی وجامعہ ملیہ اسلامیہ، تحریک پیام انسانیت وغیرہ جیسے ملی اداروں کا اب اللہ ہی حافظ ہے۔

حضرت مولاناؒ عربی واُردو کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے اور دونوں زبانوں میں انھوں نے علم ودین اوراسلامی افکار کی جو مؤثر اور طاقتور ترجمانی کی ہے اور عصری ذہن ومزاج کے لئے جو حکیمانہ اور مصلحانہ طرزِ بیان اپنایا ہے اس کی وجہ سے انکی علمی ودینی خدمات عصر حاضر میں اسلام کی مثالی اور معیاری ترجمانی کا دلکش نمونہ بن گئی ہیں۔

اسلام اوراسلامی تعلیمات کے خلاف مستشرقین اور دوسرے فرق ضالہ کا دفاع انھوں نے جس حکمت وبصیرت کے ساتھ کیا ہے وہ تبلیغ دین کے داعیوں اور کارکنوں، عوام وخواص سب کیلئے دعوت فکر وعمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

عالم اسلام میں عرب قومیت اور مغربیت کے فتنے کی سرکوبی ان کا بڑا کارنامہ ہے، اسیطرح آزادی کے بعد سے فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام، مسلم پرسنل لاء، مسلم یونیورسٹی، دینی تعلیم اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ وبقا کے سلسلے میں حضرت مولاناؒ کی سرگرمیاں اور قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں جنکو یاد کرتے ہوئے آج ہندوستانی مسلمان بجا طور پر اپنے کو محروم ویتیم محسوس کررہے ہیں۔

یوں تو حضرت مولاناؒ کا تعلق سبھی دینی اداروں اور مدرسوں سے تھا، لیکن چند مدارس کو انکے خصوصی ربط وتعلق کا شرف حاصل تھا، ان میں دارالعلوم الاسلامیہ بستی بھی ہے، جس کے قیام کیلئے اس کے صدر والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم کو آمادہ کرنے میں حضرت مولانا کا دستِ شفقت بھی تھا۔

دارالعلوم الاسلامیہ کے قیام کے بعد حضرت مولاناؒ کی یہاں بار بار تشریف آوری ہوئی اور بڑے

جلسے واجتماعات ہوئے اور دارالعلوم کی ترقی کیلئے انھوں نے دعائیں کیں اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا، صدرِ دارالعلوم نے اس مبارک باہمی تعلق کے سبب حضرت مولانا کی وفات پر حجازِ مقدس سے (جہاں وہ سفر پر تھے) اخباروں کو اپنا تعزیتی پیغام روانہ کیا۔

دارالعلوم کے تمام کارکن اور اہل تعلق حضرت مولانا کے سانحۂ ارتحال کو اپنا ذاتی سانحہ سمجھتے ہیں اور ان کے جانشین حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اور دیگر اہلِ خاندان سے دلی تعزیت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت کی مغفرت و ترقیٔ درجات کیلئے دست بدعا ہیں۔

{ "معاصر فقہ اسلامی نمبر" سہ ماہی فکر اسلامی بستی }

مدرسہ کیا ہے؟

ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے، اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کیجاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

(۷)

منظوم خراجِ عقیدت

دُعا

ترا شیوہ کرم ہے اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولا ترے در کے فقیروں کی
ترے دربار سے مایوس پھر جائیں بھلا کیونکر
کہ تو کرتا رہا ہے خواہشیں پوری حریصوں کی
ادھر بھی ابر رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سر سبز کھیتی ہم غریبوں بد نصیبوں کی
خزاں میں بھی شجر سر سبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی
مری اولاد کو تو یا الٰہی اتنی ہمت دے
کہ ہو کر قوت بازو خبر لیں ہم ضعیفوں کی
انہیں کے علم اور اقبال کی شہرت جہاں میں ہو
ہے شہرت جیسی عالم میں نبیؐ کے ہم نشینوں کی
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر ہوں ان میں اور وہی فطرت کریموں کی
ترے دربار سے بہتر کی بھی امید بر آئے
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی علی راحت ہو سینوں کی

محترمہ خیر النساء بہترؔ والدۂ علی میاںؒ

تیری ہستی کو چراغِ رہ گزر پاتا ہوں میں

شفیق جونپوری اردو زبان کے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء سے پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

انجمن کی انجمن کو پُر خطر پاتا ہوں میں
جاگ اُٹھے خوابیدگانِ خوابِ غفلت جاگ اٹھے

اپنی ہی جانب حریفانہ نظر پاتا ہوں میں
نعرۂ توحید میں تیرے اثر پاتا ہوں میں

ہو رہا ہے کب سے عیارانِ مغرب کا ستم
سچ تو یہ ہے آج کی تاریکیٔ الحاد میں

نوجوانانِ حرم کو بے خبر پاتا ہوں میں
تیری ہستی کو چراغِ رہ گزر پاتا ہوں میں

ایک ہی خطرہ میں ہیں ایران بھی افغان بھی
رخ نہ کر بحث بریلی ہو کہ بحث دیوبند

قوم میں بحثِ ابو بکرؓ و عمرؓ پاتا ہوں میں
اس سے بالاتر تجھے اے نامور پاتا ہوں میں

آرہا ہے اپنی جانب ایک ایسا زلزلہ!
آج لادینی کی دنیا میں زہے تیرا وجود

جس سے خوف جنبشِ دیوار و در پاتا ہوں میں
شب کی تاریکی میں پیغامِ سحر پاتا ہوں میں

اے علی ندویؒ غنیمت ہے تری تبلیغ آج
تقریروں سے جاگ اٹھتا ہے میرا ذوقِ عشق

تجھ میں بے شک عالمی ذوقِ نظر پاتا ہوں میں
تجھ سے گویا کوئے سلمیٰ کی خبر پاتا ہوں میں

خاکساری تیری دیتی ہے پیامِ بو ترابؓ
منزلِ جاناں کی جانب ہے تری پروازِ شوق

تیری دانائی میں اندازِ عمرؓ پاتا ہوں میں
تجھ میں کچھ آثارِ مرغِ نامہ بر پاتا ہوں میں

گر نہیں سیف و علم نوکِ قلم سے کام لے
مردِ حق بیں کے تجسس میں شفیق زار کو

اے علی ندوی تجھے کچھ باخبر پاتا ہوں میں
اک بگولہ کی طرح آوارہ تر پاتا ہوں میں

شفیق جونپوریؒ

بیاد

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

از:- مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں
ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

دنیائے علم و فضل کے اے شاہِ ذی وقار
ہے تیرے غم میں عالمِ اسلام سوگوار

ہیں اہل دل کے قلب و جگر زخمی و فگار
اہلِ نظر کی آنکھ ہے ہر سمت اشکبار

ہے چاک چاک آج گریبانِ احتیاط
دامن ہوا ہے صبر و تحمل کا تار تار

ہر غنچہ دل گرفتہ ہے ہر گل اداس ہے
رخصت ہے تیرے ساتھ ہی اب موسمِ بہار

قائم تھا اس کے دم سے بھرم اپنی قوم کا
تھا بوالحسنؒ کی ذات سے ملت کا اعتبار

انسانیت نواز تھا پیغام بوالحسنؒ
جس سے فضائے ہند سراسر تھی مشکبار

تیری زباں سے نکلے ہیں کیا دُرِّ شاہوار
تیرے قلم نے کتنے کھلائے ہیں لالہ زار

تیری کتابِ علم کا ہر حرف معتبر
تیری کتابِ زیست کا ہر لفظ پر وقار

اسلوب نرم رو ترا موجِ نسیم تھا
اور گاہے تند و تیز کہ گرتا ہو آبشار

خوشبوئے فکر سے تری مہکے ہیں گلستاں
پہنچی صدائے حق تری از ہند تا تتار

مہر و وفا کی بزم میں شبنم سے بھی لطیف
جور و جفا کے رزم میں شمشیر ذوالفقار

خلق محمدی کی جھلک اس کے خلق میں
شانِ علیؓ، علیؓ کی ادا سے تھی آشکار

غیرت میں گرد پیرو آلِ حسینؓ تھا
اخلاق میں وہ خلقِ حسنؓ کا تھا جلوہ زار

اے آنکہ بود حُسنِ حسنؓ در جمالِ تو — اے شانِ بو الحسنؓ زجبینِ تو آشکار
گونجے تری اذاں سے ہیں مشرق کے بام و در — مغرب کی وادیاں بھی نہیں اس سے برکنار
تیری اذاں سے مشرق و مغرب کے معرکے — تیری فغاں سے ہے حق و باطل میں کارزار
تیری صدا سے تیز دل شرق کا لہو — تیری نوا ہے نعرۂ تکبیر کی پکار
اللہ! جانشینِ علیؓ پھر عطا کرے — اسلامیوں کو بخش دے کھویا ہوا وقار

سایہ فگن ہو رحمتِ حق بو الحسنؓ پہ اب!
اور ان پہ فضلِ خاص ہو اے ربِّ کردگار!

ایک جامع دُعا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ برس تمام دعاؤں کی جامع دعا جو حضرت ابو امامہؓ (شام کے آخری صحابی) سے منقول ہے، انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ میں نے بہت دعائیں یاد کیں، لیکن وہ میرے حافظہ میں محفوظ نہیں رہتیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا، میں تمہیں ایک ایسی دعا بتاتا ہوں جو تمام دعاؤں کی جامع ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِ مَا سَئَلَكَ مِنْهُ نَبِیُّكَ مُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم)، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِیُّكَ مُحَمَّدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم)، (رواہ البخاری)

ترجمہ:۔ اے اللہ! میں تجھ سے اُن سب بھلائیوں کا سوال کرتا ہوں جن کا سوال تجھ سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور میں اُن سب برائیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں جن سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی

خراجِ عقیدت

بیاد

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی

نتیجۂ فکر :- محمد عبدالقدیر — ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہ آباد۔

ہر طرف تھا علمِ نو کا ایک شور انقلاب — کشتیٔ اقدارِ آدم کھا رہی تھی پیچ و تاب
اور سارا عالمِ انسانیت تھا محوِ خواب — دہر میں اُگنے کو تھا تازہ صدی کا آفتاب

گلشنِ ہستی سے وہ جانِ چمن رخصت ہوا
کشورِ ہندوستاں سے بوالحسنؒ رخصت ہوا

یعنی وہ رخصت ہوا، تھا جو امیرِ کارواں — جس کے دم سے فکر و دانش کا تھا اک دُنیا رواں
جس کے علم و فضل کا قائل تھا ہر پیر و جواں — مختصر میں جس کو کہئے نازشِ ہندوستاں

آشنائے راہ منزل صاحب کردار تھا
ملّت اسلامیہ کا قافلہ سالار تھا

رومی و اقبال کے افکار کا تھا جانشیں — اس کی تحریروں میں تھی روحِ غزالی جاگزیں
تیمیہ اور ابن قیم کی امانت کا امیں — جسکی شخصیت کے قائل تھے سبھی علماءِ دیں

واعظ و ناصح، فقیہ و نکتہ داں جاتا رہا
یعنی فخرِ کشورِ ہندوستاں جاتا رہا

سارے انسانوں کو دیتا تھا محبت کا پیام
جس کا کرتے تھے سبھی مسلک کے علما احترام

اس کی تحریروں سے مہکا دور تک عالم تمام
وہ ہو یورپ یا کہ ایران و عراق و مصر و شام

نقش وہ چھوڑا ہے قصرِ علم کی تعمیر میں
دیر تک زندہ رہے گا پیکر تحریر میں

آشنائے رمز قرآں اور مفسر بے بدل
اک محدث، اک معلم اور عالم باعمل

صاحب علم و بصیرت، گفتگو میں بر محل
اس کے قول و فعل سے ایوانِ باطل میں خلل

خامشی میں اس کی مغنی خیز سوز و ساز تھا
اور جب بولا تو عالم گوش بر آواز تھا

ایک تنہا فرد لیکن علم و فن کی درسگاہ
ذات اس کی تشنگانِ علم کی آماجگاہ

نطقِ گویائی بنا لیتی تھی شہرِ دل میں راہ
اس کی ہستی میں تھے یکجا مدرسہ اور خانقاہ

درد ملت سے پریشاں صورتِ بسمل بھی تھا
رونقِ محفل، شریکِ شورشِ محفل بھی تھا

اس کی شہرت ہر طرف تھی وہ عرب ہو یا عجم
جس کے آگے ہیچ تھا شاہوں کا بھی جاہ و حشم

سینۂ گیتی میں کر کے نصب عظمت کا علم
خامشی سے وہ روانہ ہو گیا ملکِ عدم

مدتوں کرتا ہے گردش آسماں پر آفتاب
تب کہیں ہوتا ہے پیدا ایک مردِ کامیاب

سہ منزلہ دارالاقامہ (ہوسٹل) کا ایک خوبصورت منظر ..

دارالعلوم کی درسگاہوں کا ایک دلفریب منظر

Quarterly

FIKR-E-ISLAMI

دارالعلوم الاسلامیہ
ایک جامعہ

آج بستی حاضری کے موقع پر دارالعلوم الاسلامیہ کو جس ترقی، وسعت، نظم وانتظام کی بلند سطح پر دیکھا اور اس کی ترقی و توسیع کے جو مظاہر اور نمونے دیکھے ان کا تصور ہی نہ تھا دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکلا کہ یہ تو ایک جامعہ (یونیورسٹی) معلوم ہوتا ہے، دارالعلوم اپنے ذمہ داروں کی بیدار مغزی، معاونین کے اخلاص اور اہل دین اور اہل اثر کے تعاون کی بناء پر ایک اور بلند مستقبل کی خبر دیتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ہندوستان کے ممتاز مدارس اور مقاماتِ تعلیم و تربیت میں ممتاز مقام حاصل کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے اسباب مہیا فرمائے اور کارکنان اور ان کے معاونین کو زیادہ سے زیادہ اس میں تعاون کی توفیق عطا فرمائے۔

ابوالحسن علی ندوی

(حضرت مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی (نور اللہ مرقدہ)

ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۳ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ

Markaz-e-Dawat-o-Irshad Darul Uloom Al Islamia Basti-272001
U.P. India, Phone : (05542)-82893, 82458